MAUR102CCT

تاریخ ادب اردو

(دبستان، تحریکات، رجحانات)

ایم۔اے۔اردو

(پہلا سمسٹر)

دوسرا پرچہ

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

حیدرآباد۔500032، تلنگانہ، بھارت

©Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad

Course : M. A. Urdu

ISBN: 978-93-95203-41-8

Edition: 2022

ناشر	:	رجسٹرار، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد
اشاعت	:	2022
تعداد	:	5000
قیمت	:	340/-
ترتیب وتزئین	:	ڈاکٹر محمد نہال افروز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد
سرورق	:	ڈاکٹر محمد اکمل خان، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد
مطبع	:	اریہنت آفسیٹ، نئی دہلی

تاریخ ادب اردو

(دبستان، تحریکات، رجحانات)

Tareekh-e-Adab Urdu

(Dabistaan, Tahreekaat, Rujhanaat)

For M. A. Urdu 1st semester
Paper 2nd

Editor
Prof. Nikhath Jahan
Professor (Urdu), DDE, MANUU

On behalf of the Registrar, Published by:

Directorate of Distance Education

Maulana Azad National Urdu University

Gachibowli, Hyderabad-500032 (TS), Bharat

Director: dir.dde@manuu.edu.in **Publication:** ddepublication@manuu.edu.in

Phone: 040-23008314 **Website:** manuu.edu.in

مجلسِ اِدارت

پروفیسر نکہت جہاں

(پروفیسر اردو)

نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو

پروفیسر محمد نسیم الدین فریس

سابق صدر، شعبۂ اردو

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

ڈاکٹر سید محمود کاظمی

صدر، شعبۂ ترجمہ

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

ڈاکٹر ارشاد احمد

اسسٹنٹ پروفیسر (اردو)

نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو

ڈاکٹر محمد نہال افروز

گیسٹ فیکلٹی/اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول)

نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

ڈاکٹر محمد اکمل خان

گیسٹ فیکلٹی/اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول)

نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

کورس کوآرڈی نیٹر

پروفیسر نکہت جہاں، نظامتِ فاصلاتی تعلیم، مانو، حیدرآباد

مصنفین	اکائی نمبر
ڈاکٹر قاضی نوید، شعبۂ اردو، مولانا آزاد کالج آف آرٹس، سائنس اینڈ کامرس، اورنگ آباد	اکائی 1,2
ڈاکٹر عمر غزالی، شعبۂ اردو، ہگلی محسن کالج، بردوان یونیورسٹی، مغربی بنگال	اکائی 3
ڈاکٹر محمد شمس الدین، اے۔ آر۔ ڈی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 4, 5
ڈاکٹر محمد عقیل، لکچرر، البرکات پبلک اسکول، علی گڑھ	اکائی 6, 7
ڈاکٹر محمد نہال افروز، گیسٹ فیکلٹی/اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول)، مانو، حیدرآباد	اکائی 8
پروفیسر یوسف سرمست (سبکدوش)، شعبۂ اردو، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد	اکائی 9
پروفیسر شمس الہدیٰ، صدر شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 10
پروفیسر مجید بیدار سابق صدر، شعبۂ اردو، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد	اکائی 11
پروفیسر شمس الہدیٰ، صدر شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد /	
ڈاکٹر محمد نہال افروز، گیسٹ فیکلٹی/اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول)، مانو، حیدرآباد	اکائی 13
پروفیسر فاروق بخشی، سابق صدر شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 12
پروفیسر بیگ احساس، سابق صدر شعبۂ اردو، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 14
پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، جامعہ عثمانیہ / ڈاکٹر عبدالغنی، اے۔ آر۔ ڈی۔ نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو، حیدرآباد	اکائی 15
پروفیسر خالد جاوید، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	اکائی 16

فہرست

پیغام وائس چانسلر 07

پیغام ڈائرکٹر 08

کورس کا تعارف کورس کوآرڈی نیٹر 09

بلاک I مابعد دکنی ادب

اکائی 1۔ ریختہ گوئی اور ولی کی روایت 11

اکائی 2۔ تحریک ایہام گوئی اور ردعمل 33

اکائی 3۔ تحریک اصلاحِ زبان 48

بلاک II دبستان

اکائی 4۔ دبستان دہلی کا تعارف 71

اکائی 5۔ دبستان دہلی کے شعر وادب پر اثرات 91

اکائی 6۔ دبستان لکھنؤ کا تعارف 113

اکائی 7۔ دبستان لکھنؤ کے شعر وادب پر اثرات 130

بلاک III اردو کے علمی وادبی ادارے

اکائی 8۔ فورٹ سینٹ جارج کالج 149

اکائی 9۔ فورٹ ولیم کالج 169

اکائی 10۔ قدیم دہلی کالج 189

اکائی 11 ۔ جامعہ عثمانیہ 206

بلاک VI ادبی تحریکات ورجحانات

اکائی 12۔ اردو نظم اور انجمن پنجاب لاہور	223
اکائی 13۔ علی گڑھ تحریک	244
اکائی 14۔ ترقی پسند تحریک	267
اکائی 15 ۔ رومانی تحریک اور حلقۂ ارباب ذوق	288
اکائی 16۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت	310
نمونۂ امتحانی پرچہ	333

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی 1998 میں وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی۔اس کے چار نکاتی مینڈیٹس یہ ہیں۔ (1) اردو زبان کی ترویج وترقی (2) اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی فراہمی (3) روایتی اور فاصلاتی تدریس سے تعلیم کی فراہمی اور (4) تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ۔ یہ وہ بنیادی نکات ہیں جو اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد اور ممتاز بناتے ہیں۔قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری اور علاقائی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد ومنشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی رہا ہے۔کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند ''ادبی'' اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔یہی کیفیت اکثر رسائل واخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔اُردو قاری اور اُردو سماج دورِ حاضر کے اہم ترین علمی موضوعات سے نابلد ہیں۔چاہے یہ خود ان کی صحت وبقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، یا مشینی آلات ہوں یا ان کے گرد وپیش ماحول کے مسائل ہوں،عوامی سطح پر اِن شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے عصری علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کر دی ہے۔یہی وہ چیلنجز ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔اِسکولی سطح پر اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیرِ بحث آتے ہیں۔چوں کہ اُردو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے اور اس میں عصری علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

مجھے اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ یونیورسٹی کے ذمہ داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور ماہرینِ علم کے بھرپور تعاون کی بنا پر کتب کی اشاعت کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو چکا ہے۔ایک ایسے وقت میں جب کہ ہماری یونیورسٹی اپنی تاسیس کی پچیسویں سالگرہ منارہی ہے مجھے اس بات کا انکشاف کرتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہورہی ہے کہ یونیورسٹی کا نظامت فاصلاتی تعلیم ازسرنو اپنی کارکردگی کے نئے سنگ میل کی طرف رواں دواں ہے اور نظامت فاصلاتی تعلیم کی جانب سے کتابوں کی اشاعت اور ترویج میں بھی تیزی پیدا ہوئی ہے۔نیز ملک کے کونے کونے میں موجود تشنگانِ علم فاصلاتی تعلیم کے مختلف پروگراموں سے فیضیاب ہورہے ہیں۔گرچہ گزشتہ دو برسوں کے دوران کووڈ کی تباہ کن صورت حال کے باعث انتظامی اموراور ترسیل وابلاغ کے مراحل بھی کافی دشوار کن رہے تاہم یونیورسٹی نے اپنی حتی المقدور کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نظامت فاصلاتی تعلیم کے پروگراموں کو کامیابی کے ساتھ روبہ عمل کیا ہے۔میں یونیورسٹی سے وابستہ تمام طلبا کو یونیورسٹی سے جڑنے کے لیے صمیم قلب کے ساتھ مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ ان کی علمی تشنگی کو پورا کرنے کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا تعلیمی مشن ہر لمحہ ان کے لیے راستے ہموار کرے گا۔

پروفیسر سید عین الحسن
وائس چانسلر

پیغام

فاصلاتی طریقۂ تعلیم پوری دنیا میں ایک انتہائی کارگر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جا چکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے اِس طرزِ تعلیم کو اختیار کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا آغاز 1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور ٹرانسلیشن ڈِویژن سے ہوا اور اس کے بعد 2004 میں باقاعدہ روایتی طرزِ تعلیم کا آغاز ہوا اور بعد ازاں متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔ نو قائم کردہ شعبہ جات اور ٹرانسلیشن ڈِویژن میں تقرریاں عمل میں آئیں۔ اس وقت کے اربابِ مجاز کے بھرپور تعاون سے مناسب تعداد میں خود مطالعاتی مواد تحریر و ترجمے کے ذریعے تیار کرائے گئے۔

گزشتہ کئی برسوں سے یو جی سی۔ ڈی ای بی UGC-DEB اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کماحقہ ہم آہنگ کر کے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیا جائے۔ چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ ہے، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی۔ ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات کو ہم آہنگ اور معیار بلند کر کے خود اکتسابی مواد SLM از سرِ نو بالترتیب یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھ بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کرائے جا رہے ہیں۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ پندرہ کورسز چلا رہا ہے۔ بہت جلد تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جائیں گے۔ متعلمین کی سہولت کے لیے 9 علاقائی مراکز بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر اور 6 ذیلی علاقائی مراکز حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراوتی کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک تیار کیا ہے۔ ان مراکز کے تحت سرِ دست 144 متعلم امدادی مراکز (Learner Support Centres) نیز 20 پروگرام سنٹرس (Programme Centres) کام کر رہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔ نظامت فاصلاتی تعلیم نے اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا استعمال شروع کر دیا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جا رہی ہیں، نیز جلد ہی آڈیو۔ ویڈیو ریکارڈنگ کا لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ایس ایم ایس (SMS) کی سہولت فراہم کی جا رہی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات، کونسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو مرکزی دھارے میں لانے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہوگا۔

پروفیسر محمد رضاء اللہ خان

ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم

کورس کا تعارف

زبان انسانی خیالات وجذبات کے اظہار کا موثر وسیلہ اور معاشرتی عمل ہے۔اس کے ذریعے انسان اپنا مافی الضمیر واضح کرتا ہے اور یہی انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے۔زندگی کی دلکشی اور رنگینی زبان کی بدولت ہے۔ہندوستانی زبانوں کی فہرست میں اردو کا نمایاں اور تاریخی مقام ہے۔اگرچہ اردو ہندوستان میں پیدا ہوئی تاہم اس کی وسعت اور بین الاقوامی حیثیت کا اندازہ اس بات سے ہوجاتا ہے کہ دنیا کے بیشتر ممالک میں اسے بولا اور سمجھا جارہا ہے اور کئی یونیورسٹیوں میں باقاعدہ اسے پڑھایا جارہا ہے۔عالمی سطح پر اردو گیارہویں نمبر پر بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے۔اردو کا پیرایہ اظہار خوش گوار نزاکت کا آئینہ دار ہے۔اردو کا لہجہ دل آویز اور شیرینی کا شاہ کار ہے۔یہ زبان ان چند زبانوں میں سے ایک ہے ،جو اپنے اندر تمام انسانی آوازوں کی بہ خوبی ادائیگی کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کسی بھی زبان کو روزمرہ کے کام تک ہی محدود رکھنا کافی نہیں ہوتا۔بول چال کے علاوہ اس کا لکھنا، پڑھنا اور اس میں موجود ادب سے واقف ہونا بھی ازحد ضروری ہے۔تخلیقی اعتبار سے ادب کی مختلف نوعیتیں ہیں، جہاں ادب شخصیت کو سنوارنے اور نکھارنے کا فریضہ انجام دیتا ہے وہیں اپنے قاری کو مسرت سے بصیرت تک پہنچانے کا سامان بھی مہیا کرتا ہے اور سب سے اہم درس وتدریس کی دنیا میں طلبا کی تربیت اور معلومات کی ترسیل کا بھی اہم وسیلہ ہے۔اسی مقصد کے تحت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے فاصلاتی تعلیم کے طلبا کی تعلیمی ضرورت کو پورا نے کے لیے نصابی کتابوں کی تخلیق کا سلسلہ شروع کیا ہے۔

یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (UGC) کی ہدایت کے تحت یونیورسٹی کے روایتی اور فاصلاتی تعلیم کے لیے ایک ہی نصاب لازمی قرار دیا گیا ہے تاکہ نہ صرف ان دونوں نظام تعلیم کے طلبا کا تعلیمی معیار یکساں ہو بلکہ حصول تعلیم کے لیے فراہم کی جانے والی مختلف سہولیات کے اس دور میں طلبہ کے لیے دوران تعلیم ایک نظام تعلیم سے دوسرے نظامِ تعلیم کی طرف منتقلی بھی قابل عمل ہو۔

یو جی سی کے ہدایت پرعمل کرتے ہوئے نظامت فاصلاتی تعلیم ،مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے تمام مضامین میں نصابی کتابوں کی تخلیق واشاعت کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ان کتابوں کی تیاری میں اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ یہ اکتسابی مواد نہ صرف معیاری اور ہمہ گیر ہو بلکہ مضمون کے تمام اہم موضوعات کی نمائندگی بھی کرتا ہو اور مسابقتی امتحانات کی تیاری کے لیے معاون ومددگار بھی ہو سکے۔

ایم۔اے اردو کا یہ کورس چار سمسٹرز پر محیط ہے۔ہر سمسٹر میں چار، چار پرچے ہیں۔سب ہی پرچوں میں چار بلاک ہیں،جنہیں سولہ اکائیوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن کے تحت موضوع سے متعلق تمام ضروری معلومات آپ تک پہنچانے کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے۔ہر سمسٹر میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے طلبا کو چاروں پرچوں کے امتحانات دینے کے علاوہ تفویضات کی تکمیل بھی لازمی طور پر کرنا ہے،تبھی وہ اس کورس میں کامیاب قرار دیے جائیں گے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہم ایم۔اے اردو کے پہلے سمسٹر کے دوسرے پرچے کی یہ کتاب پیش کررہے ہیں، جس کا عنوان ''تاریخ ادب اردو'' (دبستان،تحریکات،رجحانات) ہے۔طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ فراہم کردہ نصابی کتابوں کے علاوہ جہاں تک ممکن ہو سکے تجویز کردہ کتابوں اور مشاورتی جماعتوں سے بھی بھرپور استفادہ کریں گے۔

پروفیسر نکہت جہاں
کورس کوآرڈی نیٹر

تاریخ ادب اردو

(دبستان، تحریکات، رجحانات)

بلاک I : مابعد دکنی ادب

اکائی 1: ریختہ گوئی اور وؔلی کی روایت

اکائی کے اجزا

1.0 تمہید

1.1 مقاصد

1.2 ریختہ کیا ہے؟

1.3 ریختہ کی روایت

1.4 ریختہ کا دکنی پس منظر

1.4.1 قطب شاہی عہد

1.4.2 عادل شاہی عہد

1.4.3 نظام شاہی عہد

1.5 وؔلی کا تعارف

1.6 وؔلی کی غزل گوئی

1.7 وؔلی کی روایت

1.8 دہلی کے ریختہ گو شعرا

1.9 اکتسابی نتائج

1.10 کلیدی الفاظ

1.11 نمونہ امتحانی سوالات

1.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1.12 مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1.0 تمہید

اردو زبان کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں اس کے قدیم ادب میں دو اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ایک اثر ہندوی روایت کا جو اپنی ابتدا سے لے کر دسویں صدی ہجری تک قائم رہا ہے۔ دوسرا اثر فارسی کا ہے جس میں ادب کی مستحکم روایت اور اس کا عظیم الشان ذخیرہ تھا۔ اس دوران اردو کہیں گجری کہلائی اور کہیں اسے دکنی کہا گیا۔ کہیں وہ لاہوری اور دہلوی کے نام سے موسوم ہوئی اور کہیں ہندوی اور کھڑی بولی کہلائی۔ اورنگ زیب عالمگیر نے جب دکن کو فتح کیا تو شمال اور جنوب گھر آنگن بن گئے تھے اور جنوب یعنی دکن کی طویل ادبی روایت شمال کی زبان اور لہجے سے مل کر وؔلی کے دور میں ایک نئے عالمگیر معیار کو پہنچی۔ زبان و ادب کے اس نئے معیار کا نام ''ریختہ'' قرار پایا اور بعد میں اردو کے نام سے موسوم ہوئی۔ غزل کو اس کی ممتاز صنف ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

1.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ :

- ☆ ریختہ کے معنی و مفہوم سے واقفیت ہو سکیں۔
- ☆ دکن کے شعری مزاج سے واقف ہو سکیں۔
- ☆ وؔلی دکنی اور ان کے اجتہاد سے واقف ہو سکیں۔
- ☆ اس دور کی صورتحال اور تقاضوں سے واقف ہو سکیں۔
- ☆ اس بات سے واقف ہو سکیں کہ وؔلی نے شمال اور جنوب کی شعری روایت کو جوڑنے کا کام کیا۔
- ☆ شمالی ہند کے ریختہ گو شعرا سے واقف ہو سکیں۔

1.2 ریختہ کیا ہے؟

ریختہ کے لغوی معنی ہیں بے ساختہ نکلا ہوا، بلا تکلف و بلا تصنع زبان سے نکلا ہوا، پختہ، مضبوط، پکا، چونے گچی کا بنا ہوا۔ اردوئے معلّٰی کے اشعار، دہلی کی خاص سیدھی سادھی اردو زبان اور اس کے اشعار۔ اصطلاح میں ریختہ زبان اردو کی اُس نظم کو کہتے ہیں جو بے ساختہ کہی گئی ہو۔

عارفؔ یہ ریختہ بھی نہیں فارسی سے کم
دیوان سینکروں مرے ایراں تلک گئے
(عارفؔ)

کس کس طرح سے میؔر نے کاٹا ہے عمر کو
آخر آخر آن کے یہ ریختہ کہا
(میر تقی میؔر)

بعض لوگ اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ریختہ معماروں کی اصطلاح میں اس مصالحہ کو کہتے ہیں جو مضبوطی کے واسطے چونا وغیرہ ملا کر

بنایا جاتا ہے۔ چوں کہ اردو نظم میں بھی مختلف زبانوں مثلاً عربی، فارسی، ترکی، ہندی، برج بھاشا، کھڑی بولی وغیرہ کے الفاظ شامل ہیں اس لیے اس کا نام ریختہ پڑ گیا۔ میرتقی میرؔ کہتے ہیں۔

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

غالبؔ نے کہا ہے۔

ریختہ کے تمھیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

ریختہ ابتدا میں موسیقی کی ایک اصطلاح تھی اور اسے شاید امیر خسرو نے وضع کیا تھا۔ پروفیسر محمود شیرانی لکھتے ہیں:

''اس اصطلاح سے موسیقی میں یہ مقصد قرار پایا کہ جو فارسی خیالؔ ہندوی کے مطابق ہو اور جس میں دونوں زبانوں کے سرود ایک تال اور ایک راگ میں بندھے ہوں اس کو ریختہ کہتے ہیں۔''

کچھ عرصہ بعد اس کا اطلاق ایسے منظوم کلام پر ہونے لگا جس میں دونوں زبانوں یعنی ہندی اور فارسی کا اجتماع ہو۔ مثلاً آدھا مصرع فارسی میں آدھا ہندی میں یا ایک مصرع فارسی میں ایک ہندی میں۔ اٹھارویں صدی میں ریختہ کی اصطلاح اردو شاعری کے لیے استعمال ہونے لگی۔

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

(میرؔ)

یار کے آگے پڑھا یہ ریختہ جا کے نظیرؔ
سن کے بولا واہ واہ، اچھا کہا اچھا کہا

(نظیر اکبرآبادیؔ)

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشک فارسی
گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

(غالبؔ)

لیکن ریختہ کی اصطلاح اردو شاعری تک محدود نہ رہی بلکہ زبان اردو کے لیے بھی استعمال ہونے لگی۔

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر — یہ ہماری زبان ہے پیارے — (میرؔ)

زبان ریختہ میں کہے ہوئے کلام کے لیے ''ریختہ'' کا لفظ استعمال کرنے کا رواج انیسویں صدی کے وسط تک جاری رہا۔ اسی طرح اردو زبان کے نام کے طور پر ''ریختہ'' اور ''ہندی'' کے الفاظ انیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک چلن میں رہے۔

شہر دہلی میں جو ہندوستان کا نہ صرف سیاسی بلکہ ثقافتی مرکز بھی رہا ایک طویل عرصے تک ''غزل'' اور ''ریختہ'' میں فرق کیا جاتا رہا۔ غزل

سے مراد صرف فارسی غزل تھی اور زبان ریختہ میں کہی ہوئی غزل کو غزل نہیں بلکہ ریختہ کہا جاتا تھا۔ چناں چہ فارسی غزل کے مشاعروں کو مشاعرہ اور ریختہ کے مشاعروں کو ''مراختہ'' کہا جاتا تھا،لیکن رفتہ رفتہ فارسی کا زور ختم ہوتا گیا اور ریختہ کو عام مقبولت ملنے لگی اور مصحفی کے زمانے کے آتے آتے فارسی پر ریختہ کو غلبہ حاصل ہو گیا اور مراختوں کو بھی مشاعرہ کہا جانے لگا۔ مصحفی نے اپنے تذکرہ ہندی گویاں میں لکھا ہے:

''ہندوستان میں فارسی شاعری کا رواج ریختہ کی بہ نسبت کم ہے اور ہمارے زمانے میں ریختہ بھی فارسی جیسے بلند مقام تک پہنچ گیا ہے بلکہ فارسی سے بھی بہتر ہے۔''

شاکر ناجی نے اپنے ایک شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

بلندی سن کے ناجیؔ ریختے کی
ہوا ہے پست شہرہ فارسی کا

1.3 ریختہ کی روایت

ریختہ کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو صنف غزل کا پہلا شاعر مسعود سعد سلمان کو کہا جاتا ہے لیکن مسعود سعد سلمان ہندی کا شاعر تھا اور اب تک اس کا کوئی اردو کلام دستیاب نہیں ہوا ہے۔ اس بنیاد پر ہم مسعود سعد سلمان کو اردو کا پہلا شاعر نہیں تسلیم کر سکتے ہیں۔ البتہ امیر خسرو کے یہاں ریختہ کے اشعار کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کے چند اشعار ریختہ کے اشعار معلوم ہوتے ہیں۔ دراصل امیر خسرو فارسی شعری روایت کے پروردہ تھے فارسی اور ہندی کا ایک حسین امتزاج ان کی شاعری میں ہمیں نظر آتا ہے۔ یہ ہم ضرور کہہ سکتے ہیں کہ پہلے پہل ریختہ کے اشعار امیر خسرو کے یہاں ملتے ہیں۔ مثلاً۔

گوری سووے سیج پر، مکھ پر ڈالے کیس
چل خسروؔ گھر اپنے، رین بھئی چوندیس

یا پھر

زحال مسکیں مکن تغافل دورائے نینا ، بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں! نہ کاہے لیہو لگائے چھتیاں
شبان ہجراں دراز چو زلف و روز وصلت چوں عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

لیکن امیر خسرو کے یہاں غزل کا کوئی واضح تصور بحیثیت صنف سخن نظر نہیں آتا۔ انھوں نے فارسی غزل کی نہج پر شاعری ضرور کی ہے۔ کبھی کبھی ایک مصرع فارسی میں اور ایک مصرع ہندی زبان میں کہا ہے لیکن بحیثیت مستقل صنف اردو غزل کا کوئی واضح تصور ان کے کلام میں نہیں ملتا۔ اس لیے ہم امیر خسرو کو بھی اردو کا پہلا باضابطہ غزل گو شاعر نہیں قرار دے سکتے۔ اردو کے لیے اگر چہ کہ شمالی ہندوستان کی فضاء زیادہ سازگار تھی لیکن شعر و ادب کی تخلیق کا سلسلہ دکن سے شروع ہوا۔ میرؔ نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے۔

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے

1.4 ریختہ کا دکنی پس منظر

یہاں ہم دکن میں ریختہ کی روایت کو اس کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ دکن کی بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد جب یہاں پانچ خودمختار ریاستیں قائم ہوئیں تو دکنی یعنی قدیم اردو کو ان کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ قطب شاہی اور عادل شاہی حکومتوں نے مغلوں کے مقابلے میں اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کے لیے فارسی کے بجائے دکنی زبان کی سرپرستی کی۔ اگرچہ کہ دکن کے بادشاہوں کی مغلوں کے ساتھ رقابت اور دشمنی سیاسی نوعیت کی تھی لیکن اس کے اثرات اس زمانے کی تہذیب اور معاشرت پر بھی پڑھے۔ شمالی ہندوستان میں اردو گھروں اور بازاروں میں تو رائج ہو چکی تھی لیکن اس کو ایک ادنی زبان سمجھا جاتا تھا اور فارسی کا مرتبہ اس کے مقابلے میں کافی زیادہ بلند تھا۔ دکن کے بادشاہ شعوری طور پر اپنے آپ کو مغلوں کی تمام خصوصیات سے الگ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے ایرانی کلچر کے مقابلے میں دکنی کلچر اور مقامی روایات کی طرف توجہ کی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی زبان کے بجائے مقامی زبان یعنی دکنی اردو نے اپنا مقام بنانا شروع کیا۔ دکنی زبان پر ہندی اور بھاشا کے اثرات فارسی سے زیادہ ہیں۔ یہاں زیادہ تر مثنویاں لکھی گئیں بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ صرف مثنویاں لکھی گئیں۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ غزل دکن کے لیے غیر مانوس تھی لیکن کم کہی جاتی تھی۔ یہ اردو کا ابتدائی اور تشکیلی دور تھا۔ اس ابتدائی دور کے جن دکنی شعرا کے یہاں ریختہ کی جھلک ملتی ہے اور جن سے اس زمانے کے طرزِ فکر کا اندازہ ہوتا ہے ان میں محمد قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی اور ہاشمی وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ دکن میں اردو زبان صوفیائے کرام کے ذریعے پہنچی۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، خوب محمد چشتی وغیرہ صوفیوں نے اپنی تصانیف تحریر کیں۔ بہمنی سلطنت میں دکنی کو فروغ ہوا۔ فخر دین نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ سے مثنوی نگاری کا آغاز ہوا۔ اسی دور میں غزل کی صنف بھی روشناس ہوئی۔ مشتاق اور لطفی دکنی کے اولین شعرا میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔

1.4.1 قطب شاہی عہد:

بہمنی بادشاہوں کے جانشینوں میں شاہانِ قطبیہ کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ ان کی شہرۂ آفاق دولت وثروت، تعمیر کاری اور علم وادب کی سرپرستی ہمیشہ یاد رہے گی۔ اردو زبان وادب نے اس عہد میں غیر معمولی ترقی کی۔ انھوں نے تقریباً 80 سال تک گولکنڈہ اور دکن کے زیادہ تر آندھرا علاقوں پر حکمرانی کی۔ اس خاندان کے آٹھ بادشاہوں میں آخری چار بادشاہ اردو کے سرپرست ہونے کے ساتھ ساتھ خود اردو کے شاعر تھے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ اس خاندان کا پانچواں حکمراں تھا جو اردو کا ایک عظیم شاعر ہے۔ اس نے تقریباً پچاس ہزار اشعار کہے، جو دکنی اردو میں ہیں۔ قلی قطب شاہ کی شاعری میں ہندوستانیت کی روح جلوہ گر ہے۔ ہندوستانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی رنگا رنگ تصویریں اس کے کلام میں نظر آتی ہے۔ عید، شب برات، ہولی، دیوالی جیسے ہندوستانی تہواروں کا بیان بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔ غرض کہ اس کی شاعری میں مقامی رنگ کچھ اس طرح جھلکتا ہے کہ ہم اس کے کلام سے اس عہد کے رہن سہن اور طرزِ معاشرت کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر سکتے ہیں۔ قلی قطب شاہ ایک جری بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ عاشقانہ مزاج کا بھی مالک تھا جس کا اندازہ ہمیں اس کی ان نظموں سے ہوتا ہے جو اس نے اپنی بارہ گوپیوں کی تعریف میں کہی ہیں۔ یہ نظمیں عشق ومحبت کی والہانہ کیفیت کی سچی تصویریں پیش کرتی ہیں۔ جن نظموں میں شاعر نے اپنی محبوباؤں کے سراپا اور حسن کے ناز وانداز کی تصویریں پیش کی ہیں ان میں ہندی، سنسکرت کی عشقیہ شاعری کا رنگ جھلکتا ہے۔ یہ نظمیں مسلسل غزل کے فارم میں ہیں۔ جن پر نظم سے زیادہ غزل کا

گمان ہوتا ہے۔سلطان محمد قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر مانا جاتا ہے۔اس کے کلیات میں مثنویاں ، قصائد، مراثی ،غزلیات اور رباعیات جیسی تمام اصناف میں تخلیقات موجود ہیں۔اس کی زبان میں کافی ترقی اور پختگی ہے اور تخلیقات میں ایک ادبی شان ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کی نظموں میں عشق و مستی اور تصوف کے ساتھ ساتھ انسانی معاشرت اور مظاہر قدرت کا بھی بیان ملتا ہے۔اس کی یہ نظمیں اپنے تنوع اور رنگا رنگی کی وجہ سے نظیر کی نظموں کی یاد دلاتی ہیں جس طرح اس کی شاعری کے موضوعات میں ہندوستانی رنگ نمایاں ہے اسی طرح اس کی زبان پر ہندوستانی زبان کا رنگ غالب ہے جو فارسی کے بجائے ہندی زبان سے قریب تر ہے۔اس نے حافظ کی زمینوں میں غزلیں کہیں اور بعض اشعار کا ترجمہ بھی کیا۔حافظ کی طرح خمریات محمد قلی قطب شاہ کے دیوان میں اہم موضوع کی حیثیت رکھتی ہے۔مثلاً

پیا باج پیا لا پیا جائے نا
پیا باج ایک تِل جیا جائے نا

جہاں تو واں ہوں میں پیارے مجھے کیا کام ہے کس سے
نہ بت خانے کی پروا ہے نہ مسجد کی خبر مجھ کو

جو کوئی عشق میں ثابت ہے جینا ہے سدا اس کا
سو اس کے نام سے میخانہ سب معمور کر ساقی

عشق کے پنتھ میں ہماری پند ہے
غیر کے باتاں نہ سُن ہیں بے حساب
مرا دل ہے زر بفت کا کارخانہ
نہیں منج کوں بازارِ والا کا حاجت

قلی قطب شاہ کے ان اشعار میں ہندی شاعری کا طرز غالب ہے۔اس کے کلام میں کہیں کہیں فارسی کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں لیکن مجموعی فضاء ہندی کی ہے۔ملا وجہی کے پاس تو ہندی اثرات محمد قلی قطب شاہ سے بھی زیادہ ہیں۔ہاشمی کی غزلوں میں تمام تر عورتوں کے مختلف جذبات واحساسات کی ترجمانی ملتی ہے۔ہاشمی کی غزلوں میں صنف نازک کے جذبات واحساسات کو گہرے نفسیاتی شعور کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔جس میں سادگی ،معصومیت اور بھولا پن پایا جاتا ہے۔یقیناً یہ ہندی کے اثرات کا نتیجہ ہے۔

قطب شاہی دور کے جن شعرا نے اردو کے گیسو سنوارے اور اس میں ادبیت پیدا کی ان میں فیروز، ملا وجہی ،غواصی ،ابن نشاطی ،خیالی، محمود وغیرہ شعرا قابل ذکر ہیں۔اس دور کے مشہور شاعروں میں فیروز کو استادی کا درجہ حاصل تھا۔وجہی گولکنڈہ کا پہلا ملک الشعرا تھا۔اب تک وجہی کی 16 /غزلیں دستیاب ہو چکی ہیں۔جن کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ وہ قدیم اردو یا دکنی کا ایک پختہ مشق اور قادرالکلام غزل گو بھی تھا۔وہ شاعری کے متعلق اپنا ایک واضح نقطہ نظر رکھتا تھا جس کا ذکر اس نے قطب مشتری میں تعریف سخن کے عنوان سے کیا ہے۔اس کے

نزدیک سادگی، سلاست اور ربط و برجستگی اچھے شعر کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ شعر میں ایسے الفاظ کا استعمال کیا جائے جنھیں اساتذہ نے برتا ہو۔

کتا ہوں تجے پند کی ایک بات
کہ ہے فائدہ اس منے دھات دھات
جو بے ربط بولے تو بیتاں پچیس
بھلا ہے جو اک بہت بولے سلیس
اسی لفظ کوں شعر میں لیاے توں
کہ لیا یا ہے استاد جس لفظ کوں

وجہی کی غزلوں کی نمایاں خصوصیت حقیقت پسندی کا رجحان ہے۔ یہ رجحان کم و بیش امتیاز کے ساتھ سبھی دکنی شعرا کے یہاں نظر آتا ہے۔ وجہی کا اسلوب تیکھا تھا۔ اس کے کلام کا اثر دماغ کے بجائے دل پر ہوتا تھا۔ فکر سے زیادہ اس کے یہاں جذبے اور خلوص کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے۔ اس کا سب سے نمایاں وصف پاکیزگی ہے۔ قلی قطب شاہ کی غزلوں میں چنچلتا، شوخی اور ہرجائی پن بسا اوقات حد سے متجاوز ہو گیا ہے۔ جو ہوس قلی قطب شاہ کی غزلوں میں ہے وہ ملا وجہی کے یہاں پاکیزگی اختیار کر لیتی ہے۔ اس کے کلام میں ایک قسم کا رکھ رکھاو اور ضبط وتحمل کے ساتھ احتیاط کی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔

اے ماہ شام ہوئی ہے سحر تج فراق تے
کاں وصل دیکھوں جاوں کدھر تج فراق تے
یکتائیں سہیلی مرنا ، دل دوجے پر نا دھرنا
اس پیو کوں اپنا کرنا اس پاپی من کوں کھوے کر
ہاتف خبر دے بیگ اگر دوست ہے مرا
کس رات آ ملے گی وہ چنچل سندر مجھے
تج زلف کے یک تار سوں زنار کر گھالوں گلے
گنگا دھرے توں جیو منے کاسی کوں جانا کیا سبب

وجہی اپنے عہد کا نہ صرف ایک عظیم المرتبت شاعر و ادیب تھا بلکہ بلند پایہ عالم، فلسفی اور حکیم بھی تھا۔ اس کی غزلوں میں واردات عشق کے ساتھ ساتھ معرفت و سلوک، فلسفہ و تصوف اور اخلاق و حکمت کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ اسی طرح سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دور کے اردو شاعروں میں غواصی بہت مشہور ہوا ہے۔ وہ اگرچہ محمد قلی کے دور ہی سے اپنا ایک علیحدہ دبستانِ سخن بنا چکا تھا مگر وجہی کے ملک الشعرا کے آگے اس کا چراغ جل نہ سکا۔ اس کے کلیات میں غزلیں، نظمیں، رباعیات، مراثی غرض تمام اصنافِ سخن موجود ہیں لیکن اس کی شہرت اس کی میناستونتی، طوطی نامہ اور سیف الملوک و بدیع الجمال کی وجہ سے ہے۔ جہاں تک صنف غزل کا تعلق ہے تغزل و سرمستی، جذبات کا سوز و گداز، زبان و بیان کی بے ساختگی اور

لطافت اور شگفتگی اشعار کی نغمگی اور موسیقیت' یہ وہ خصوصیات ہیں جہاں غواصی دیگر غزل گو شعرا سے منفرد نظر آتا ہے۔ اس کی بعض غزلیں' جو علوے جذبات' خوش آہنگی' کیف و مستی' سرخوشی و سرشاری اور شعور ذات کی رفیع جمالیاتی کیفیات کی عکاسی کرتی ہیں، حافظ اور خسرو کی اسی رنگ و آہنگ کی غزلوں کی ہم پایہ ہیں۔

سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد کا ایک بڑا عوامی شاعر ابن نشاطی ہے جس نے اپنے فنی شعور اور فارسی رنگ و آہنگ سے اردو کو ایک نئی آب و تاب اور ادبی شان بخشی۔ اس کی ادبی شان اور شاعرانہ صلاحیت کا جیتا جاگتا ثبوت اس کی بے مثال مثنوی ''پھول بن'' ہے۔ یہی مثنوی اس کی شاعری کا پہلا اور آخری نمونہ ہے۔ اس میں نہایت سادگی اور پرکاری کے ساتھ اکثر و بیشتر صنعتوں کو استعمال کیا ہے۔ ابن نشاطی دراصل ایک صاحبِ ذوق انشا پرداز تھا اور شاعری اور سخن گستری اس کا پیشہ نہیں تھا۔ وجہی یا غواصی کے برعکس اس کو شاہی دربار سے کوئی تعلق بھی نہیں تھا۔ ابن نشاطی حیدرآباد کے ادب اور سخن گستری کے اس دور کا ایسا صاحبِ کمال تھا جس نے شاعروں اور ادیبوں کی درباری اور سرکاری قدردانی سے بے نیاز ہو کر شعر و سخن میں مصروف رہنے کا راستہ دکھایا۔ چناں چہ اس کے بعد کئی ایسے شاعروں اور ادیبوں کے نام ملتے ہیں جن کی تصانیف و تالیف کا شاہی سرپرستی سے کوئی تعلق ظاہر نہیں ہوتا۔ ان میں سید بلاقی شاہ راجو، میراں جی، خدانما، فاروقی اور میران یعقوب کے کارنامے اب تک مشہور ہیں جو عہد عبداللہ شاہ کا تحفہ ہیں۔ عبداللہ قطب شاہ کے آخری زمانے میں اورنگ زیبؒ کے حملے کی وجہ سے قطب شاہی سلطنت میں انتشار پیدا ہوا۔ اورنگ زیبؒ نے گولکنڈہ کو فتح کر کے عبداللہ شاہ کے ساتھ صلح کر لی اور یہاں اپنا ایک سفیر مقرر کیا۔ اورنگ زیبؒ کا سفیر حکومت کے ہر معاملے میں مداخلت کرتا تھا گویا حکومت نام کو باقی رہ گئی تھی بلکہ پوری طرح اورنگ زیبؒ کا قبضہ ہو گیا تھا۔ عبداللہ قطب شاہ کے بعد ابوالحسن تانا شاہ نے پندرہ سال تک حکمرانی کی۔ تانا شاہ خود بھی بہت اچھا شاعر تھا اور شعرا کی قدردانی بھی کرتا تھا۔ اس کے عہد میں بھی اردو ادب کی کافی ترقی ہوئی۔ اس کا ایک پیر بھائی طبعی اس دور کا ایک اعلیٰ شاعر تھا اس نے ''بہرام و گل اندام'' لکھی تھی۔ طبعی کی یہ مثنوی دکنی اردو کے بہترین کارناموں میں سے ہے۔ زبان کی سلاست اور شاعرانہ نزاکتوں میں طبعی اپنے پیش رو اساتذہ وجہی، غواصی اور ابن نشاطی تینوں پر سبقت لے گیا ہے۔ اس دور کے دوسرے شعرا میں امین، خواص، سیوک، شاہ افضل، محبّ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

1.4.2 عادل شاہی عہد:

بہمنیوں کے زوال اور گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت کے قیام سے بہت پہلے ہی علاقۂ کرناٹک کے مرکزی شہر بیجاپور میں ایک آزاد سلطنت قائم ہو گئی اور علم و ادب کا مرکز بنتی گئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کا بانی یوسف عادل شاہ محمود گاواں کا تربیت یافتہ تھا اور اس نے اپنے مربی کی شہادت کے بعد ہی بہمنیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور اس کے اعلان آزادی کے ساتھ وہ تمام اہل علم و فضل اس کے اطراف جمع ہو گئے جو محمود گاواں جیسے عالم و فاضل وزیر کے دست راست تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ خود یوسف علم و ادب کا دلدادہ اور فارسی کا اچھا شاعر تھا۔ یوسف عادل شاہ کے بعد ابراہیم عادل شاہ کا نام اردو ادب کے لیے قابل ذکر ہے اس نے شیعہ مذہب ترک کر کے سنی مذہب اختیار کیا، اس کی وجہ سے ایرانی اثر کم ہو گیا اور دکھنیوں کو عروج ہوا۔ اس تبدیلی کا اثر زبان پر بھی ہوا۔ ابراہیم نے علما اور فضلا کی سرپرستی اور قدردانی فرمائی۔ خواجہ معین الدین، آقا شہاب الدین شیروانی، خواجہ عنایت اللہ شیروانی، ملا فتح اللہ شیرازی وغیرہ اس کے عہد کے مشہور علما ہیں۔ اس کے زمانے میں شاہ برہان الدین جانم نے جو بیجاپور کے بہت بڑے صوفی اور صاحب ارشاد و ہدایت تھے کئی رسالے دکنی زبان میں قلم بند کیے جو آج بھی کتب خانوں میں

موجود ہیں۔

عادل شاہی سلطنت کے ایک حکمراں ابراہیم عادل شاہ ثانی کو شاعری اور موسیقی سے خاص دلچسپی تھی۔ وہ نہ صرف شاعری اور موسیقی کا قدر دان تھا بلکہ خود بھی ان دونوں فنون میں مہارت رکھتا تھا۔ظہوری، ملک قمی، آتشی، مقیمی، جیسے شعرا دربار کی زینت بنے ہوئے تھے۔اس عہد میں ابوالقاسم فرشتہ نے اپنی مشہور کتاب ''تاریخ فرشتہ'' قلم بند کی۔ظہوری نے اپنے قلم کی جولانی سہ نثر ظہوریؔ کی صورت میں دکھائی۔ملک قمی نے مخزن اسرار نظامی کا جواب لکھا۔اسی دور کا ایک شاعر عبدلؔ بھی تھا جس نے اپنے محسن ابراہیم عادل شاہ ثانی کے حالات ایک طویل اردو مثنوی ابراہیم نامہ میں قلم بند کیے ہیں۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے بعد محمد عادل شاہ خود تو شاعر نہیں تھا لیکن اس کا دربار شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں سے بھرا ہوا تھا۔اس کی ملکہ خدیجہ سلطان شہر بانو گولکنڈہ کے محمد قطب شاہ کی دختر تھیں۔کمال خاں رستمی نے خدیجہ سلطان شہر بانو بیگم کے اعلان انعام پر فارسی خاور نامہ ابن حسام کا عمدہ اردو ترجمہ کیا اور انعام اول کا مستحق قرار پایا۔

عادل شاہی سلطنت سے دکنی شاعری درباری آداب سے آشنا ہوئی۔دربار میں شعرا کی عزت افزائی ہونے لگی اس طرح علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ کے دور حکومت میں بیجاپور کے عظیم المرتبت شاعر نصرتی کو پہلی بار ملک الشعرا جیسے جلیل القدر خطاب سے نوازا گیا۔خود عادل شاہ ثانی بھی ایک عمدہ شاعر تھا اور شاہی تخلص کرتا تھا۔اس کو موسیقی سے بھی شغف تھا۔اپنی غزلیہ شاعری میں حسن پرستی، رندمشربی اور غنائیت کے سبب اپنا ایک ممتاز مقام رکھتا تھا۔

تج گال پرنکھ کا نشاں دستاں ہے منج اس دھات کا
روشن شفق میں جگمگے جیوں چاند پہلی رات کا

ملک الشعرء نصرتی کو اردو شاعری میں افضلیت حاصل ہے۔اس نے رزم اور بزم ہر دو طرح کی شاعری کی ہے اس کی غزل تجربات حسن و عشق کا سدابہار گلدستہ دکھائی دیتی ہے۔

برہے کے نس میں غم سوں جلتا ہوں شمع نمنے
دکھلا صبا درس کا اے خاور جمالی

نصرتی کے بعد دبستان بیجاپور کے ریختی گو شاعر ہاشمی کا نام لیا جاتا ہے۔ہاشمی بیجاپوری نے نصرتی کی روایات کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ اس کو ایک استحکام بھی بخشا ہے۔ہاشمی نے ریختی میں اپنی ایک امتیازی شناخت قائم کی ہے۔ملک خوشنود اور فراقی بھی اس دور کے ممتاز شعرا تھے۔ان شعرا نے مثنوی کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔

1.4.3 نظام شاہی عہد:

نظام شاہی دورِ حکومت میں بھی اردو زبان نے کافی ترقی کی لیکن اس دور میں جتنا کام عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں میں ہوا اس کی نسبت نظام شاہی دور میں اتنا کام نہیں ہوا۔البتہ اردو غزل کی ابتدا کے لیے یہ علاقہ اہمیت کا حامل ہے۔اس سلطنت کے ایک اہم شاعر اشرف ہیں۔ ان کا نام شیخ محمد اشرف تھا اور اشرف تخلص کرتے تھے۔اشرف کو مقبولیتِ دوام ان کی مثنوی ''نوسر ہار'' کی وجہ سے ملی۔

اِس کے بعد جس شاعر نے غزل کی ہیئت کو باضابطہ صنف کی حیثیت سے باقاعدگی کے ساتھ استعمال کیا اُس شاعر کا نام خواجہ محمد دہدار فانیؔ ہے۔ خواجہ محمد دہدار فانیؔ کا تعلق شیراز سے تھا۔ وہ علی عادل شاہ کے دور میں بیجاپور آیا تھا پھر احمد نگر میں مستقل سکونت اختیار کی۔ وہ فارسی کی شعری روایت سے بخوبی واقف تھا۔ وہ بنیادی طور پر فارسی کا شاعر تھا لیکن ماحول کے تقاضوں کے پیش نظر اس نے دکنی اور مقامی زبان میں شعر موزوں کیے۔ دکنی اور فارسی کا ایک حسین امتزاج اس کی شاعری میں نظر آتا ہے۔

ارے اس یک پنے کے باغ میں آ
دوئی کا تخم ہرگز بو نکو توں
سدا یو فرض فانی تجھ اُپر ہے
خدا یک جان دیکھوں دو نکو توں
کیوں مرغ دل ہوائے حقیقت میں اڑ سکے
جب حرص کا بندیا اچھے دھاگا جو پر منے

درج بالا اشعار سے فانیؔ کے کلام کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سلیم محی الدین :

''ولیؔ زبان و بیان کی سطح پر ایک ایسے دوراہے پر کھڑا تھا جہاں سے اجتہاد کا اختیار کرنا ناگزیر تھا، تو فانیؔ کی غزل اس دوراہے کی پیشین گوئی کا فریضہ ادا کرتی نظر آتی ہے۔''

(مرٹھواڑہ میں اردو غزل، ڈاکٹر سلیم محی الدین۔ ص 35)

بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

''ان (دیدار فانیؔ) کے ہاں جدید اسلوب اپنے نقش و نگار ابھارتا دکھائی دیتا ہے اور ان کے کلام کی حیثیت ایک جزیرے کی سی معلوم ہوتی ہے۔'' (تاریخ ادب اردو، جلد اول، ص 229)

خواجہ محمد دہدار فانیؔ کے بعد جو خالص غزل کا شاعر ہمارے سامنے آتا ہے وہ ہے حسن شوقیؔ۔ حسن شوقیؔ نے دکنی غزل کو ایک نیا لہجہ اور نیا آہنگ۔ اس نے دکنی غزل کی روایت میں ایک نئے طرز سخن کی بنیاد رکھی۔ بقول ڈاکٹر سلیم محی الدین :

''فانیؔ اردو غزل کی روایت میں ایک سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ حسن شوقی اسی روایت کے باقاعدہ قیام، استحکام اور دوام کی علامت ہے۔'' (مراٹھواڑہ میں اردو غزل، ڈاکٹر سلیم محی الدین، ص 35)

حسن شوقی کے یہاں غزل اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہے۔ یہ وہی حسن شوقی ہے جس کی روایت کو ولیؔ اورنگ آبادی نے آگے بڑھایا ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی :

''حسن شوقی کی غزلیں اسی روایت کا ایک حصہ ہیں جس کے فراز پر ولیؔ دکنی کی غزل کھڑی ہے۔ یہ غزلیں اپنے مزاج کے اعتبار سے جدید غزل کی ابتدائی روایت اور رنگ و روپ کا حصہ ہیں۔ حسن شوقی کے ذہن میں غزل کا واضح تصور ہے۔ وہ

غزل کو عورتوں سے باتیں کرنے اور عورتوں کی باتیں کرنے کا ذریعہ اظہار سمجھتا ہے۔اس کی غزلوں کا بنیادی تصور یہی ہے۔عشقیہ جذبات کے مختلف رنگوں اور کیفیات کو غزل کے مزاج میں گھلاتا ملاتا نظر آتا ہے۔''

(تاریخ ادب اردو، جلد اول، مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی، ص290)

حسن شوقی ایک باکمال شاعر تھا جس نے اپنی غزلوں کے ذریعے خیال' اسلوب' لہجے اور طرز ادا میں فارسی غزل کی تقلید میں عشقیہ جذبات اور سوز و ساز کو دکنی غزل کے مزاج کا حصّہ بنا دیا ہے۔حسن شوقی کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

جب عاشقاں کی صف میں شوقی غزل پڑھے تو
کوئی خسروی ' ہلالی ' کوئی انوری کتے ہیں

شوقی کی ہے پیاری ہنس ہنس کہے سو ناری
افضل غزل تمھاری جوں سُور ہے گگن میں

خوباں کی انجمن میں لالن ہوا ہے ساقی
نرمل شراب نیہہ کا اک جام بھر نہ بھیجا

دکنی غزل کی روایت کو آگے بڑھانے میں حسن شوقی نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔اس دور کے تخلیقی عمل کے دائرے کا جائزہ لیا جائے تو حسن شوقی کی عظمت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔غزل کے فارم کو اپنی پوری خارجیت اور داخلیت کے ساتھ برتنے کا سہرا حسن شوقی کے سر ہے وہ روایت اور جدت کے درمیان کھڑا نظر آتا ہے۔عادل شاہوں کے آخری دور کا ایک قادر الکلام شاعر محمود بحری ہے۔جو اپنی ندرت اظہار کے سبب بلند مقام حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہے ۔

ڈرتا ہوں میں اس مست سیہ چشم سوں آخر
بے دیں کریں محمودؔ سے سجادہ نشیں کوں

دکن میں غزل کی ترقی ولیؔ اورنگ آبادی اور سراجؔ اورنگ آبادی کی مرہون منت ہے۔جب اورنگ زیب عالمگیرؒ نے 1062ھ میں اورنگ آباد کو اپنا صدر مقام قرار دیا۔اسی وقت سے اس کی رونق میں اضافہ ہونے لگا۔پہلے قطب شاہی پائے تخت گولکنڈہ اور عادل شاہی دارالحکومت بیجاپور شاعری کے مراکز تھے تو اب مغلیہ دور میں اورنگ آباد نے ان کی جگہ لے لی۔اس دور میں نہ صرف بیجاپور، گولکنڈہ اور احمد نگر کے قابل حضرات یہاں جمع ہوئے بلکہ دہلی کے امراء و وسا، علما اور شعرا کا بھی یہی مرکز بن گیا۔اس طرح یہاں شعر و شاعری کا چرچا بڑھا اور اردو شاعری کے قدم یہاں اچھی طرح جم گئے اور شعرا نے بہترین کلام اپنی یادگار چھوڑا۔مغلیہ حکومت میں مختلف اصحاب کو یکے بعد دیگرے صوبہ داری ملتی رہی۔مگر کسی نے اپنی باضابطہ اور باقاعدہ حکومت کا نقش ثبت نہیں کیا۔بالآخر 1136ھ میں نواب قمرالدین نظام الملک آصف جاہ نے لشکر کھڑلہ کی لڑائی میں فتح یاب ہو کر سلطنت آصفیہ کی بنیاد ڈالی۔اس زمانے میں بھی اورنگ آباد شاعری کا مرکز رہا۔اس 37 سالہ مدت میں اردو کے کئی شعرا مشہور ہوئے جن میں ولیؔ اورنگ آبادی کا نام

سرفہرست ہے۔

1.5 وؔلی کا تعارف

وؔلی کا نام ولی محمد تھا۔ وؔلی تخلص کرتے تھے۔ ان کی تاریخ ولادت کے بارے میں محققین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ مقام پیدائش کے متعلق بھی اختلاف رائے ہے۔ محمد ظہیرالدین مدنی اور محمد میاں اختر جونا گڑھی انھیں گجراتی بتاتے ہیں۔ بیشتر نامور اور مستند محققین مثلاً ڈاکٹر زور اور نصیر الدین ہاشمی نے اورنگ آباد کو وؔلی کا مقام پیدائش قرار دیا ہے۔ بعض ناقدین نے اس کا یہ حل نکالا کہ وؔلی کو دکنی کہا جائے جواز یہ دیا گیا کہ چوں کہ گجرات بھی دکن کے حدود میں آتا تھا اور اورنگ آباد تو ابتداء ہی سے دکن کا حصہ رہا ہے۔ خیر اس سے وؔلی کی شاعرانہ عظمت پر کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کہاں پیدا ہوئے لیکن قوی قیاس یہی ہے کہ وہ اورنگ آباد ہی میں پیدا ہوئے۔ وؔلی دکنی کو اردو شاعری میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ محمد حسین آزاد نے ان کو اردو شاعری میں وہی مقام دیا ہے جو انگریزی میں چاسؔر اور فارسی میں رودکی کو حاصل ہے۔ مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے زمانے میں ان کی شاعری نے نشو ونما پائی۔ بقول ڈاکٹر محی الدین قادری زور :

''اورنگ زیب عالمگیرؒ غازی کے طویل قیام دکن اور سکونت اورنگ آباد کا اگر کوئی بہتر اور قابل فخر نتیجہ نکل سکا تو صرف وؔلی اور ان کا کلام ہے۔'' (دکنی ادب کی تاریخ، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ص 104)

بیجاپور اور حیدر آباد کے اجڑ جانے کے بعد وہاں کی ادبی محفلیں سونی ہوگئیں، جس کی وجہ سے اورنگ آباد شعر و ادب، علم و فن اور تہذیب و تمدن کا مرکز بن گیا۔ اس وقت اورنگ آباد پورے ہندوستان کا مرکز تھا اور ہر خطے کے باکمال لوگ شاہی دربار سے فیضیاب ہونے کے لیے یہاں آتے تھے۔ بیجاپور اور حیدر آباد کے نامی گرامی شعرا بھی اورنگ آباد کی طرف کھنچے چلے آئے اور ایک نہایت سازگار ماحول کی ابتدا ہوئی۔ ایسے ہی ماحول میں وؔلی نے نشو و نما پائی۔

وؔلی کئی اعتبار سے اردو کے پہلے بڑے شاعر ہیں۔ اردو شعری روایت کی ابتدا میں بڑی شاعری کے جو عناصر پائے جاتے ہیں وہ سب سے زیادہ کثرت کے ساتھ وؔلی کی شاعری میں موجود ہیں۔ وؔلی انتہا درجہ کے قادرالکلام شاعر تھے۔ انھوں نے زبان کے تشکیلی دور میں اپنی قادرالکلامی سے کام لیا ہے۔ انھوں نے تمام مروجہ اصناف جیسے مستزاد، مخمس، ترجیع بند، قصائد، مثنوی، قطعات، رباعی میں اپنا کمال شاعری دکھایا ہے۔ اس کے علاوہ مثلث، چاردرچار، اور بازگشت وغیرہ ایسی اصناف بھی شامل ہیں جن کا رواج اب نہیں، لیکن جس چیز نے ان کو شہرت دوام بخشی وہ غزل ہے۔

1.6 وؔلی کی غزل گوئی

وؔلی ریختہ کے موجو اور امام ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ وؔلی سے قبل دکن میں غزلیں بھی لکھی گئیں، لیکن ان میں کسی گہرے تجربے، احساس یا حیات و کائنات کے شعور کی کارفرمائی نہیں تھی۔ وؔلی نے اس میں زندگی کے رنگا رنگ تجربات، تنوع اور داخلیت کو سمو کر غزل کے دائرے میں پوری کائنات کو سمیٹ لیا۔ وؔلی کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کے جو فارم اور سانچے ڈھالے وہ آج تک موجود ہیں اور غزل کے ساز پر جو نغمے انھوں نے چھیڑے دنیائے غزل میں آج تک ان کی بازگشت سنائی دے رہی ہے۔ وہ نہ صرف خود بڑے شاعر تھے بلکہ انھوں نے آنے والی نسلوں کے شاعروں کے لیے بڑائی کے راستے ہموار کر دیے جس کی بساط پر میرؔ اور غالب جیسے عظیم شاعروں نے اپنی شاعری کھڑی کی ہے۔ طویل عرصے تک زبان پر وؔلی کا ہی سکہ چلتا رہا۔ امداد امام اثرؔ ''کاشف الحقائق'' میں لکھتے ہیں :

''غزل گوئی کے اعتبار سے وؔلی اوّل درجے کے شاعر تھے۔ جوغزل گوئی کے تقاضے تھے ان سے وؔلی کو پوری اطلاع حاصل تھی چناچہ غزل گوئی میں بیشتر شاعری کا داخلی پہلو پیش نظر رکھتے تھے۔ اسی لیے ان کی غزل سرائی پُر تاثر نظر آتی ہے......وؔلی کے کلام میں دردؔ، سوداؔ، میرؔ، مصحفیؔ، ذوقؔ، ناسخؔ، آتشؔ سب کے رنگ بکثرت موجود ہیں۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی کس قدر قوی الدماغ شاعر تھے جو ہر نوع کے کلام پر قدرت تامّہ رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مابعد کے جتنے متغزلین موجد کسی طرز کے کہاتے ہیں درحقیقت اسی پیر طریقت کے مرید ہیں۔'' (کاشف الحقائق، دہلی، 1982، ص409)

وؔلی کے اردو شاعری پر بہت سے احسانات ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کے لیے بہت سے امکانات پیدا کر دیے تا کہ آنے والے شاعر ان امکانات سے فائدہ اٹھا سکیں۔ انھوں نے شاعری کے مختلف اور کثیر پہلوؤں کے دروازے دوسروں کو بڑا شاعر بننے کے لیے کھول دیے۔ انھوں نے بڑائی کا راستہ دوسروں کے لیے ہموار کر دیا۔۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں :

''غرض کہ وؔلی کی شاعری میں اتنے پہلو اتنے موضوعات، اتنے تجربات زندگی سمٹ آئے ہیں کہ جس پہلو سے اردو غزل کو دیکھیے اس کی واضح ابتدا وؔلی سے ہوتی ہے۔ وؔلی کی غزل میں اردو غزل کی کم و بیشو ساری آوازیں سنائی دیتی ہیں جو سراؔج سے لے کر داؔغ تک مختلف شاعروں کی انفرادیت کی نشانیاں بنیں اور جن سے آج تک بزم معنی کی شمع روشن ہے۔''

(تاریخ ادب اردو، جلد اول، ص550)

آگے وہ لکھتے ہیں :

''یہ بات یاد رہے کہ آگے چل کر جتنے رجحانات نمایاں ہوئے وہ خواہ عشقیہ شاعری کا رجحان ہو یا ایہام پسندی کا، لکھنوی شاعری کی خارجیت اور مِسی چوٹی والی شاعری ہو، مسائل تصوف کے بیان والی شاعری ہو یا ایسی شاعری ہو جس میں داخلیت اور رنگا رنگ تجربات کا بیان ہو یا اصلاح زبان و بیان کی تحریک ہو، سب کا مبدا وؔلی ہے۔''

(تاریخ ادب اردو، جلد اول، ص557)

وؔلی کی زبان صدیوں قدیم ہونے کے باوجود موجودہ زبان سے قریب تر ہے۔ مثلاً ۔

دیکھنا ہر صبح تجھ رُخسار کا
ہے مطالعہ مطلع انوار کا
طالب نہیں مہر و مشتری کا
دیوانہ ہوا جو تجھ پری کا
مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے
کیوں کے ملنا صنم کا ترک کروں
دلبری اختیار کھوتی ہے
جسے عشق کا تیر کاری لگے

اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
دل کو گر مرتبہ ہو درپن کا
مفت ہے دیکھنا سریجن کا

وؔلی کے پاس غزل اپنی پوری سج دھج اور فنی رچاؤ کے ساتھ نظر آتی ہے۔ اُن کی غزلوں میں حسن، تازگی، رعنائی اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ یہ خصوصیات حسن ادا اور موضوعات کی رنگینی سے پیدا ہوئی ہیں۔ وہ محبت کے دلکش نغمے چھیڑتے ہیں۔ محبوب کی دلفریب اداؤں کو مختلف انداز سے بیان کرتے ہیں۔ حسن کے خدوخال اور اس کے رنگ روپ کو اشعار کا جامہ پہناتے ہیں اور عشق کی مختلف کیفیتوں کو اپنی غزل میں سموتے ہیں۔ ان کے کلام میں عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ چناں چہ کہتے ہیں ۔

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا

مجھے بولیا کہ گر تو واقف نہیں عشق حقیقی سُوں
تو بہتر یوں ہے جا دامن پکڑ عشق مجازی کا

وؔلی نے فارسی شاعری سے بھرپور فائدہ اٹھایا لیکن اپنی شاعری کے لیے بیرونی عناصر کے بجائے مقامی عناصر اور ملکی روایات کو زیادہ پسند کیا اور ہندوستانی اساطیر اور ہندو دیو مالا سے استفادہ کیا ہے۔ وہ اپنی تہذیب کا بہت احترام کرتے تھے۔ انھوں نے کبھی بھی اپنی تہذیب سے کٹ کر شاعری نہیں کی۔ وہ جانتے تھے کہ اردو کو بڑی زبان بننے کے لیے اپنی تہذیب سے جڑا رہنا بہت ضروری ہے ۔

کوچۂ یار عین کاسی ہے
جوگیِ دل وہاں کا باسی ہے
زلف تیری ہے موج جمنا کی
تل نزک اس کے جیوں سناسی ہے
تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری
اے بت کی پجن ہاری اس بت کوں پجاتی جا
تجھ گھر کی طرف سندر آتا ہے ولی دائم
مشتاق درس کا ہے ٹک درس دکھاتی جا

وؔلی کا عشق بہت پاکیزہ اور معصوم ہے۔ ان کے کلام میں نشاطیہ رنگ و آہنگ ملتا ہے۔ درد و کرب کا احساس کم پایا جاتا ہے۔ وؔلی کے غم میں بلا کا سوز پایا جاتا ہے لیکن اس سے شکست اور نامرادی کا دور تک بھی تعلق نہیں ہے۔ ان کو تصوف سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ تصوف کی وجہ سے ان کی شاعری میں عشق حقیقی اور عشق مجازی کی حدیں ملی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اُن کے یہاں ذوق جمال، لطافت احساس، نازک خیالی اور غنائیت و

موسیقیت کا سیلاب ہے۔انھوں نے فارسی شاعری اور ہندی شاعری کی روایات کو ایک خاص انداز میں پیش کر کے اردو زبان کو نیا رنگ و آہنگ دیا ہے۔سراپا نگاری میں بھی وہ مہارت رکھتے تھے۔ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں :

''ولؔی کے محبوب کے مکھ میں سب سے زیادہ دلکشی ہے۔یہ مکھ حسن کا دریا ہے۔اس کی جھلک سے آفتاب شرمندہ اور بے تاب ہے۔اس مکھ کا صفحہ' رخسار صفحہ' قرآن ہے۔اس کے بعد درجہ بدرجہ آنکھ، لب، خال اور قد غرض سراپائے جسم کی تعریف و توصیف اتنے عمدہ اور دلکش پیرائے میں بیاں کی ہے کہ ولؔی کو اردو شاعری میں سب سے بڑا سراپا نگار کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔''

(جمال دوست اسلوب پرست، ولی، ڈاکٹر سید عبداللہ، ولؔی دکنی، مرتبہ: گوپی چند نارنگ، ص256)

ترے لب پر جو ''خط عنبریں'' ہے
خط یاقوت سوں ''نقش' نگیں ہے
''روح بخشی'' ہے کام تجھ لب کا
''دمِ عیسیٰ'' ہے نام تجھ لب کا

تجھ لب کی صفت، لعل بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں ترے نین، غزالاں سوں کہوں گا
دل کوں تجھ باج بے قراری ہے
چشم کا کام اشک باری ہے

ہوش کھوتی ہے نازنیں کی ادا
سحر ہے سروِ گل جبیں کی ادا
دیکھنا ہر صبح تجھ رخسار کا
ہے مطالعہ مطلعِ انوار کا

ترے مکھ پر اے نازنیں یو نقاب
جھلکتا ہے جیوں مطلعِ آفتاب
جگ کے ادا شناساں ہے جن کی فکر عالی

تجھ قد کو دیکھ بولے یوں ناز ہے سراپا

راہ مضمونِ تازہ بند نہیں
تا قیامت کھلا ہے باب سخن

1.7 ولؔی کی روایت

ولؔی عہد آفریں سخن ور تھے۔ وہ نہایت عالم فاضل انسان تھے۔ ان کے زمانے میں تصوف کا دور دورہ تھا اور ولؔی نے صوفیانہ مسلک اختیار کر لیا تھا۔ اسی مسلک کی مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے ولؔی نے احمد آباد برہان پور اور سورت کا سفر کیا۔ حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ سے بھی مشرف ہوئے تھے۔ متحرک طبیعت اور سیاحت کے شوق نے ولؔی کو دہلی کا سفر کرنے پر اکسایا۔ 1700ء میں ولؔی دلی پہنچے۔ دلی کے مشاعروں میں ولؔی نے اپنا کلام سنا کر وہاں کے شعرا کو حیرت میں ڈال دیا۔ اس وقت تک وہاں اردو زبان صرف بازاری سمجھی جاتی تھی لیکن ولؔی کا کلام سننے اور پڑھنے کے بعد وہاں کے شعرا اس بات کے قائل ہو گئے کہ اس زبان میں بھی شاعری کی جا سکتی ہے اور شعرائے دہلی نے فارسی کے بجائے اردو میں طبع آزمائی شروع کر دی اور نہ صرف اس زبان میں غزلیں لکھیں بلکہ ولؔی کی طرز پر شاعری کرنے لگے۔ حاتم، مظہر، آبرو، ناجی اور فغاں وہ شعرائے دہلی ہیں جنھوں نے ولؔی کا کلام خود ان کی زبان سے سنا اور ان کی غزلوں پر غزلیں لکھیں اور اپنے کلام کے لیے وہی محاورہ اور زبان استعمال کی جو ولؔی نے کی تھی۔ ولی ؔنے لسانی اور تہذیبی سطح پر شمال اور جنوب کے درمیان ایک پل کا کام کیا ہے جہاں سے نہ صرف اردو کے ایک معیار، ایک تہذیب اور ایک لسانی اتحاد کا آغاز ہوتا ہے بلکہ غزل کے حسن، اس کی تاثر پذیری اور وسعت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ جب ولؔی کا دیوان دہلی آیا تو بقول محمد حسین آزاد :

> ''اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا۔ قدردانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا۔ لذت نے زبان سے پڑھا، گیت موقوف ہو گئے۔ قوال معرفت کی محفلوں میں انھیں کی غزلیں گانے بجانے لگے۔ ارباب نشاط یاروں کو سنانے لگے۔ جو طبیعت موزوں رکھتے تھے۔ انہیں دیوان بنانے کا شوق ہوا'' (آبِ حیات۔ محمد حسین آزاد)

ولؔی کے دیوان نے شمالی ہند کے شعرا کے ذہنوں کو جھنجھنا دیا اور فکر نو سے روشناس کیا۔ ان شعرا نے ولؔی کے اثر کو قبول کیا جس کا ثبوت حاتؔم کا ''دیوان زادہ'' ہے، جس کے دیباچے میں حاتؔم نے ولؔی اورنگ آبادی کی انفرادیت کا اعتراف اس انداز میں کیا ہے۔

حاتؔم یہ فن شعر میں کچھ تو بھی نئیں کم
لیکن ولی، ولی ہے جہان سخن کے بیچ

ولؔی کی استادی کا اعتراف کرتے ہوئے شاہ مبارک آبرو کہتے ہیں۔

ولؔی ریختے بیچ استاد ہے
کہے آبرو کیونکہ اس کا جواب

ایک اور جگہ آبرو نے لکھا ہے۔

آبرو شعر ہے ترا اعجاز

جوں ولؔی کا سخن کرامت ہے

سراؔج اورنگ آبادی نے بھی ولؔی کی عظمت کا اعتراف یوں کیا ہے۔

تجھ مثال اے سراج بعد ولؔی
کوئی صاحب سخن نئیں دیکھا

ولی کو خود بھی اپنی شاعرانہ عظمت کا احساس تھا جس کا انہوں نے اپنے مقطوں میں بار بار اظہار کیا ہے۔

اے ولی لگتا ہے ہر دل کو عزیز
شعر تیرا بسکہ شوق انگیز ہے

ولی تجھ طبع کے گلشن میں جو بھی سیر کرتے ہیں
وہ تحفہ لے کے جاتے ہیں تیری گفتار ہر جانب

ہر سخن تیرا لطافت سوں ولؔی
مثلِ گوہر زینتِ ہرگوش ہے

دلی اور شمالی ہند کے دیگر علاقوں میں ولؔی کی اس روایت کو بعد کے شاعروں مثلاً خانِ آرزؔو، یک رنگ آبرؔو، شاکر ناجؔی، مضموؔن، حاتؔم، مظہؔر، فائؔز، افضؔل، جعفر زٹلؔی، حسرؔت، فغاؔں وغیرہ نے آگے بڑھایا۔

1.8 دہلی کے ریختہ گوشعرا

خان آرزؔو: سراج الدین خان آرزؔو اس عہد کے نامور فارسی شاعر اور عالم تھے۔ان کا کارنامہ یہ ہے کہ کئی بلند پایہ شعرا نے ان کے دامن میں تربیت پائی اور انہی کے زیر اثر اردو شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے۔میر نے لکھا ہے کہ اردو شعر گوئی کے جس فن کو ہم نے اپنایا اسے معتبر بنانے میں والے خان آرزو ہی تھے۔

خان آرزؔو عالم ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ذہین اور شیریں گفتار تھے۔تذکرہ نویسوں نے ان کی حاضر جوابی کے بہت سے واقعات لکھے ہیں۔اسی مناسبت سے ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو، جو ریختہ میں ہے۔

اس زلف سیہ فام کی کیا دھوم پڑی ہے
آئینے کے گلشن میں گھٹا جھوم پڑی ہے

آبرؔو: نجم الدین نام، شاہ مبارک عرفیت اور آبرو تخلص تھا۔گوالیار کے صوفی خاندان سے تعلق تھا اور وہیں پیدا ہوئے، لیکن دہلی چلے آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔خان آرزؔو سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔شاہی ملازمت کے سلسلے میں کچھ دنوں تک نارنول میں بھی رہ چکے تھے۔آبرؔو کی ایک آنکھ میں پھولا تھا جس پر حریف اکثر چوٹیں کیا کرتے تھے۔اپنے عہد کے سر برآوردہ شعرا میں آبرؔو کا شمار ہے۔خوشگو نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ آبرؔو اردو شاعری کی آبرو ہیں۔ایہام گوئی اور رعایت لفظی ان کے کلام میں بہت ہے، لیکن جو شعر ایہام اور رعایت لفظی سے خالی نہیں وہ خوب ہیں۔ان کا حسن بیان آج بھی دلوں پر اثر کرتا ہے۔اشعار ملاحظہ ہو:

آیا ہے صبح نیند سے اٹھ رسمسا ہوا
جامہ گلے میں رات کا پھولوں بسا ہوا

پھرتے تھے دشت دشت دوانے کدھر گئے
وے عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے

ناجیؔ: ناجیؔ کا نام سید محمد شاکر تھا۔ ان کے مزاج میں بلا کی ظرافت تھی۔ ہر وقت ہنساتے رہتے تھے مگر خود نہیں ہنستے تھے۔ ناجیؔ نے دہلی کو اپنی آنکھوں سے اجڑتے دیکھا۔ نادر شاہ کے حملے اور دلی کی تباہی کا منظر ان کی حساس طبعیت پر اثر کر گیا اور انھوں نے ایک بہت ہی درد انگیز نظم بھی رقم کی۔ ان کا دیوان آج کل دستیاب ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں اپنے دور کے اہم رجحان ایہام گوئی کو کی تقلید کی۔ وہ صنائع کا استعمال کرتے تھے اور زیادہ تر غزل ہی کی شکل میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے تھے۔ وہ دلی کے دور ایہام گوئی کے نمایاں شاعروں میں شمار کیے جاتے تھے اور ایہام گوئی کے رنگ پر فخر بھی محسوس کرتے تھے۔

بلند آواز سے گھڑیال کہتا ہے کہ اے غافل
کٹی ہے یہ گھڑی تجھ عمر سے اور تو نہیں چیتا

مضمونؔ: یہام گوئی کو رواج دینے میں تیسرا نام شیخ شرف الدین مضمونؔ کا ہے۔ ناجی کی طرح انہیں بھی ایہام گوئی پر بڑا ناز تھا۔ وہ بابا فرید گنج شکر کی اولاد میں سے تھے۔ وطن اکبر آباد تھا، لیکن عالم جوانی میں دہلی چلے آئے تھے اور آخری دم تک یہیں رہے۔

مضمونؔ خان آرزوؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ خان آرزو بھی انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ مضمونؔ شعر اسی وقت کہتے تھے جب انہیں کوئی خاص مضمون سوجھتا۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

دردِ دل سے جس طرح بیمار اٹھتا ہے کراہ
اس طرح اک شعر مضمونؔ بھی کہے ہے گاہ گاہ

حاتمؔ : حاتمؔ کا نام شیخ ظہورالدین تھا۔ حاتمؔ تخلص کرتے تھے۔ ایہام گوئی کے اہم اور مشہور شعرا میں حاتم کو بے حد اہمیت حاصل ہے، کیوں کہ وہ صرف بڑے شاعر ہی نہ تھے بلکہ کئی بڑے شاعروں کے استاد بھی تھے۔ انھوں نے لمبی عمر پائی تھی۔ جس وقت انھوں نے شاعری کی ابتدا کی اس وقت دلی میں ولیؔ کا اثر روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ حاتمؔ نے بھی کامیابی کے ساتھ ولیؔ کی تقلید کی۔ انھوں نے اپنا دیوان بھی تیار کر لیا تھا لیکن جب شاعری کا رنگ بدلا تو انھوں نے ایہام گوئی ترک کر دی۔ یہاں تک کہ اپنے دیوان سے ایہام کے اشعار حذف کیے اور نیا دیوان مرتب کیا جس کا نام ''دیوان زادہ'' رکھا۔ حاتمؔ کے دیوان زادے کی خاص بات یہ ہے کہ اس کے شروع میں ایک دیباچہ ہے جس میں حاتمؔ نے زبان اور شاعری کی نسبت اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ علمی و ادبی نقطہ نظر سے یہ دیباچہ بہت اہم ہے۔ کیوں کہ اس میں وقت کی بدلتی ہوئی پسند اور لسانی ارتقاء کی جھلک ملتی ہے:

؎ کھپ گئی ہے دل میں حاتمؔ کے تری بانکی نگاہ

چلتے چلتے ٹک بتاتا جا ، ترا کیا نام ہے

مظہؔر: اصل نام جان جاناں تھا، مظہر تخلص کیا کرتے تھے۔ عربی فارسی کے عالم تھے۔ اردو میں بھی شعر کہتے تھے مگر ان کے بہت کم اشعار تذکروں کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں۔ بہت بلند پایہ صوفی شاعر تھے اور بڑے بڑے امرا ان کا احترام کرتے تھے۔ شاعری کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے اور اس نکتے سے خوب واقف تھے کہ صنائع کا حد سے زیادہ استعمال شعر کی خوبی کو برباد کر دیتا ہے۔ چناں چہ ایہام گوئی سے ہمیشہ پرہیز کیا۔ مظہؔر کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو شاعری کو ایہام گوئی سے پاک کرنے میں مدد کی اور اسے فطری اظہار کا راستہ دکھایا۔ ان کا کلام شستہ و پر اثر ہے۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے

اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا

فائزؔ : فائز کا نام صدرالدین محمد تھا۔ وہ دلّی کے رہنے والے تھے اور دلّی کے دربارِ شاہی میں ان کو بلند منصب حاصل تھا۔ صاحب ثروت تھے اور عالم بھی۔ فارسی میں ان کی بہت سی کتابیں ملتی ہیں۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے ان کا اردو دیوان اپنے بیش بہا مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ فائز شمالی ہند کے پہلے اردو شاعر ہیں جنھوں نے اپنا دیوان مرتب کیا۔ جس سے اس زمانے کی سیاسی اور ادبی تاریخ کا اندازہ ہوتا ہے۔ فائز کی شاعری میں دہلی کا رنگ گہرا ہے۔ ان کی شاعری میں ہندی شاعری کا رنگ جھلکتا ہے۔

تری گلی مجھ دل کو پیاری لگے

دعا میری تجھ من کو بھاری لگے

جعفر زٹلی: جعفر زٹلی دہلی کے گاوں نرنیال موجودہ ہریانہ میں پیدا ہوئے۔ اصل نام محمد جعفر تھا زٹلی تخلص رکھا۔ زٹلی کے لغوی معنی بے ربط گفتگو کرنے والا ہے۔ سید گھرانے میں پیدا ہوئے زندگی کا زیادہ تر حصہ دہلی کے آس پاس میں گزرا۔ زٹلی نے لکھنے کا آغاز مغل بادشاہ اورنگزیب کے دور میں کیا۔ اورنگ زیب پر بہت زیادہ تنقید کے ساتھ ساتھ انہوں نے اورنگ زیب کی انتظامی صلاحیتوں کی تعریف بھی کی ہے۔ اورنگ زیب کے بعد کا دور مغلیہ سلطنت کے زوال کا دور تھا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں مغلیہ دور حکومت پر بہت زیادہ تنقید کی۔ مغلیہ دور کے معاشی اور سیاسی حالات اور بادشاہ وقت کے خلاف شاعری کے ذریعے اپنی آواز بلند کی۔ مغل بادشاہ فرخ سیر نے تخت نشینی کے بعد اپنے نام کا سکہ جاری کیا تو اس پر یہ شعر درج تھا:

سکہ زد از فضلِ حق بر سیم وزر

پادشاہ بحر وبر فرخ سیر

جعفر زٹلی نے اس کے جواب میں یہ ''سکہ'' لکھ کر اپنے غم وغصے کا اظہار کیا۔

سکے زد بر گندم و موٹھ و مٹر

بادشاہ ہے تسمہ کش فرخ سیر

فرخ سیر کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے 1713ء میں اسے قتل کر دیا۔

جعفر زٹلی ولی دکنی کے ہم عصر شاعر ہیں۔ زٹلی کو فارسی میں عبور ہونے کے ساتھ ساتھ ہندی اور ریختہ پر بھی مہارت حاصل تھی یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں فارسی اور ریختہ کا خوبصورت امتزاج لکھتے تھے ان کے اشعار میں اشعار میں شوخی اور ظرافت نمایاں ہے ان کی ظریفانہ کلام میں ہجویات، قطعات نظمیں اور غزلیں وغیرہ ملتی ہیں ان کی اکثر ظریفانہ غزلیات فارسی زبان میں ہیں لیکن بعض غزلیات اور اشعار آج کی اردو زبان کے قریب تر ہیں۔

1.9 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ ریختہ کے لغوی معنی ہیں بے ساختہ نکلا ہوا، بلا تکلف و بلا تصنع زبان سے نکلا ہوا، پختہ، مضبوط، پکا، چونے گچی کا بنا ہوا۔ اردوئے معلّٰی کے اشعار، دہلی کی خاص سیدھی سادھی اردو زبان اور اس کے اشعار۔ اصطلاح میں ریختہ زبان اردو کی اُس نظم کو کہتے ہیں جو بے ساختہ کہی گئی ہو۔

☆ ریختہ کی ابتدا امیر خسرو سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد ریختہ گوئی کے نمونے دکن میں ملتے ہیں۔

☆ زبان ریختہ میں کہے ہوئے کلام کے لیے ''ریختہ'' کا لفظ استعمال کرنے کا رواج انیسویں صدی کے وسط تک جاری رہا۔ اسی طرح اردو زبان کے نام کے طور پر ''ریختہ'' اور ''ہندی'' کے الفاظ انیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک چلن میں رہے۔

☆ ولؔی نے غزل میں اجتہاد سے کام لیا ہے۔

☆ ولؔی کو اردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔

☆ ولؔی نے داخلیت کے ذریعہ زندگی کے رنگارنگ تجربات کو سمو کر غزل کے دائرے میں پوری کائنات کو سمیٹ لیا۔

☆ ولؔی کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کے جو فارم اور سانچے ڈھالے وہ آج تک موجود ہیں اور غزل کے ساز پر جو نغمے انھوں نے چھیڑے دنیائے غزل میں آج تک ان کی بازگشت سنائی دے رہی ہے۔

☆ ولؔی نے لسانی اور تہذیبی سطح پر شمال اور جنوب کے درمیان ایک پل ایک کڑی کا کام کیا ہے۔

☆ دلی اور شمالی ہند کے دیگر علاقوں میں ولؔی کی اس روایت کو بعد کے شاعروں مثلاً خانِ آرزؔو، یک رنگ آبرؔو، شاکر ناجؔی، مضموؔن، حاتؔم، مظہؔر، فائزؔ، افضؔل، جعفر زٹلؔی، حسرؔت، فغاںؔ وغیرہ نے آگے بڑھایا۔

1.10 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
مستحکم	:	مضبوط
عالمگیر	:	دنیا میں پھیلا ہوا
خوگر	:	عادی
سخن	:	شاعری

امتزاج	:	دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا ملاپ۔ ملاوٹ۔ آمیزش
تغیر	:	تبدیلی
اسلوب	:	طرزِ تحریر
ملک الشعرا	:	شاعروں کا بادشاہ۔ وہ خطاب جو بادشاہ کی طرف سے اعلیٰ درجے کے شاعر کو دیا جاتا ہے۔
عظیم المرتبت	:	اعلیٰ درجے کا حاصل
سوز و گداز	:	جلن، پگھلنے کی کیفیت
آہنگ	:	آواز، نغمہ
جمالیات	:	حسن شناسی
اجتہاد	:	جدوجہد کرنا، کوشش کرنا
تقلید	:	پیروی، کسی کے نقش قدم پر چلنا، نقل کرنا
موقوف	:	برخاست، منسوخ
اساطیر	:	قدیم زمانے کے قصے کہانیاں

1.11 نمونہ امتحانی سوالات

1.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ غزل کس زبان کا لفظ ہے؟

2۔ غزل کے لغوی معنی کیا ہیں؟

3۔ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر کون ہے؟

4۔ قطب شاہی سلطنت کا پہلا ملک الشعرا کون تھا؟

5۔ بیجا پور کے دربار کا ملک الشعرا کون تھا؟

6۔ اردو شاعری کا باوا آدم کسے کہتے ہیں؟

7۔ غزل کو اردو شاعری کی آبرو کس نے قرار دیا؟

8۔ کس شاعر کی تقلید شمالی ہندوستان کے شعرا نے کی؟

9۔ شمال اور جنوب کے درمیان پل یا کڑی کا کام کس شاعر نے کیا؟

10۔ اردو شاعری کا چاسر کس کو کہا جاتا ہے؟

1.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ غزل کی تعریف تحریر کیجیے۔

2۔ دکن میں ریختہ کے پس منظر پر روشنی ڈالیے۔

3۔ ریختہ کسے کہتے ہیں؟

4۔ ولؔی دکنی کے اجتہاد پر نوٹ لکھیے۔

5۔ ’’ولؔی نے شمال اور جنوب کو جوڑنے کا کام کیا‘‘ اس قول پر اپنی رائے تحریر کیجیے۔

1.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ دکن میں ریختہ گوئی کی روایت پر سیر حاصل گفتگو کیجیے۔

2۔ ولؔی کی شاعرانہ عظمت کا محاکمہ کیجیے۔

3۔ دکنی دور کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔

1.12 مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	تاریخ ادب اردو (جلد اول)	ڈاکٹر جمیل جالبی
2۔	کلیاتِ ولؔی	مرتبہ: نورالحسن ہاشمی
3۔	دکن میں اردو	نصیرالدین ہاشمی
4۔	دکنی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ
5۔	غزل کا سفر	ڈاکٹر قاضی نوید
6۔	زبان ریختہ	عبدالغفور نساخ
7۔	داستان ریختہ	خواجہ عبدالماجد

اکائی 2: تحریک ایہام گوئی اور ردِ عمل

اکائی کے اجزا

2.0 تمہید

2.1 مقاصد

2.2 ایہام گوئی کی تعریف

2.3 ایہام گوئی کا آغاز

2.4 ایہام گوئی کا سماجی وسیاسی پس منظر

2.5 اردو میں ایہام گوئی کا زمانہ

2.6 ایہام گوئی کا بانی

2.7 اہم ایہام گو شعرا

2.8 ایہام گوئی مفید یا مضر

2.9 ایہام گوئی کا ردِ عمل

2.10 اکتسابی نتائج

2.11 کلیدی الفاظ

2.12 نمونہ امتحانی سوالات

2.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

2.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

2.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

2.13 مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں

2.0 تمہید

اردو شاعری میں لفظ و معنی میں تعلق اور رعایت کی بڑی اہمیت ہے۔ شاعری ایک فن ہے۔ جس میں لفظ و معنی کی رعایت سے بہت سے مفہوم پیدا کیے جاتے اور کلام کو مرصع و مسجع بنایا جاتا ہے۔ بعض اشعار جو پُر تاثیر اور معنوی اعتبار سے بحر بیکراں ہوتے ہیں وہ یونہی معروضِ وجود میں نہیں آجاتے بلکہ اس کے لیے فنی مہارت کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ شاعری کی تمام اصناف میں فن کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ شاعری کی مقبول و مشہور صنف غزل کا بھی اپنا فن ہے۔ جس سے کما حقہ واقفیت شعر گوئی کے لیے لازمی ہے۔ شعر کی تاثیر، وسعت اور اِس میں اتھاہ گہرائی کے لیے

جن امور سے کام لیا جا سکتا ہے وہ فن کے اجزاء یا عناصر کہلاتے ہیں۔ شاعری میں صنعتوں سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ اردو میں بہت ساری صنعتیں ہیں انہی میں سے ایک ایہام بھی ہے۔

2.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ ایہام گوئی کی تعریف کر سکیں۔
- ☆ ایہام گوئی کے آغاز کے متعلق اظہار خیال کر سکیں۔
- ☆ ایہام گوئی کے محرکات سے پر روشنی ڈال سکیں۔
- ☆ ایہام گوئی کے پس منظر کی وضاحت کر سکیں۔
- ☆ ایہام گو شعرا کے متعلق معلومات کا اظہار کر سکیں۔
- ☆ ایہام گوئی کی مخالف تحریک پر گفتگو کر سکیں۔
- ☆ ایہام گوئی کی سطحیت پر بحث کر سکیں۔

2.2 ایہام گوئی کیا ہے

ایہام عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں ''غلطی میں ڈالنا، شک میں ڈالنا۔'' اصطلاح میں ایہام ایک ایسی صنعت معنوی کو کہا جاتا ہے جس کے تحت شعر میں لفظ کو ذو معنی بنا کر یا لغوی طور پر ذو معنی لفظ کو قرینۂ خفی و جلی کے لحاظ سے اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ لفظ کے قریب و بعید کے دو معنی ہو جاتے ہیں۔ قریب کے معنی فقط وہم پیدا کرنے کے لیے ہوتے ہیں جب کہ شعر میں معنی بعید دوسرے الفاظ کی دلالتوں کے لحاظ سے صحیح ہوتے ہیں۔ مثلاً۔

بستے ہیں ترے سائے میں سب شیخ و برہمن
آباد تجھی سے تو ہے گھر دیر و حرم کا

یہاں ایک سایہ تو دھوپ کی ضد ہے۔ دوسرا سایہ حمایت اور سرپرستی ہے۔ یہاں دوسرے معنی مراد ہیں۔

عالم ہوں علم عشق کا میں کر نہ ہمسری
اے عندلیب تو ہے پڑھی بوستان تلک

اس شعر میں شاعر بلبل سے کہتا ہے کہ تو باغ کے باہر کی دنیا سے واقف نہیں ہے جب کہ میں تمام دنیا کے بارے میں جانتا ہوں۔ بوستاں کے ایک معنی باغ ہیں دوسرے معنی سعدؔی کی مشہور کتاب کا نام ہے۔ یہاں پڑھی سے مراد سعدؔی کی بوستان ہے۔

شمع کی مانند ہم اس بزم میں

چشم نم آئے تھے دامن تر چلے

(خواجہ میر دردؔ)

اس شعر میں دامن تر سے مراد گناہ گار ہے۔

اردو شعریات میں حسن بیان کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔خیال جتنی خوبی سے بیان کیا جائے وہ اتنا ہی عمدہ ہوتا ہے،یعنی حسنِ بیان کے بغیر حسنِ خیال نہیں۔شاعری کے سلسلے میں مضمون آفرینی اور معنی آفرینی پر شعر کے معیار کا انحصار ہوتا ہے۔آپ نے اکثر شاعرا کی شاعری کے اوصاف کے بیان میں مضمون آفرینی اور معنی آفرینی جیسے الفاظ ضرور سنے ہوں گے۔اردو کے مشہور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے ان امور کی وضاحت سادہ، سلیس اور عام فہم انداز میں کی ہے۔مضمون آفرینی کے تحت بیان کی صفائی اور خیال بندی کا شمار ہوتا ہے۔بیان کی صفائی سے مراد یہ ہے کہ مضمون ایسا نہ ہو، یا اسے اس طرح نہ بیان کیا گیا ہو کہ اس کو سمجھنے میں بہت زیادہ محنت اور مشکل صرف ہو اور جب اسے سمجھ لیں تو یہ ہرگز محسوس نہ ہو کہ یہ ساری محنت بیکار گئی۔خیال بندی کے تحت شعر میں نئے مضمون پیدا کیے جاتے ہیں یا پرانے مضامین کے نئے پہلو تلاش کیے جاتے ہیں۔یہ ایک بہت مشکل کام ہے اس لیے کہ اس کا کوئی قاعدہ نہیں ہے۔دراصل پرانے بیانات کو نئے رنگ میں بیان کرنے یا دوسرے الفاظ میں ''ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ'' سے باندھنے کے عمل کو مضمون آفرینی کہا جاتا ہے۔معنی آفرینی، مضمون آفرینی اور رعایت لفظی ہماری شعریات کے بنیادی تصورات ہیں۔ رعایت کی کم از کم دو شرطیں ہیں۔اول یہ کہ کسی لفظ یا فقرے کے دو معنی ہوں، ایک قریب اور ایک بعید۔دوسری شرط یہ ہے کہ قریب کے معنی بیان کے مناسب ہوں، لیکن بعید معنی اسی جگہ کے کسی اور لفظ یا فقرے سے مناسبت رکھتے ہوں۔یعنی رعایت کا تقاضا یہ ہے کہ ایسا لفظ یا فقرہ لایا جائے جس کے دو معنی بھی ہوں اور ایک معنی کا علاقہ اسی عبارت میں وہیں کہیں کسی اور لفظ یا فقرے سے بھی ہو۔اسی اعتبار سے یہ نکتہ بھی ہے کہ جس لفظ یا فقرے پر ایہام کی بنیاد رکھی گئی ہے، اسے بدل کر کوئی مترادف دوسرا لفظ رکھ دیں تو کلام بے معنی ہو جائے گا، لیکن اگر رعایت والا لفظ یا فقرہ بدل کر کوئی دوسرا بامعنی مترادف لفظ رکھ دیں تو کلام بے معنی نہ ہوگا لیکن اس کی قوت کم ہو ہو جائے گی۔مثال کے طور پر ایک لفظ ''مدام'' کو دیکھئے۔اس کے دو معنی ہیں: اول معنی ہیں ''ہمیشہ'' اور دوم معنی ''شراب'' اب اگر ''مدام'' کو اول معنی یعنی ''ہمیشہ'' میں صرف کریں، لیکن اس طرح کہ دوسرے معنی یعنی شراب سے بھی کچھ نہ کچھ علاقہ پیدا ہو جائے تو لطف دوبالا ہو جائے گا۔غالب' کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل

انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

اس شعر میں مدام کے معنی ''ہمیشہ'' تو مراد ہے ہی لیکن پیالہ و ساغر کی مناسبت سے ''شراب'' کا بھی تعلق بن جاتا ہے۔لہٰذا یہاں بڑی خوبصورتی سے رعایت کا استعمال کیا گیا ہے۔

مناسبت کی بھی شرط یہی ہے کہ کلام میں الفاظ یا فقرے ایسے ہوں جن کا آپس میں معنوی علاقہ ہو۔لیکن ان دونوں میں ایک بنیادی فرق بھی ہے۔رعایت میں الفاظ یا فقرے کے مابین معنی کے تعلق کا محض گمان گذرتا ہے اور مناسبت میں معنی کا تعلق واقعی ہوتا ہے۔مناسبت کے ذریعے شعر کے معنی میں جو افزائش اور استحکام وجود میں آتا ہے وہ رعایت کے بس کا نہیں، یعنی مناسبت کے معنی ہیں کلام میں ایسے الفاظ کا استعمال کیا جائے

جو آپس میں معنوی علاقہ رکھتے ہوں اور جو کلام کے معنی میں اضافہ کریں یا اسے مزید قوت یا وسعت یا گہرائی عطا کریں۔ مثال کے طور پر میرؔ کا یہ شعر دیکھیے۔

ہے جہان تنگ سے جانا بعینہ اس طرح
قتل کرنے لے چلیں ہیں جیسے زندانی کے تئیں

اس شعر میں ''جہان تنگ'' کو ''زنداں'' سے مناسبت ہے اور اس باعث شعر کا لطف اور معنویت دونوں میں اضافہ ہوا ہے۔ زنداں چاہے کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو زندانی یعنی قیدی کو تو وہ تنگ ہی لگتا ہے۔

اس طرح ایہام کی بہت سی صورتیں شعرا نے استعمال کی ہے جس سے شعر کی معنویت میں اضافہ ہوا ہے۔

2.3 ایہام گوئی کا آغاز

ایہام گوئی کی ابتدا کے متعلق ارباب دانش نے مختلف نظریات پیش کیے ہیں جن کو یہاں اختصار سے پیش کیا جاتا ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ موضوع اور زبان و بیان کے اعتبار سے ابتدا میں اردو شاعری، فارسی شاعری کے نقش قدم پر چلتی رہی۔ بیشتر اصناف میں اردو شعرا نے فارسی شعرا کی تقلید کی اور فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ لیکن وؔلی دکنی کے کلام نے شمالی ہندوستان کے اساتذہ کو بہت متاثر کیا۔ وؔلی دکنی کی یہ خوبی تھی کہ انھوں نے فارسی شاعری کی تمام بحروں، محاوروں، شاعرانہ اصطلاحوں، تشبیہوں، تراکیب اور زمینوں کو بڑے سلیقے اور چابکدستی کے ساتھ اردو شاعری میں منتقل کر دیا۔ وؔلی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے آنے والی نسل کے لیے بڑی شاعری کے دروازے کھول دیے۔ اردو شاعری میں جتنے پہلو اور طرز نظر آتے ہیں اُن کی ابتداء وؔلی سے ہی ہوتی ہے۔ امام امداد اثر نے بھی کاشف الحقائق میں لکھا ہے کہ وؔلی کے کلام میں دردؔ، سوداؔ، میرؔ، مصحفیؔ، ذوق، ناسخ، آتش سب کے رنگ بکثرت موجود ہیں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ وؔلی دکنی کس قدر قوی الدماغ شاعر تھے جو ہر قسم کے کلام پر قدرتِ تامہ رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعد کے جتنے متغزلین جد کسی طرز کے موجد کہلاتے ہیں، درحقیقت اسی پیر طریقت کے مرید ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا بھی یہی خیال ہے۔ وہ تاریخ ادب اردو میں وؔلی کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وؔلی کی شاعری میں اتنے پہلو، اتنے موضوعات، اتنے تجرباتِ زندگی سمٹ آئے ہیں کہ جس پہلو سے اردو غزل کو دیکھیے اُس کی ابتدا وؔلی سے ہوتی ہے۔ وؔلی کی غزل میں اردو غزل کی وہ ساری آوازیں سنائی دیتی ہیں جو سراج سے لے کر داغ تک مختلف شاعروں کی انفرادیت کی نشانیاں بنیں اور جن سے آج تک بزم معنی کی شمع روشن ہے۔ آگے وہ لکھتے ہیں کہ یہ بات یاد رہے کہ آگے چل کر جتنے رجحانات نمایاں ہوئے وہ خواہ عشقیہ شاعری کا رجحان ہو یا ایہام پسندی کا، لکھنوی شاعری کی خارجیت اور مسی چوٹی والی شاعری ہو، مسائل تصوف کے بیان والی شاعری ہو یا ایسی شاعری ہو جس میں داخلیت اور رنگا رنگ تجربات کا بیان ہو یا اصلاحِ زبان و بیان کی تحریک ہو۔ سب کا مبداء وؔلی ہے۔ وؔلی کے کلام میں گو کہ کم ایہام ہے لیکن شمالی ہند کے شعرا نے وؔلی کے ایہام کا تتبع کیا۔

ایک نظریہ اردو میں ایہام گوئی کی ابتدا کے متعلق یہ بھی ہے کہ یہ ہندی اثرات کے زیر اثر اردو میں رائج ہوئی۔ شمالی ہندوستان میں، فارسی میں شاعری کا رواج تھا۔ وؔلی اورنگ آبادی کی زیر اثر ہندوی رنگ کا اثر شمالی ہند کی شاعری پر ہونے لگا۔ شیخ چاند مرحوم نے بھی ایک مضمون میں اِس بات کا ذکر کیا ہے کہ وؔلی کی تقلید سے اس کے مقلدین میں ایک حد تک ہندی کا عنصر غالب تھا۔ ہندی عنصر نے اس قدر شدت اختیار کر لی تھی کہ ایہام

کا رواج ہوگیا۔مولوی عبدالحق بھی ایہام گوئی کے چلن کو ہندی شاعری ہی کا اثر بتاتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ یہ خیال قرین صحت معلوم ہوتا ہے کہ اردو ایہام گوئی پر زیادہ تر ہندی شاعری کا اثر ہوااور ہندی میں یہ چیز سنسکرت سے پہنچی۔مولانا محمد حسین آزاد نے ہندی دوہروں کواردو میں ایہام گوئی کی ابتداء کا سبب قرار دیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ نظم اردو کے آغاز میں یہ امر قابل اظہار ہے کہ سنسکرت میں ایک لفظ کے کئی کئی معنی ہیں۔اِس واسطے اس میں اور برج بھاشا اس کی شاخ میں ذومعنین الفاظ اور ایہام پر دوہروں کی بنیاد ہوتی تھی۔فارسی میں یہ صنعت ہے مگر کم۔اردو میں پہلے پہلے شعر کی بنیاد اسی پر رکھی گئی۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ اردو میں ایہام گوئی کی ابتداء فارسی کے زیر اثر ہوئی۔اورنگ زیب اور وؔلی دکنی کے زمانے میں شعری خصوصیت میں پہلا درجہ تصنع کے عنصر کا تھا۔اگرچہ قصیدہ گوئی متروک ہوچکی تھی اورغزل گوئی سب سے زیادہ مقبول صنف قرار پائی تھی مگر شاعری میں زورِ بیان اور خیال دونوں کا انحصار تصنع پر تھا۔ڈاکٹر نورالحسن انصاری نے ’’فارسی بعہد اورنگ زیب‘‘ میں لکھا ہے کہ اس دور میں اظہارِ ابلاغ کے لیے جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ عموماً پیچیدہ، تمثیلی، استدلالی اور بڑی حد تک بے جان اور گنجلک ہے۔غزل میں خالص روحانیت اور سپردگی کا فقدان اور ایک طرح کی فلسفیانہ قنوطیت کی بہتات ہے۔تمثیل اور ایہام کا استعمال اُس دور کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔

نورالحسن ہاشمی بھی اردو میں ایہام کی ابتدا کو فارسی کا اثر مانتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ اس زمانے میں فارسی شعرا کا دربار اور شعروادب کی محفل میں بہت اثر تھا اور یوں بھی ادب میں دہلی والے فارسی کی روایت برتتے تھے۔اس لیے یہ بہت ممکن ہے کہ متاخرین شعرائے فارسی کے واسطے سے ایہام گوئی عام ہوئی ہو۔ہندی شاعری اور ہندی بحروں نیز ہندی کے الفاظ روزمرہ برتے جاتے تھے لیکن وہ الفاظ بول چال کے تھے۔کوئی با اثر ہندی شاعر بھی اس عہد میں نظر نہیں آتا۔میر حسن نے تو اردو میں ہندی بحریں اختیار کرنے والوں کا نمونہ کلام بھی بے رتبہ جانا۔قیاس کہتا ہے کہ ہندی اور سنسکرت کا اثر اکبر، شاہ جہاں، داراشکوہ کے زمانہ میں رہا ہوگا لیکن اورنگ زیب کے عہد میں جب کہ اردو میں ایہام گوئی اختیار کی گئی، فارسی گو شعرا کا زیادہ زور تھا اور انہی کے توسط سے اس قسم کی رعایت لفظی قادرالکلامی کی دلیل اور سند قرار پائی۔

بہرحال چاہے وؔلی کے اثر سے ہو یا فارسی کے یا پھر ہندی کے یہ تینوں اثرات اردو میں ایہام گوئی کا باعث بنے۔اس تعلق سے ڈاکٹر محمد حسن کا میلان یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے ایہام گو شعرا پر فارسی اور ہندی دونوں کے اثرات بیک وقت پڑے۔ان کا کہنا ہے کہ شمالی ہند میں اردو ادب کی ابتدا فارسی اور ہندی کی دوہری ادبی روایت کے سایہ میں ہوئی۔فارسی نے اردو ادب سے بہت کچھ اخذ و اختیار کیا۔اس کی حسن کاری، لفظوں کے در و بست، اضافت و تراکیب، شاعرانہ لب و لہجہ، اور ایک مخصوص افتادِ طبع اور شائستگی کا ایک خاص تصور لیا۔ہندی شاعری سے بالواسطہ کئی اثرات اس تک پہنچے۔جن میں تمثیلی پیرایہ اظہار، عشق کے بعض تصورات، صنعت گری اور نک سک اور نائکہ بھید کے رموز و معارف شامل ہیں۔

الغرض اگر اردو غزل گو شعرا کے اس عہد کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں فارسی لب ولہجہ کے اثرات کم اور ہندی یا بھاشائی لب ولہجہ کے اثرات نسبتاً زیادہ ملتے ہیں اور ہندی اثرات کے تحت بیشتر اشعار ایہامی ہیں۔اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس عہد میں جب کہ وؔلی اورنگ آبادی نے دلی کا دورہ کیا تو شاہ گلشن نے انھیں یہ مشورہ دیا تھا کہ فارسی میں جو سرمایہ موجود ہے وہ اردو میں استعمال کیا جائے۔اس کا اثر یہ ہوا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دلی کے دورے سے قبل ولی کے کلام میں ہندی یا ہندوی رنگ غالب ہے جب کہ بعد کے دور میں انہوں نے فارسی رنگ کو خصوصی طور پر اپنایا اور منظّم

طریقے سے اردو کو فارسی زبان کے ذریعہ بڑی زبان بنانے کی کوشش کی گئی اور اسے ہندی یا ہندوی کے سحر سے آزاد کیا گیا۔

2.4 ایہام گوئی کا سماجی وسیاسی پس منظر

اردو میں ایہام کے رجحان کے فروغ پانے کے تاریخی اور سیاسی اسباب بھی رہے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے یہ مغلیہ حکومت کا آخری اور انحطاط پذیر دور تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد سلطنت متزلزل ہو چکی تھی۔ ایک کے بعد دیگر تین بادشاہ تخت نشین ہوئے۔ جب حکومت عدم استحکام کا شکار ہوگئی تو محمد شاہ رنگیلا مغلیہ حکومت کا فرمان روا بن گیا۔ یہ بڑا عیش پرست بادشاہ تھا۔ ہر وقت شراب اور عشق و عاشقی میں ملوث رہتا۔ دربار طوائفوں اور گویوں کا اڈہ بن چکا تھا۔ دراصل یہ دور اخلاقی پستی اور سماجی گراوٹ کا دور تھا۔ امراء، روساء اور خود بادشاہ تمام اخلاقی برائیوں میں ملوث تھے۔ پورا معاشرہ اندرونی طور پر کھوکھلا ہو چکا تھا اور اپنے اسی کھوکھلے پن کو چھپانے کے لیے ظاہری آسائش و زیبائش کا اہتمام ہونے لگا۔ اس عہد کے لوگوں کا ظاہر اور باطن یکساں نہیں تھا۔ وہ ظاہرداری میں ملوث ہو چکے تھے جب کہ ان کا باطن کچھ اور ہی تھا یعنی ان کے ظاہر و باطن میں فرق تھا۔ یہ تشکیک کا دور تھا اور ہر چیز کے دو رخ نظر آرہے تھے۔ ایہام گوئی کی بنیاد معنیاتی و تلاشِ مضمونِ تازہ پر رکھی گئی تھی اور اس میں یہ چھپی ہوئی خواہش بھی شامل تھی کہ وہ معنی جو زندگی میں باقی نہیں رہے تھے انھیں شاعری میں تلاش کیا جائے۔ فقرہ بازی، ضلع جگت، پھبتیوں اور لطیفوں سے زندگی میں مزہ پیدا کیا جانے لگا تھا جو اس فن میں طاق ہوتا وہ اتنا ہی کامیاب شاعر تصور کیا جاتا تھا۔ ایہام گوئی اسی تہذیبی فضاء کی کوکھ سے پیدا ہوئی۔

2.5 اردو میں ایہام گوئی کا زمانہ

اردو میں ایہام گوئی کا آغاز اورنگ زیب عالمگیر کے بعد سے ہی ہو چکا تھا۔ 1130ھ یا اس کے قریب ایہام گوئی کی ابتداء ہوئی اور غالباً 1160ھ سے کچھ پہلے تک اس کا زور رہا۔ ایک اندازہ یہ بھی ہے کہ ولؔی کے دیوان کے دلی آنے کے ساتھ ہی ایہام گوئی شروع ہوگئی تھی اور اس کی بھاشائیت اور دکنیت کا رنگ پھیکا ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اپنی تحقیق میں شاہ حاتم کے ''دیوان زادہ'' کے سلسلے میں یہ ثابت کیا ہے کہ شاہ حاتم نے دیوان زادہ سے تقریباً بارہ سال پہلے ایہام گوئی ترک کردی تھی اور اس کے ثبوت میں حاتم کا ایک مقطع پیش کیا ہے۔

کہتا ہے صاف و شستہ سخن بسکہ بے تلاش
حاتم کو اس سبب نہیں ایہام پر نگاہ

اس شعر سے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ایہام گوئی کے مقبولیت کا زمانہ 1157ھ تک ختم ہو چکا تھا۔ اس کے بعد اس کا معمولی اثر رہا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کا عرصہ تیس سال بتایا۔ الغرض اردو میں ایہام گوئی کا دور پچیس سے تیس برس کے درمیان ہے۔

2.6 ایہام گوئی کا بانی

ایہام گوئی کو کس شاعر نے رواج دیا ہے؟ یہ بھی سوال محققین کو بے چین کرتا رہا۔ اس سلسلے میں مضمونؔ نے ایہام گوئی کا بانی ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ کہتے ہیں۔

ہوا ہے جگ میں مضمونؔ شہرہ تیرا
طرح ایہام کی جب سیں نکالی

مضمونؔ کے موجد ہونے کی تصدیق گلشنِ گفتار سے بھی ہوتی ہے۔ صاحب گلشن گفتار نے مضمونؔ کو ایہام ریختہ کا موجد مانا ہے مگر شاکر ناجیؔ نے بھی اس تعلق سے ایک شعر کہا ہے ملاحظہ ہوں۔

ریختہ ناجیؔ کا ہے محکم اساس
بات میری بانیِ ایہام ہے

مضمونؔ اور شاکر ناجیؔ کے علاوہ آبروؔ کو ایہام گوئی کا پیش رو قرار دیا جاتا ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی ''شعرالہند'' میں لکھتے ہیں کہ ان بزرگوں نے ایہام کو اپنا خاص فن بنالیا تھا اور شاہ مبارک آبروؔ ان سب کے پیشرو قرار پائے۔ ''تذکرۂ قدرت'' میں بھی آبروؔ کو ایہام گوئی کا سر آمد کہا گیا ہے۔ اگر ایہام گوئی کی مقدار کو دیکھا جائے تو یقیناً شاہ مبارک ایہام گوئی کے سر آمد قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ اگر شاکر ناجیؔ کے شعر کی بات کی جائے تو اس میں انھوں نے فقط اپنی ایہام گوئی کو بنیادی قدر ماننے پر زور دیا ہے اور اس پہلو سے اپنے ریختے کو محکم اساس بتایا ہے۔ مگر جیسا کہ اپنے شعر میں مضمونؔ نے ایہام گوئی کا بانی ہونے کا دعویٰ کیا ہے تو ہمیں اس بات سے متفق ہونا پڑے گا کہ مضمونؔ ہی اردو میں ایہام گوئی کے بانی ہیں۔

2.7 اہم ایہام گوشعرا

ولیؔ کے زیر اثر شمالی ہند کے شعرا میں یہ خیال بھی عام ہوا کہ فارسی کے بجائے اردو میں بھی غزل کہی جاسکتی ہے، غزل دہلی پہنچی تو ایہام گوئی نے اس کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ ایہام گوئی کی تحریک اس زمانے کے سیاسی انتشار اور پریشان زندگی کا ردعمل تھی۔ فارسی غزل کا اتباع آسان نہیں تھا اور اس لیے اعلیٰ مضامین کے بجائے لفظی بازی گری نے جگہ بنالی۔ جن شعرا نے ایہام گوئی کا انداز اختیار کیا ان میں آبروؔ، حاتمؔ، مضمونؔ، احسن اللہ خاں بیاںؔ، شاکر ناجیؔ اور مصطفی خان یکرنگؔ، میر مکھن پاکبازؔ، محمد اشرف، ولی اللہ اشتیاقؔ، دلاور خان بیرنگؔ، شرف الدین علی خان پیامؔ، شاہ فتح محمد دلؔ، میاں فضل علی داناؔ، میر سعادت علی سعادتؔ، میر سجاد، محمد عارف، عبدالغنی مقبول، شاہ کاکل، شاہ مزمل، عبدالوہاب یکروؔ اور حیدر شاہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ خان آرزوؔ اور ان کے ساتھی ٹیک چند بہارؔ، حسن علی شوقؔ، شہاب الدین ثاقبؔ، آنند رام مخلصؔ اور میرزین العابدین آشناؔ وغیرہ کے یہاں بھی بیشتر رعایتِ لفظی اور کمتر ایہام کی صورتیں ملتی ہیں۔ ان سب نے اردو غزل کی تعمیر وتشکیل میں نمایاں حصہ لیا لیکن ان کے پاس خیال کی بلند پروازی اور فکر کی گہرائی نہیں ملتی لیکن اصلیت اور واقعیت ضرور موجود ہے۔ اس زمانے کے شعرا ہندی الفاظ کثرت سے استعمال کرتے تھے جن سے غزل کی صحیح فضا کو ٹھیس لگتی تھی۔ یہاں چند ایہام گو شعرا کا مختصر ذکر پیش کیا جارہا ہے۔

آبروؔ : شاہ مبارک آبروؔ کا نام نجم الدین تھا اور تخلص آبرو۔ وہ گوالیار کے ایک مشہور صوفی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور خان آرزوؔ کے شاگرد تھے۔ اب اُن کا دیوان بھی دستیاب ہے۔ اُن کو صنائع کے استعمال کا بہت شوق تھا۔ اِس وجہ سے کہیں کہیں ان کی شاعری بے مزہ معلوم ہوتی ہے۔ مگر دہلی کا رنگ ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

قول آبرو کا تھا کہ نہ جاؤں گا اس گلی

ہوکر کے بے قرار دیکھو آج پھر گیا

افسوس ہے کہ مجھ کو وہ یار بھول جاوے
وہ شوق وہ محبت وہ پیار بھول جاوے

عارض کے آئینہ پہ تُمنا کے سبز خط ہے
طوطی اگر جو دیکھے گلزار بھول جائے

دل سرد ہوگیا ہے جب سے پڑا ہے پالا
ہم جانتے تھے خوباں گرمی کریں گے ہم سے

ناجؔی : ناجؔی کا نام سید محمد شاکر تھا۔ ان کے مزاج میں بلا کی ظرافت تھی۔ ہر وقت ہنساتے رہتے تھے مگر خود نہیں ہنستے تھے۔ ناجؔی نے دہلی کو اپنی آنکھوں سے اجڑتے دیکھا۔ نادر شاہ کے حملے اور دلی کی تباہی کا منظر ان کے حساس طبعیت پر اثر کر گیا اور انھوں نے ایک بہت ہی درد انگیز نظم بھی رقم کی۔ ان کا دیوان آج کل دستیاب ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں اپنے دور کے اہم رجحان ایہام گوئی کو کی تقلید کی۔ یعنی وہ صنائع کا استعمال کرتے تھے اور زیادہ تر غزل ہی کی شکل میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے تھے۔ وہ دلی کے دور ایہام گوئی کے نمایاں شاعروں میں شمار کیے جاتے تھے اور ایہام گوئی کے رنگ پر فخر بھی محسوس کرتے تھے۔

کیا فردا کا وعدہ سروقد نے
قیامت کا جو دن سنتے تھے کل ہے

نمکین حسن دیکھ کر پی کا
رنگ گل کا مجھے لگا پھیکا

بلند آواز سے گھڑیال کہتا ہے کہ اے غافل
کٹی ہے یہ گھڑی تجھ عمر سے اور تو نہیں چیتا

محبت سے علی کی دیکھ ناجؔی

ہوا ہے دل مرا اب حیدرآباد

حاتم : حاتم کا نام شیخ ظہورالدین تھا۔ حاتم تخلص کرتے تھے۔ ایہام گوئی کے اہم اور مشہور شعرا میں حاتم کو بیحد اہمیت حاصل ہے، کیوں کہ وہ صرف بڑے شاعر ہی نہ تھے بلکہ کئی بڑے شاعروں کے استاد بھی تھے۔ انھوں نے لمبی عمر پائی تھی۔ جس وقت انھوں نے شاعری کی ابتدا کی اس وقت دلی میں ولی کا اثر روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ حاتم نے بھی کامیابی کے ساتھ ولی کی تقلید کی۔ انھوں نے اپنا دیوان بھی تیار کر لیا تھا لیکن جب شاعری کا رنگ بدلا تو انھوں نے ایہام گوئی ترک کر دی۔ یہاں تک کہ اپنے دیوان سے ایہام کے اشعار حذف کیے اور نیا دیوان مرتب کیا جس کا نام ''دیوان زادہ'' رکھا۔ حاتم کے دیوان زادے کی خاص بات یہ ہے کہ اس کے شروع میں ایک دیباچہ ہے جس میں حاتم نے زبان اور شاعری کی نسبت اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ علمی وادبی نقطہ نظر سے یہ دیباچہ بہت اہم ہے۔ کیوں کہ اس میں وقت کی بدلتی ہوئی پسند اور لسانی ارتقاء کی جھلک ملتی ہے۔

پیری میں حاتم اب نہ جوانی کی یاد کر
سوکھے درخت بھی کہیں ہوتے ہیں پھر ہرے

جس کو دیکھا سو یہاں دشمن جاں ہے اپنا
دل کو جانے تھے ہم اپنا ، سو کہاں ہے اپنا

خواب میں تھے جب تلک تھا دل میں دنیا کا خیال
کھل گئی تب آنکھ تو دیکھا تو سب افسانہ تھا

بدن پر کچھ مرے ظاہر نہیں اور دل میں سوزش ہے
خدا جانے یہ کس نے راکھ اندر آگ دابی ہے

فائز : فائز کا نام صدرالدین محمد تھا۔ وہ دلّی کے رہنے والے تھے اور دلّی کے دربارِ شاہی میں ان کو بلند منصب حاصل تھا۔ صاحب ثروت تھے اور عالم بھی۔ فارسی میں ان کی بہت سی کتابیں ملتی ہیں۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے ان کا اردو دیوان اپنے بیش بہا مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ فائز شمالی ہند کے پہلے اردو شاعر ہیں جنھوں نے اپنا دیوان مرتب کیا۔ جس سے اس زمانے کی سیاسی اور ادبی تاریخ کا اندازہ ہوتا ہے۔ فائز کی شاعری میں دہلی کا رنگ گہرا ہے۔ ان کی شاعری میں ہندی شاعری کا رنگ جھلکتا ہے۔

تری گالی مجھ دل کو پیاری لگے
دعا میری تجھ من کو بھاری لگے
چیری ہیں اس کی اربسی ، رمبھا و رادھکا

پربھو نے پھر بنائی نہیں ویسی دوسری

مندرجہ بالا شعرائے دہلی کو ایہام گوئی کے بڑے شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جتنا ایہام کا استعمال ان شعرا کے یہاں نظر آتا ہے اس عہد کے دوسرے شعرا کے کلام میں کم نظر آتا ہے اور یہی اپنے عہد کے صف اول کے شعرا تھے۔ اس دور کے چند خاص شعرا میں مضموںؔ، یکرنگؔ اور انجامؔ بھی ہیں۔

2.8 ایہام گوئی مفید یا مضر

فنی سطح پر ایہام گوئی سے نقصان پہنچا ہے، لیکن اس نے اردو شاعری میں خوبصورت اضافے بھی کیے ہیں۔ اردو شاعری کی ممتاز خصوصیات میں صناعی، مضمون آفرینی، رعایتِ لفظی اور نازک خیالی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اردو شعری روایات کے مثبت پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح ایہام گوئی کے فائدوں کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ لفظوں کی صوری اور معنوی دونوں صورتوں میں کتنا تنوع اور کتنے مختلف الجہت مفاہیم ہو سکتے ہیں اس کی مثال اگر دیکھنا ہو تو ایہام گو شعرا کے کلام کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ اُن کے یہاں اس قبیل کے بیش بہا اشعار مل جائیں گے جس سے اردو کو فائدہ ہی ہوا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے اس کے متعلق صحیح کہا ہے کہ ایک لفظ اس کے کتنے پہلوؤں کو سمجھا سکتا ہے، محاورہ کا جز بن کر کس طرح اس میں معنوی تبدیلی آ جاتی ہے، الفاظ کس طرح دوسرے الفاظ سے مربوط ہو کر اپنے معنی تبدیل کر سکتے ہیں، ان لطیف نکات کی طرف جس طرح ایہام گو شعرا نے توجہ کی اس سے قبل نہیں کی گئی تھی۔ ایہام گو شعرا کے نزدیک لفظ گنجینۂ معنی کے طلسم کی حیثیت رکھتا ہے جس سے مختلف آوازیں اور مختلف نغمے پیدا ہوتے ہیں۔ لفظیات کا یہ نیا ادراک زبان اور ادب کے ابتدائی دور میں خدمت کی حیثیت رکھتا ہے۔ (ڈاکٹر محسن حسن، دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر، ص 287)

منظر اعظمی نے ''اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکات اور رجحانات کا حصہ'' میں اس بات کو مثالوں کے ذریعے پیش کیا ہے جس کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ''لفظ کے معنی میں تنوع کس طرح پیدا ہوتا ہے چند مثالوں سے واضح ہو سکے گا۔ مثلاً آبروؔ کا شعر ہے ؎

یہ شعلہ عشق کا حسن ازل کا نور ہے گویا
جلا ہے جب سے سینا تب سے کوہِ طور ہے گویا

لفظ سینا اور اس کے جلنے سے جہاں کوہِ طور اور اس کے جلنے کی طرف ذہن جاتا ہے شعلۂ عشق کی مناسب سے سینے کی جلن کی طرف بھی منتقل ہوتا ہے اور یہی سینے کی جلن حسن ازل سے نور کی نسبت سے عشقِ حقیقی کے ہم معنی ہو جاتی ہے۔ دوسرے مصرعے میں گویا کلام کی طرف بھی اشارہ ہے۔ یعنی جب عشق میں شدت پیدا ہوتی ہے تو وہ محبوب سے ہم کلام بھی کرا سکتی ہے۔ اسی طرح محاوروں کے استعمال سے مفہوم کس طرح بدل جاتا ہے اس کی بھی متعدد مثالیں بکھری پڑی ہیں۔ مثلاً آبروؔ کا ایک شعر دیکھیے ؎

کیوں بلایا بھیڑ میں ہم سے یہ نادانی ہوئی
دختر رز شرم سیں آبزم میں پانی ہوئی

بھیڑ میں دختر رز کو بلانا اور اس کا شرم سے پانی ہونا اور پھر بلانے کے عمل کو نادانی کہنا، الفاظ کے ربط و ترتیب اور محاورے کے تیکھے استعمال

سے بڑے دلچسپ مفہوم پیدا کردیتا ہے۔

اگرچہ ایہام گوئی کی عمر پچیس تیس برس سے زیادہ نہیں مگر اس کے اثرات لکھنوی شعرا کے یہاں بھی رعایت لفظی اور ضلع جگت کی صورت میں پائے جاتے ہیں۔ گویا ایہام گوئی کو لکھنؤ میں دوسرا جنم ملا۔ ڈاکٹر محمد حسن کا بھی یہی خیال ہے کہ لکھنوی شعرا نے ایہام گوئی میں کمال دکھایا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دور کے شعرا نے مختلف ترکیبیں استعمال کی ہیں۔ کہیں ترتیبِ کلام کسی ایک لفظ کے مناسبات سے عبارت ہے۔ کسی ایک شئے یا تصویر کو کسی چیز سے تشبیہ دی گئی ہے اور پھر اس تشبیہ کی مناسبت سے پوری تصویر مرتب کی گئی ہے۔ اس طرح تشبیہ در تشبیہ اور استعارہ در استعارہ سے وہ کیفیت پیدا ہوگئی ہے جسے لکھنؤ کے شعرا نے رعایتِ لفظی کی شکل میں کمال تک پہنچایا۔ بہرحال ایہام گوئی کے اشعار محض سطحی اور معیار سے گرے ہوئے نہ تھے بلکہ ان میں سے بعض میں درس وعبرت کے بھی کئی پہلو تھے۔ ایہام گوئی کی حمایت میں ڈاکٹر محمد حسن نے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے وہ یہ کہ بعض تاریخی تلمیحات، سماجی حوالے، لباس، میلے ٹھیلے، نشست وبرخاست، عام گفتگو کے انداز، محاورے، عام روایتیں اور اصطلاحیں ایہام گو شعرا نے نظم کی ہیں۔ یوں تو تاریخی ومعاشرتی اصطلاحیں بعد کے دوسرے شعرا کے کلام میں بھی ملتی ہیں لیکن یہاں فرق یہ ہے کہ یہاں ایہام گوئی کی بدولت یہ حوالے اپنے دوسرے متعلقات اور مناسبات کے ساتھ آئے ہیں اور اس لیے زیادہ واضح ہوگئے ہیں۔ اس کے علاوہ ایہام گو شعرا کے یہاں متعدد تاریخی حوالے، واقعات اور شخصیات کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں جس کے سبب ان شخصیات اور واقعات میں ایک نکھار پیدا ہوگیا ہے۔ اس طرح مختصر عرصہ میں ایہام گوئی نے اردو کے ادبی ارتقاء میں بہت کچھ اضافہ کیا لیکن چوں کہ یہ اردو فن شعر پر بہت بڑا ستم تھا اس لیے جلد ہی فنی اور تہذیبی سطح پر اس کی مخالفت شروع ہوگئی۔

2.9 ایہام گوئی کا ردِعمل

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ شاعری لفظ ومعنی کے درمیان توازن برقرار رکھنے سے نکھرتی اور قوت پاتی ہے۔ اس توازن میں کمی واقع ہوجائے تو شاعری بے وقعت ہوکر رہ جاتی ہے۔ ایہام گوئی کی تحریک اردو کو ترقی اور بلندی تک پہنچانے کے لیے شروع کی گئی تھی۔ نیز شاعری کے حسن کو نکھارنے اور دوبالا کرنے کے لیے اس صنعت کو بروئے کار لایا جارہا تھا۔ لیکن جب اس میں شدت پیدا ہوئی اور شاعری میں الفاظ کا گورکھ دھندہ زیادہ ہونے لگا اور جب شعر میں فکر ومعنی کے بجائے الفاظ کے الٹ پھیر اور سطحی ذومعنی الفاظ کے استعمال پر زیادہ قوت صرف کی جانے لگی تو شاعری جذبہ سے محروم اور الہامی کیفیت سے خالی ہونے لگی۔ اس کے نتیجے میں حقیقت کے بجائے تصنع کا غلبہ بڑھنے لگا۔ الفاظ کی ظاہری تراش خراش اور مصنوعی چمک کے سامنے خیال اور جذبے کی چمک ماند پڑنے لگی، جب شاعری، فکر ومعنی کی لطافتوں سے عاری بے جان الفاظ کا مجموعہ ہونے لگی تو اس کے خلاف ردِعمل ہونا لازمی تھا۔ اس لیے کہ لفظ ومعنی کے درمیان لطیف رشتے کا شعور رکھنے والے اور الفاظ کی تراش خراش کے ساتھ فکر ومعنی کی بلندی اور شاعری میں جذبہ کی اہمیت کے قائل شعرا کے لیے شاعری کی بے حرمتی ناقابل برداشت ہوگئی۔ اس طرح ایہام گوئی کی مخالفت کی تحریک کا آغاز ہوا۔

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ ایہام گوئی کی تحریک اس زمانے کے سیاسی انتشار اور پریشان زندگی کا ردِعمل تھی۔ اعلیٰ مضامین کے بجائے لفظی بازی گری نے جگہ بنالی۔ اس زمانے کے شعرا ہندی الفاظ کثرت سے استعمال کرتے تھے جن سے غزل کی صحیح فضا کو ٹھیس لگتی تھی۔ سب سے

پہلے حاتم نے اس حقیقت کومحسوس کیا اور ہندی الفاظ کوغزل سے خارج کردیا۔ ہندی الفاظ کے اخراج کا یہ سلسلہ ناسخ تک جاری رہا۔جن شعرانے ایہام گوئی کی مخالفت کی تحریک میں حصہ لیا، ان میں مظہر جان جاناں، خواجہ میر دردؔ، میر تقی میرؔ اور سوداؔ قابل ذکر ہیں۔ان تمام شعرا میں مرزا مظہر جان جاناں کا نام نمایاں ہے وہ اس تحریک میں پیش پیش تھے۔

مرزا مظہر جان جاناں اٹھارہویں صدی عیسوی کے سلسلۂ نقشبندیہ کے بزرگوں میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ خدا نے ان کو کچھ ایسا مزاج اور ایسی صلاحیتیں ودیعت کی تھیں کہ وہ جس میدان میں قدم رکھتے، وہاں کے امام بن جاتے۔اردو شاعری میں انھیں ''نقاش اوّل ریختہ'' کہا جاتا ہے۔ انھوں نے جب شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو اردو شاعری میں ایہام گوئی کے نام پر صرف الفاظ کی جادوگری بنی ہوئی تھی۔انھوں نے اس خلافِ فطرت، تصنع اور بناوٹ کے خلاف آواز بلند کی اور سادہ گوئی کی بنیاد رکھی۔انھوں نے فارسی اور اردو زبان کو ایک ہی تار میں جوڑنے کی کوشش کی اور اس دور کی مروجہ ایہام گوئی کے عیب سے زبان کو پاک کر کے اس میں بڑی صفائی اور شستگی پیدا کی۔انھوں نے اردو زبان سے ہندی کے اثرات کو زائل کیا اور فارسی کے سبک اور شیریں الفاظ کو شاعری میں داخل کرنے پر زور دیا۔ فارسی کی نئی نئی اور خوبصورت ترکیبیں اردو میں داخل کیں اور فکر وخیال کے معیار کو بلند و بالا کیا۔

مرزا مظہر جان جاناں نفاست پسند تھے۔ان کی گفتگو شستہ اور شائستہ تھی۔لوگ ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ان کا مزاج ایہام گوئی سے میل نہیں کھاتا تھا بلکہ وہ ایہام گوئی کو ناپسند کرتے تھے اور اس کے خلاف تھے۔انھوں نے اپنے شاگردوں کو جن میں انعام اللہ خان یقینؔ، احسن اللہ خان بیانؔ، میر باقر حزیںؔ، محمد فقیہ دردمندؔ اور ہیبت قلی خاں حسرتؔ قابل ذکر ہیں ایہام کی مخالفت کے لیے تیار کیا۔ان شعرا نے ایہام گوئی کی باقاعدہ مخالفت کی اور اتنے منظّم انداز میں یہ تحریک چلائی کہ ہر کوئی ایہام گوئی کو برا سمجھنے لگا اور شعوری طور پر شعرا اس سے پرہیز کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ چناں چہ سوداؔ نے کہا کہ ؎

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دو رنگی
منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

قائم نے کہا کہ ؎

کہتا ہے صاف شستہ سخن بسکہ بے تلاش
حاتم کو اس سبب نہیں ایہام پر نگاہ

مرزا مظہر جان جاناں کے بعد شاہ حاتم نے ایہام گوئی کی مخالفت کی تحریک کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔حاتم پہلے خود ایہام گوئی کے ایک نمائندہ شاعر تھے لیکن مظہر جان جاناں کی تحریک کے بعد انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ ایہام گوئی کو اپنا کر انھوں نے بہت بڑی غلطی کی ہے تو انھوں نے اپنے کلیات پر نظر ثانی کی اور ایہام کے اشعار کو اپنے کلیات سے خارج کردیے اور اپنا عمدہ کلام منتخب کر کے ''دیوان زادہ'' کے نام سے ایک نیا مجموعہ مرتب کیا۔اس مجموعے کے مقدمے میں انھوں نے اصلاح زبان کے اصول پیش کیے جو آئندہ کے لیے منشور کہلانے کے مستحق قرار پائے۔اس میں انھوں نے ثقیل اور نامانوس الفاظ کو ترک کرنے پر زور دیا۔ ساتھ ہی عربی و فارسی الفاظ کو املا و تلفظ کی مکمل صحت کے ساتھ برتنے کا

اصرار کیا' بھاشا کو اردو شاعری سے خارج کر کے عام فہم اور روزمرہ کو اختیار کرنے پر زور دیا۔

حاتمؔ کے بعد خواجہ میر دردؔ نے اردو زبان کو تصوف، دردمندی، روانی اور نغمگی عطا کی۔ محمد رفیع سوداؔ نے بھی اس تحریک کو قوت بخشی۔ انھوں نے الفاظ کی ترکیب سازی کی اور کفایت لفظی کے رجحان کو فروغ دیا۔ اس سلسلے میں میر تقی میرؔ کا نام بھی بہت اہم ہے۔ میرؔ نے بھاری بھرکم الفاظ کی جگہ کومل، لطیف اور موسیقی آمیز الفاظ کا استعمال اپنی شاعری میں کیا ہے اور شاعری میں حقیقت اور سوز وگداز پیدا کیا۔ اس طرح ایہام گوئی کا اثر اردو شاعری میں کم سے کم تر ہوتا گیا اور شاعری میں نت نئے موضوعات پیش کیے جانے لگے۔

2.10 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں :

☆ ایہام عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے لغوی معنی ہیں غلطی میں ڈالنا، شک میں ڈالنا۔ اصطلاح میں ایہام ایک ایسی صنعت معنوی کو کہا جاتا ہے، جس کے تحت شعر میں لفظ کو ذو معنی بنا کر استعمال کیا جاتا ہے۔

☆ 1130ھ یا اس کے قریب ایہام گوئی کی ابتدا ہوئی اور 1160ھ سے کچھ پہلے تک اس کا زور رہا۔

☆ مضمونؔ نے ایہام گوئی کا بانی ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔

☆ مضمونؔ اور شاکر ناجیؔ کے علاوہ آبروؔ کو ایہام گوئی کا پیش رو قرار دیا جاتا ہے۔

☆ ایہام گوئی کے اہم اور مشہور شعرا میں قائم کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔

2.11 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
ایہام	:	ذو معنی، ایسی صنعت جس میں ایک لفظ کے دو یا دو سے زیادہ معنی ہوتے ہیں۔
دوہے	:	ہندی شاعری کی ایک مشہور صنف
بعید	:	دور
مترادف	:	ہم معنی دو ایسے لفظ جن کے معنی ایک ہو
استحکام	:	مضبوطی
زنداں	:	قید خانہ، جیل
وقعت	:	قدر، اعتبار، ساکھ
بروئے کار	:	استعمال کرنا
ذومعنی	:	دو معنی
الہامی	:	خدا کی طرف سے دل میں آئی ہوئی بات

تصنع	:	بناوٹی
لطافت	:	خوبی،نرمی،باریکی
لطیف	:	نازک
بے حرمتی	:	بے عزتی
اتباع	:	پیروی
ودیعت	:	امانت،سپردگی،صلاحیت
نقاش	:	نقش بنانے والا
خارزار	:	کانٹوں سے بھرا راستہ
شستگی	:	الفاظ کی سلاست،صاف ستھرا
زائل	:	دور ہونے والا،کم ہونے والا
سبک	:	ہلکا،چست وچالاک

2.12 نمونہ امتحانی سوالات

2.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ایسی صنعت جس میں کسی لفظ کے دو معنی ہو کیا کہلاتی ہے؟

2۔ محمد حسین آزاد کے مطابق اردو میں ایہام کی ابتدا ہندی کی کس صنف کے اثر سے ہوئی؟

3۔ ایہام کس زبان کا لفظ ہے؟

4۔ ایہام کے لفظی معنی کیا ہے؟

5۔ ایہام گوئی کا آغاز کس عہد سلطنت میں ہوا؟

6۔ اردو میں ایہام گوئی کا دور کتنے سال پر محیط ہے؟

7۔ ایہام گوئی کی مخالفت میں کون بہت مشہور ہوئے؟

8۔ دکن کے کس شاعر کے اثرات شمالی ہند کے شعرا پر پڑے؟

9۔ ایہام گوئی کی ابتداء کس زبان کے زیر اثر ہوئی؟

10۔ کس شاعر کو ایہام گوئی کا ''سرآمد'' کہا جاتا ہے؟

2.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ایہام کی تعریف تحریر کیجیے۔

2۔ مضمون آفرینی کی وضاحت کیجیے۔

3۔ اردو میں ایہام گوئی کے محرکات بیان کیجیے۔

4۔ ایہام گوئی کا مقبول شاعر کسے مانا جاتا ہے؟

5۔ ایہام گوئی کی مخالفت کی تحریک میں کس شاعر کو شہرت حاصل ہے؟

2.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ایہام گوئی کے سیاسی وسماجی پس منظر پر روشنی ڈالیے۔

2۔ مرزا مظہر جان جاناں کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

3۔ ایہام گوئی کے فائدے اور نقصانات پر تفصیلی مضمون لکھیے۔

2.13 مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	تاریخ ادب اردو (جلد اول)	ڈاکٹر جمیل جالبی
2۔	کلیاتِ ولؔی	مرتبہ: نورالحسن ہاشمی
3۔	شمالی ہند کی اردو شاعری میں ایہام گوئی	حسن احمد نظامی
4۔	ادبی تحریکات ور جحانات	انور پاشا
5۔	غزل کا سفر	ڈاکٹر قاضی نوید

اکائی 3 : تحریک اصلاحِ زبان

اکائی کے اجزا

3.0 تمہید
3.1 مقاصد
3.2 تحریک اصلاح زبان: تعارف
3.3 شعرائے اصلاح زبان
3.3.1 مظہر جان جاناںؔ
3.3.2 شاہ حاتمؔ
3.3.3 خواجہ میر دردؔ
3.3.4 محمد رفیع سوداؔ
3.3.5 میر تقی میرؔ
3.3.6 شیخ قیام الدین علی قائمؔ
3.3.7 انعام اللہ خاں یقینؔ
3.3.8 محمد فقیہ دردمندؔ
3.3.9 احسن اللہ خاں بیاںؔ
3.3.10 میر محمد حیات حسرتؔ
3.3.11 میر محمد باقر حزیںؔ
3.3.12 میر عبدالحی تاباںؔ
3.3.13 شیخ امام بخش ناسخؔ اور ان کے تلامذہ
3.4 اکتسابی نتائج
3.5 کلیدی الفاظ
3.6 نمونہ امتحانی سوالات
3.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
3.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
3.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
3.7 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

3.0 تمہید

دنیا کی ہر بڑی زبان موافق اور ساز گار حالات میں اپنی ترویج و اشاعت کی راہ پر گامزن رہتی ہے بالخصوص اپنے ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے ہر عہد میں اس کے معیار کا تعین کرتی ہے۔ ردو قبول کے عمل سے گزرتے ہوئے ترمیم و اضافے بھی کرتی ہے۔ اس ضمن میں کئی رجحانات و تحریکات بھی وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اردو زبان بھی دنیا کی بڑی زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس نے بھی ارتقائی مراحل طے کیے اور اس دوران اس میں کئی رجحانات و تحریکات معرض وجود میں آئے۔ اردو زبان کی نشو و نما میں ابتداً کئی ترمیم و اضافے ہوئے اور ردو قبول کے در وا ہوئے۔ ''اصلاحِ زبان'' کا وجود بھی اسی ضمن میں ہوا۔

''اصلاحِ زبان'' کی تحریک دراصل ایہام گوئی کے خلاف ردِ عمل ہے۔ ایہام گوئی کے مثبت رویوں کے ساتھ ہی منفی رجحانات بھی در آئے تھے۔ جہاں الفاظ کی بازی گری کو تقویت ملی وہیں تلاشِ لفظ تازہ، مبتذل اور بازاری مضامین بھی شاعری میں مستعمل ہوئے۔ اردو زبان کو بازاری مضامین اور ابتذال سے محفوظ کرنے کے لیے ہی اصلاح زبان کا خیال آیا۔ اصلاح زبان کا کام ایہام گوئی کے زمانے ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ سراج الدین علی خاں آرزو، انجام اور شاہ حاتم وغیرہ نے اصلاح زبان میں اہم حصہ لیا۔ مرزا مظہر جان جاناں نے باضابطگی سے اصلاح زبان کی تحریک چلائی۔ ان کی ہمنوائی میں مظہر کے تلامذہ یقین، دردمند، بیان، حسرت اور حزیں وغیرہ نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اس لیے اردو زبان میں اصلاح زبان کی قدر و منزلت واضح ہے۔ بعد کے زمانے میں ناسخ اور ان کے شاگردوں نے اصلاح زبان میں اہم حصہ لیا۔

3.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ اردو میں تحریک اصلاح زبان کا تعارف پیش کر سکیں۔

☆ اردو کے ماہرین زبان و لسان کی اصلاحی خدمات پر روشنی ڈال کر سکیں۔

☆ اصلاح زبان کے تحت اردو زبان کی معیار بندی کی وضاحت کر سکیں۔

☆ زبان کی اصلاح میں تازہ گوئی کی لہر اور اس کی نئی شعریات پر روشنی ڈال سکیں۔

3.2 تحریک اصلاح زبان: تعارف

محمد شاہی دور میں ریختہ کی شاعری کو قبولِ عام حاصل ہو چکا تھا۔ اس دور میں ایہام کی تحریک بلبلے کی طرح اٹھی۔ ایک مختصر سے عرصے کے لیے رقصِ آب کا مظاہرہ کیا اور پھر ختم ہو گئی۔ اس تحریک کے بہت سے شعرا سپاہی پیشہ، داروغانِ مطبخ اور ملازم تھے۔ چناں چہ ایہام کی تحریک فارسی کے بلند پایہ شعرا کی مخالفت میں نسبتاً کمتر درجے کے شعرا کی تحریک تھی۔ اس تحریک کے خلاف ردِ عمل میرزا مظہر جانِ جاناں جیسے عالم و فاضل شاعر نے ظاہر کیا، جو تیموری خاندان کا نواسہ تھا، جس کے والد اورنگ زیب عالم گیر کے دربار میں صاحبِ منصب تھے۔ میرزا مظہر جانِ جاناں کا نسب باپ کی طرف سے محمد بن ابن حنفیہ سے ملتا ہے۔ اس لحاظ سے ان کی رگوں میں عرب اور عجم دونوں کا خون دوڑ رہا تھا اور اس میں ہندوستانی خون کی آمیزش نہیں ہوئی تھی۔ میزا مظہر جان جاناں کی شخصیت کا دوسرا زاویہ تصوف سے پھوٹتا ہے۔ جاناں خود بھی صاحبِ طریقت تھے اور ان کا تعلق نقشبندی سلسلے سے تھا۔ انہوں نے علم حدیث با اصول پڑھا تھا اور حنفی مذہب کی شریعت کو صدقِ دل سے ادا کرتے تھے۔ مظہر جان جاناں کی سلاست طبع اور لطافت

کی بڑی شہرت ہے۔ چناں چہ ان کی نازک مزاجی نے ایہام کو قبول نہ کیا اور اسے قابل ترک قرار دے کر اپنے عہد کے شعرا کا طبقہ الگ کر دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایہام کے تصنع کے خلاف میرزا مظہر جان جاناں نے مضبوط آواز اٹھائی تاہم اسے صرف ان کے لطیف مزاج کا ردعمل قرار دینا ممکن نہیں۔

مظہر جان جاناں نے اردو زبان سے ہندی کے اثرات زائل کرنے اور فارسی کے غلبے کو قبول کرنے کی تحریک کی اور یہ بالواسطہ طور پر ایرانی تہذیب کی پیش قدمی کی ہی ایک صورت تھی۔ اس لحاظ سے اصلاح زبان کی تحریک کا ایک پہلو سیاسی نوعیت بھی رکھتا ہے۔ اس تحریک میں میرزا مظہر کا عملی ساتھ انعام اللہ خاں یقینؔ نے دیا۔ یقین ننہال کی نسبت سے براہ راست حضرت مجدّد الف ثانی کے نواسے تھے۔ چناں چہ مجدّدیت ان کے خون میں بھی موجود تھی۔ جب میرزا مظہر جانِ جاناں نے اردو کی تطہیر شروع کی تو یقینؔ اردو کو ہندی کے اثرات سے پاک کرنے میں اس لیے بھی زیادہ مستعد ثابت ہوئے کہ انہیں یہ فریضہ مذہبی بھی نظر آتا تھا۔ اس لحاظ سے اس تحریک کا ایک زاویہ مذہبی بھی ہے۔ چناں چہ یہاں یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ خواجہ میر دردؔ نے ایہام کو لفظ دوئی قرار دیا اور واصل بہ حقیقت ہونے کے لیے اسے مٹانا ضروری سمجھا۔

اصلاحِ زبان کی تحریک کا مقصد ریختہ میں فارسی الفاظ، تراکیب اور صنعتوں کا استعمال تھا۔ چناں چہ نکات الشعرا میں میر تقی میرؔ نے اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے اور اسی کو اپنا انداز شعر قرار دیا ہے۔

> ''فارسی کی محض وہ ترکیبیں لائی جائیں جو زبان ریختہ کے مناسب ہوں............ایسی ترکیبیں کہ جو ریختہ کے لیے نامانوس ہوں معیوب ہیں۔ اس کا جاننا بھی سلیقۂ شاعری پر موقوف ہے۔ میں نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ اگر فارسی ترکیب گفتگوئے ریختہ کے مطابق ہو تو مضائقہ نہیں ....چھٹی قسم وہ انداز شعر ہے جسے ہم نے اختیار کیا ہے۔ یہ انداز تمام صنعتوں مثلاً تجنیس، ترصیع، تشبیہ، فصاحت، بلاغت، ادا بندیٔ خیال وغیرہ پر مشتمل ہے۔''

دلی میں فارسی ادب کی روایت چوں کہ ابھی زندہ تھی اس لیے فارسی آمیز اردو کو مقبول ہونے میں کسی خاص دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ بلکہ بہت جلد بیشتر وہ شعرا جو ایہام گوئی میں اپنا نام پیدا کر چکے تھے اس نئی تحریک کے ہم نوا بن گئے۔ ان میں سب سے اہم شاہ حاتمؔ تھے۔

شاہ حاتمؔ نے قدیم طرزِ سخن میں دیوان بھی مرتب کیا تھا اور ان کی اولین ناموری ایہام کی تحریک کی بدولت ہی ہے۔ شاہ حاتمؔ کا اس نئی روش کو قبول کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جامد ذہن کے شاعر نہیں تھے اور انہوں نے اپنی آنکھیں مستقبل کی طرف کھول رکھی تھیں۔ شاہ حاتمؔ نے ''دیوان زادہ'' کے دیباچے میں اصلاحِ زبان کے لیے اصول وضع کیے اور متروکاتِ سخن کی ایک فہرست بھی مرتب کی چناں چہ ''دیوان زادہ'' کے دیباچے کو اگر اس تحریک کا اولین تحریری منشور قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ شاہ حاتمؔ نے ''دیوان زادہ'' کے دیباچے میں جو اصول بتائے ہیں ان کا مفہوم یہ ہے۔

''فقیر شاہ مبارک آبرو، شرف الدین مضمون، میرزا مظہر جانِ جاناں، شیخ احسن اللہ، میر شاکر ناجی اور غلام مصطفیٰ یک رنگ کا ہم عصر ہے۔ لفظ ''در'' (میں)، ''بر'' (پر)، ''از'' (سے) اور ''اُو'' (وہ) جو کہ فعل اور حرف ہیں، شاہ مبارک آبرو کے بہ قول ریختے میں ان کا استعمال غلط ہے۔

وقت جن کا ریختے کی شاعری میں صرف ہے
ان ستی کہتا ہوں بوجھو حرف میرا ژرف ہے

جو کہ لاوے ریختے میں فارسی کے فعل وحرف
لغو ہیں گے فعل اُس کے، ریختے میں حرف ہے

بندے نے اپنے قدیم دیوان میں اس کی پابندی کی اور اس معاملے میں تقریباً دس بارہ سال سے اکثر الفاظ کو ترک کر دیا۔ عربی و فارسی کے وہ الفاظ جو قریب الفہم اور کثیر الاستعمال ہیں اور دہلی کا روزمرہ جو میرزایان اور فصیحان ہندوستان کا روزمرہ ہے، مجھے پسند آیا۔ ہر علاقے کی زبان یہاں تک ہندوی بھی جسے 'بھاکا' کہتے ہیں، میں نے ترک کر دی۔ البتہ صرف وہ روزمرہ جو عام فہم اور خاص پسند ہوا اختیار کیا۔ جن الفاظ کو ترک کر دیا ان کا کچھ بیان اس طرح ہے۔

عربی اور فارسی الفاظ کو عوام کی طرح بولنا مثلاً تسبیح کو تسبی اور صحیح کو صحی، بے گانہ کو بگانہ اور دیوانہ کو دوانہ کہنا وغیرہ۔ متحرک کو ساکن اور ساکن کو متحرک کرنا مثلاً مَرَض کو مَرض، غَرَض کو غَرض کہنا۔ اسی طرح الفاظ ہندی جیسے نین، جگ، نت، بسر وغیرہ کا استعمال لفظ ''مار'' اور ''موا'' اور اسی قبیل کے دوسرے الفاظ کے استعمال سے قباحت لازم آتی ہے۔ غلط ہے۔ اسی طرح سے کی جگہ ستی (یا سیتی) یا اُدھر کو ادھر اور کدھر کو کیدھر کہنا جو اصل لفظ میں حرف کا اضافہ ہے، درست نہیں۔ پر کی جگہ پہ یا یہاں کو یاں اور وہاں کو واں (اور ہر ایک کو ہر یک) کہنا بھی غلط ہے۔ زیر، زبر اور پیش قافیے میں لانا یا رافارسی کا قافیہ راہندی بنانا، جیسے گھوڑا اور بورا اور دھڑ اور سر وغیرہ، غلط ہے۔ لیکن ہائے ہوز کو الف سے تبدیل کرنا جو کہ عام اور خاص کے محاورے میں ہے تو بندہ اس معاملے میں جمہور کی تقلید کرنے پر مجبور ہے۔ چناں چہ بندہ کو بندا اور پردہ کو پردا (شرمندہ کو شرمندا وغیرہ جو اس قبیل سے ہیں خلاف محاورہ اور غیر اصطلاحی نہیں اور اس کے استعمال میں روزمرہ کی غلطی اور فصاحت کا نقصان نہیں۔''

شاہ حاتم کے ان خیالات سے زبان کے بدلتے ہوئے ڈھانچے اور اس کے قواعد وضوابط سامنے آتے ہیں اور ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس سے قبل ریختہ ایک لالۂ خودرو کی طرح بڑھ رہی تھی اور اس پر مخصوص ادبی لہجے کے بجائے مقامی لہجہ غالب تھا۔ چناں چہ ایک علاقے کے ریختہ کو دوسرے علاقے کے ریختہ گوئی سے الگ کر کے دیکھنا اور ان کے امتیازی خطوط متعین کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ شاہ حاتم نے ملک بھر میں ایک مرکزی ریختہ رائج کرنے اور زبان کو غیر مانوس الفاظ سے پاک صاف کرنے کی سعی کی اور متروک الفاظ اور ان کے متبادل مانوس الفاظ کی جو فہرست مرتب کی اس کی تلخیص حسب ذیل ہے۔

قدیم مستعمل لفظ	نیا لفظ	قدیم مستعمل لفظ	نیا لفظ
انکھیاں	آنکھیں	جیو	جی
نین	چشم، آنکھ	سُرج	سُورج
جُھٹا	جھوٹا	اپس	آپس
ستی	سے	دیا	چراغ
مُکھ	مُنہ	سنسار	دنیا

درپن	آئینہ	اگے	آگے
سون	سے	آنجھو	آنسو
بیجلی	بجلی	نزیک	نزدیک
کوئے	کوئی	مَن	دِل
گال	رخسار	رَین	رات

3.3 شعرائے اصلاحِ زبان

اصلاحِ زبان کا عمل ہر بڑی زبان میں واقع ہوا ہے۔ اردو زبان میں بھی اصلاحِ زبان کی کوشش کی گئی ہے۔ ابتدائی زمانے میں زبان و لسان کی اصلاح پر توجہ صرف کی گئی ہے۔ اردو زبان کی ترقی میں اصلاحِ زبان کا عمل دخل رہا ہے۔ دیوانِ ولی کی آمد سے قبل شمالی ہند میں ریختہ گوئی کی جانب توجہ مبذول کی گئی۔ زبان کی تبدیلی کو ملحوظ رکھتے ہوئے فارسی گو شعرانے خال خال ریختہ میں طبع آزمائی کی۔ فطرت، بیدلؔ، قبولؔ، گلشنؔ، امیدؔ اور دیگر شعرا وغیرہ اس ضمن میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ آمدِ دیوانِ ولی کے بعد برصغیر میں ریختہ گوئی کی طرف باضابطگی سے توجہ دی گئی اور ساتھ ہی مغلوں کی زوال پذیری اردو کو فارسی کی جگہ دینے کا سبب ہوئی۔ اور اردو رابطے کی زبان کی حیثیت سے نمودار ہوئی۔ فائز، حاتم، آبرو، ناجی، مضمون، یک رنگ اور یک رو جیسے شعرانے بھی اردو زبان میں شاعری کی۔ زمانے کی قدروں کی تبدیلی نے زبان کو بھی تبدیل کر دیا تھا۔ عہد محمد شاہی کی تہذیب وتمدن، سیاسی وسماجی اور ادبی صورتحال کے پیشِ نظر ایہام گوئی کو فروغ ملا۔ لفظی صناعی کے معمار و ماہرین نے اسے تقویت بخشی۔ تکلفاتِ الفاظ، مضمون آفرینی اور الفاظ کی بازی گری کے ساتھ تلاشِ لفظ تازہ کا خیال رکھا گیا لیکن بازاری مضامین کو استوار کیا گیا اور صنعت ایہام پر توجہ صرف کی گئی جو ابتذال کی صورت اختیار کر گئی۔ اسی ایہام گوئی کے خلاف ردِعمل کے طور پر اصلاحِ زبان کی تحریک وجود میں آئی۔ اس تحریک جن شعرانے کارہائے نمایاں انجام دیئے، ذیل میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔

3.3.1 مظہر جان جاناں:

شمس الدین جان جاناں المتخلص بہ مظہرؔ کی ولادت رمضان المبارک 1699ء مطابق 1111ھ میں ہوئی اور وفات 1781ء مطابق دس محرم 1195ھ میں ہوئی۔ مرزا محمد رفیع سوداؔ نے تاریخ وفات کہی :

مرزا کا ہوا جو قاتل ایک مُرتدِ شوم
اور اُن کی ہوئی خبر شہادت کی عموم
تاریخ ازروئے درد یہ سُن کے کہی
سوداؔ نے کہ ہائے جانِ جاناں مظلوم
(1195ھ)

آپ کے والد میرزا جان، اورنگ زیب کے دربار میں منصب دار تھے اور والدہ بیجاپور کی شریف زادی۔ دادا جان بھی دربارشاہی سے منسلک رہے اور صاحب منصب تھے۔ اکبر شاہ کی دختر نیک اختر سے آپ کے پَر دادا کی شادی ہوئی۔ اس وجہ سے مظہرؔ، تیموری خاندان کے نواسے

ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ جب اورنگ زیب دکن میں مع فوج تھے تو مرزا جان کے گھر بیٹا تولد ہونے کی خبر سنی تو اس نے میرزا جان کے لڑکے کا نام ''جانِ جاناں'' رکھا۔ جان جاناں کے والد نے ان کا نام شمس الدین رکھا تھا، جو مشہور نہ ہوا۔

مظہر جانِ جاناں کو بچپن ہی سے صوفیائے کرام اور اہلِ دل سے وابستگی رہی۔ اسی لیے تیس برسوں تک مدرسوں اور خانقاہوں کی خاک چھانی۔ اکابر علما سے حدیث اور فقہ کی تعلیمات حاصل کیں۔ پھر تصوف کی جانب ملتفت ہوئے۔ علم و فضل کا یہ عالم تھا کہ ہر کس و ناکس نے ان سے استفادہ کیا۔ مظہرؔ عربی و فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے ساتھ ہی انہوں نے اردو میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کے تلامذہ میں متعدد مشاہیرِ علم و فن گزرے ہیں جن میں انعام اللہ خاں یقینؔ، درد مندؔ، خواجہ احسن اللہ خاں بیانؔ، میر محمد باقر حزیںؔ، بساون لال بیدارؔ حسرتؔ وغیرہ جیسے اساتذۂ کرام اہم ہیں۔

مظہر جانِ جاناں جہاں یادِ الٰہی میں غرق رہتے وہیں دنیاوی معاملات سے بھی کما حقہ واقفیت رکھتے۔ ان کی نازک خیالی نے ایہام گوئی کو قطعی قبولیت کا درجہ نہیں دیا اور اس کے ردِ عمل کو میں اصلاحِ زبان کو فروغ دیا۔ انہوں نے مغلوں کا زوال پذیر معاشرہ دیکھا تھا اس لیے ہندی کے بے جا اثرات سے قطع نظر فارسی کو قبول کیا، اور اصلاحِ زبان کا خاص خیال رکھا۔ انہوں نے اردو شاعری کو فطری اظہار کا درس دیا۔ مظہر کی شاعری درد و کیف سے لبریز ہے۔ خیال کی پاکیزگی اور زبان کی شستگی نے ان کی شاعری کو عروج اور اردو شاعری کو جلا بخشی ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیے :

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار

اس گل کو بھیجنا ہے مجھے خط صبا کے ہاتھ
اس واسطے لگا ہوں چمن میں ہوا کے ساتھ

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

اتنی فرصت دے کہ رخصت ہو لیں اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سائے میں تھے آباد ہم

کبھی اس دل نے آزادی نہ جانی
یہ بلبل تھا قفس کا آشیانی

ایک دم تھا سو وہ بھی نہ رہا مظہرؔ
جی گیا، جان گیا، دم بھی چلا یار کے ساتھ

لوگ کہتے ہیں مرگیا مظہرؔ
فی الحقیقت میں گھر گیا مظہرؔ

3.3.2 شاہ حاتمؔ:

شیخ ظہورالدین المتخلص بہ حاتمؔ کی ولادت 1111ھ مطابق 1699ء میں دہلی میں ہوئی اور ان کی وفات بھی دہلی ہی میں 1791ء یا 1792ء میں ہوئی۔ فن سپہ گری میں مہارت رکھنے کی وجہ سے یہی پیشہ اختیار کیا۔ ابتدائی عمر ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ نواب امیر خاں انجامؔ کی حکومت میں ملازم تھے۔ مشقِ سخن جاری رکھنے سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ جلد ہی اساتذہ کی فہرست میں شامل ہوئے۔ شاہ حاتمؔ کے اہم شاگردوں میں سوداؔ اور رنگینؔ کے نام نامی شامل ہیں۔ ابتداء میں ایہام گوئی کی طرف مائل تھے لیکن بعد میں جب اس صنعت کی گمراہیوں کا احساس ہوا تو ترک ایہام گوئی کی اور اصلاحِ زبان کو فروغ دیا۔ ساتھ ہی اپنے کلام کا انتخاب کیا اور ایک مختصر مجموعہ بعنوان ''دیوان زادہ'' مرتب کیا۔ شاہ حاتم نے اس مجموعہ پر ایک دیباچہ سپردِ قلم کیا اور زبان و شاعری سے متعلق اپنے خیالات و آرا سے روشناس کیا۔

شاہ حاتم کا ابتدائی تخلص ''رمز'' ہوا کرتا تھا۔ بعد میں حاتمؔ تخلص اختیار کیا۔ زبان اور شاعری سے کما حقہ واقفیت نے انہیں استادالعصر بنا دیا

اور دبستان دہلی کے بانی قرار دیے گئے، ساتھ ہی ''جگت استاد'' بھی کہلائے۔ انہوں نے صرف ونحو کے لحاظ سے اردو زبان کی اصلاح کی۔ صحتِ الفاظ اور صحیح تلفظ کی ادائیگی پر زور دیا۔ وہ جہاں ہندی کے ثقیل الفاظ سے احتراز کرنے کی تلقین کرتے رہے وہیں عربی و فارسی کے غیر مانوس الفاظ سے اجتناب کا درس بھی دیتے رہے۔ حاتم کی اصلاح زبان کا اولین اصول یہ تھا کہ عربی و فارسی کے قابلِ فہم الفاظ، جن کی ترسیل بہ آسانی ہو اور بہ کثرت مستعمل ہوں، اردو زبان میں عام کیے جانے چاہیے۔

شاہ حاتم چوں کہ استاد الاساتذہ تھے' اس لیے ان کا اسلوبِ نگارش دیگر شعرا سے منفرد و مختلف تھا۔ ساتھ ہی ان کا انداز دیگر ہمعصروں سے زیادہ نکھرا اور ستھرا تھا۔ ان کے اشعار کی بے ساختگی نے ایسا حسن پیدا کیا کہ دوسرے شعرا عش عش کر اٹھتے۔ اس لیے حاتم اپنے عہد کے دیگر شعرا سے ممتاز شمار کیے جاتے ہیں۔ شاہ حاتم نے ایک مسلسل نظم بعنوان ''قہوہ'' بفرمائش نواب عمدۃ الملک امیر خاں انجام تحریر کی۔ یہ نظم ''قہوہ'' کی تعریف میں ہے۔ شمالی ہند میں اس نظم کو اولیّت حاصل ہے۔

شاہ حاتم فصاحت اور زبان کی صفائی کو اہمیت دیتے تھے۔ ان کی شاعری میں روزمرہ اور فصاحت دوسروں کے مقابل زیادہ ہے۔ اشعار میں بے ساختگی و کیف و سرور موجزن ہے۔ تجربات زندگی و عاشقانہ سرمستی ان کی شاعری کے امتیازات ہیں۔ حاتم تقریباً تمام اصنافِ سخن پر قادر تھے۔ تاہم ان کی غزل کے چند اشعار یہاں پیشِ خدمت ہیں :

زندگی درد سر ہوئی حاتم　　کب ملے گا مجھے پیا میرا

ہجر کی زندگی سے موت بھلی　　کہ جہاں سب کہیں وصال ہوا

شبنم کی مثال روتے روتے　　اس باغ سے چشمِ تر گیا دل

کیا کعبہ و دیر کیا خرابات　　تو ہی تھا غرض جدھر گئے ہم

مثالِ بحر موجیں مارتا ہے　　لیا ہے جس نے اس جگ کا کنارا

ہے وہ چرخ مثال سرگرداں　　جس کو حاتم تلاش مال ہوا

ملک دل آباد کیوں کرتا ہے حاتم کا خراب　　اے مری بستی ! خوش آتی ہے تجھے ویرانگی

3.3.3 خواجہ میر درد:

خواجہ میر درد کی پیدائش 1721ء میں دہلی میں ہوئی۔ خواجہ میر ان کا نام اور تخلص درد تھا۔ موسیقی سے کافی لگاؤ تھا۔ درد کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ان کی مذہبیت و خدا شناسی ہے۔ 1785ء میں دہلی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ درد فقیرانہ زندگی گزارنا پسند کرتے تھے۔ ان کی زندگی کا

عکس ان کی شاعری میں بھی ملتا ہے۔ وہ ایک صوفی بزرگ تھے اوران کی شاعری میں حقیقی عشق ملتا ہے۔تصوف ان کی شاعری کا اہم موضوع رہا جس میں انہیں انفرادیت حاصل ہے۔ درد کی شاعری میں ایک قسم کا سکون پایا جاتا ہے۔ دردؔ کو نہ صرف موسیقی سے دلچسپی تھی بلکہ وہ خود موسیقی کے ماہر تھے۔ سادگی اور زبان و بیان کی دلکشی ان کے کلام میں نمایاں طور پر سے نظر آتی ہے۔ فارسی اور اردو دیوان کے علاوہ درد کی دیگر تصانیف بھی ملتی ہیں جن میں کتاب الصلوۃ، واردات، علم الکتاب، حرمت غنا وغیرہ شامل ہیں۔

خواجہ میر دردؔ نے تحریک اصلاح زبان کو تصوف کے آئینے میں دیکھا اور حرفِ دوئی (ایہام) کو مٹانے کے لیے خوش تر اور لطیف زبان فروغ دینے میں کی کوشش کی۔ دردؔ کی حیثیت ایک ایسے شاعر کی ہے جو شمعِ انجمن کی طرح ایک جگہ مسند آرا تھا لیکن اپنی روشنی دور تک بکھیر رہا تھا۔ ان کے یہاں لفظوں کے انتخاب میں شعوری کاوش نظر نہیں آتی بلکہ زیرِ لبی کی کیفیت نے زبان کو دردمندی، روانی اور نغمگی عطا کردی ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

وائے ناکامی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا — خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا — پر اسے آہ کچھ اثر نہ کیا

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا — تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

3.3.4 مرزا محمد رفیع سودا:

مرزا محمد رفیع سودا المتخلص بہ ''سوداؔ'' کی ولادت 1706ء میں ہوئی۔ آپ کے والدِ محترم مرزا محمد شفیع دہلی کے ایک تاجر تھے، جنکا تعلق کابل سے تھا۔ وہ بغرض تجارت کابل سے ہندوستان تشریف لائے۔ انہوں نے دنیائے تجارت میں خوب نام کمایا۔ اور نعمت خان عالی کی دختر نیک اختر سے ان کا رشتۂ ازدواج منسلک ہوا۔ اور سوداؔ کی پیدائش ہوئی۔ سوداؔ کی ابتدائی تعلیم دہلی میں ہوئی۔ ابتدائے عمر میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ والد کی دولت ترکہ میں ہاتھ آئی۔ جب یہ دولت ختم ہوگئی تو تلاشِ معاش میں سرگرداں رہے اور فوج میں سپاہی ہوئے مگر طبیعت اس ملازمت پر مائل نہیں ہوئی اور جلد ہی فوج کی ملازمت سے دستبردار ہوئے۔ ان کا آبائی پیشہ سوداگری تھا لیکن بقول سوداؔ :

سوداگری کیجیے تو ہے اس میں یہ مشقت
دکن میں بکے وہ جو خریدِ صفہاں ہے

مرزا محمد رفیع سوداؔ کو ابتدائی زمانے ہی سے شاعری سے شغف تھا۔ اسی لیے طبیعت کی موزونیت نے اس طرف متوجہ کیا۔ مشقِ سخن کا آغاز تقریباً 39-1738ء کے درمیان ہوا اور شاہ حاتمؔ جیسے قابل قدر استاد کے آگے شرفِ تلمذ تہہ کیا۔ ابتداء میں سوداؔ نے فارسی میں شاعری کی اور اس میں انہوں نے کمال حاصل کرلیا۔ جب بعد میں اردو شاعری کی جانب متوجہ ہوئے تو یہاں بھی انہوں نے خود کو ثابت کیا اور اپنے وقت کے ایک بڑے استاد شاعر بن کر ابھرے۔ بادشاہ شاہ عالم نے سوداؔ سے اصلاح لینا شروع کیا لیکن یہ سلسلہ دہلی کی تباہی کے بعد منقطع ہوگیا اور وہ دہلی سے فرخ آباد منتقل ہوئے جہاں مہرباں خاں کی مہربانی انہیں راس آئی اور تقریباً سترہ اٹھارہ برس تک یہیں بڑی آسودگی سے زندگی گزاری۔ فرخ آباد سے فیض

آباد تشریف لائے اور یہاں شجاع الدولہ کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ان کے انتقال کے بعد نواب آصف الدولہ کے ساتھ دارالسلطنت لکھنؤ منتقل ہوئے اور تادم حیات یہیں رہے۔ 1781ء مطابق 1195ھ میں جب انکا انتقال ہوا تو ان کے استاد شاہ حاتم بقیدِ حیات تھے،انہوں نے جب سوؔدا کی وفات کی خبر سنی تو برجستہ کہا:

''افسوس ہمارا پہلوان سخن مر گیا''

مرزا محمد رفیع سوؔدا نے شاعری میں وہ کمالات دکھائے ہیں کہ استاد شاہ حاتم نے انہیں ''پہلوانِ سخن'' قرار دیا۔انہوں نے تقریباً ہر صنفِ شاعری میں طبع آزمائی کی ،لیکن غزل' قصیدہ اور بالخصوص ہجو میں ان کا کمال قابلِ قدر ہے۔سوؔدا نے الفاظ' بندشیں اور استعارے خوب خوب اپنی شاعری میں پیش کیے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب زبان خود کی تلاش میں سرگرداں تھی۔نت نئے الفاظ کا وضع ہونا،استعارات کا برمحل استعمال،شوکتِ الفاظ کی خوش نمائی،قدرت کلام کا اظہار، جوشِ بیان کی شدّت وغیرہ نے سوؔدا کو اصلاحِ زبان کا اہم علمبردار بنا دیا۔ان کی زبان دانی کے قائل کلیم الدین احمد بھی ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ :

''......اگر معیار محض لفظی رہے تو سوؔدا کی جگہ بہت بلند ہوگی.......''

سوؔدا کے عہد میں شعرا زورِ بیان پر زیادہ توجہ کرتے تھے۔ بندشوں اور تراکیب پر ساری قوت صرف کرتے۔سوؔدا ان تمام شعرا میں نمایاں رہے' جنھوں نے تراکیبِ الفاظ' بندشِ الفاظ' زورِ بیانِ الفاظ' علامات' اشارات' اور استعارات وضع کیے اور اس فن میں کمال حاصل کیا۔بقول محمد حسین آزاد:

''ان کے (سوؔدا) کلام کا زورشور انورؔی اور خاقانی کو دباتا ہے

اور نزاکت مضمون میں عرفؔی و نظیرؔی کو شرماتا ہے۔''

مولانا حسرت موہانی نے سوؔدا کو اردو قصائد کا موجد کہا۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام نے سوؔدا کے قصائد کی خوب تعریف کی ہے۔سودا کی شاعری کی اہم خصوصیات یہ ہیں:

- ☆ مشکل ترین زمین میں نشستِ الفاظ کی دل آویزی
- ☆ متانت' زورِ الفاظ' پختگی اظہار اور شوکتِ الفاظ کا برمحل اور معروضی استعمال۔
- ☆ استعارات وتشبیہات واشارات وعلامات کی تجدید۔
- ☆ الفاظ پر حاکمانہ قدرت

شاہ حاتؔم کے بعد اصلاحِ زبان کو سودا نے فروغ دیا ہے۔فارسی افعال وتراکیب کے اردو تراجم پیش کیے۔فارسی تراکیب وتشبیہات کو اردو میں رائج کیا اور اردو کے سرمایۂ الفاظ کو سرمایۂ افتخار بنایا۔مثلاً سرِ زخمِ دل' مرغِ قبلۂ خانہ براندازِ چمن' خفتگانِ خاک' نالۂ شب گیر' صیادِ گل اندام' چشم پر آب' گوشۂ ابرو اور طبع ناہنجار وغیرہ۔

سوؔدا کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے :

موج نسیم آج ہے آلودہ گرد سے
دل خاک ہو گیا ہے کسی بے قرار کا

گرمی کسو طرح نہیں بازارِ عشق میں
سوؔدا متاعِ دل کے تئیں آگ دیجیے

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوؔدا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

بہار بے سپرِ جامِ یار گزرے ہے
نسیم تیری چھاتی کے پار گزرے ہے

اے ساکنان کنج قفس صبح کو صبا!
سنتے ہیں جائے گی سوئے گلزار کچھ کہو

قاصد اشک آکے خبر کر گیا
قتل کوئی دل کا نگر کر گیا

ظالم نہ میں کہا تھا کہ اس خوں سے درگزر
سوؔدا کا قتل ہے' یہ چھپایا نہ جائے گا

داماں و داغِ تیغ کو دھویا تو کیا ہوا
عالم کے دل سے داغ دھلایا نہ جائے گا

گلہ لکھوں میں اگر تیری بے وفائی کا
لہو میں غرق سفینہ ہو آشنائی کا

دیکھوں نہ کبھی گل کو ترے منہ کے میں ہوتے
سُنبل کے سوا زلف تری بو نہ کروں میں

3.3.5 میر تقی میرؔ:

محمد تقی المتخلص بہ میرؔ 1722ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے اور وفات 1810ء میں بمقام لکھنؤ ہوئی۔ میرؔ کے آباو اجداد ارضِ حجاز سے ہندوستان وارد ہوئے تھے۔ آپ کے والد محترم میر متقی درویش صفت انسان تھے۔ اس لیے لفظ عشق سے خاص رغبت رہی۔ صوفیوں کے درمیان یہ بات مانی جاتی ہے کہ عشق حقیقی تک رسائی کے لیے عشق مجازی سے گزرنا پڑتا ہے۔ اللہ کے بندوں سے عشق کیے بغیر اللہ سے عشق ناممکنات میں سے ہے۔ میرؔ کی تربیت اسی نہج پہ ہوئی، اس لیے میرؔ کی داخلی کیفیات ان کی شاعری میں اجاگر ہوتی ہیں۔ ان کی شاعری نے دنیا کو بچشم نم پر دیکھا ہے۔ میر کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف میں ناقدینِ اردو ادب نے انہیں ''خدائے سخن'' کہا ہے۔ انہوں نے تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ میرؔ کے شعری کمالات غزلوں اور مثنویوں میں موجزن ہیں۔ میرؔ کی عظمت کا اعتراف مرزا غالبؔ نے یوں کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

میرؔ کی شاعری میں ان کا اسلوب' ان کا انداز اور ان کا لہجہ قابلِ توجہ ہے۔ اور اسے پیش کرنے کے لیے میرؔ نے بندشِ الفاظ' ترتیبِ الفاظ' ترکیبِ الفاظ اور شوکتِ الفاظ کو برتنے کی سعی کی ہے۔ ان کی شاعری میں کیفیاتِ حسن وعشق کی چاشنی ملتی ہے۔ ندرتِ بیان اور اسلوبِ نگارش کی انفرادیت نے میرؔ کی شاعری کو اعتبار بخشا ہے۔ اظہار پر انہیں قدرت ہے۔ تخیل کی بلندی ان کی شاعری کو بلند و بالا کرتی ہے۔ انہوں نے عام اور پیش پا افتادہ موضوعات سے بیشتر احتراز کیا ہے۔ ان کی زبان میں سلاست و روانی کی موجیں لہراتی ہیں۔ سادگئ زبان ان کی شاعری کا ہنر ہے۔ محاورات اور روزمرہ کی زبان کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے اور اسے بامِ عروج تک پہنچا دیا ہے۔ ان کے خاص محاورات و مصطلحات نے میرؔ کی میریت کو جلا بخشی۔

میر تقی میرؔ نے اصلاح زبان کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے ذوقِ اعلیٰ کی ترجمانی کی ہے۔ میرؔ کا دعویٰ تھا کہ ان کا کلام کوئی شخص اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ وہ دلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بولی جانے والی زبان سے کما حقہ واقفیت حاصل نہ کر لے۔ ساتھ ہی انہوں نے زبان کی ہیئت کو اس کی داخلی کیفیات سے روشناس کرایا ہے۔ تاکہ زبان کی داخلی روح اجاگر ہو سکے۔ اردو میں فارسی حروف' افعال اور غیر مانوس تراکیب و بندشِ الفاظ کے استعمال کو نامناسب قرار دیا گیا ہے۔ باوجود ان باتوں کے فارسی کی ان تراکیب کو قابلِ قبول سمجھا جو اردو کے لیے مانوس ہوں۔ مثال کے طور پر سخن مشتاق' قادرِ سخن' خاک افتادہ' عاجز سخن' دلِ غفراں پناہ' شوق کشتہ' صحرا صحرا وحشت' جہاں در جہاں غفلت اور یک بیابان وغیرہ۔ انور سدید میرؔ کی اصلاح زبان سے متعلق رقمطراز ہیں :

''میرؔ کی زبان نے اردو گرامر کو بھی متاثر کیا ہے۔ چناں چہ انہوں نے سیر' جراحت' جان' سطح اور خلش وغیرہ کو مذکر اور خواب' گلزار' حشر' مزار وغیرہ کو مؤنث باندھا۔ ندا کی حالت میں الفاظ کی جمع فارسی طریق کے مطابق لائی گئی۔ چناں چہ بتاں' ہم صفیراں' بلبلاں' آوارگاں' موزوں طبعاں وغیرہ بیسیوں الفاظ میرؔ کے رنگِ خاص کے غماز ہیں۔ اسی طرح جمع مؤنث میں الف اور نون کے لاحقے کام میں لائے گئے اور افعال اور صفات کو بھی یوں جمع بنالیا۔ بے وفائیاں' کج ادائیاں' زلفیں دکھائیاں' باتیں نہ مانیاں وغیرہ میرؔ کی زبان میں مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان سے حرفِ اضافت بھی حذف کر دیا جاتا ہے۔

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنہیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی گر خدا ہوتے

میرؔ کا یہ تصرف اس کے تخلیقی مزاج کا حصہ ہے اور اس رنگِ خاص سے عبارت ہے جسے ڈاکٹر سید عبداللہ نے رنگِ میرؔ کا عنوان دیا ہے۔''

میر تقی میرؔ اردو کے مسلم الثبوت استاد ہیں۔ انہوں نے تغزل کو بڑی ہنرمندی اور خوش اسلوبی سے اجاگر کیا ہے' جو میرؔ کی انفرادیت بھی ہے۔ بقول امام امداد امام اثر' میرؔ کی شاعری میں سوز و گداز' خستگی' نشتریت' رنگینی' ملاحت' شیرینی اور شوخی وغیرہ کی کیفیات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ میر

کے چنداشعار ملاحظہ فرمائیے :

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختہ کے　　بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا　　بہت عالم کرے گا غم ہمارا

کہا میں نے گل کو ہے کتنا ثبات　　کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

پھر زلف ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی　　شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام　　آفاق کی اس کار گہہِ شیشہ گری کا

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ　　مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

گلی میں اس کی گیا سو گیا نہ بولا پھر　　میں میرؔ میرؔ کر اس کو پکار رہا

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں　　تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

رات ساری تو کٹی سنتے پریشاں گوئی　　میری کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگِ گل سے میرؔ　　بلبل پکاری دیکھ کے صاحب ! پرے !! پرے !!

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے　　یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

ناحق ہم مجبوروں پہ یہ تہمت ہے مختاری کی　　چاہے ہیں سو آپ کریں ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کردیا مجھ کو　　وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے

3.3.6 شیخ قیام الدین علی قائمؔ:

شیخ قیام الدین المتخلص بہ قائمؔ کی ولادت 1723ء اور 1726ء کے درمیان چاند پور ضلع بجنور میں ہوئی اور بچپن ہی میں دہلی تشریف لے آئے تھے۔ دہلی کی تباہیوں نے شعرا کو ہجرت کرنے پر مجبور کیا تو قائمؔ بھی ہجرت پر آمادہ ہوئے۔ آخری ایامِ عمر رام پور میں گزارے اور وہیں 70 سال کی عمر میں 94-1793ء میں انتقال فرمایا۔ قائم زندہ دل، بذلہ سنج، ذہین اور خوش طبع انسان تھے۔ انہوں نے رام پور میں ایک ''دبستانِ شعر'' کا قیام عمل میں لایا۔

قیام دہلی کے زمانے میں قائمؔ نے یہاں کے ماحولِ شعر و سخن میں خود کو آراستہ کر لیا تھا۔ خان آرزو، میرزا مظہر اور شاہ حاتم جیسے مسلم الثبوت اساتذہ کی نگرانی میں خود کو باکمال بنایا۔ کم عرصے ہی میں وہ میدانِ سخن کے شہ سوار ہوئے اور اساتذہ کی صف میں شمار کیے جانے لگے۔

قائمؔ کی شاعری کی انفرادیت اور بنیادی خصوصیات کئی ہیں جن میں بہ اعتبار تعدادِ اشعار علامتی پیرائے زیادہ سے زیادہ ان کی شاعری میں مستعمل ہوئے۔ گویا یہ کہ ان کی شاعری کے امکانات روشن اور وسیع ہیں۔ قائمؔ نے چوں کہ آرزو، مظہر اور حاتم جیسے اساتذہ سے فیوض حاصل کیے تھے، ان سے ہی متاثر ہو کر اصلاحِ زبان کی خاطر خواہ کوششیں کیں۔ عربی و فارسی پہ عبور ہونے کے باوجود اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے ان زبانوں سے استفادہ بھی کیا اور ضرورتاً اجتناب بھی برتا، ساتھ ہی سلیس، سادہ، عام فہم لفظیات کا استعمال بھی کیا۔ انہوں نے تبدیل شدہ زبان کو فروغ دیا، ساتھ ہی نئے شعری اسالیب وضع کیے۔ مختصر یہ کہ قائم اپنے وقت کا جدید ترین شاعر ہی نہیں ہے بلکہ بقول قدرت اللہ شوقؔ، قائم بسیار آدم بامزہ و اہلِ درد، متواضع، خلیق، نہایت پرگو و خوش مقال و در فنونِ سخن وری باکمال ہیں۔ قائمؔ پُر اعتماد ہو کر اپنے اسلوب کا ذکر یوں کرتے ہیں:

میرا سا لب و لہجہ کہاں مرغ چمن میں
گل کتروں ہوں سو رنگ سے میں طرزِ سخن میں

قائمؔ نے فنِ شاعری کو اعتبار و وقار بخشا۔ انہوں نے تقریباً ہر صنفِ شاعری میں طبع آزمائی کی۔ غزل کے سخن داں ہیں، قصیدہ میں معتبر ہیں، مثنوی میں تمثیل و بیانیہ لاجواب ہے، قطعہ و رباعی میں بھی فرد ہیں، معنی کی گہرائی و وسعت وقوتِ شعری میں اپنے عہد کے ممتاز شعرا میں باکمال متصور کیے جاتے ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ کیجیے:

مانعِ گریہ کس کی خو ہے کہ آج
آنسوؤں سے بہا نہیں جاتا

قائمؔ یہ جی میں ہے کہ تقیّد سے شیخ کی
اب کی جو میں نماز کروں بے وضو کروں

سب ہی بندے تو خدا کے ہیں پر اتنا ہے فرق
تو گرفتارِ تعیّن ہے ہم آزاد ہیں شیخ

لے گیا خاک میں ہمراہ دل اپنا قائمؔ
شاید اس جنس کا یاں کوئی خریدار نہ تھا

نامہ بر مل رہا ہے غیر کے ساتھ
خط میں کچھ اصطلاح کیجیے گا

دردِ دل کچھ کہا نہیں جاتا
آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

قائمؔ میں ریختہ کو دیا خلعتِ قبول
ورنہ یہ پیش اہلِ ہنر کیا کمال تھا

ہے تو تو فنِ سخن بیچ مسلّم قائمؔ
معتقد گو نہ کوئی ہو تری استادی کا

ٹک اے مُرغِ چمن رکھ گوش ایدھر کو تو ہر ساعت
میں کیا کیا طرز نو اس کام میں ایجاد کرتا ہوں

3.3.7 انعام اللہ خاں یقیںؔ:

انعام اللہ خاں المتخلص بہ یقین کی ولادت 1727ء میں دہلی میں ہوئی اور ان کی وفات بہت قلیل عمر میں 1755ء میں دہلی ہی میں ہوئی۔ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے یقیںؔ کی وفات پر اپنی کتاب ''تذکرہ چمنستان شعرا'' میں قطعہ تاریخ تحریر کی ہے:

شاعر نازک سخن و خوش خیال
کرد سفر جانب ملک عدم
سال وصالش خرد نکتہ سنج
گفت یقیںؔ رفت بسوئے ارم

1169ھ

یقیںؔ کے والد محمد اظہر الدین خاں بڑے منصب دار تھے۔ وہ خاں بہادر، مبارز جنگ اور مبارک جنگ بہادر جیسے اعلیٰ خطابات سے بھی نوازے گئے۔ ان کی والدہ عالمگیری سردار نواب حمید الدین خاں نیمچہ کی دختر تھیں۔ یقین کا سلسلۂ ونسب حضرت مجدد الف ثانیؒ سے ہوتے ہوئے حضرت عمر فاروقؓ سے جاملتا ہے۔

انعام اللہ خاں یقیںؔ اردو زبان کے اعلیٰ شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ عربی و فارسی پر عبور تھا۔ اوائل عمری ہی سے شعر فہمی کا ذوق تھا اسی لیے شعر گوئی کی جانب مائل ہوئے۔ شاہ حاتم جیسے استاد شاعر نے بھی یقیںؔ کی زمین میں غزل تحریر کی اور یہ زمانہ غالباً 1739ء کا ہوگا۔ اس ضمن میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یقین کی شاعری صرف تیرہ برس کی عمر میں کتنی قابلِ تقلید تھی۔ یقیںؔ، میرزا مظہر جان جاناں کی شاگردی پر فخریہ اظہار یوں کرتے نظر آتے ہیں:

جوں نماز اپنے پہ صبح و شام لازم کر یقیںؔ
حضرت استاد یعنی شاہ مظہرؔ کی ثنا

مظہر جان جاناں جیسے استاد نے جس طرح سے ایہام گوئی کو رد کیا اور اصلاح زبان کو فروغ دیا اس طرح سے یقیںؔ نے بھی اصلاح زبان کی کوشش کی۔ فن شعر سے وہ کما حقہ واقفیت رکھتے تھے۔ مضمون آفرینی ان کی شاعری کا حسن ہے۔ ان کے رنگین مضامین پر دیگر شعرا رشک کرتے اور ان کے تازہ معانی و خوش آئند کلام کو مظہر جان جاناں سے منسوب کرتے۔ یقیںؔ نے صنعتِ تلمیح کے لیے شیریں فرہاد، یوسف وزلیخا اور موسیٰ و کوہ طور وغیرہ کو شعری پیکر عطا کیا۔ صنعتِ تشبیہ، لف ونشر اور مراعاۃ النظیر وغیرہ کو اپنی شاعری میں بحسن وخوبی جگہ دی۔ زبان فارسی کا استعمال برمحل کیا ہے اور فارسی محاوروں سے استفادہ بہ کثرت کیا ہے۔ یقیںؔ کے شعری لب ولہجہ سے ان کے معاصرین بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان میں سوؔدا، دردؔ، تاباں، بیان، حزیں اور میرؔ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ جب کہ حاتمؔ جیسے استاد بھی اس کے معترف ہیں۔

انعام اللہ خاں یقیںؔ کے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ کیجیے:

یہ کوہِ طور سرمہ ہوگیا سارا ہی کیا کہیے
کوئی پتھر بھی بچ جاتا تو دیوانے کے کام آتا

خدا کی بندگی کہیے اسے یا عشقِ معشوقی
یہ نسبت ایک ہے سو سو طرح تعبیر کرتے ہیں

تو نہ تھا حیف، یقیںؔ ورنہ دِوانہ ہوتا
آج اس طرح کا دیکھا ہے پری زاد کہ بس

آگ بھی بجھتی ہے اور سورج بھی ہوتا ہے غروب	رات دن جلتا ہے یکساں داغِ حسرت کا چراغ
یہ بیمار آپ مر جاتا جو جیتا ، ان کے کام آتا	یقیں کو مارکر زور آوروں کے ہاتھ کیا آیا

3.3.8 محمد فقیہ دردمند:

محمد فقیہ المتخلص بہ دردمند اصلاح زبان کے اہم شعرا میں سے ایک ہیں۔ مظہر جان جاناں کے شاگرد رشید تھے۔ دردمند کی تاریخ ولادت ہنوز تحقیق طلب ہے۔ ویسے ان کا تعلق اودگیر (مہاراشٹرا) سے ہے۔ 1136ھ مطابق 1723ء میں اپنے والد محترم کے ہمراہ کم سنی میں شاہ جہاں آباد تشریف لائے، وہیں حضرت شاہ ولی اللہ کی صحبتوں سے فیض حاصل کیا۔ قلیل عرصے میں والد کی وفات نے دردمند کو درد سے لبریز کر دیا اور مظہر جان جاناں نے اپنے سایۂ عافیت سے مالا مال کر دیا۔ میرزا مظہر نے دردمند کی تربیت بڑے سلیقے سے کی اور انہیں مجموعۂ کمالات سے آراستہ و پیراستہ کیا۔ وہ خود فرماتے ہیں :

مظہر مباش غافل از احوالِ درد مند

لعلیست اینکہ در گرہ روزگار نیست

دردمند کو فارسی زبان پر عبور تھا۔ ان کی فارسی شاعری پایۂ کمال کو پہنچی۔ اردو میں انہوں نے کم کم ہی تحریر کیا ہے۔ تاہم جتنا تحریر کیا ہے وہ قابلِ داد و تقلید ہے۔ مثال کے طور پر اردو زبان میں ان کا ''ساقی نامہ'' بہت مشہور ہوا۔ زبان و بیان کا یہ عالم کہ استاد مظہر جان جاناں خود ان کی عظمت کے قائل رہے۔ ان کی قادرالکلامی بلا کی ہے۔ دردمند شاہ جہاں آباد سے عظیم آباد تشریف لائے اور کچھ دنوں کے بعد دلی واپسی ہوئی۔ آخری عمر مرشدآباد میں گزاری اور بقول میرزا علی لطف (گلشن ہند) 1176ھ میں وفات پائی۔

دردمند چوں کہ دلی کی عام بول چال سے کماحقہ واقفیت رکھتے تھے، اس لیے ان کی شاعری میں اس کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس ضمن میں ''ساقی نامہ'' کے چند اشعار پیش خدمت ہیں جو قاری کو اپنی جانب متوجہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے :

چمن میں بھرا ہے نشہ یاں تلک	کہ جاتی ہے نرگس کی گردن ڈھلک
تجھے جام کی چشم تر کی قسم	تجھے اپنے پنہاں نظر کی قسم
ادا سے لہکنے کی تجھ کو قسم	نشہ سے بہکنے کی تجھ کو قسم
نہ یہ مے نہ یہ باغ رہ جائے گا	نہ ملنے کا یہ داغ رہ جائے گا

3.3.9 احسن اللہ خاں بیان:

احسن اللہ خاں المتخلص بہ ''بیاں'' کی ولادت 1727ء میں آگرہ میں ہوئی اور پرورش و پرداخت دلی میں۔ بیاں کے آباواجداد کشمیری تھے جنہوں نے آگرے سے ہوکر دلی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ بیاں کی تعلیم و تربیت شاہ فخرالدین دہلوی کی مریدی میں ہوئی ساتھ ہی شاعری میں مظہر جان جاناں کے شاگرد ہوئے۔ بیاں مظہر کی شاگردی کا فخریہ اقرار یوں کرتے ہیں :

جب سے شاگرد ہوا حضرتِ مظہر کا بیاں

کیا شاگردی کا اقرار سب استادوں نے

مظہر جان جاناں نے اپنے شاگردوں کی ذہنی وفنی آبیاری بڑی سلیقگی سے کی ہے۔ بیاںؔ ان کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔۔ بیاںؔ چوں کہ پیرومرشد سے قریب رہے،اس لیے اپنی شاعری میں ان کی بزرگی وعقیدت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔وہ فرماتے ہیں :

تجھ کو کس نام سے اے فخر مرے یاد کروں
باپ ہے ، پیر ہے ، مرشد ہے ، خدا ہے ، کیا ہے

مظہؔر کے شاگرد ہونے کی وجہ سے فن شاعری پر انہوں نے عبور حاصل کرلیا تھا۔اس لیے اصلاح زبان کی کوشش کی۔ان کی شاعری میں جہاں عربی وفارسی کے الفاظ درآئے ہیں وہیں بول چال کی عام زبان اور لہجے کو فروغ ملا ہے۔ان کی زبان وبیان،فصاحت وبلاغت،ندرت وشیرینی اورفہم وفراست غضب کی رہی ہے۔مختصر یہ کہ بیاںؔ ایک خوش فکر شاعر ہیں،جن کی شاعری میں زندگی انگڑائیاں لیتی نظر آتی ہے۔آخری وقت میں بیاںؔ حیدرآباد تشریف لے گئے اور وہیں مشقِ سخن جاری رکھی۔انہوں نے غزل،مثنوی،مسدس،مخمس،قصیدہ،نعت،منقبت اور دیگر تمام اصنافِ شاعری پر طبع آزمائی کی۔بیاںؔ کی وفات 1213ھ مطابق 1798ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔بیاںؔ کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے :

مجالِ حرف وہ آئینہ رو مجھ کو اگر دیتا — تو رہتیں طوطیاں خاموش، ایسی گفتگو کرتا
بیاںؔ محفل بہ محفل ڈھونڈتا تھا جس کو کاش! اس کی — میں اپنے دل کی خلوت گاہ ہی میں جستجو کرتا
ہر چند تیرے عشق میں رسوا ہوا بیاںؔ — لیکن تجھے تو شہرۂ آفاق کردیا
جو زمیں پر فراغ رکھتے ہیں — آسماں پر دماغ رکھتے ہیں

3.3.10 میر محمد حیات حسرتؔ:

میر محمد حیات المتخلص بہ حسرتؔ کی ولادت عظیم آباد میں ہوئی۔حسرت کا لقب ''ہیبت قلی خاں'' تھا۔وہ نواب علی وردی خاں کے نواسے نواب شوکت جنگ کی خدمت میں رہے اور مرشدآباد تشریف لائے۔1756ء میں نواب علی وردی خاں کا انتقال ہوا۔ان کے انتقال کے بعد تخت نشینی کے لیے دونوں نواسوں نواب شوکت جنگ اور نواب سراج الدولہ میں جنگ ہوئی۔شوکت جنگ کو شکست ہوئی اور جنگ میں ہلاک ہوئے۔ نواب سراج الدولہ کی حکومت میں حسرت نے داروغہ اور عرض بیگی کی ملازمت اختیار کی۔1757ء میں پلاسی کی جنگ کے بعد بھی انھوں نے مرشد آباد کو خیرباد نہیں کہا۔اور یہیں کے ہوکر رہے۔نواب ببرعلی خان کے عہد نظامت میں 1210ھ مطابق 1795ء میں وفات پائی اور مرشد آباد ہی میں مدفون ہوئے۔

حسرتؔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کرتے اور میرزا مظہر جان جاناں سے اصلاح لیتے۔آپ کا دیوان بہ شکلِ مخطوطہ رام پور رضا لائبریری میں محفوظ ہے، جو تقریباً دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔حسرتؔ کی طبیعت میں شوخی تھی۔بذلہ سنجی،لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی میں یدطولی حاصل تھا۔حسرت نے مظہؔر کی صحبت سے خوب خوب استفادہ کیا ہے،اس لیے اصلاح زبان سے قریب تر رہے۔انہوں نے بھی اصلاح زبان کی خاطر خواہ کوششیں کیں۔

ہیبت قلی خاں حسرت کی شاعری ان کے معاصرین شعرا کے مقابلے زیادہ پاک وصاف ہے۔انہوں نے مختلف اصنافِ شاعری پر طبع آزمائی کی۔ایک رباعی اور غزل کے چند اشعار بطورِ نمونہ پیشِ خدمت ہیں :

زاہد جو نہیں ہے میرے دل سے آگاہ
کہتا ہے کہ ''کافر ہے تو اے روئے سیاہ''
ہوں جس کی پرستش میں کہوں کیا یارو
آتا ہے وہ بت ، دیکھو اللہ ! اللہ !

کلفت ایام سے حسرتؔ یہاں عمر میں کیا خاک بسر کر گیا
تمہیں خدا کی سوں اے جان لو ہوا سو ہوا بھلا دو غصّے کو آؤ چلو ہوا سو ہوا
چھپاؤں اشکِ گلگوں کس طرح ہائے گریباں ہو رہا ہے جابجا سرخ

3.3.11 میر محمد باقر حزیںؔ:

میر محمد باقر المتخلص بہ حزیںؔ کا تعلق عظیم آباد سے رہا ہے۔ آپ کے والد فخر اللہ خاں تھے۔ ان کی شہادت کے بعد وہ دہلی کوچ کر گئے۔ کلیم الدین احمد کے مرتب کردہ ''تذکرۂ شورش'' کے مطابق جب دہلی میں نادر شاہ کا حملہ ہوا تو وہ دوبارہ عظیم آباد آ گئے۔ اور جب یہاں کی حالت بھی ناگفتہ بہ ہوگئی تو بقول میر تقی میرؔ (نکات الشعرا) انہوں نے سرزمین بنگال کا رُخ کیا۔ کلیم الدین احمد کی تحقیق (تذکرۂ عشقی) کے مطابق حزیںؔ کا انتقال مرشد آباد میں ہوا۔ اور سن وفات 1752ء بتایا جاتا ہے۔

حزیںؔ کو شاعری کا شوق اوائلِ عمری ہی سے تھا۔ لیکن جب وہ دہلی آئے تو انہیں ایک قابل قدر استاد ملا جن کا نام میرزا مظہر جان جاناں ہے۔ انہوں نے حزیںؔ کی فکری وفنی آبیاری کی اور اس لائق بنا دیا کہ وہ خود ہی فائق ہوگئے۔ حزیں نے بنگال آنے کے بعد اپنا ایک اور تخلص ''ظہورؔ'' رکھا۔ قیام دہلی کے دوران انہوں نے زبان وبیان پر اتنی قدرت حاصل کر لی تھی کہ ان کا شمار نئی شاعری کے علم برداروں میں ہونے لگی۔ انہوں نے دو دواوین ترتیب دیے۔

حزیںؔ کو اپنے استاد مظہر جان جاناں سے والہانہ شفقت اور خاص عقیدت تھی، جس کا اظہار انہوں نے یوں کیا ہے :

جس طرح جی چاہتا ہے ہو نہیں سکتی حزیںؔ
حضرتِ اوستاد یعنی شاہ مظہرؔ کی ثنا

اے حزیں شکر کہ ہے مصحف ارباب جنوں
فیض سے حضرت مظہر کے یہ دیواں میرا

حزیںؔ کا ایک اہم کارنامہ اردو زبان وادب کی ترویج وتشکیل ہے۔ یہ ہنر انہوں نے اپنے استاد مظہر جان جاناں سے سیکھا تھا۔ اسی لیے ایہام سے دور دور تک ان کا کوئی واسطہ نہیں رہا اور اصلاح زبان کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ گویا انہوں نے اصلاح زبان کی تحریک کو آگے بڑھایا۔ انکی شاعری کی زبان، ان کا بیان جذبات واحساسات سے لبریز ہے۔ انہوں نے شاعری کی طرح کے رنگ وآہنگ سے آراستہ وپیراستہ کیا ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ کیجیے :

غم نے آباد کیا خانۂ ویراں میرا
ابر مژگاں سے ہوا سبز بیاباں میرا

لطف سے سرسبز کر اپنے ، محبت کا چمن
خشک رہتا ہے وفا بن جان الفت کا چمن

مل کے میں اُن گل رخوں سے حظ اٹھاتا ہوں حزیںؔ
سیر کرتا ہوں خدا کی دیکھ قدرت کا چمن

وہ نگاہ مست ہے اس چشم گریاں کا علاج
مے سے ہوتا ہے خمار مے پرستاں کا علاج

کچھ کٹے وصل میں کچھ ہجر میں گریاں گزرے
ہائے مری عمر کے اوقات پریشاں گزرے

میں چاہتا ہوں عشق چھپاؤں پہ کیا کروں
رسوا کرے ہے خلق میں یہ چشمِ تر مجھے

3.3.12 میر عبدالحئی تاباںؔ:

میر عبدالحئی المتخلص بہ ''تاباںؔ'' کی ولادت تقریباً 1130ھ اور 1135ھ کے درمیان دہلی میں ہوئی۔ میر حسن کے مطابق تاباںؔ عہدِ محمد شاہی میں مشہور و معروف تھے۔ میر تقی میرؔ نے اپنے ''تذکرہ نکات الشعرا'' جو 1165ھ میں مکمل ہوا، نوعمر تاباںؔ کی وفات کا ذکر کیا ہے، جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تاباںؔ نے تقریباً پچیس تیس برس کی قلیل عمر پائی اور 1160ھ اور 1165ھ کے درمیان وفات پائی۔ تاباںؔ کا سلسلۂ نسب حضرت موسیٰ رضا سے جاملتا ہے۔ یعنی وہ نجیب الطرفین سید تھے۔ وہ جامہ زیب شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا حسن و جمال ایسا تھا کہ لوگ انہیں ''یوسف ثانی'' کہتے۔ ان کا تخلص ''تاباںؔ'' اسم بامسمّٰی تھا کیوں کہ جب وہ سیاہ لباس زیب تن کرتے تو ان کی تابانی جلوہ نما ہوتی۔ وہ خوش گفتار بھی واقع ہوئے اور طبیعت میں موزینت بلا کی پائی تھی، اس لیے دہلی کی تمام محفلوں، مجلسوں، نشستوں، مشاعروں اور دیگر ادبی پروگراموں کی جان تھے۔

تاباںؔ، حاتمؔ کے شاگرد ہوئے اور میرزا محمد علی حشمت سے بھی اصلاح سخن حاصل کر چکے تھے۔ حشمتؔ کی شاگردی کا اعتراف تاباںؔ یوں کرتے ہیں :

سخن کے بحر میں آگے مری کشتی تباہی تھی
کنارے آ لگی جب سے ہوا تو ناخدا حشمتؔ

ابتدائی استاد حشمتؔ کی شہادت کے بعد انہوں نے شاہ حاتمؔ کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا، جن کی استادی کا ذکر اپنی شاعری میں اکثر کیا ہے:

اور ہی رتبہ ہوا ہے تب سے اس کے شعر کا
جب سے حاتمؔ نے توجہ کی ہے تاباں کی طرف

تاباںؔ کے عہد میں اصلاح زبان کی خاطر خواہ کوششیں جاری تھیں، جس سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ عربی، فارسی اور اردو زبانوں پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ چوں کہ وہ خود ہی نازک طبع تھے اس لیے ان کی شاعری میں نازک خیالی بدرجۂ اتم دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کی زبان میں فارسی اور ہندوستانی کا حسین امتزاج ہے نظر آتا۔ ان کی شاعری سلیس، سادہ اور سہل ممتنع تھی۔ انہوں نے اصلاح زبان کو فروغ دیا۔ انہوں نے شاعری عام فہم زبان میں کی ہے اور روزمرہ کے موضوعات شاعری میں برتتے ہیں۔ ان کی زبان صاف اور رواں ہے ساتھ ہی اشعار میں روانی و برجستگی پائی جاتی ہے۔
چند اشعار ملاحظہ کیجیے :

پڑا ہے شور عالم میں ترے تاباںؔ کے رونے کا
اچٹ جاتی ہیں نیندیں سب کی جب راتوں کو روتا ہے

نہ کوئی دوست اپنا ، یار اپنا ، مہرباں اپنا
سناؤں کس کو غم اپنا ، الم اپنا ، فغاں اپنا

بتا مجھ کو کہاں جاؤں کروں کیا میں ترا عاشق
نہیں رکھتا سوا تیرے کوئی دنیا میں یار اپنا

نہ طاقت ہے اشارے کی نہ کہنے کی نہ سننے کی
کہوں کیا میں سنوں کیا میں بتاؤں کیا بیاں اپنا

خوباں سے اگر مجھ کو سروکار نہ ہوتا
تو دل کو مرے ہائے کچھ آزار نہ ہوتا

3.3.13 شیخ امام بخش ناسخؔ اوران کے تلامذہ:

شیخ امام بخش المتخلص بہ ناسخؔ کی ولادت فیض آباد میں 7/محرم 1186ھ مطابق 15/اپریل 1772ء میں ہوئی۔ ناسخؔ نے خود ہی اپنی پیدائش کے دن کا ذکر اس شعر میں یوں کیا ہے :

رہے کیونکر نہ دل ہر دم نشانہ ناوک غم کا
کہ ہے میرا تولّد ہفتم ماہِ محرم کا

ناسخؔ کی وفات پنج شنبہ 24/جمادی الاولیٰ 1254ھ مطابق 15/اگست 1838ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ میر اوسط علی رشکؔ شاگردِ ناسخؔ نے ایک مادّۂ تاریخ سے سن عیسوی ظاہر کیا ہے۔ وہ مصرعہ یہ ہے۔ ''صد حیف ہائے ناسخؔ صد حیف ہائے ناسخؔ'' اب قطعۂ تاریخ وفات ملاحظہ کیجیے :

درکانپور بودم کایں واقعہ شنیدم
زیں دہر منتقل شد در خلد جائے ناسخؔ
سال وفات جستم تاریخ شد مسیحی
صد حیف ہائے ناسخؔ ، صد حیف ہائے ناسخؔ

ناسخؔ کی صحیح عمر کا پتہ رشکؔ کے ذیل کے مصرعہ سے چلتا ہے کہ ان کی عمر 69 سال کی رہی :

''مرُ د اے ہے بسال شست و نہم''

ناسخؔ پہلوان سخن تھے۔ پہلوان لفظ کا استعمال یوں ہی نہیں ہوا ہے بلکہ جسمانی قوت اور کسرت کے عبارت سے وہ واقعی پہلوان تھے۔ ان کا کسرتی بدن دسترخوان کی دادخواہی کا متلاشی ہوتا۔ جسم بھی توانا اور خوراک بھی۔ دوسری طرف پہلوان سخن کا لفظ اس لیے استعمال ہوا کہ وہ فن شعر میں بھی پہلوان تھے اور جب ان کی شاعری اپنے شباب پر پہنچی تو تمام استاد شعرا اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ ایسی حالت میں ناسخؔ کی استادی کو عروج حاصل ہوا۔ اور یہ شعر کہا :

صنعتِ ترصیع گر دیکھو مرے اشعار میں
پھر پسند آئے نہ صناعی مرصّع ساز کی

ناسخ بڑے زبان داں اور ماہر فن تھے۔ ناسخ نے اصلاح زبان کو ملحوظ رکھتے ہوئے زبان کو فروغ دیا۔ مثال کے طور پر انہوں نے سنسکرت کے ثقیل الفاظ کو خارج از کلام کیا ساتھ ہی قدیم ہندی محاورات کو بھی قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ بلکہ اس کی جگہ عربی و فارسی کے مانوس الفاظ کو قابلِ قدر

سمجھا۔متروکات کو حذف کیا۔غزل کی زمینوں میں تصرف کیا اور ردیف وقافیے کے آداب مقرر کیے۔تذکیر وتانیث کے اصول وضع کیے۔پرشکوہ الفاظ اور صنعتوں کے استعمال کو خاطر خواہ جگہ دی۔قافیے کو بالخصوص اہمیت حاصل ہوئی۔شعری زمینوں کو استوار کیا۔مختصر یہ کہ شاعری کو فنی خوبیوں سے مالا مال کرنے کی سعی کی لیکن اس سے جذبے کی ترسیل میں کمی واقع ہوئی۔صحتِ الفاظ پر بھی زور دیا اور بھدے اور ثقیل اور ناگوار محاورات کو زبان سے خارج کیا۔

مختصر یہ کہ ناسخ کے وضع کردہ اصول وضوابط نے صحتِ الفاظ کو فروغ دیا اور زبان کی اصلاح کی کوشش کی۔ان کے کلیات میں تین دواوین ''دیوان ناسخ''،''دفتر پریشان'' اور ''دفتر شعر'' شامل ہیں۔انہوں نے تقریباً ہر صنفِ شاعری پر طبع آزمائی کی۔استادِ سخن ناسخ کے چند اشعار بطور نمونہ پیش خدمت ہیں :

نہ ترک صحبت احباب کیجیو ناسخ
گرا جو برگ شجر پایمال رہتا ہے

شعر گوئی میں ہیں استاد جناب ناسخ
معنی آرا سخن ایجاد جناب ناسخ

فصاحت ہو بلاغت ہو کہ تحقیق
نہ ہوگا کوئی تجھ سا ہائے ناسخ

چمکنا برق کا لازم پڑا ہے ، ابر باراں میں
تصور چاہیے رونے میں اس کے روئے خنداں کا

دور ہے یار اپنی نظروں سے تصور میں قریب
گھر تو ویراں ہے مگر بزم خیال آباد ہے

جو دل ہی ٹوٹ گیا کیا ہو شعر تر پیدا
ہوئے ہیں شاخ شکستہ سے کب ثمر پیدا

وہ مجھ سے گریزاں تھا کل اس کو میں گھر اپنے
باتوں میں لگا لایا تقریر اسے کہتے ہیں

جی لڑا دیتا ہے کیسی ہی زمین سنگلاخ ہو
خامہ تیشہ ہے تو ناسخؔ کوہ کن سے کم نہیں

کرلیا پریوں کو تسخیر سنا کر اشعار
مثل ناسخ نہیں اب صاحب افسوں پیدا

دلی میں ناسخ کی تحریک کا متوازی زاویہ غالب کی شخصیت سے ابھرا۔غالب شرفائے دہلی میں شمار ہوتے تھے۔غالبؔ معنویت کو لفاظی پر اہمیت دیتے تھے اس لیے یہ کہنا بجا ہے کہ ناسخؔ نے اصلاح زبان، کفایتِ لفظی، بندش اور تراکیب کے جو اصول وضع کیے تھے ان سب کو غالبؔ نے کسی خارجی تحریک کے بغیر عملی طور پر استعمال کیا اور اس لحاظ سے غالب نے تحریک اصلاحِ زبان میں معنی خیزی کو پروان چڑھایا۔تاہم غالبؔ کی مشکل گوئی کو اس زمانے میں بھی جب فارسی زبان ابھی پوری طرح معدوم نہیں ہوئی تھی مقبولیت حاصل نہ ہوسکی۔تاہم میر انیس کے ہاں اس کی نمو موضوع کے داخلی تقاضے سے ظاہر ہوئی۔چناں چہ میر انیس نے اصلاحِ زبان کی تحریک میں ایک اہم رول ادا کیا۔انہوں نے عوام کے ذوقِ سخن کی تربیت کی اور انہیں لسانی سطح پر بلندی تک پہنچا دیا۔ان کی شاعری میں بلا کا تحرک اور روانی ہے۔

میر انیسؔ مرزا غالبؔ کی طرح مشکل پسند نہیں تاہم ان کا لسانی خمیر بھی فارسی زبان سے ہی اٹھا ہے اور ناسخؔ کی طرح وہ بھی صحتِ زبان کی سند تسلیم کیے جاتے ہیں۔

3.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ اصلاح زبان کی اکائی میں حتی الامکان یہ کوشش کی گئی ہے کہ زیر مطالعہ موضوع سے متعلق کماحقہ واقفیت پیش کی جائے۔اردو زبان کی اصلاح

اس وقت سے ہوتی آئی ہے جب سے اردو زبان نے سانسیں لینی شروع کیں۔

☆ ابتدائی زمانے میں زبان نے جس صورت سے خود کو زندہ رکھا تھا، اسی صورت سے ادب کی بھی تخلیق ہوئی۔ اردو زبان کی آبیاری میں صدیوں کی محنت شامل ہے۔ فارسی شعرا نے اردو زبان کو قابل قدر نہیں سمجھا۔ لیکن اردو شاعری نے جیسے جیسے اپنے دامن کو وسیع کیا، فارسی شعرا اردو شاعری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

☆ شمالی ہند کے شعرا نے جب فارسی کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں بھی شاعری کی تو اردو زبان و بیان کو مزید تقویت ملی۔

☆ جیسے ہی اردو زبان میں عربی و فارسی الفاظ مستعمل ہونے لگے اردو زبان کی اصلاح کا کام بھی بتدریج آگے بڑھنے لگا۔ اردو زبان کے اصول وضوابط کو وضع کیا گیا اور قواعد کی رو سے زبان کو برتنے کا سلیقہ بھی میسّر ہوا۔ ردّ و قبول کی گنجائش سامنے آئی۔

☆ ترمیم و اضافے در آئے۔ ''انجمن اصلاح زبان'' کا قیام عمدۃ الملک امیر خاں انجامؔ کے ذریعہ عمل میں آیا۔ سراج الدین علی خاں آرزو، شاہ حاتم، مظہر جان جاناں، انعام اللہ خاں یقینؔ، محمد فقیہ دردمندؔ، احسن اللہ خاں بیاںؔ، میر محمد حیات حسرتؔ، میر محمد باقر حزیںؔ، میر عبدالحیٔ قائم اور شیخ امام بخش ناسخ جیسے استاذ اساتذہ اور ماہرینِ علم و فضل نے اصلاح زبان کی بتدریج کوششیں کیں۔

☆ اردو زبان کو سنوارنے اور عالمی زبانوں کے قریب لا کر کھڑا کرنے میں ان تمام ماہرینِ زبان کی ذہنی و فکری کاوشیں شامل ہیں۔

☆ زبان وہی زندہ رہتی ہے، جو عوام الناس سے جڑی ہو، جس میں ردّ و قبول کی گنجائش ہو، جس میں ترمیم و اضافے کے دروازے ہیں، جس میں دوسری بڑی زبانوں سے استفادہ کرنے اور مستعار لینے کی پوری آزادی ہو اور یہ تمام خصوصیات زبان اردو میں موجود ہیں۔

☆ اس لیے اصلاح زبان کی کوششیں جاری رہیں گی اور زبان اردو ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گی۔

3.5 کلیدی الفاظ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
اصلاح	صحت، درستی	اجتناب	پرہیز کرنا
ترویج	رواج دینا، اشاعت کرنا	مستعار	مانگا ہوا، ادھار لیا ہوا
گامزن	تیز رو، تیز رفتار	صیّاد	شکاری
ایہام	شک یا وہم میں ڈالنا	قفس	پنجرہ، جال
مبتذل	ذلیل، حقیر	قادرالکلام	کلام پر قابو اور قدرت رکھنے والا
متخلص	تخلص رکھنے والا، لقب	زاہد	متقی، پرہیزگار
متروک	ترک کیا ہوا	کلفت	رنج، تکلیف، رنجش

مستعمل	عمل میں لایا ہوا	بذلہ سنجی	خوش طبعی
ساقی	شراب پلانے والا	گل گوں	گلاب کی طرح سرخ رنگ کا
ترسیل	بھیجنا، روانہ کرنا	مژگاں	پلکیں
ہجر	مفارقت، علیحدگی	زانوئے تلمذ تہہ کرنا	شاگرد ہونا

3.6 نمونہ امتحانی سوالات

3.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ میرزا مظہر جان جاناں کی ولادت کس سنہ میں ہوئی؟

2۔ ''انجمن اصلاح زبان'' کس نے قائم کی؟

3۔ شاہ حاتم کے شعری مجموعے کا نام کیا ہے؟

4۔ میرزا مظہر کا نام ''جانِ جاناں'' کس نے رکھا؟

5۔ انعام اللہ خاں یقیںؔ کے استاد کا نام کیا ہے؟

6۔ میر محمد حیات حسرتؔ کا انتقال کس سنہ میں ہوا؟

7۔ ''خدائے سخن'' کس شاعر کو کہا جاتا ہے؟

8۔ میر باقر علی کا تخلص کیا تھا؟

9۔ مرزا اشرف علی خاں فغاںؔ کی ولادت کب اور کہاں ہوئی؟

10۔ ''پہلوانِ سخن'' کس شاعر کو کہا جاتا ہے؟

3.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ شاہ حاتم کے حالاتِ زندگی پر مختصر نوٹ لکھیے۔

2۔ میرزا مظہر جان جاناں کے تلامذے کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

3۔ انعام اللہ خاں یقیںؔ کے شعری محاسن کا مختصر جائزہ پیش کیجیے۔

4۔ محمد فقیہ دردمندؔ کے حالات زندگی پر مختصر نوٹ لکھیے۔

5۔ مرزا محمد رفیع سوداؔ کی غزل گوئی کا مختصر جائزہ لیجیے۔

3.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ اصلاحِ زبان کی اہمیت وافادیت پر مفصّل روشنی ڈالیے۔

2۔ میرزا مظہر جان جاناں کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

3۔ شیخ امام بخش ناسخ کے شعری امتیازات سے متعلق اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔

3.7 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	مختصر تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر سید اعجاز حسین
2۔	اردو میں شعری زبان کی اصلاح کی کوششیں (ایک جائزہ)	ڈاکٹر منظر اعظمی
3۔	اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ	ڈاکٹر منظر اعظمی
4۔	تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ
5۔	اصلاح زبان اردو	خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت

بلاک II : دبستان

اکائی 4: دبستان دہلی کا تعارف

اکائی کے اجزا

4.0 تمہید

4.1 مقاصد

4.2 پس منظر

4.2.1 دبستان دہلی کا تعارف

4.3 دبستانِ دہلی کی خصوصیات

4.4 دبستان دہلی کے اہم شعرا

4.4.1 میر تقی میرؔ

4.4.2 مرزا محمد رفیع سوداؔ

4.4.3 خواجہ میر دردؔ

4.4.4 میر سوزؔ

4.4.5 مرزا اسداللہ خاں غالبؔ

4.4.6 مومن خاں مومن

4.4.7 شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ

4.4.8 بہادر شاہ ظفرؔ

4.5 اکتسابی نتائج

4.6 کلیدی الفاظ

4.7 نمونۂ امتحانی سوالات

4.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

4.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

4.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

4.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

4.0 تمہید

اُردو شاعری کے دو اہم دبستان ہیں۔ ایک دبستانِ لکھنؤ اور دوسرا دبستانِ دہلی۔ اس اکائی میں دوسرے اہم دبستان یعنی دبستانِ دہلی کا تعارف پیش کیا گیا ہے اور اسی سلسلے میں دبستان دہلی کی شاعری اور خصوصیات شاعری کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ دبستانِ دہلی کے پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس دبستان کے پہلے عہد یعنی اٹھارہویں صدی کے اہم شعرا میر تقی میرؔ، مرزا محمد رفیع سوداؔ، خواجہ میر درد اور، میر سوزؔ کی شاعری اور خصوصیات شاعری پر گفتگو کی گئی ہے۔ انیسویں صدی کے اہم شعرا مرزا اسداللہ خاں غالبؔ، مومن خاں مومنؔ، شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ اور بہادر شاہ ظفر کی شاعری پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں اس اکائی کے اکتسابی نتائج پیش کیے گئے ہے، کلیدی الفاظ دیے گئے ہیں اور اکائی مکمل ہونے پر طلبا کی سہولت کے لیے نمونہ امتحانی سوالات بھی دیے گئے ہیں۔ آخر میں سفارش کردہ کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔

4.1 مقاصد

اس اکائی کے پڑھنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ دبستان دہلی کا پس منظر اور تہذیبی وسماجی مسائل پر روشنی ڈال سکیں۔

☆ دبستان دہلی اور اس کی خصوصیات کو سمجھ سکیں اور انہیں بیان کرنے کے قابل ہو سکیں۔

☆ دبستان دہلی کے اہم شعرا میر تقی میرؔ، مرزا محمد رفیع سوداؔ، خواجہ میر درد، میر سوز، مرزا غالب، مومن خاں مومن، ذوق اور بہادر شاہ ظفر کی شاعری کو سمجھ سکیں اور بیان کرنے کے قابل ہو سکیں۔

4.2 پس منظر

دبستان دہلی یا دہلویت ایک طرز شاعری ہے جس میں تصوف، داخلیت، سادگی وغیرہ پائی جاتی ہے۔ دبستان دہلی سے صرف ان شعرا کی شاعری مراد نہیں ہے جو دہلی میں رہے بلکہ وہ شعرا بھی مراد لیے جاتے ہیں جو دہلی میں اگرچہ نہیں رہے مگر ان کے یہاں دبستان دہلی کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ذیل میں دبستان دہلی کا پس منظر، تعارف، خصوصیات اور دبستان دہلی کے شعرا پر تفصیلی روشنی ذیل میں ڈالی جا رہی ہے۔

دبستان دہلی کو سمجھنے کے لیے اس عہد کے سیاسی، سماجی وتہذیبی منظر نامہ پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ دبستان دہلی کے دو اہم ادوار اٹھارہویں و انیسویں صدی سے قبل یعنی اٹھارہویں صدی کی ابتدا 1707 میں شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔ بادشاہت حاصل کرنے کی غرض سے اپنے بھائیوں یا قریبی رشتہ داروں کو قتل کرنا اس وقت کا رواج بن گیا تھا۔ اورنگ زیب نے اسی ڈر سے اپنے تینوں بیٹوں معظم، اعظم اور کام بخش میں اپنی سلطنت تقسیم کر کے انہیں جنگ وجدال سے بچانے کی کوشش کی مگر ایسا نہیں ہوا۔ معظم نے اپنے دونوں بھائیوں کو قتل کر دیا اور شاہ عالم بہادر شاہ کا لقب اختیار کر کے حکومت کرنے لگا۔ مگر پانچ سال بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ بہادر شاہ کے چار بیٹے تھے جن میں معز الدین جہاں دار شاہ نے اپنے تینوں بھائی عظیم الشان، رفیع الشان اور خجستہ اختر جہاں شاہ کو قتل کر کے 1712ء میں بادشاہت حاصل

کرلی۔ جہاں دار شاہ ایک نااہل اور عیاش بادشاہ تھا۔اس لیے دوسرے افراد شاہی تخت پر نظر رکھنے لگے۔ جہاں دار کے بھتیجے فرخ سیر نے 1713ء میں بادشاہ کو شکست دے کر خود شاہی تخت پر قبضہ کرلیا۔مگر سید برادران کو اس کی کوئی بات انتہائی ناپسند گزری اور انہوں نے 1719ء میں فرخ سیر کا قتل کرادیا۔ پھر محمد شاہ تخت نشیں ہوا۔محمد شاہ کے دور میں ملک کو پے در پے مختلف مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ روہیلوں کی بغاوت ہوئی، نادر شاہ و احمد شاہ ابدالی کے حملے ہوئے اور ملک میں خانہ جنگی کے حالات پیدا ہوگئے۔1748ء میں محمد شاہ کا انتقال ہوا تو احمد شاہ نے حکومت سنبھالی مگر 1754ء احمد شاہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ پھر عالم گیر ثانی، اس کے بعد شاہ جہاں ثانی کچھ عرصے تک تخت نشیں رہے۔احمد شاہ ابدالی نے پھر دہلی پر حملہ کیا اور 1761ء میں اس پر قبضہ کر کے شاہ عالم ثانی کو تخت نشیں کیا۔اس طرح مغلیہ حکومت بالکل تباہی کے دہانے پر پہونچ گئی۔میر تقی میرؔ نے احمد شاہ ابدالی کی قتل و غارت گری کا حال 'ذکرِ میرؔ' میں تفصیل سے لکھا ہے۔

مغلیہ حکومت کی کمزوری پر انگریزوں نے پوری نظر رکھی تھی۔وہ دھیرے دھیرے مغلیہ حکومت پر قبضہ کرنے لگے۔1803ء میں ولزلی نے دہلی پر قبضہ کرلیا مگر بادشاہ کا نام باقی رہا۔شہنشاہ دہلی کے احکامات صرف قلعے تک محدود ہوگئے۔1806ء میں اکبر شاہ ثانی تخت نشیں ہوئے۔اس طرح کئی بادشاہ بنے مگر وہ صرف انگریزوں کی کٹھ پتلی تھے۔عوام معاشی تنگی اور بدحالی سے گزرنے لگی۔ بہادر شاہ ظفر مغلیہ حکومت کے سب سے آخری بادشاہ تھے۔انگریزوں نے مغلیہ حکومت پر اتنا قبضہ کرلیا تھا کہ بادشاہ کے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔اسی درمیان انقلاب 1857ء کا واقعہ رونما ہوا جس میں بے انتہا ہندوستانی انقلابی شہید ہوئے۔انگریزوں کو بہادر شاہ ظفرؔ سے پوری طرح حکومت چھین لینے کا اچھا بہانا مل گیا۔انہوں نے بہادر شاہ ظفرؔ پر 1857ء میں ہندوستانی انقلابیوں کا ساتھ دینے کے جرم میں مقدمہ چلایا۔ پھر انہیں گرفتار کر کے رنگون بھیج دیا گیا جہاں 1862ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ان سیاسی وسماجی حالات کا خصوصی طور پر دہلی پر کافی اثر پڑا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد ایک لمبے عرصے تک دہلی میں فسادات، بدنظمی، بے بسی اور بیچارگی صاف نظر آتی ہے۔عوام معاشی تنگ دستی سے پریشان تھی۔ مغلیہ حکومت اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی۔شاہی زندگی گزارنے والے شاہی خاندان کے افراد کو کھانے کے لالے پڑ گئے تھے۔اس سیاسی ومعاشی بدحالی کی صورت حال کے باوجود اس وقت شعر وادب اور علم وفن ترقی کررہا تھا۔البتہ ان تمام صورت حال کا تہذیب وتمدن اور ادب پر براہ راست اثر پڑا۔خاص کر اردو شاعری پر اس کے دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔جس کی جھلک اس دور کے سبھی شعرا کے اشعار میں دیکھائی دیتی ہے۔خصوصاً میر وسودا کے کلام میں جا بجا نظر آتی ہے۔دہلی کے اسی ماحول میں اُردو شاعری پروان چڑھی۔میرؔ نے دہلی کی اس صورت حال کی عکاسی کرتے ہوئے لکھا۔

تھا کل تلک دماغ جنہیں تخت وتاج کا   دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں

سودا نے بھی اپنے شہر آشوب اور ہجو یہ قصائد میں دہلی کی بدحالی کی تصویر کشی کی ہے۔ایسے ناگفتہ بہ حالات میں شاعری کو زوال نہیں بلکہ عروج حاصل ہوا۔شعرا نے اس دور کے ابتر حالات سے چشم پوشی نہیں کی بلکہ ان حالات کو اپنی شاعری میں کھل کر لکھا جو اس وقت کے حالات و واقعات کی آئینہ دار ہے۔

4.2.1 دبستان دہلی کا تعارف:

بقول نور الحسن ہاشمی ''دہلویت نام ہے ایک نقطۂ نظر، ایک افتادِ ذہنی، ایک مزاج شعری کا جسے سمجھنے کے لیے لکھنویت سے قدم قدم مقابلہ کرنا

ہوگا‘‘ گویا دہلویت (دبستان دہلی) کو سمجھنے کے لیے لکھنویت (دبستان لکھنؤ) کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ کیوں کہ دونوں دبستانوں میں تفریق کی بڑی وجہ سیاسی، سماجی اور معاشی حالات تھے جس کا اثر شعرا کے ذہنوں پر پڑا۔ دہلی کے برخلاف لکھنؤ میں خوش حالی تھی، جس کا اثر وہاں کی شاعری پر بھی پڑا۔ لکھنؤ میں ہنسی وقہقہے، ذہن کی موشگافیاں اور زعم ملتا ہے تو دہلی میں نالہ وفریاد، غم واندوہ اور قلب کی وارداتیں ہیں۔ گویا لکھنؤ طربیہ کا رخ پیش کرتا ہے تو دہلی المیہ کا اظہار کرتا ہے۔

دبستان دہلی کے شعرا کے یہاں تصوف کی تعلیمات عام ہوئیں۔ تصوف کا اہم مقصد خدا تک رسائی ہے۔ جس میں شاعر کا اہم مقصد یہی ہوتا ہے کہ اس کے روح کی بے قراری اور قلبی تکلیفوں سے اس کا معشوق واقف ہو جائے۔ دبستان دہلی کا شاعر عشق حقیقی تک پہونچنے کے لیے عشق مجازی کو ذریعہ بناتا ہے۔ دبستان دہلی میں صوفیانہ انداز میں شاعر کا معشوق مرد ہوتا ہے جب کہ دبستان لکھنؤ میں معشوق عورت ہے۔ دہلی کے شاعر کے یہاں جہاں تڑپ پائی جاتی ہے اس کے برعکس لکھنؤ کی شاعری میں فرحت وانبساط اور حسن۔ البتہ لکھنویت کا حسن نہ حسن رہتا ہے نہ عشق عشق رہتا ہے بلکہ ہوس پرستی اور ظاہری تعریف وتوصیف بن کر رہ جاتی ہے۔ جہاں شاعر عورت کے زیور، سراپا، لباس، چال ڈھال، اور اداؤں کو اپنی شاعری میں پیش کرتا ہے بلکہ کبھی کبھی وہ عورتوں کی زبان بھی استعمال کرنے لگتا ہے۔

دبستان دہلی میں عشق حقیقی ہے جس کا معشوق حقیقی ہوتا ہے۔ دردؔ، سوداؔ، میرؔ مصحفیؔ، قائمؔ، ظفر، غالبؔ، شیفتہؔ، ناسخ وغیرہ کے یہاں عشق حقیقی ملتا ہے۔

قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے	اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے	(دردؔ)
ہائے پہونچا نہ گیا قید خودی سے اس تک	اپنے ہی دام سے چھٹنا مرا دشوار ہوا	(سوداؔ)
پھر نہ شیطاں سجود آدم سے	شاید اس پردے میں خدا ہووے	(میرؔ)

دبستان دہلی کے شعرا کے یہاں عشق حقیقی اور تصوف اپنے تمام اثرات وکیفیات کے ساتھ گھل مل گئے ہیں جو سبھی شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ البتہ خواجہ میر دردؔ کے یہاں تصوف جو گہری معنویت لیے ہوئے ہے دوسرے شعرا جیسے میر حسن، مصحفیؔ، جرأت وغیرہ کے یہاں کم ہے اور ذوقؔ، ظفرؔ اور مومنؔ کے یہاں مزید کم۔ البتہ داخلیت دبستان دہلی کے تمام شعرا کے یہاں موجود ہے کیوں کہ عشق حقیقی دہلی کے تمدن میں سرایت کر گیا تھا۔

دراصل جب دہلی تباہی وبربادی کی صورت حال سے دوچار ہو رہی تھی اس وقت دیگر افراد کی طرح دہلی کے شعرا بھی پرامن جگہ کی تلاش میں تھے۔ اس وقت لکھنؤ سب سے زیادہ پرامن مقام تھا اس لیے دہلی کے کئی شعرا آرزو، فغاں، مصحفیؔ، میر حسن، سودا وغیرہ نے لکھنؤ کا سفر کیا اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انہیں شعرا کی بدولت لکھنؤ میں شعروشاعری کا ایسا ماحول بنا کہ وہاں کے لوگوں میں بھی شعری مذاق پیدا ہو گیا۔ دہلی سے آئے شعرا لکھنؤ کی تہذیب وتمدن اور خوش حالی سے متاثر ہوئے اور ان کی شاعری میں دہلوی شعری انداز سے ہٹ کر نیا شعری انداز پیدا ہوا۔ لکھنؤ کے شعرا نے اس نئے شعری انداز کو مزید فروغ دیا اور دہلوی شاعری سے امتیازات کے پیش نظر اپنا ایک نیا طرز ہی بنا ڈالا جو دبستان لکھنؤ کہلایا۔ اس لیے ان شعرا کی شاعری میں واہ، خارجیت اور معنی کے بجائے لفظیات پر توجہ دی جانے لگی۔ محبوب کا سراپا کھلے لفظوں میں پیش کیا جانے لگا۔ مشکل سے مشکل تر

الفاظ کا استعمال کرنا شاعری کی عظمت شمار کیا جانے لگا۔اس طرح مشکل گوئی، خارجیت، رنگینی، قافیہ پیمائی اور واہ دبستان لکھنؤ کی شناخت بن گئی۔ برعکس دہلی کی شاعری کے جہاں سادگی، سلاست، آہ ونالہ، روحانیت، تصوف، شگفتگی پائی جاتی تھی۔

4.3 دبستان دہلی کی خصوصیات

دہلی کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں دہلی کے حالات بہتر نہ تھے۔مختلف حکمرانوں نے دہلی پر قبضہ کرنے کے لیے بار بار حملہ کیا اس طرح دہلی کئی بار اجڑی اور پھر بسی۔ چوں کہ شاعر پر اس کے اردگرد کے حالات و مسائل کا بھی اثر پڑتا ہے، اس لیے دہلی کے شعرا پر بھی دہلی کے حالات کا اثر پڑا۔ دہلی میں رہنے والے میرؔ اور غالبؔ جیسے اہم شعرا کی ذاتی زندگی بھی معاشی اعتبار سے کافی پریشان کن تھی، اس لیے ان کی شاعری پر اس کا مزید اثر ہوا۔ یہی وجہ رہی کہ اس دور کے شعرا کے اشعار میں غم کی لہریں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔جس کے سبب دہلی کے شعرا کے یہاں داخلیت، حقیقی جذبات، عشق حقیقی، تصوف، الفاظ سے زیادہ معانی پر زور، سادہ وسلیس زبان اور آورد کے بجائے آمد کی کیفیت ملتی ہے۔

دہلی کے سیاسی حالات نے ہر شخص کے دل کو گداز اور دردمند بنا دیا تھا۔ حالات کے نشیب وفراز نے انھیں سادگی پسند اور تکلف وتصنع سے دور رکھا۔ زندگی کی سادگی اُن کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ میرؔ وسوداؔ سے لے کر انشاؔ و مصحفیؔ کی شاعری میں ہمیں تکلف اور بناوٹ کی جگہ سادگی اور خلوص کا احساس نظر آتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
نادان پھر وہ جی سے بُھلایا نا جائے گا

(میرؔ)

جو ملا اُس نے بے وفائی کی
کچھ عجب رنگ ہے زمانے کا

(مصحفیؔ)

تیرا جو ستم ہے اُس کی تُو جان
اپنی تھی سو خوب کرگئے ہم

(سوداؔ)

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ اس دور کے شعرا کے اشعار میں غم کی لہریں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں، وہ اس لیے کہ ان شعرا کا غم صرف اپنی ذات کا غم نہیں تھا بلکہ ایک عظیم الشان تہذیب کے خاتمہ کا غم تھا۔ جس کا احساس اور ملک وسماج کی ابتر حالات نے ان کی زندگیوں میں غم ویاس کا زہر گھول دیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
دردو غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

(میرؔ)

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

(دردؔ)

کیوں گردشِ مدام سے گھبرانہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

(غالبؔ)

دبستان دہلی کے شعرا کے یہاں تصوف کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ میرؔ، سوداؔ، غالبؔ اور مومنؔ تمام ہی شعرا کے یہاں تصوف کے مضامین ملتے ہیں۔ خواجہ میر دردؔ کی پوری شاعری تصوف میں ڈوبی ہوئی ہے۔ تصوف کے اس اثر نے جذبات میں گہرائی اور خیالات میں بلندی پیدا کردی۔ چند اشعار دیکھیے۔

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا
موسیٰ نہیں جو سیر کروں کوہِ طور کا

(سوداؔ)

نظر میرے دل کی پڑی دردؔ کس پر
جدھر دیکھتا ہوں وہی روبہ رو ہے

(دردؔ)

اُردو شاعری کے پورے سرمایہ میں مضامینِ عشق و محبت کو ایک غالب عنصر کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ دبستان دہلی کے شعرا نے عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔ انھوں نے لکھنوی شعرا کی طرح اپنی عشقیہ شاعری کو جذبے کی بالائی سطح کے اظہار کا اسیر نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے خارجی مضامین باندھنے کی جگہ داخلی جذبہ کی ترجمانی کی۔ ان کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ ان کی دل کی تپش اور روح کی بے قراری کا اندازہ اُن کے محبوب کو ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں روح کی تڑپ سوز و گداز اور درد و اضطراب کی کیفیت ملتی ہے۔

پاسِ ناموس عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

(میرؔ)

جہاں تک دبستان دہلی سے وابستہ شعرا کی زبان و بیان کا تعلق ہے تو اس میں بھی اُن کے مزاج کی سادگی، صفائی، بے تکلفی اور بے ساختگی کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ وہ دہلی کے روزمرہ محاوروں پر جان دیتے ہیں۔ وہ تشبیہات و استعارات سے بھی کام لیتے ہیں۔ لکھنؤ کے شعرا کی طرح عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ سے زبان کو بوجھل نہیں بناتے بلکہ آسان و شیریں الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح صفائی، سادگی اور سلاست دبستان دہلی کی شاعری کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ کریں۔

جلتا ہے اب پڑا خس و خاشاک میں ملا
وہ گل کہ ایک عمر چمن کا چراغ تھا

(دردؔ)

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دُعا کر چلے

(دردؔ)

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

(غالبؔ)

اس طرح دبستان دہلی کی خصوصیات میں داخلیت، حقیقی جذبات، عشق حقیقی، تصوف، الفاظ سے زیادہ معانی پر زور، سادہ و سلیس زبان اور آورد کے بجائے آمد کی کیفیت ہے۔ غرض دبستانِ دہلی کی شاعری ہر اعتبار سے عوام وخواص میں بے حد مقبول رہی۔

4.4 دبستان دہلی کے اہم شعرا

دبستان دہلی کو دو اہم ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک میرؔ کا عہد اور دوسرا غالبؔ کا عہد۔ میرؔ کے ہم عصر اہم شعرا میں مرزا محمد رفیع سوداؔ، خواجہ میر دردؔ، میر سوزؔ وغیرہ ہیں۔ اس عہد سے زبان کی اصلاح دینے والے شاہ حاتمؔ اور مظہر جان جاناںؔ کا تعلق بھی ہے۔ اس عہد میں قدیم ہندی و دکنی زبان متروک ہوئی۔ اس دور کا سب سے اہم کارنامہ ایہام گوئی کا ترک کیا جانا ہے۔ اُردو شاعری جس پر غزل کا تسلط تھا اس میں قصائد، مثنویاں اور مرثیے لکھے جانے لگے۔ شعرا کی تعداد میں اضافہ ہوا اور شعرا کے تذکرے بھی لکھے گئے۔ دبستان دہلی کا دوسرا دور غالب کا عہد ہے۔ اس عہد کے اہم شعرا میں مومن خاں مومنؔ، شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ، بہادر شاہ ظفر وغیرہ ہیں۔ دبستانِ دہلی کے ان شعرا پر ذیل میں مختصراً روشنی ڈالی جارہی ہے۔

4.4.1 میر تقی میرؔ:

میرؔ کی پیدائش 1722ء میں آگرہ میں ہوئی۔ اصل نام محمد تقی اور تخلص میرؔ تھا۔ ان کے والد کا نام محمد علی متقی تھا۔ میرؔ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد کے دوست امان اللہ اور بعد میں اپنے والد سے حاصل کی۔ میرؔ ابھی بمشکل گیارہ برس کی عمر کو پہنچے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ یہیں سے میرؔ کی زندگی میں رنج والم کا باب کھل گیا۔ تلاش روزگار کے سلسلے میں میرؔ نے دہلی کا رخ کیا جہاں ایک عرصے تک نوکری کرکے زندگی بسر کرتے رہے۔ یہیں ان کے شعری سفر کا آغاز ہوا اور انہیں کافی شہرت حاصل ہوئی۔ مگر جب مرہٹوں نے دہلی کو لوٹ لیا تو میرؔ کوڑی کوڑی کے محتاج ہوگئے اور صرف شاعری ان کا مشغلہ رہ گیا۔ اس طرح میرؔ اپنی عمر کے پچاس سال تک مختلف پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ انہیں کبھی آرام کا موقع میسر نہ ہوسکا۔ جس کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا۔

نواب آصف الدولہ نے 1781ء میں انہیں لکھنؤ آنے کی دعوت بھیجی۔ میرؔ نے لکھنؤ پہنچ کر آصف الدولہ کی قصیدہ خوانی کی تو انہیں تین سو

تا چار سو روپے ماہانہ تنخواہ پر بطور ملازم مقرر کیا۔ اس طرح میرؔ کے لکھنؤ میں 31 برس آرام کے گزرے اور 20 ستمبر 1810ء جمعہ کے دن دار فانی سے کوچ کر گئے۔

میرؔ نے غزل کے علاوہ دیگر اصناف پر بھی طبع آزمائی کی مگر غزل ان کا اہم میدان تھا۔ ان کی غزلیں ذاتی مسائل کے علاوہ سماجی، سیاسی اور معاشرتی مسائل کی عکاس ہیں۔ میرؔ ہر بات کو سادگی سے بیان کرتے ہیں۔ جیسا کہ میرؔ کی سوانح عمری سے پتہ چلتا ہے کہ میرؔ زندگی بھر مختلف پریشانیوں سے گزرے۔ تلاش معاش میں مختلف امرا کے یہاں کام بھی کیا۔ اس وقت دہلی کے حالات بھی کچھ ایسے رہے کہ دہلی کو بار بار لوٹا گیا۔ اس طرح میرؔ کی شخصیت کے داخلی و خارجی دونوں پہلو پر غم کا اثر رہا جو میرؔ کی شاعری میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ میرؔ کی شاعری میں عصری جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ دہلی کی تباہی و بربادی اور بادشاہوں کے آنکھوں کو دہکتی سلائیوں سے جلانے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ میرؔ اپنے اشعار میں اکثر خود کلامی کرتے نظر آتے ہیں۔ میرؔ کی آپ بیتی جگ بیتی لگتی ہے۔ کیوں کہ میرؔ نے وہی کہا جو ان کے دل پر گزری۔ میرؔ اپنے جذبات، کیفیات، تجربات اور واردات کو ایسی جمالیاتی کیفیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے یا سننے والا ان کے کلام کی سحر انگیزی سے بچ نہیں پاتا۔ چند اشعار پیش ہیں۔

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انہیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

استخواں کانپ کانپ جلتے ہیں
عشق نے آگ یہ لگائی ہے

گل ہو مہتاب ہو آئینہ ہو خورشید ہو میرؔ
اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہے

اگر چہ دیگر کئی شعرا نے عشق کو موضوع بنا کر غزل گوئی کی ہے مگر میرؔ نے جس طرح مکمل طور پر عشق کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر عشق کو موضوع بنایا ہے وہ دیگر شعرا کے یہاں نہیں ملتا۔ میرؔ کی شاعری میں عشق مجازی و عشق حقیقی دونوں ملتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف عشق حقیقی کو موضوع بنایا ہے بلکہ وحدت الوجود، وحدت الشہود، فنا و بقا، وحدت و کثرت، وجود و عدم، جبر و قدر پر بھی گفتگو کی ہے۔ میرؔ کو زندگی کی بے ثباتی کا بھی احساس ہے۔ چند اشعار پیش ہیں۔

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا
جدھر دیکھا ادھر تیرا ہی رو تھا

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

میؔر کے اشعار میں دل سوزی، حزنیہ کیفیات، المناک فضا اور نشتر کی طرح دل میں اتر جانے والی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ میؔر کی آپ بیتی جگ بیتی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے اشعار سے قاری کو ایسی انسیت واپنائیت ہوتی ہے گویا خود اسی کا معاملہ ہو۔ ان کی زبان نرم اور رسیلی ہے۔ میؔر کی شاعری میں کہیں کہیں حیات وکائنات کے رنگا رنگ مظاہر کا بھی ذکر ملتا ہے۔ میؔر اپنے اشعار میں نشتریت وچبھن بھی پیدا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا
دل کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا شام گیا

حالِ بدگفتنی نہیں میرا
تم نے پوچھا تو مہربانی کی

میؔر کے اشعار میں نرمی، غنائیت، موسیقیت اور ترنم اس طرح ہے جیسے نغمے کی لہر دوڑ جائے۔ وہ اپنے اشعار میں مترنم الفاظ، چھوٹی بحروں اور نغمگی پیدا کرنے والے ردیف وقافیہ کا استعمال کرتے ہوئے تکرار الفاظ سے نغمگی پیدا کرتے ہیں۔ تشبیہات واستعارات کا خوب استعمال کرتے ہیں۔

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

میؔر کی یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی بنیاد پر میؔر نے غزل کو بلندیوں پر پہونچایا۔ غنائیت اور داخلی شاعری میں ان کا کوئی نظیر نہیں۔ انہیں کی غزلیہ شاعری کا نتیجہ تھا کہ وہ دور غزل کا عہد زریں کہلایا۔ میؔر کے زیادہ تر اشعار حزنیہ کیفیت رکھتے ہیں مگر یہ اشعار مایوس نہیں کرتے بلکہ ناکامی ومایوسی سے نکل کر زندگی جینے کا سلیقہ دیتے ہیں۔

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

میر تقی میؔر کی مختلف تصانیف ملتی ہیں جن میں کلیاتِ اُردو، جو چھ دیوان پر مشتمل ہے، کے علاوہ فارسی دیوان، ذکر میر (فارسی میں میر کی سوانح عمری) فیض میر اور نکات الشعرا (تذکرہ) ہیں۔ میؔر نے غزل کے بعد مثنوی پر سب سے زیادہ طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی مثنویات میں بطور خاص

دریائے عشق، معاملات عشق، خواب وخیال، شعلۂ عشق اور جوش عشق قابل ذکر ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھیں تو میؔر کی شاعری میں تشبیہات واستعارات کی ندرت، خوبصورت پیکر تراشی، عصری حسیت، روانی، سلاست، نغمگی، بے ساختگی، قوت متخیلہ، امیجری اور اپنے دور کے مسائل کی عکاسی میؔر کو آفاقی شاعر بنادیتے ہیں۔ میؔر کی شاعری کی عظمت کے سبب انہیں خدائے سخن کہا گیا۔ غالبؔ، ذوقؔ، داغؔ، امیر مینائیؔ اور فراقؔ گورکھپوری جیسے شعرا نے نہ صرف میؔر کی شاعری کا اعتراف کیا ہے بلکہ ان کا اثر بھی قبول کیا ہے۔ غالبؔ نے خود کہا کہ:

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میؔر نہیں

4.4.2 مرزا محمد رفیع سودا:

سوداؔ 1706ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ مرزا محمد رفیع نام اور سوداؔ تخلص تھا۔ والد کا نام مرزا محمد شفیع تھا۔ سودا نے ابتدائی دور میں فارسی میں شاعری کی مگر بعد میں اردو میں اشعار کہنے لگے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کو انہوں نے مخمس وشہر آشوب کی شکل میں بڑے پر اثر انداز میں تحریر کیا ہے۔ دہلی کی تباہی کے بعد دیگر کئی شعرا کی طرح انہوں نے بھی نقل مکانی کی اور فرخ آباد، فیض آباد پھر لکھنؤ روانہ ہوئے۔ لکھنؤ میں شجاع الدولہ، آصف الدولہ اور سعادت علی خاں سبھی نے ان کی شاعری کی عظمت کو تسلیم کیا۔ انہیں ملک الشعرا کا خطاب بھی ملا۔ وہیں 1781ء میں وفات پائی۔

اردو قصیدہ کے حوالے سے سوداؔ کا کوئی ثانی نہیں ملتا۔ ان کے قصیدے فارسی قصیدوں کے ہم پلہ شمار کیے گئے۔ انہوں نے فارسی قصیدہ نگاری کا بغور مطالعہ کیا اور اس کی تمام خصوصیات کو اردو قصیدہ میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی۔ متنوع موضوعات پر بے شمار قصیدے لکھے۔ قصیدہ کے علاوہ ان کی غزل، مثنویاں اور مراثی بھی ملتے ہیں۔

سودا نے 43 سے زائد قصیدے لکھے اس کے علاوہ مراثی، مثنویاں، رباعیاں، مستزاد، قطعات، پہیلیاں وغیرہ بھی ان سے یادگار ہیں۔ سودا طبعیتاً میؔر اور دردؔ سے مختلف تھے۔ میر و درد کے یہاں وحدت کی شاعری پائی جاتی ہے جب کہ سودا کی شاعری میں کثرت کا تصور ملتا ہے۔ سودا کے یہاں انتخاب لفظ، بندش، ترکیب اور تشبیہوں میں بھی پختگی اور ندرت پائی جاتی ہے۔ سودا کے یہاں زور کلام اور شور بیان نظر آتا ہے۔ سودا غزلوں، قطعوں اور زیادہ تر قصائد کو اپنے احساسات وتجربات کے اظہار کا ذریعہ بناتے ہیں۔ جیسے:

چہرہ مہروش ہے ایک سنبل مشک فام دو
حسن بتاں کے دور میں ہے سحر ایک شام دو

ہوا ہے کفر ثابت ہے یہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی

قصائد میں سودا کا زور تخیل مزید و بلند نظر آتا ہے۔ پرشکوہ الفاظ، دلکش و نادر بندشیں، نرالی تشبیہیں اور استعارے سودا کے قصائد میں پائے جاتے ہیں۔ سودا ہجو گوئی میں بھی اولیت رکھتے ہیں مگر ہجو میں ذاتیات کا عنصر غالب ہے۔

4.4.3 خواجہ میر درد:

دردؔ کی پیدائش 1721ء میں دہلی میں ہوئی۔ خواجہ میراں کا نام اور تخلص دردؔ تھا۔ موسیقی سے کافی لگاؤ تھا۔ دردؔ کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلوان کی مذہبیت وخدا شناسی ہے۔ 1785ء میں دہلی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ دردؔ فقیرانہ زندگی گزارنا پسند کرتے تھے۔ ان کی زندگی کا عکس ان کی شاعری میں بھی ملتا ہے۔ وہ ایک صوفی بزرگ تھے اور ان کی شاعری میں حقیقی عشق ملتا ہے۔ تصوف ان کی شاعری کا اہم موضوع رہا جس میں انہیں انفرادیت حاصل ہے۔ درد کی شاعری میں ایک قسم کا سکون پایا جاتا ہے۔ دردؔ کو نہ صرف موسیقی سے دلچسپی تھی بلکہ وہ خود موسیقی کے ماہر تھے۔ سادگی، زبان و بیان کی دلکشی ان کے کلام میں کثرت سے نظر آتی ہے۔ فارسی اور اردو دیوان کے علاوہ درد کی دیگر تصانیف بھی ملتی ہیں جن میں کتاب الصلوۃ، واردات، علم الکتاب، حرمت غنا وغیرہ شامل ہیں۔ اُردو کو ابتدا میں ترقی دینے والے چار ستونوں مرزا مظہر جان جاناںؔ، مرزا محمد رفیع سوداؔ اور میر تقی میرؔ کے ساتھ ان کا شمار کیا جاتا ہے۔ درد کا نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا
ہم سبھی مہمان تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا

تجھی کو جو یاں جلوہ فرمانہ دیکھا
برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

4.4.4 میر سوزؔ:

میر سوزؔ کی پیدائش 1721ء میں دہلی میں ہوئی۔ محمد میراں کا نام اور سوزؔ تخلص تھا۔ ابتدا میں میرؔ بھی تخلص رکھا تھا مگر میر تقی میرؔ کی شہرت کے باعث سوزؔ تخلص اختیار کرلیا۔ دہلی کی تباہی کے بعد فرخ آباد اور فیض آباد رہائش اختیار کی مگر آخر میں لکھنؤ کو اپنا مسکن بنایا۔ 99-1798ء میں لکھنؤ میں ان کا انتقال ہوگیا۔

سوزؔ کی غزلوں میں سیدھے سادے خیالات، اُسلوب کی سادگی، زبان کی صحت وصفائی ملتی ہے۔ سوزؔ کی محبت اس مٹی کی دنیا کے محبوب کی محبت ہے جس میں ناکامی وکامیابی کی درمیانی کیفیت کا اظہار ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں ناکامی کے بعد کی شدت ناپید ہے۔ البتہ ان کے یہاں سطحیت بھی نہیں ہے جو محبت میں کامیابی کے بعد ملتی ہے۔ ان کے یہاں روزمرہ کے عشق کی کیفیات کا اظہار ہے۔ وہ صاف الفاظ میں حال دل بیان کرتے ہیں۔ سوزؔ کے یہاں فلسفہ تصوف بھی نہیں ملتا۔ سوزؔ کی شاعری میں سادگی، بے تکلفی وشیرینی ملتی ہے۔ سوزؔ کا خاص میدان غزل ہے مگر مثنوی، رباعی اور مخمس میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ سوزؔ کی حیثیت میرؔ، سوداؔ اور دردؔ کے مساوی نہیں ہے مگر دبستانِ دہلی کے ایک اہم رکن کی حیثیت

ضرورر کھتے ہے۔ چند منتخب اشعار دیکھیے۔

صنم کا وصل جو چاہے تو حائل ہو نہ اے عاشق
غبار جسم اٹھ جاوے تو کچھ حائل نہیں ہوتا

بلبل نے جس کا جلوہ جاکر چمن میں دیکھا
وہ آنکھ موند اپنی ہم من ہی من میں دیکھا

مجھ سے مت جی کو لگاؤ کہ نہیں رہنے کا
میں مسافر ہوں کوئی دن کو چلا جاؤں گا

اہل ایماں سوزؔ کو کہتے ہیں کافر ہوگیا
آہ یارب راز دل ان پر بھی ظاہر ہوگیا

4.4.5 اسداللہ خاں غالبؔ:

غالبؔ 1797ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ان کا نام مرزا اسداللہ خاں تھا۔ابتدا میں اپنا تخلص اسدؔ رکھا مگر بعد میں غالبؔ استعمال کرنے لگے۔غالبؔ کی عرفیت مرزا نوشہ قرار پائی۔والد کا نام عبداللہ بیگ تھا۔غالبؔ کے سر سے بچپن میں والد کا سایہ اٹھ چکا تھا،اس لیے ان کے چچا مرزا نصراللہ بیگ نے غالبؔ کی پرورش کی۔مگر غالبؔ ابھی آٹھ سال کی عمر کو پہونچے تھے کہ ان کے چچا کا انتقال ہوگیا۔1810ء میں تیرہ سال کی عمر میں غالبؔ کی شادی امراؤ بیگم سے ہوئی۔1812ء میں آگرہ چھوڑ کر دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔غالبؔ کی کوئی اولاد نہ تھی۔سات بچے پیدا ہوئے مگر کوئی زندہ نہ رہا۔

غالبؔ کی پوری زندگی معاشی تنگدستی میں گزری۔ذوق کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفر کے کلام پر اصلاح دینے لگے۔بہادر شاہ ظفرؔ نے مرزا غالبؔ کو نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ کا خطاب عطا کر کے 50 روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا اور خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا۔ذوقؔ کے بعد بہادر شاہ ظفرؔ نے غالبؔ کو اپنا استاد تسلیم کیا۔1857 کے بعد جب غالبؔ کی سرکاری پنشن بند ہوگئی تو ان کی زندگی نہایت ہی کس مپرسی میں گزرنے لگی۔آخری عمر میں بیماری اور کمزوری نے انہیں گھیر لیا۔مرنے سے ایک روز قبل دماغ پر فالج کا اثر ہوا اور وہ 1869ء کو وفات پا گئے۔ دہلی کی بستی حضرت نظام الدین میں انہیں دفنایا گیا۔

غالبؔ نے اُردو شاعری کو نئی بلندیوں تک پہونچایا۔نئے نئے موضوعات شامل کیے۔فلسفیانہ خیالات کو جگہ دی۔غالبؔ زندگی کا گہرا شعور رکھتے تھے۔غالبؔ نے زندگی کے حقائق اور نفسیات کو بڑی سادگی سے اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔وہ انسانی زندگی کے بنیادی معاملات و مسائل پر غور وفکر کرتے ہیں پھر ان کی گتھیوں کو سلجھا کر انسان کو اس کی عظمت کا احساس دلاتے ہیں۔غالبؔ نے اُردو اور فارسی دونوں میں شاعری کی مگر ان کو

اُردو شاعری کے سبب شہرت حاصل ہوئی۔ غالبؔ تقلید کے قائل نہیں تھے وہ اپنا راستہ خود بناتے تھے۔ انہوں نے اُردو غزل میں نئے نئے تجربے کر کے اس میں وسعت بخشی۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی ''غالبؔ کی بڑائی اس میں ہے کہ انہوں نے متنوع موضوعات کو غزل کے سانچے میں ڈھالا ہے''۔

غالبؔ کی شاعری کئی حیثیت سے انفرادیت رکھتی ہے۔ طنز وظرافت، رمزوایمائیت، نکتہ آفرینی، نادر تشبیہات واستعارات اور مسائل ان کی شاعری کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ غالبؔ کی غزل حسن خیال، حسن معنی اور حسن بیان کا پرتو ہے۔ ان کی شاعری میں قول محال کا استعمال ملتا ہے، یعنی ایسی بات جو بظاہر درست مفہوم نہ لگے مگر غور کریں تو درست ہو۔ ایک ہی شعر کے کئی کئی معانی نکلتے ہیں۔ لطافت ونکتہ آفرینی بھی پائی جاتی ہے۔ خوبصورت تشبیہات واستعارات کا استعمال ملتا ہے۔ انسان دوستی بھی ان کی شاعری کا موضوع ہے۔ ذیل میں چند اشعار پیش ہیں۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالبؔ شخصی طور پر ایک اچھے انسان تھے اور شاعر کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ انھوں نے فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں اعلیٰ درجے کی شاعری کی۔ غالبؔ نے قصیدے بھی لکھے لیکن دراصل وہ قصیدے کے شاعر نہیں تھے بلکہ ان کا رنگ تو غزل میں کھلتا ہے۔ غالبؔ کو

بات کرنے کا انداز آتا تھا۔ وہ ایسی جدت اور ندرت سے کام لیتے تھے کہ بات کچھ کی کچھ ہو جاتی تھی۔ غالبؔ کے کلام کی خصوصیت شوخی اور ظرافت بھی ہے۔ یہ اُن کی شخصیت کا کمال تھا کہ اتنی آفتوں کو سہنے اور ایسے ہولناک مناظر کو دیکھنے کے باوجود انھوں نے شوخی اور ظریفانہ حس کو برقرار رکھا۔ غالبؔ نے اپنے خطوط کے ذریعہ اردو نثر کو بھی بلندیوں تک پہونچا۔ الغرض غالبؔ صرف اپنے دور کے ہی عظیم شاعر نہیں بلکہ ہر دور کے بڑے شاعر ہیں۔ اُن کی عظمت کے گُن اُردو شعر و ادب میں ہمیشہ گائے جاتے رہیں گے۔

4.4.6 مومن خاں مومن:

مومن خاں مومنؔ کی پیدائش 1800ء میں دہلی میں ہوئی۔ اصل نام محمد مومن تھا۔ والد کا نام حکیم غلام نبی خاں تھا جو دہلی کے مشہور حکیم تھے۔ چوں کہ مومنؔ کا خاندانی پیشہ طب تھا، اس لیے انہیں بھی طب کی اچھی معلومات ہو گئی تھیں۔ وہ علم نجوم سے بھی واقف تھے۔ وہ نہایت ہی خوبصورت اور حسین تھے۔ مومنؔ کی زندگی کا سب سے دلچسپ حصّہ ان کی حیات معاشقہ ہے۔ ان کی شاعری میں عشق مجازی کا پورا رنگ ملتا ہے۔ مومنؔ کی وفات 1852ء میں دہلی میں ہوئی۔

مومن خاں مومنؔ کا خاص میدان غزل ہے۔ حالاں کہ ان کے یہاں غزل کے علاوہ قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، قطعہ، رباعی اور واسوخت بھی ملتے ہیں۔ تغزل، داخلیت، نازک خیالی، ندرت اسلوب، سادگی اور پیچیدہ انداز کی شاعری، ان کے غزل کی خصوصیات ہیں۔ تشبیہات و استعارات، صنائع و بدائع کو بھی مومنؔ نے بڑی خوبی سے برتا ہے۔ ان کی شاعری میں مکر شاعرانہ بھی پایا جاتا ہے یعنی شاعر بہ ظاہر ایسی بات کرتا ہے جس میں محبوب کے فائدہ کا احساس ہوتا ہے مگر دراصل اس میں عاشق کا فائدہ ہوتا ہے۔ عشق مجازی مومنؔ کا خاص میدان ہے۔ وہ عشق کے مختلف جذبات و حالات کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ وعدہ کرنا اور پھر اس کو نہ نباہنا، روٹھنا اور تمنا کرنا کہ کوئی منا لے، ایسے جذبات نگاری کی جو دلکش تصویر کشی مومن کے یہاں ملتی ہے وہ دیگر شعرا میں کم ملتی ہے۔

عمر تو ساری کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری عمر میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
کل تو ہم خواب عدم میں شب ہجراں ہوں گے

میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ
تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

مومنؔ کی درج ذیل غزل بہت مشہور ہوئی، جو معاملہ بندی کی پوری تصویر کشی کرتی ہے۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے، وہ شکایتیں، وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم بھی چاہ تھی، کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومن مبتلا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مومنؔ کے یہاں نازک خیالی، ندرت اسلوب اور شاعرانہ شوخی ملتی ہے۔ مومنؔ کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ درج ذیل شعر کے تعلق سے غالبؔ نے کہا تھا کہ مومنؔ مجھے یہ شعر دے دیں اور میرا دیوان لے لیں۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

4.4.7 شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ:

ذوقؔ 1790ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اصل نام شیخ محمد ابراہیم اور ذوقؔ تخلص تھا۔ والد کا نام شیخ محمد رمضان تھا۔ جب وہ پیدا ہوئے تو دہلی میں شعر وشاعری کا دور دورہ تھا۔ انہوں نے بھی بہت کم عمر میں شاعری شروع کردی۔ انہوں نے اس عہد کے مشہور استاد سخن استاد نصیر کی شاگردی اختیار کی۔ مگر کچھ دنوں بعد ذوقؔ اپنی غزلوں پر خود ہی نظر ثانی کرنے لگے اور جلد ہی دہلی کے مشہور شاعروں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ وہ نہ صرف شاعری کرنے لگے بلکہ ان کے شاگردوں کی تعداد بھی تیزی سے بڑھنے لگی۔ وہ بہادر شاہ ظفر کے بھی استاد رہے۔ ذوقؔ کو موسیقی، نجوم، طب، تعبیر خواب وغیرہ پر کافی دسترس حاصل تھی۔ دربار دہلی سے انہیں ''خاقانی ہند'' کا خطاب ملا۔ 1854ء میں دہلی میں ذوقؔ کا انتقال ہوگیا۔

غزل اور قصیدہ ذوقؔ کے خاص میدان تھے۔ اس کے علاوہ مثنوی، قطعہ، واسوخت بھی تحریر کیے۔ ذوقؔ کے کلام کی خصوصیات میں رعایت لفظی، تازگی مضمون، صفائی کلام، چستی ترکیب اور خوبی محاورہ شامل ہیں۔ انہوں نے حسن تعلیل اور محاورے کو خوب استعمال کیا ہے۔ سوداؔ کے بعد قصیدہ میں ان کا کوئی مقابل نہیں ہے۔ ذوقؔ کے چند منتخب اشعار پیش ہیں۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

تم بھول کر بھی یاد نہیں کرتے ہو کبھی
ہم تو تمہاری یاد میں سب کچھ بھلا چکے

4.4.8 بہادر شاہ ظفؔر:

بہادر شاہ ظفؔر کی پیدائش 1775ء دہلی میں ہوئی۔ ان کا پورا نام ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ تھا۔ ابوظفر ان کا تاریخی نام تھا۔ اسی رعایت سے اپنا تخلص ظفؔر رکھا۔ تعلیم و تربیت قلعۂ معلیٰ میں ہوئی۔ بہادر شاہ ظفر اپنے والد اکبر شاہ ثانی کے انتقال کے بعد مغلیہ سلطنت کے وارث مقرر ہوئے۔ یہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا دور تھا۔ بہادر شاہ ظفؔر کی آمدنی کم اور شاہی اخراجات زیادہ تھے۔ اس لیے دھیرے دھیرے حالات بد سے ابتر ہوتے گئے۔ 1857ء کی تحریک انقلاب کی ناکامی کے بعد جسے انگریزوں نے 'غدر' کا نام دیا تھا، بہادر شاہ ظفؔر کو انگریزوں نے گرفتار کر کے ان پر باغی ہونے کا مقدمہ چلایا۔ پھر مجرم ثابت کر کے قیدی بنا کر انہیں رنگون بھیج دیا گیا جہاں 1862ء میں ان کا انتقال ہو گیا اور رنگون ہی میں مدفون ہوئے۔

بہادر شاہ ظفؔر کی شاعری پر دہلی کے ابتر حالات کا اثر نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں خارجیت و داخلیت کا امتزاج ملتا ہے۔ ذوؔق کے بعد غالبؔ سے اپنی شاعری پر اصلاح لی۔ تصوف، اخلاق اور معاملہ بندی ان کی شاعری کے خاص موضوع ہیں۔ شاعری میں ہندی الفاظ کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں۔ حمد، نعت، سلام، مرثیہ، مسدس، مخمس، قطعات و رباعیات ان کے دیوان میں موجود ہیں۔ کلیات میں تیس ہزار کے قریب اشعار ملتے ہیں۔ چند اشعار پیش ہیں۔

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تیری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

شمع جلتی ہے پر اس طرح کہاں جلتی ہے
ہڈی ہڈی مری اے سوز نہاں جلتی ہے

صحبت گل ہے فقط بلبل سے کیا بگڑی ہوئی
آج کل سارے چمن کی ہے ہوا بگڑی ہوئی

بہادر شاہ ظفؔر کی پوری زندگی دہلی کے قلعہ معلیٰ میں گزری مگر زندگی کے آخری ایام میں انقلاب 1857ء کے بعد حالات ایسے بدلے کہ انہیں رنگون میں قید کر دیا گیا جہاں ان کا انتقال بھی ہو گیا۔ حالاں کہ ان کی خواہش تھی کہ وہ دہلی میں رہیں۔ اپنی اس مجبوری کی داستان اپنی شاعری میں تحریر کی ہے۔

کتنا ہے بدنصیب ظفؔر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

4.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ دبستان دہلی کے وجود کی وجہ وہاں کا سیاسی وسماجی ماحول تھا جو شہنشاہ اورنگ زیب کے 1707 میں وفات کے بعد مغلیہ حکومت کے زوال سے پیدا ہوا تھا۔ ان تمام صورت حال کا تہذیب وتمدن اور ادب پر براہ راست اثر پڑا۔ خاص کر اردو شاعری پر اس کے دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔

☆ اٹھارہویں صدی کے اہم شعرا میرؔ، سوداؔ، دردؔ اور میر سوز وغیرہ کی شاعری پر بھی اس کا اثر پڑا۔ اسی طرح انیسویں صدی کے شعرا غالبؔ، مومن خاں مومن ذوقؔ اور بہادر شاہ ظفرؔ وغیرہ کی شاعری پر بھی ان حالات کا کافی اثر ہوا۔

☆ ان حالات کے پیش نظر دہلی کی شاعری میں تصوف، داخلیت، عشق حقیقی، سادگی، سادہ وسلیس زبان اور آورد کے بجائے آمد کی کیفیت پائے جانے لگی جو دبستان دہلی کہلائی۔

☆ دبستان دہلی کے شعرا کے یہاں تصوف کے مضامین ملتے ہیں۔ میرؔ، سوداؔ، غالبؔ اور مومنؔ تمام ہی شعرا کے یہاں تصوف کے مضامین پائے جاتے ہیں۔ خواجہ میر دردؔ کی پوری شاعری تصوف میں ڈوبی ہوئی ہے۔

☆ دبستان دہلی کے شعرا نے عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔ انھوں نے خارجی مضامین باندھنے کی جگہ داخلی جذبہ کی ترجمانی کی۔ دبستان دہلی کی زبان وبیان میں بھی سادگی، صفائی، بے تکلفی اور بے ساختگی کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

☆ شعرا دہلی کے روزمرہ محاوروں، تشبیہات واستعارات کا استعمال کرتے ہیں۔ آسان وشیریں الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح صفائی، سادگی اور سلاست دبستان دہلی کی شاعری کے ساتھ مخصوص ہیں۔

☆ میر تقی میرؔ کی پیدائش 1722ء میں آگرہ میں ہوئی۔ میرؔ اپنی عمر کے پچاس سال تک دہلی میں مختلف پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ آخر میں میرؔ لکھنؤ میں 31 برس آرام کے گزار کر 1810ء میں دار فانی کوچ کر گئے۔ میرؔ کی شاعری میں عصری جھلکیاں ملتی ہیں۔

☆ میرؔ اپنے جذبات، کیفیات، تجربات اور واردات کو ایسی جمالیاتی کیفیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے یا سننے والا ان کے کلام کی سحر انگیزی سے بچ نہیں پاتا۔

☆ میرؔ کے اشعار میں دل سوزی، حزنیہ کیفیات، المناک فضا اور نشتر کی طرح دل میں اتر جانے والی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ میرؔ کی آپ بیتی جگ بیتی محسوس ہوتی ہے۔

☆ مرزا محمد رفیع سوداؔ، خواجہ میر دردؔ اور میر سوز میر کے ہم عصر اہم شعرا ہیں۔ اردو قصیدہ کے حوالے سے سوداؔ کا کوئی ثانی نہیں ملتا۔ ان کے قصیدے فارسی قصیدوں کے ہم پلہ شمار کیے گئے۔ انہوں نے متنوع موضوعات پر بے شمار قصیدے لکھے۔

☆ خواجہ میر دردؔ ایک صوفی بزرگ تھے اور ان کی شاعری میں حقیقی عشق ملتا ہے۔ سادگی، زبان وبیان کی دلکشی ان کے کلام میں کثرت سے نظر آتی ہے۔

☆ میر سوزؔ کی غزلوں میں سیدھے سادھے خیالات، اُسلوب کی سادگی، زبان کی صحت وصفائی ملتی ہے۔ ان کے یہاں روزمرہ کے عشق کی کیفیات

کا اظہار ہے۔ وہ صاف الفاظ میں حال دل بیان کرتے ہیں۔

☆ مرزا غالبؔ 1797ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ بعد میں آگرہ چھوڑ کر دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ غالبؔ کی پوری زندگی معاشی تنگدستی میں گزری۔ بالآخر 1869ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔

☆ غالبؔ نے اُردو شاعری میں نئے نئے موضوعات شامل کیے۔ ان کی شاعری میں طنز وظرافت، رمز وایمائیت، نکتہ آفرینی، نادر تشبیہات و استعارات اور تصوف کا ذکر بالخصوص پایا جاتا ہے۔

☆ غالبؔ کی غزل حسن خیال، حسن معنی اور حسن بیان کا پرتو ہے۔ خوبصورت تشبیہات و استعارات کا استعمال ملتا ہے۔ غالبؔ کے کلام کی خصوصیت شوخی اور ظرافت بھی ہے۔ انھوں نے فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں اچھی شاعری کی۔

☆ غالبؔ صرف اپنے دور کے ہی عظیم شاعر نہیں بلکہ ہر دور کے بڑے شاعر ہیں۔

☆ مومن خاں مومنؔ، شیخ محمد ابراہیم ذوق اور بہادر شاہ ظفر غالب کے اہم ہم عصر شعرا ہیں۔ مومن خاں مومنؔ کا خاص میدان غزل ہے۔ تغزل، داخلیت، نازک خیالی، ندرت اسلوب، مکر شاعرانہ، سادگی اور پیچیدہ انداز کی شاعری، ان کے غزل کی خصوصیات ہیں۔ عشق مجازی مومنؔ کا خاص میدان ہے۔

☆ شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے غزل اور قصیدہ دونوں خاص موضوعات تھے۔ ان کے کلام کی خصوصیات میں رعایت لفظی، تازگی مضمون، صفائی کلام، چستی ترکیب اور خوبی محاورہ شمار کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے حسن تعلیل اور محاورے کو خوب استعمال کیا ہے۔

☆ سوداؔ کے بعد قصیدہ میں ان کا کوئی مقابل نہیں ہے۔ بہادر شاہ ظفرؔ کا دور مغلیہ سلطنت کے زوال کا دور تھا۔ ان کی شاعری میں خارجیت و داخلیت کا امتزاج ملتا ہے۔

☆ تصوف، اخلاق اور معاملہ بندی ان کی شاعری کے خاص موضوع ہیں۔ شاعری میں ہندی الفاظ کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں۔ حمد، نعت، سلام، مرثیہ، مسدس، مخمس، قطعات و رباعیات ان کے دیوان میں موجود ہیں۔ کلیات میں تیس ہزار کے قریب اشعار ملتے ہیں۔

4.6 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
غنائیت	:	موسیقیت
امیجری	:	تصویر کشی
تصنع	:	دکھاوا / بناوٹ
سحرانگیزی	:	جادوبھری
ندرتِ اسلوب	:	انوکھا اسلوب
طرزِ بیان	:	بیان کرنے کا طریقہ
تصوف	:	دل سے خواہشوں کو دور کرکے اللہ کی طرف دھیان لگانا

4.7 نمونہ امتحانی سوالات

4.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ اورنگ زیب عالمگیر کا انتقال کب ہوا؟

2۔ مغلیہ حکومت کے آخری بادشاہ کا نام بتائیں۔

3۔ تصوف کس دبستان کی خصوصیات شاعری ہے؟

4۔ تذکرہ نکات الشعرا کس کا ہے۔

5۔ غالبؔ کی پیدائش کب ہوئی؟

6۔ اردو کے سب سے اہم قصیدہ گو شاعر کا نام بتائیں؟

7۔ کس شاعر کو موسیقی سے کافی دلچسپی تھی؟

8۔ خاقانی ہند کس شاعر کو کہا جاتا ہے؟

9۔ بہادر شاہ ظفرؔ کو گرفتار کر کے کہاں بھیجا گیا تھا؟

10۔ درج ذیل شعر کس شاعر کا ہے؟

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

4.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ دبستان دہلی سے کیا مراد ہے؟ واضح کیجیے۔

2۔ دبستان دہلی کے سیاسی وسماجی پس منظر پر روشنی ڈالیے۔

3۔ غالبؔ کی شاعری کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

4۔ سوداؔ کی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

5۔ مومن خاں مومنؔ، شیخ ابراہیم ذوقؔ اور بہادر شاہ ظفر میں سے کسی ایک کی شاعری پر روشنی ڈالیں۔

4.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ دبستان دہلی کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے مثالوں سے واضح کیجیے۔

2۔ میرؔ کی شاعری کی خصوصیات مثالوں کے ساتھ پیش کیجیے۔

3۔ دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کی شاعری میں فرق واضح کیجیے۔

4.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	دلی کا دبستان شاعری	نورالحسن ہاشمی
2۔	دہلی میں میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر	محمد حسن
3۔	لکھنؤ کا دبستان شاعری	ابواللیث صدیقی
4۔	میر تقی میر (مونوگراف)	مظفر حنفی
5۔	تاریخ ادب اردو (جلد دوم)	جمیل جالبی

اکائی 5: دبستانِ دہلی کے شعروادب پر اثرات

اکائی کے اجزا

5.0 تمہید

5.1 مقاصد

5.2 دبستان دہلی کا شعروادب

5.2.1 دبستان دہلی کا ادبی ماحول

5.2.2 دہلی میں شاعری کے موضوعات

5.2.3 دبستان دہلی کی زبان

5.3 شاعری پر دبستان دہلی کے اثرات

5.3.1 تصوف

5.3.2 داخلیت

5.3.3 جذبات عشق

5.3.4 واقعیت وصداقت

5.3.5 حزن ویاس

5.3.6 سادگی

5.3.7 اختصار

5.4 اکتسابی نتائج

5.5 کلیدی الفاظ

5.6 نمونۂ امتحانی سوالات

5.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

5.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

5.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

5.7 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

5.0 تمہید

جیسا کہ گزشتہ اکائی میں آپ نے پڑھا کہ اُردو کے دو اہم دبستان ہیں۔ایک دبستانِ لکھنؤ اور دوسرا دبستانِ دہلی۔اس اکائی میں دوسرے اہم دبستان یعنی دبستانِ دہلی پر گفتگو کرتے ہوئے دبستان دہلی کے مختلف ادوار میں اردو شاعری میں ہونے والی تبدیلیوں اور اردو شعر و ادب پر اس کے پڑنے والے اثرات کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔اس تعلق سے گفتگو کرتے ہوئے دبستان دہلی کے موضوعات، زبان و بیان، تصوف، داخلیت، سادگی وغیرہ کے اردو شاعری پر کیا اثرات مرتب ہوئے اس کی وضاحت کی گئی ہے۔آخر میں طلبہ کی سہولت کے لیے اکتسابی نتائج، کلیدی الفاظ، نمونۂ امتحانی سوالات کے علاوہ مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔

5.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ دبستان دہلی کے ادبی ماحول پر اظہار خیال کر سکیں۔
- ☆ دبستان دہلی کے مختلف ادوار میں ہوئی زبان میں تبدیلی اور اس کے اثرات کی وضاحت کر سکیں۔
- ☆ اردو شعر و ادب پر دبستان دہلی کے اثرات بیان کر سکیں۔
- ☆ میر تقی میرؔ، مرزا غالبؔ، مومن خاں مومنؔ، ذوق اور بہادر شاہ ظفرؔ و دیگر شعرا کے اثرات کی صراحت کر سکیں۔

5.2 دبستان دہلی کا شعر و ادب

5.2.1 دبستانِ دہلی کا ادبی ماحول:

دہلی میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ولیؔ کے دیوان سے ہوا۔1707ء میں جب ولیؔ کا دیوان دہلی پہنچا تو اردو شاعری کو مقبولیت ملنے لگی۔اس سے قبل دہلی میں فارسی میں شعر و شاعری کا چرچا تھا اور اردو میں شاعری کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔مگر ولیؔ کے دیوان کے آنے کے بعد نہ صرف عوام بلکہ خواص میں بھی اردو شاعری کو مقبولیت ملی۔ولیؔ کے اشعار زبان زد عام و خواص ہو گئے۔ولیؔ کی اردو شاعری کی مقبولیت کی بڑی وجہ ان کی شاعری میں ان خصوصیات کا پایا جانا تھا جو صرف فارسی شاعری کی خصوصیات سمجھی جاتی تھیں۔ولیؔ کی اس مقبولیت نے دوسرے شعرا کو بھی اردو شاعری کی طرف متوجہ کیا۔کچھ شعرا نے فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہنے کی کوشش کی تو کئی شعرا نے ولیؔ کی غزلوں پر غزلیں کہہ کر دیوان تیار کر لیا۔حاتمؔ، آبروؔ، فائزؔ وغیرہ نے اردو میں شعر کہہ کر اردو شاعری کو فروغ دیا تو میر تقی میرؔ، مرزا رفیع سوداؔ، مومن خاں مومن، مرزا اسداللہ خاں غالبؔ جیسے شعرا نے اردو شاعری کو ترقی کے اعلیٰ ترین منازل تک پہنچا دیا۔ان کا دور یعنی اٹھارہویں اور انیسویں صدی کا دور اردو شاعری کا عہدِ زریں کہلایا۔

اردو شاعری جہاں مختلف ادوار سے گزرتی رہی وہیں مختلف علاقوں میں اسے فروغ ملا۔اس طرح علاقائی حیثیت سے اردو شاعری کے دو اہم دبستان، دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ مشہور ہوئے۔دبستان دہلی کی شاعری کو ماہرین ادب نے پانچ ادوار یعنی پہلا دور اردو شاعری کا ابتدائی زمانہ، دوسرا دور ایہام گوئی کا، تیسرا دور متقدمین کا، چوتھا دور مصحفیؔ، جراُت، انشا اور رنگین کا اور آخر میں پانچواں دور متوسطین میں تقسیم کیا ہے۔یہ تقسیم کوئی حتمی تقسیم نہیں ہے بلکہ شاعری کو بہتر انداز میں سمجھنے کے لیے کی گئی ہے۔

پہلا دور اردو شاعری کا ابتدائی زمانہ ہے جو عہد عالمگیر کے اختتام سے محمد شاہ کے ابتدائی عہد پر مشتمل ہے۔ یہ وہ دور ہے جب تفنن طبع کی غرض سے کچھ شعرا اردو میں شاعری کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن زیادہ تر شعرا کے یہاں فارسی الفاظ کی بہتات ہوتی تھی۔ اس دور کے شعرا میں خواجہ محمد عطاؔ، جعفر زٹلی اور اٹلؔ خاص طور پر مشہور ہیں۔

دوسرا دور ایہام گوئی کا دور ہے۔ اس دور میں فارسی گو شعرا جنہوں نے بطور تفنن ریختہ میں کہنا شروع کیا ان کے یہاں ایہام کی کوئی قید نہیں تھی اور ریختہ میں ان کا کلام بہت مختصر تھا۔ اس دور کے شعرا کے یہاں ایہام گوئی کا رواج عام رہا۔ ایہام گو اہم شعرا میں شاہ مبارک آبروؔ، شرف الدین مضمونؔ، شاہ حاتمؔ، محمد شاکر ناجیؔ، غلام مصطفی خاں یکرنگؔ، ولی اللہ اشتیاقؔ، دلاور خاں بیرنگؔ وغیرہ شامل ہیں۔ ایہام گوئی میں ایسے الفاظ لائے جاتے ہیں جن کے قریب و بعید دونوں معنی ہوتے ہیں اور شاعر کی مراد معنی بعید سے ہوتی ہے نہ کہ معنی قریب سے۔ مثال کے طور پر ایہام گوئی کے چند اشعار ملاحظہ کریں۔

دریائے اشک اپنا جب سر بہ اوج مارے
طوفان نوح بیٹھا گوشے میں موج مارے

(خان آرزوؔ)

اس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں
عارضی میری زندگانی ہے

(شاکر ناجیؔ)

ایہام گوئی کے اس دور میں شاعری میں ابتذال بھی آنے لگا تھا، اس لیے ایہام گوئی کو ناپسند کیا جانے لگا۔ میرزا جان جاناں مظہر، میر تقی میرؔ اور مرزا رفیع سودا جیسے دیگر شعرا نے ایہام گوئی کو ناپسند کیا اس طرح ایہام گوئی کے دور کا خاتمہ ہوا۔ تیسرا دور یعنی میرؔ و سوداؔ کا دور دور متقدمین کہلایا چوتھا دور مصحفی، جرأت، انشا اور رنگین کا دور رہا جب کہ پانچواں دور یعنی غالبؔ، ذوقؔ اور ظفر کا زمانہ دور متوسطین کہلایا۔ چوں کہ اس اکائی میں دبستان دہلی کے اثرات کے تعلق سے گفتگو کی جانی ہے اس لیے دبستان دہلی کے مختلف ادوار پر عمومی گفتگو نہ کر کے اثرات کے تعلق سے گفتگو کی جائے گی۔

5.2.2 دہلی میں شاعری کے موضوعات:

ولیؔ کے دہلی آنے کے بعد اگر چہ اردو میں شاعری کو فروغ ملا مگر ابتدائی طور پر شاعری کے وہی موضوعات رہے جو اس وقت کی مقبول زبان فارسی شاعری کے موضوعات تھے۔ فارسی شاعری میں عاشق و معشوق جس طرح کے ہوتے تھے اردو میں بھی اسی طرح پیش کیا گیا۔ تشبیہ و استعارہ، صنائع و بدائع بھی فارسی زبان سے ماخوذ ہوئے۔ فارسی شاعری پر تصوف کا اثر جہاں اسلامی تمدن کی وجہ سے رہا وہیں حافظؔ شیرازی اور شیخ سعدیؔ کے فارسی شاعری کی وجہ سے بھی رہا۔ اردو شاعری میں بھی تصوف کے موضوعات کو فروغ ملا۔ وحدت الوجود، وحدت الشہود، فنا و بقا، دنیا کی بے ثباتی جیسے موضوعات کو جگہ ملی۔ عشق کے موضوعات جب اٹھائے گئے تو اردو شاعری میں عاشق و معشوق کو پیش کرنے کا انداز بھی فارسی سے لیا گیا۔ خصوصاً اردو غزل میں معشوق کو بے وفا، بے رحم، ظالم، قاتل، ہرجائی، بدگمان جیسے اوصاف سے متصف کیا گیا جب کہ عاشق کو غم زدہ، مصیبت زدہ، وفادار، جفا کش، صابر، دیوانہ وغیرہ پیش کیا گیا۔ معشوق کے حسن کو چاند، سورج، گل لالہ اور جنت سے تشبیہ دی گئی تو آنکھ کو نرگس، ابرو کو کمان، دانتوں کو موتیوں

اور قد کو صنوبر جیسی تشبیہات ملیں۔ باغ سے متعلق الفاظ کا انتخاب ہوا تو گل وبلبل، صیاد، گل چیں، باغ باں، آشیانہ، دام، نسرین، خار وغیرہ شامل ہوئے، صحرا کی بات آئی تو نخل، چنار، راہ زن، رہ نما جیسے الفاظ کا انتخاب ہوا، دریا کے متعلق گفتگو ہوئی تو ناخدا، موج، ساحل، حباب، قطرہ جیسے الفاظ کا ذکر ہوا، محفل سے متعلق بات ہوئی تو شمع، پروانہ، پیالہ، خمار، ساقی، رقص، وجد جیسے الفاظ استعمال ہوئے۔ گویا اردو شاعری میں فارسی شاعری کے موضوعات اور الفاظ کا کافی اثر رہا۔ اردو میں تشبیہات واستعارات استعمال کرتے وقت فارسی کے الفاظ کو ترجمہ کر کے داخل کرنے کی کوشش ہوئی۔ البتہ دبستان دہلی کی شاعری جب مختلف ادوار سے گزری اور میرؔ وسوداؔ، غالبؔ ومومنؔ جیسے شعرا نے شاعری کی تو اردو شاعری کے الفاظ اور موضوعات میں کافی وسعت ہوئی۔

5.2.3 دبستان دہلی کی زبان:

ابتدائی دور میں دبستان دہلی کے شعرا کے یہاں فارسیت کا غلبہ زیادہ تھا۔ چوں کہ شعرائے دہلی فارسی شعرا اور فارسی کی شعری روایت سے متاثر تھے اس لیے اردو شاعری پر بھی اس کا اثر رہا۔ اردو شاعری کے ابتدائی دور میں نہ صرف موضوعات بلکہ فارسی الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے۔ دہلی کے شعرا اردو اور فارسی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فارسی اسلوب اور موضوعات وغیرہ دہلی کے دبستان شاعری میں شامل ہوگئے۔ کئی شعرا نے فارسی شعرا سعدی اور حافظ کا ترجمہ کیا اور اردو کو پروان چڑھایا۔ اس طرح دبستان دہلی کی شاعری میں فارسی کا غلبہ رہا۔

دہلی میں اردو شاعری کا ابتدائی دور ولیؔ کے آمد کے بعد شروع ہوتا ہے۔ ولیؔ کی آمد کے وقت عوام میں اردو زبان رائج تھی مگر خواص کبھی کبھی استعمال کرتے تھے۔ جب ولیؔ کے دیوان کو مقبولیت حاصل ہوئی تو وہاں کے شعرا نے تفنن طبع یا دیوان سازی کی غرض سے اردو میں شاعری پر توجہ دینے لگے اور کئی شعرا نے دیوان بھی بنالیا۔ مگر ان کی اردو شاعری میں فارسی کی کثرت ہے۔ دبستان دہلی کے کچھ ایسے شعرا ہیں جنھوں نے اپنی شاعری میں ہندی کے الفاظ بھی کثرت سے استعمال کیے۔ مضمونؔ، آبروؔ، حاتمؔ، خان آرزو وغیرہ کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ ہندی اور دکنی الفاظ کا زیادہ استعمال کرتے تھے۔ مگر میرؔ ومرزا وغیرہ کے زمانے میں الفاظ میں کئی تبدیلیاں ہوئیں جن میں ہندی کے الفاظ کو بھی تبدیل کیا گیا جیسے نین کو چشم، ساجن کو معشوق، سنسار کو دنیا، تن من کو جان ودل، جگ کو دنیا، نا کو نہیں اور پیا کو معشوق سے تبدیل کیا گیا۔

دوسرے دور میں فارسی افعال ومحاورات کے تراجم کو اردو میں رائج کیا گیا۔ چوں کہ دہلی میں فارسی کا رواج تھا اس لیے اس کے تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کو فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا جنھیں عوام میں مقبولیت حاصل ہوئی اور رائج بھی ہوئے۔ میرؔ اور سوداؔ کے یہاں اس طرح کی جدتیں اور زبان سازی زیادہ ہے۔ ان دونوں ادیبوں کو اردو زبان کے مصلحین کی حیثیت حاصل ہے۔ سب سے زیادہ مصادر میں تبدیلی پر توجہ دی گئی جیسے فارسی ''آب آب شدن'' اردو میں ''پانی پانی ہونا'' ہوا، اسی طرح ''دل از دست رفتن'' کو ''ہاتھ سے دل جانا'' بنایا گیا''، ''از جان گزشتن'' اردو میں ''جان سے جانا'' ہوا تو فارسی کا ''پوست کشیدن'' اردو میں ''کھال اتارنا'' اور ''زبان دراز کردن'' کو ''زبان دراز کرنا'' بنایا گیا۔

اس دور میں غلط العام کو مقبولیت ملی۔ ہندی کے ٹھیٹھ الفاظ کو ترک یا تبدیل کیا گیا۔ ان سب اصلاحات کے باوجود اردو زبان کے اصول و قواعد پر سختی سے عمل کرنے کی پابندی نہیں کی گئی، جس کے سبب شعرا کو جو بھی الفاظ ملے انہوں نے اپنی شاعری میں استعمال کیا اس طرح اس دور میں شعرا کی تعداد میں بڑا اضافہ ہوا۔ میرؔ نے بھی ہندی کے کئی الفاظ استعمال کیے جنہیں بعد میں اگر چہ ترک کر دیا گیا جیسے ہندی ''راہ گھیروں'' (راہ روکوں)، تجھ بن (تیرے بغیر)، پون بہی (ہوا چلی)، پات (پتّا)، دیا (چراغ) وغیرہ۔

تیسرا دور انؔشا، مصحفؔی اور جرأت کا ہے جہاں انہوں نے اردو میں کچھ خاص نئ جدتیں تو نہیں کیں البتہ کچھ قدیم الفاظ ومحاورے ترک کردیے۔ میرؔ وسوؔدا نے جن الفاظ ومحاورے کو رائج کیا تھا زیادہ تر وہی باقی اور رائج رہے۔ انشاء کی کتاب ''دریائے لطافت'' سے اس زمانے کے زبان کے حوالے سے کئی اہم باتیں ملتی ہیں۔ انشاء کے مطابق ہر وہ لفظ جو اردو میں مشہور ہوگیا اگر چہ وہ کسی دوسری زبان جیسے عربی، فارسی، ترکی یا پنجابی کا ہو، وہ اردو کا لفظ ہے۔ اسی طرح اردو میں جو لفظ مستعمل ہے وہ صحیح ہے، اگر چہ وہ لغت کی رو سے غلط ہو، حالاں کہ ان کے اس اصول پر اعتراض بھی کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں دہلی اور لکھنؤ کی زبان اور اردو صرف ونحو کے حوالے سے بھی بحث ملتی ہے۔

چوتھا دور دہلی میں شاہ نصیؔر، ذوقؔ، مومن اور غالب کا ہے جب کہ لکھنؤ میں ناسؔخ اور آتؔش کا دور تھا۔ اس دور میں بھی اردو زبان میں مزید قواعد بدلے گئے، مذاق شعری کے مطابق شعرا کسی لفظ کو اختیار کرتے یا ترک کر دیتے مگر با قاعدہ اصول نہیں بنائے گئے۔ کچھ الفاظ بھی ترک کیے گئے جیسے باتیں ہماریاں، راتیں تمہاریاں، عورتیں آئیاں، کھانا لائیاں وغیرہ۔ اس طرح دہلی کی زبان میں کافی صفائی وشستگی پیدا ہوگئی البتہ قدیم الفاظ اور تراکیب بھی باقی رہے۔ غرض دہلویت نے کبھی اپنے پرانے لباس کو بالکل اتار کر نہیں پھینکا اس نے قواعد سے زیادہ رواج کو برتا۔ اس دور میں لکھنؤ کی زبان میں کافی تبدیلیاں ہوئیں۔ ناسؔخ نے زبان وقواعد بنائے، دہلی کے الفاظ اور محاوروں کے بجائے لکھنؤ کے الفاظ، محاوروں، تذکیر وتانیث اور تلفظ کو اصول وقواعد کے مطابق رواج دیا۔ اس وقت تک زبان اردو کو ریختہ کہا جاتا تھا، ناسؔخ کے وقت اس کا نام اردو مقرر ہوا۔ غزل کو لوگ ریختہ کہتے تھے ناسؔخ نے غزل کا لفظ جاری کیا اس طرح ریختہ کا لفظ ہر معنی میں متروک ہوگیا۔ جہاں تک ممکن ہوسکا ہندی الفاظ کے بجائے عربی الفاظ استعمال کیے گئے۔ تمام مستعمل الفاظ کے تذکیر وتانیث کے قاعدے بنائے گے۔ غزل میں ہر قسم کے مضامین کو شامل کیا گیا اور عاشقانہ طرز کم ہوا۔ الغرض ناسؔخ کے وقت کئی تبدیلیاں ہوئیں جس سے اردو زبان میں خوش نمائی اور چستی پیدا ہوئی۔ مگر دبستان دہلی کی سادگی وصفائی زبان ہمیشہ مقبول رہی۔

دبستان دہلی کا پانچواں دور اہم شاعر داؔغ کا دور ہے۔ داؔغ اگر چہ ذوقؔ کے شاگرد رہے مگر داؔغ نے ان کی پوری طرح پابندی نہیں کی۔ ذوقؔ کے یہاں مضمون اعلیٰ ہے، داؔغ کے یہاں روانی، داؔغ وہ زمینیں اختیار نہیں کرتے جو لکھنؤ میں متروک ہیں، داؔغ دہلی کے محاورات کو کثرت سے باندھتے ہیں۔ داؔغ کے یہاں دبستان دہلی کی زبان زیادہ صاف، بامحاورہ اور سلیس نظر آتی ہے جہاں دبستان دہلی کا محاورہ اور لکھنؤ کے اصول بھی ہیں۔ اس طرح دبستان دہلی کی زبان میں ایک ایسا اثر پیدا ہوا جو پہلے نہ تھا۔

دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کے درمیان زبان کا فرق ذیل میں درج ہے جن کی طرف نورالحسن ہاشمی نے ''دلی کا دبستان شاعری'' میں اشارہ کیا ہے۔

لکھنؤ میں علامت مصدر 'نا' کو مونث کی خاطر 'نی' نہیں کرتے، جیسے روٹی کھانا پڑے گی (لکھنؤ) روٹی کھانی پڑے گی (دہلی)۔ دہلی میں مونث عربی الفاظ کی جمع مونث بولتے ہیں جب کہ لکھنؤ میں تمام عربی الفاظ کی جمع خواہ وہ مونث ہی کیوں نہ ہو مذکر استعمال کرتے ہیں جیسے لفظ دلیل کی جمع دلائل لکھنؤ میں مذکر اور دہلی میں مونث ہے۔ لکھنؤ میں صحیح تلفظ کی خاطر صحیح لغت کو ترجیح دیتے ہیں جب کہ دہلی میں رواج کو ترجیح دی جاتی ہے جیسے اَلماس (لکھنؤ)، اِلماس (دہلی)۔ کہیں تذکیر وتانیث میں بھی فرق ہے جیسے لفظ 'فاتحہ' لکھنؤ میں مذکر مگر دہلی میں مونث استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح سلنا اور دھلنا جیسے الفاظ بولتے وقت ''شیروانی سل گئی ہے''، ''ٹوپی دھل گئی ہے'' دہلی میں بولتے ہیں جب کہ ''شیروانی سی گئی'' اور ''ٹوپی دھوگئی'' لکھنؤ میں بولا جاتا ہے۔

مجموعی طور سے دیکھا جائے تو مختلف ادوار میں دبستان دہلی کا اردو شعر و ادب پر کافی اثر رہا۔ خصوصی طور پر زبان پر اس کے دیرپا اثرات قائم ہوئے۔ دہلی کو مرکزیت حاصل ہونے کے سبب وہاں کی زبان کو بھی ہمیشہ اہمیت حاصل رہی۔ دہلی میں اہم شعراو ادبا کی موجودگی نے وہاں کی زبان کو بھی ادبی ولسانی حیثیت سے معیاری بنایا۔ دبستان لکھنؤ کے وجود میں آنے کے بعد اس کا اثر بھی اردو شعراو ادب پر پڑا۔ لکھنؤ میں ایک عرصے تک مرصع و مقفی عبارت آرائی ہوتی رہی مگر دہلی میں سادہ بیانی غالب رہی۔ دبستان دہلی کی سادہ زبان کا اردو شاعری اور نثر دونوں پر اثر رہا۔ جس کے سبب دہلی میں نہ صرف شاعری کو فروغ ملا بلکہ نثر کو بھی کافی ترقی ملی اور بڑی تعداد میں نثری تصانیف وجود میں آئیں۔ سرسید اور غالب کی واضح اور سادہ نثر نگاری نے وہ طریقہ رائج کر دیا جو آج ہر جگہ برتا جاتا ہے۔

5.3 شاعری پر دبستان دہلی کے اثرات

دبستان دہلی اردو ادب کا اولین اور مخصوص دبستان ہے جو دہلی شہر اور خصوصاً قلعہ معلیٰ کی زبان و ادب کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ دہلی میں سیاسی وسماجی حالات اگرچہ بدتر رہے مگر اس دور میں شاعری نے کافی ترقی کی۔ البتہ اردو شاعری دہلی کی اس ناگفتہ بہ حالات سے ضرور متاثر رہی۔ اس انتشار اور ذہنی بے اطمینانی کے اثرات جہاں دہلی کے شعر و ادب پر بھی پڑ رہے تھے وہیں شعرا کی عام زندگی اور سادگی و بے تکلفی کے اثرات بھی شعر و ادب پر پڑے۔ اس عہد کے لوگ ناامیدی و محرومی اور درد و غم کے ماحول میں سانس لے رہے تھے۔ ان حالات سے پیدا ہونے والا سوز و گداز اس دور کی شاعری میں بھی شامل ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے شعرا کے اشعار میں غم کی لہر کسی نہ کسی شکل میں موجود نظر آتی ہے۔ ان شعرا کا غم صرف اپنی ذات کا غم نہیں تھا بلکہ ایک عظیم الشان تہذیب کے خاتمے کا غم تھا۔ ملک و سماج کی ابتر صورت حال نے بھی ان کی زندگیوں میں حزن و یاس کا زہر گھول رہا تھا۔ جس کا اندازہ اس زمانے کی تخلیقات کے مطالعہ سے اچھی طرح ہو سکتا ہے۔ اس طرح حزن و یاس، تصوف، سادگی اور صفائی بیان وغیرہ سے اردو شاعری متاثر رہی۔ چوں کہ ولیؔ کی شاعری کی مقبولیت کی بڑی وجہ اردو شاعری میں ان خوبیوں کا پایا جانا تھا جو صرف فارسی میں پائی جاتی تھیں۔ ولیؔ نے بڑی خوبی کے ساتھ فارسی شاعری کے موضوعات کو اردو میں پیش کر کے عوام و خواص سبھی کو اس طرف متوجہ کر دیا۔ اس لیے اردو شاعری پر بھی ان موضوعات خصوصاً تصوف کا اثر رہا جنہیں فارسی شاعری میں پیش کیا جاتا تھا۔ بعد کے آنے والے شعرا جیسے میرؔ، سوداؔ، دردؔ، غالبؔ نے تصوف کے موضوع کو اس طرح پیش کیا کہ ولیؔ سے کافی آگے نکل گئے۔ میرؔ اور دردؔ نے تصوف کے موضوعات پیش کیے تو منفرد لب ولہجہ اختیار کیا۔ غالبؔ نے تصوف کو اپنی شاعری میں پیش کیا تو نیا لب ولہجہ اختیار کر کے اپنی انفرادیت کو قائم رکھا۔ الغرض ایک مضمون کو سو ڈھنگ سے باندھا گیا۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا
(میرؔ)

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
(میرؔ)

کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں روز ہجر کو
پر جو خدا دکھائے سو لاچار دیکھنا

(سوداؔ)

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مرچلے

(دردؔ)

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

(غالبؔ)

جو ملا اس نے بے وفائی کی
کچھ عجب رنگ ہے زمانے کا

(مصحفیؔ)

اس طرح دبستان دہلی کے مختلف ادوار میں ہورہی تبدیلی کے اثرات مختلف شعرا کی شاعری پر مرتب ہوئے۔ مختلف ادوار سے ہوکر دبستان دہلی کی جو شناخت قائم ہوئی اس کا اثر جن شعرا پر پڑا ان کی نشاندہی نورالحسن ہاشمی نے اپنی کتاب ''دلی کا دبستان شاعری'' میں کی ہے۔ دبستان دہلی کے شعرا میں مرزا معز فطرتؔ موسوی خاں، مرزا عبدالقادر بیدلؔ، خواجہ عطاء اللہ عطاؔ، قزلباش خاں امیدؔ، سراج الدین علی خاں آرزوؔ، انجامؔ، فائزؔ، شاہ مبارک آبروؔ، شیخ ظہورالدین حاتمؔ، شیخ شرف الدین مضمونؔ، محمد شاکر ناجیؔ، محمد احسان اللہ احسنؔ، غلام مصطفیٰ خاں یک رنگؔ، شاہ ولی اللہ اشتیاقؔ، میر سجاد سجادؔ، مرزا مظہر جان جاناں، مرزا محمد رفیع سوداؔ، میر تقی میرؔ، میر عبدالحی تاباںؔ، انعام اللہ خاں یقیںؔ، میر محمد حسین کلیمؔ، خواجہ میر دردؔ، محمد میر سوزؔ، اشرف علی خاں فغاںؔ، میر ضیاء الدین حسین ضیاؔ، شیخ قیام الدین قائمؔ، جعفر علی حسرتؔ، محمد میر اثرؔ، ثناء اللہ فراقؔ، میر قمرالدین منتؔ، شیخ ولی اللہ محبؔ، ہدایت اللہ خاں ہدایتؔ، شاہ قدرت اللہ قدرتؔ، مرزا عظیم بیگ عظیمؔ، شیخ غلام علی راسخؔ، خواجہ احسن اللہ بیانؔ، شیخ محمد بقاء اللہ بقاؔ، میر محتشم علی خاں حشمتؔ، محمد باقر حزیںؔ، میاں صلاح الدین تمکینؔ، میاں نصیرالدین نصیرؔ، ذوقؔ، اسداللہ خاں غالبؔ، مومن خاں مومنؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، محمد مصطفیٰ خاں شیفتہؔ، میر نظام الدین ممنونؔ، میر حسن تسکینؔ، اصغر علی خاں نسیمؔ، ظہیرالدین ظہیرؔ، قربان علی سالکؔ، نواب مرزا خاں داغؔ، میر مہدی مجروحؔ، محمد حسین آزادؔ، اور الطاف حسین حالیؔ وغیرہ شامل ہیں۔ دبستان دہلی کے اہم شعرا میں مرزا محمد رفیع سوداؔ، میر تقی میرؔ، اسداللہ خاں غالبؔ نے اردو شاعری کو وہ بلندیاں عطا کیں کہ ان کے ادوار کو عہد زریں کہا گیا۔

موضوعات اور زبان کے علاوہ دبستان دہلی کے دیگر اثرات بھی اردو ادب پر مرتب ہوئے۔ دہلی کی بدحالی سے درباری شاعری کم ہوئی جس سے قصیدہ کو زوال ہوا۔ کیوں کہ قصیدہ میں سوداؔ کے بعد ذوقؔ اور غالبؔ کا نام اہم ہے البتہ سوداؔ کا مقابل کوئی نہ رہا۔ مثنوی کو بھی ترقی نہ مل سکی کیوں کہ میر حسنؔ، شوقؔ اور دیا شنکر نسیمؔ جیسے شعرا میسر نہ ہوسکے۔ ریختی کو بھی زوال ہوا جس میں عورتوں کے جذبات کو نظم کیا جاتا تھا۔ البتہ غزل کو کافی

ترقی ملی اور وہ اپنی معراج کو پہنچی۔ میر جیسے خدائے سخن شاعر نے بھی اپنی شاعری میں موسیقیت، استعارہ، کنایہ کی جلوہ گری کی، جس کا اثر بعد کی شاعری پر صاف نظر آتا ہے۔اس کے علاوہ سنگلاخ زمینوں کی طرف بھی شعرا کا رجحان کم ہوااور شعرانے اپنے کلام میں تغزل کو خاص اہمیت دی۔

مختلف ادوار میں دبستان دہلی کے اردو شاعری کی زبان و بیان پر جو اثرات مرتب ہوئے اور جو تبدیلیاں ہوئیں ان کی تفصیل دی جا چکی ہے۔شعر وادب پر دیگر اثرات جو مرتب ہوئے ان میں تصوف، داخلیت، سادگی و صفائی،عشق حقیقی،عشق مجازی، نازک خیالی، نادر تشبیہات و استعارات اور خیال کی بلندی وغیرہ ہے جو دبستان دہلی کی خصوصیات بھی ہیں۔زبان و بیان کا معاملہ ہو کہ موضوعات و پیش کش کا، دبستان دہلی کی ان خصوصیات کا اثر مابعد کی شاعری پر بھی رہا۔

5.3.1 تصوف:

دبستان دہلوی کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت تصوف ہے۔ دہلوی شعرا کے یہاں تصوف کا بیان ضرور ملتا ہے۔اردو شاعری نہ صرف فارسی شاعری سے متاثر ہوئی بلکہ فارسی شاعری کے موضوعات اوراس کی تہذیب وتمدن کا بھی اس پر اثر رہا۔ دہلی کی سیاسی ابتری و بدحالی نے تصوف کی اس روایت کو مزید پختگی اور گہرائی و گیرائی بخشی۔اس بدحالی نے لوگوں کو صبر وتوکل اور قناعت کی طرف متوجہ کیا جس کے سبب لوگوں نے تصوف کے دامن میں پناہ لی۔تصوف زخم دل کا مرہم ثابت ہوا۔عشق حقیقی اختیار کر کے دنیا کے غموں کو بھلانے کی کوشش کی گئی۔اس عہد میں تصوف اخلاق اور تہذیب کا ایک جز و بھی تھا۔

ولؔی، میرؔ،سوداؔ، غالبؔ، مومنؔ تمام شعرانے تصوف کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔خواجہ میر دردؔ کی تو پوری شاعری ہی رنگ تصوف میں ڈوبی ہوئی ہے۔وحدت الوجود، وحدت الشہود، ہمہ اوست، فنا فی اللہ، دنیا کی بے ثباتی و ناپائیداری جیسے تصوف کے مضامین کم و بیش تمام شعرا کے یہاں ملتے ہیں۔تصوف کے اس اثر نے جذبات میں گہرائی اور خیالات میں بلندی پیدا کی اور ذہن وفکر کا معیار بلند ہوا۔

جس طرح فارسی کے صوفی شعرانے دنیا کی بے ثباتی،توکل وقناعت،آلام ومشکلات،انسان کی روحانی عظمت،حقیقت ومجاز،اخلاقی تعلیم اورفنا وبقاوغیرہ کوموضوع بنایاولؔی نے بھی تصوف کے ان موضوعات کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔انہوں نے جگہ جگہ تصوف کی باریکیوں اور حیات و کائنات کے رموز کی طرف اشارہ کیا ہے۔مرزا مظہرؔ جان جاناں نے تصوف کے مختلف موضوعات جیسے وحدت الشہود، بے ثباتی دنیا، جبر وقدر،فنا وبقا کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔

عشق میں لازم ہے اول ذات کوں فانی کرے
ہو فنا فی اللہ دائم یاد یزدانی کرے
(ولؔی)

خدا کو اب تجھے سونپا ارے دل
یہیں تک تھی ہماری زندگانی
(مظہرؔ)

خواجہ میر دردؔ نے صوفیانہ زندگی گزاری۔نہ صرف ان کی زندگی متصوفانہ رہی بلکہ جس طرح تصوف کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا وہ انہیں کی

انفرادیت ہے۔ وحدت الوجود کا صوفیانہ موضوع ان کی شاعری میں کثرت سے ملتا ہے۔ اس کے علاوہ فنا و بقا، حقیقت و مجاز، دنیا کی بے ثباتی اور معرفت نفس جیسے صوفیانہ موضوعات پر بھی ان کی شاعری ملتی ہے۔ ان کی پوری شاعری تصوف اور عشق حقیقی کے ارد گرد گھومتی ہے۔ مثال کے طور پر دردؔ کے اشعار ملاحظہ ہوں:

ہے جلوہ گاہ تیرا کیا غیب کیا شہادت
یاں بھی شہود تیرا، واں بھی شہود تیرا

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

باوجودے کہ پر و بال نہ تھے آدم کے
وہاں پہنچا، کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا

وائے نادانی بہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

اردو غزل کو بلندیوں تک پہنچانے والے میر تقی میرؔ کے یہاں بھی تصوف کا موضوع خصوصاً وحدت الوجود، کثرت میں وحدت، حقیقت و مجاز، جبریہ و قدریہ یعنی انسان اپنے اعمال میں مجبور ہے یا مختار، کا تصور نظر آتا ہے۔ انہوں نے کائنات کے ظہور میں آنے سے قبل کیا تھا اور ظہور کے بعد کیا ہے جیسے صوفیانہ خیالات کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ میر تقی میرؔ کے اشعار ملاحظہ ہوں:

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

دیا دکھائی مجھے تو اسی کا جلوہ میرؔ
پڑی جہان میں جا کر نظر جہاں میری

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ نے زندگی کے مسائل اور تصوف کے موضوعات مثلاً عشق ومحبت، رنج والم، کیف ومستی، بےخودی، زندگی کی بے ثباتی، حیات کی رنگینی اور موت وبعدالموت کو شاعری کا موضوع بنایا۔تصوف کا موضوع اس وقت کے سبھی شعرا کے یہاں ملتا ہے اگرچہ انہیں تصوف سے عملی مناسبت ہو یا نہیں، غالبؔ بھی انہیں شعرا میں سے ہیں جن کو عملی تصوف سے تعلق نہیں تھا مگر تصوف کے موضوعات کو انہوں نے اپنی شاعری میں بڑی خوبی سے برتا اور وحدت الوجود، وحدت الشہود جیسے تصوف کے موضوعات کو پیش کیا۔اشعار ملاحظہ ہوں:

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اصل شہو و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہد ہے کس حساب میں

سوداؔ، ذوق، سوزؔ، اشرف علی فغاںؔ، مومن خاں مومن و دیگر شعرا نے تصوف کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔مومن خاں مومن نے جہاں غزل گوئی میں اہم مقام پیدا کیا وہیں تصوفانہ شاعری کی وجہ سے بھی مشہور ہوئے۔چند اشعار پیش ہیں۔

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا
موسیٰ نہیں جو سیر کروں کوہ طور کا

(سوداؔ)

اسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا
اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا

(ذوقؔ)

جب تلک آنکھیں کھلی ہیں دکھ پہ دکھ دیکھے گا یار
مند گئیں جب انکھڑیاں تب سوزؔ سب آنند ہے

(سوزؔ)

کٹ گئی ساری عمر غفلت میں
کچھ تری بندگی ادا نہ ہوئی

(اشرف علی خاں فغاںؔ)

عمر تو ساری کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

(مومن)

شعرا کے تصوف کا موضوع اختیار کرنے کی ایک وجہ ''تصوف برائے شعر گفتن خوب است'' بھی رہا۔ یعنی کچھ تو صوفی شعرا تھے جنہوں نے حقیقی طور پر تصوف کے مضامین باندھے لیکن کئی شعرا نے محض رسمی طور پر تصوف کے مضامین کو اختیار کیا تا کہ ان کی شاعری مقبول ہو سکے۔ چناں چہ ذوقؔ اور غالبؔ کے زمانے تک تقریباً شاعری کی مقبولیت کا ایک سبب وہ تصورات واقدار تھے جو ہندوستان کی فضا میں رچے بسے ہوئے تھے۔ جن کی بدولت انہوں نے تصوف کو موضوع بنایا۔ تصوف کی بدولت اردو شاعری میں بڑی وسعت پیدا ہوئی۔

مسائل تصوف نے اردو غزل کو رمز و کنایہ کی زبان دی، پیر مغاں، گل و بلبل، شمع و پروانہ، ساقی و مے کدہ، اسی طرح کی اور بہت سی علامتیں تصوف کے راستے اردو شاعری میں داخل ہوئیں۔ تصوف نے اردو شاعری کو فکری بلندی بھی عطا کی اور استغنا کا درس دے کر درباداری سے الگ رکھا اور مزاج میں خودداری و بے نیازی پیدا کی۔ صوفی شعرا نے خدا کو پہچاننے کا راستہ اپنے آپ کو پہچاننے اور انسان کو سمجھنے کا قرار دیا جس سے انسان کی عظمت اور انسان دوستی کی راہیں کھلتی ہیں۔

5.3.2 داخلیت:

دبستان دہلی کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت داخلیت ہے جو دہلی کے ہر شاعر کے یہاں موجود ہے۔ داخلیت سے مراد یہ ہے کہ شاعر باہر کی دنیا سے غرض نہیں رکھتا بلکہ وہ اپنے دل کی واردات کا اظہار کرتا ہے۔ اگر کوئی بات خارجی بھی ہے تو اسے بھی داخلیت کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔ کچھ شعرائے دہلی کے یہاں خارجیت بھی پائی جاتی ہے لیکن داخلیت میں واردات قلبی یعنی عشق و محبت کے مضامین اور ان مصائب کا بیان شعرائے دہلی نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ کیا ہے۔

غلام ہمدانی مصحفیؔ کی شاعری میں داخلیت اور میرؔ کا اثر ملتا ہے مگر میر کی گہرائی و گیرائی نظر نہیں آتی۔ قائمؔ، ذوقؔ، مومنؔ اور دیگر شعرا نے داخلیت کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ درج ذیل چند اشعار پیش ہیں۔

اپنی تو اس چمن میں نت عمر یوں ہی گزری
یاں آشیاں بنایا واں آشیاں بنایا

(مصحفیؔ)

تیرے کوچے ہر بہانے مجھے دن کو رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

(مصحفیؔ)

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جاکر کہاں کمند
کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا
(قائم)

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
(ذوقؔ)

اے شمع تیری عمر طبعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے روکر گزار دے
(ذوقؔ)

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
(مومنؔ)

غالبؔ کے یہاں داخلیت کے ساتھ ایک آزادانہ ذہن بھی ملتا ہے۔ میرؔ کے یہاں داخلیت اور خودسپردگی ہے جب کہ غالب کے یہاں داخلیت تو ہے مگر خودسپردگی نہیں۔ وہ اپنے جذبات واحساسات سے بلند ہوکر لذت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ شاید اس کی ایک بڑی وجہ غالب کا طبعیتاً آزاد ہونا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

5.3.3 جذباتِ عشق:

دبستان دہلی کے شعرا کے یہاں جذبات واحساسات کے اظہار پر زیادہ زور دیا گیا تھا۔ شعرا نے عشق کے جذبے کو اولین ترجیح دی۔ انہیں اس بات کی پرواہ نہیں تھی کہ ان کا اسلوب بیان اور طرز ادا بہتر سے بہتر ہو بلکہ ان کی کوشش تھی کہ شاعری میں جذبات واحساسات کا اظہار ہو جائے۔ اس لیے بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا شاعر کو عشق سے عشق ہو گیا ہے۔ دہلی کے کئی شعرا نے صرف عشق حقیقی پر زور دیا تو کچھ شعرا عشق مجازی سے گزر کر عشق حقیقی سے سرشار ہوئے۔ چناں چہ ان کی شاعری میں محبت کا درد اور تڑپ موجود ہے۔ کچھ لوگ عشق مجازی کی منزل تک ہی محدود ہو گئے۔ چناں چہ دہلی میں عشق کے یہ تینوں مدارج موجود ہیں۔ مثلاً دردؔ جیسے شاعر نے عارفانہ شاعری کی اور عشق حقیقی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔

قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے
اس کا پیام دل کے سوا کون لاسکے

(دردؔ)

عشق کا دوسرا انداز دہلی میں بہت مقبول ہوا۔ اس میں عشق حقیقی کے ساتھ ساتھ عشق مجازی کے جذبات بھی شامل ہو گئے۔ دہلی کے تمام شعرا نے بڑی خوب صورتی سے عشق حقیقی وعشق مجازی کے جذبات کو شاعری کا روپ دیا۔ یہ رنگ میر تقی میرؔ نے بہت خوبی سے نبھایا۔ ان کے جذبۂ عشق میں وہ خلوص اور گہرائی تھی جس نے ان کی شاعری کو بلندی عطا کی۔ عشق کا یہ تیکھا انداز دبستان دہلی سے مخصوص ہوا۔ میرؔ کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

قامت خمیدہ رنگ شکستہ بدن نزاد
تیرا تو میر غم میں عجب حال ہو گیا

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
نادان، پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لوہو آتا ہے جب نہیں آتا

عالم عالم عشق و جنون ہے دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

غالبؔ جذبات عشق کو سیدھا سادھا نہیں بیان کرتے بلکہ پر لطف طریقے سے بیان کرتے ہیں۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہوجائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

گر چہ ہے طرز تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پاجائے ہے

داغؔ کے یہاں جذبات عشق شوخی کے ساتھ ملتا ہے۔داغؔ کی شاعری کا عاشق ومعشوق دونوں شوخ و چلبلا ہے۔

رنج کی جب گفتگو ہونے لگی
آپ سے تم، تم سے تو، ہونے لگی

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

5.3.4 واقعیت وصداقت:

دبستان دہلی کی شاعری پرواقعیت وصداقت کا اثر رہا۔دبستان دہلی کے شعرانے حقیقت بیانی کی اور مبالغہ سے زیادہ کام نہیں لیا۔اگر چہ مبالغہ کا استعمال شاعری میں برانہیں لیکن جس کسی چیز کا استعمال حد سے تجاوز کر جائے تو پھر اسے مناسب نہیں سمجھا جا تا۔اسی طرح حد سے زیادہ مبالغہ شاعری کو مضحکہ خیز بنا دیتا ہے۔شعرائے دہلی کے پاس واقعیت،صداقت اوراعتدال پایا جا تا ہے۔دوسری بات یہ کہ صداقت کے اظہار کے لیے پر تکلف زبان کو بھی موزوں سمجھا جا تا ہے۔

سخت کافر تھا جن نے پہلے میرؔ
مذہب عشق اختیار کیا
(میرؔ)

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے
(ذوقؔ)

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی
آشیاں اپنا ہوا برباد کیا
(مومنؔ)

5.3.5 حزن ویاس:

دبستان دہلی کی شاعری کی اہم خصوصیت رنج والم اور حزن ویاس کا بیان بھی ہے۔مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ دبستان دہلی کی شاعری میں یاس وناامیدی کے جذبات بہ کثرت موجود ہیں۔شاعر خواہ کسی موضوع پر بات کرے رنج وغم کا ذکر ضرور آ جاتا ہے۔جس کا سبب دہلی کی بدحالی کا وہ دور ہے جب کسی کو اطمینان سکون حاصل نہ تھا اور زندگی ایک خواب پریشان بن کر رہ گئی تھی۔ان حالات کا شاعری پر بھی گہرا اثر نظر آتا ہے۔خصوصاً میرؔ وسوداؔ کے دور میں زندگی کی ناپائیداری کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

انشا جیسے زندہ دل انسان کی شاعری میں حزن ویاس موجود ہے تو سنگلاخ زمینوں پر شاعری کرنے والے شاہ نصیر کے یہاں بھی حزن ویاس کے جذبات ملتے ہیں۔مومن کی شاعری میں حزن ویاس کا ایک منفرد لہجہ ہے تو میر حسن تسکینؔ کی شاعری میں حزن ویاس کے ساتھ دلکشی بھی ملتی ہے۔

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
(انشاؔ)

کدھر کو جاؤں نکل کے یارب کہ گرم و سردِ زمانہ مجھ کو
دکھائے ہے شام تک سحر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
(نصیرؔ)

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
(مومنؔ)

یاں انتظار میں ہے کٹی مجھ کو ساری رات
واں وعدہ کیا کیا تھا انہیں یاد بھی نہیں
(تسکینؔ)

غالبؔ نے بھی حزن و یاس کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا مگر اپنا منفرد لب ولہجہ ہمیشہ قائم رکھا۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
(غالبؔ)

5.3.6 سادگی:

دبستان دہلی سے وابستہ شعرا کی زبان میں سادگی، صفائی اور شستگی پائی جاتی ہے۔ وہ دہلی کے روزمرہ محاوروں کا استعمال کرتے ہیں۔ عربی وفارسی الفاظ کو استعمال کر کے الفاظ کو بوجھل بنانے کے بجائے ہندی کے شیریں و بے تکلف الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ سنگلاخ زمینوں کے بجائے مترنم بحروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس طرح صفائی، سادگی، سلاست ومتانت دہلوی شاعری کے ساتھ مخصوص ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار کی روشنی میں زبان وبیان کی مذکورہ خصوصیات کا کسی قدر اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے
جس لیے آئے تھے سو ہم کر چلے
(دردؔ)

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
(دردؔ)

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
(میرؔ)

گزر مرا ترے کوچے میں گو نہیں نہ سہی
مرے خیال میں تو لاکھ بار گزرے ہے
(سوداؔ)

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
(غالبؔ)

سید میر سوزؔ کا کلام سیدھا سادا ہے جس میں تکلف و تصنع نہیں پایا جاتا۔ وہ طرحیں بھی آسان اختیار کرتے ہیں۔ درویشی اختیار کرنے والے میاں صلاح الدین تمکینؔ کے کلام میں تصوف اور سادگی ملتی ہے۔ شیخ غلام علی راسخؔ کے یہاں سادگی و صفائی خصوصی طور پر پائی جاتی ہے۔ شیفتہؔ کے یہاں سادگی و سنجیدگی ملتی ہے۔ میر نظام الدین علویؔ کی زبان بھی سادہ و سلیس ہے۔ چند اشعار پیش ہیں۔

جس نے ہر درد کو درماں بخشا
مجھ سے کافر کو بھی ایماں بخشا
(سوزؔ)

چشم معشوق کو دی عیاری
سوزؔ کو دیدۂ گریاں بخشا
(سوزؔ)

حسن اور عشق کو جس روز کہ ایجاد کیا
مجھ کو دیوانہ کیا تجھ کو پری زاد کیا
(تمکینؔ)

جب تجھے خود آپ سے بیگانگی ہوجائے گی
آشنا تب تجھ سے وہ دیر آشنا ہوجائے گا
(راسخؔ)

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہؔ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی
(شفتہؔ)

الٰہی وہ جو وعدے ہیں وفا کس طرح ہوویں گے
نہ واں خو یاد آنے کی نہ یاں شیوہ تقاضے کا
(ممنونؔ)

بہادر شاہ ظفر پند و نصائح کے مضامین نہایت سادہ زبان میں پیش کرتے ہیں۔

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے دوسروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر، تو نظر میں کوئی برا نہ رہا
(ظؔفر)

ظؔفر آدمی اس کو نہ جانئے گا وہ ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا
(ظؔفر)

حالی نے اردو شاعری کو ایک نئی سمت دی۔ مقدمہ شعر و شاعری کے ذریعہ نہ صرف اردو کے شعری اصناف میں بڑی تبدیلی کی بلکہ اردو شاعری کی تنقید کی بنیاد رکھی۔ ان کے یہاں بھی سادگی ملتی ہے۔ حاؔلی کے اشعار ملاحظہ ہوں:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

بہت لگتا ہے دل صحبت میں اس کی
وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے

5.3.7 اختصار:

شعرائے دہلی کے کلام میں جہاں زبان میں سلاست و روانی کا عنصر نمایاں ہے وہیں اختصار بھی پایا جاتا ہے۔ اس دور میں دوسری اصناف کے مقابلے میں غزل کی شاعری اختصار کی متقاضی ہوتی ہے۔ اس میں نظم کی طرح تفصیل نہیں ہوتی بلکہ بات اشاروں اور کنایوں میں کی جاتی ہے۔ اس لیے ان شعرا کے پاس اختصار ملتا ہے۔ نیز غزل کا مخصوص ایمائی رنگ بھی موجود ہے۔ یہاں کے شعرا اپنے دلی جذبات و احساسات کو جوں کا توں بڑی فن کاری سے پیش کر دیتے ہیں۔

ہم نشیں ذکر یار کر کچھ آج
اس حکایت سے جی بہلتا ہے
(قائؔم)

میر صاحب رُلا گئے سب کو
کل وے تشریف یاں بھی لائے تھے

دل مجھے اس گلی میں لے جاکر
اور بھی خاک میں ملا لایا
(میؔر)

5.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ دہلی میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ولؔی کے دیوان سے ہوا۔ اس سے قبل دہلی میں فارسی میں شعروشاعری کا چرچا تھا اور اردو میں شاعری کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ولؔی کی اردو شاعری کی مقبولیت کی بڑی وجہ ان کی شاعری میں ان خصوصیات کا پایا جانا تھا جو صرف فارسی شاعری کی خصوصیات سمجھی جاتی تھیں۔

☆ ولؔی کی اس مقبولیت نے دوسرے شعرا کو بھی اردو شاعری کی طرف متوجہ کیا۔ کچھ شعرا نے فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہنے کی کوشش کی تو کئی شعرا نے ولؔی کی غزلوں پر غزلیں کہہ کر دیوان تیار کر لیا۔ حاتؔم، آبؔرو، فائؔز وغیرہ نے اردو میں شعر کہہ کر اردو شاعری کو فروغ دیا۔

☆ دبستان دہلی کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ابتدائی دور اردو کا پہلا دور کہلایا۔ پھر ایہام گوئی کا دور رہا جسے دوسرا دور کہا گیا۔ تیسرا دور یعنی میؔر وسوؔدا کا دور دور متقدمین کہلایا چوتھا دور مصحفؔی، جرأت، انشا اور رنگؔین کا دور رہا جب کہ پانچواں دور یعنی غالبؔ، ذوقؔ اور ظفر کا زمانہ دور متوسطین کہلایا۔

☆ ابتدائی طور پر اردو شاعری کے وہی موضوعات رہے جو اس وقت کی مقبول زبان فارسی شاعری کے موضوعات تھے۔ فارسی شاعری میں عاشق ومعشوق جس طرح کا ہوتا تھا اردو میں بھی اسی طرح پیش کیا گیا۔ تشبیہ واستعارہ، صنائع وبدائع بھی فارسی زبان سے ماخوذ ہوئے۔

☆ اردو شاعری میں بھی تصوف کے موضوعات کو فروغ ملا۔ وحدت الوجود، وحدت الشہود، فنا و بقا، دنیا کی بے ثباتی جیسے موضوعات کو جگہ ملی۔ شاعری میں فارسی شاعری کے موضوعات اور الفاظ کا کافی اثر رہا۔ اردو میں تشبیہات واستعارات استعمال کرتے وقت فارسی کے الفاظ کو ترجمہ کر کے داخل کرنے کی کوشش ہوئی۔

☆ ابتدائی دور میں دبستان دہلی کے شعرا کے یہاں فارسیت کا غلبہ زیادہ تھا۔ اردو شاعری کے ابتدائی دور میں نہ صرف موضوعات بلکہ فارسی الفاظ بھی کثرت سے استعمال ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فارسی اسلوب اور موضوعات وغیرہ دہلی کے دبستان شاعری میں شامل ہو گئے۔

☆ اردو شاعری پر جہاں فارسی شاعری کے اثرات قائم ہوئے وہیں ہندی کا بھی اثر رہا۔ مضموؔن، آبؔرو، حاتؔم، خان آرزو وغیرہ کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ ہندی اور دکنی الفاظ کا زیادہ استعمال کرتے تھے۔ مگر بعد کے زمانے میں الفاظ میں کئی تبدیلیاں ہوئیں جیسے نین کو چشم، ساجن کو معشوق، سنسار کو دنیا، تن من کو جان ودل، جگ کو دنیا، ناکو نہیں اور پیا کو معشوق سے تبدیل کیا گیا۔

☆ دوسرے دور میں فارسی افعال ومحاورات کے تراجم کواردو میں رائج کیا گیا۔سب سے زیادہ مصادر میں تبدیلی پر توجہ دی گئی جیسے فارسی 'آب آب شدن' اردو میں 'پانی پانی ہونا' ہوا،اسی طرح ''دل از دست رفتن'' کو 'ہاتھ سے دل جانا' بنایا گیا''،''از جان گزشتن'' اردو میں ''جان سے جانا'' اور''زبان دراز کردن'' کو''زبان دراز کرنا'' بنایا گیا۔ہندی کے ٹھیٹھ الفاظ کوترک یا تبدیل کیا گیا۔

☆ تیسرا دور انشا، مصحفی اور جرأت کا ہے۔انشاء کی کتاب ''دریائے لطافت'' سے اس زمانے کی زبان کے حوالے کئی اہم باتیں ملتی ہیں۔انشاء کے مطابق ہر وہ لفظ جو اردو میں مشہور ہو گیا اگر چہ وہ کسی دوسری زبان جیسے عربی، فارسی،ترکی یا پنجابی کا ہو، وہ اردو کا لفظ ہے۔اسی طرح اردو میں جولفظ مستعمل ہے وہ صحیح ہے،اگر چہ وہ لغت کی رو سے غلط ہو۔

☆ چوتھا دور دہلی میں شاہ نصیر، ذوق، مومن اور غالب کا جب کہ لکھنؤ میں ناسخ اور آتش کا دور تھا۔اس دور میں بھی اردو زبان میں مزید قواعد بدلے گئے، مذاق شعری کے مطابق شعرا کسی لفظ کو اختیار کرتے یا ترک کر دیتے مگر باقاعدہ اصول نہیں بنائے گئے۔اس طرح دہلی کی زبان میں کافی صفائی وشستگی پیدا ہوگئی البتہ قدیم الفاظ اور تراکیب بھی باقی رہے۔غرض دہلویت نے کبھی اپنے پرانے لباس کو بالکل اتار کر نہیں پھینکا اس نے قواعد سے زیادہ رواج کو برتا۔

☆ اس دور میں لکھنؤ کی زبان میں کافی تبدیلیاں ہوئیں۔ناسخ نے اصلاح زبان کے قواعد بنائے، دہلی کے الفاظ اور محاوروں کے بجائے لکھنؤ کے الفاظ، محاوروں، تذکیر وتانیث اور تلفظ کو اصول وقواعد کے مطابق رواج دیا۔اس وقت تک زبان اردو کو ریختہ کہا جاتا تھا، ناسخ کے وقت اس کا نام اردو مقرر ہوا۔غزل کو لوگ ریختہ کہتے تھے ناسخ نے غزل کا لفظ جاری کیا اس طرح ریختہ کا لفظ ہر معنی میں متروک ہو گیا۔جہاں تک ممکن ہوسکا ہندی الفاظ کے بجائے عربی الفاظ استعمال کیے گئے۔تمام مستعمل الفاظ کے تذکیر وتانیث کے قاعدے بنائے وغیرہ۔

☆ دبستان دہلی کا پانچواں دور اہم شاعر داغ کا دور ہے۔داغ اگر چہ ذوق کے شاگرد رہے مگر داغ نے ان کی پوری طرح پابندی نہیں کی۔ ذوق کے یہاں مضمون اعلیٰ ہے، داغ کے یہاں روانی، داغ وہ زمینیں اختیار نہیں کرتے جو لکھنؤ میں متروک ہیں، داغ دلی کے محاورات کو کثرت سے باندھتے ہیں۔داغ کے یہاں دبستان دہلی کی زبان زیادہ صاف، با محاورہ اور سلیس نظر آتی ہے۔ جہاں دبستان دہلی کا محاورہ اور لکھنؤ کے اصول بھی ہیں۔اس طرح دبستان دہلی کی زبان میں ایک ایسا اثر پیدا ہوا جو پہلے نہ تھا۔

☆ دہلی میں سیاسی وسماجی حالات اگر چہ بدتر رہے مگر اس دور میں شاعری نے کافی ترقی کی۔البتہ اردو شاعری دہلی کی اس ناگفتہ بہ حالات سے ضرور متاثر رہی۔اس انتشار اور ذہنی بےاطمینانی کے اثرات جہاں دہلی کے شعر وادب پر بھی پڑ رہے تھے وہیں شعرا کی عام زندگی پر بھی اثر پڑا۔یہی وجہ ہے کہ اس دور کے شعرا کے اشعار میں غم کی لہر کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ اس طرح سادگی، صفائی، یاس ونا امیدی سے اردو شاعری متاثر رہی۔

☆ ولی کی شاعری کی مقبولیت کی بڑی وجہ اردو شاعری میں ان خوبیوں کا پایا جانا تھا جو صرف فارسی میں پائی جاتی تھی۔ولی نے بڑی خوبی کے ساتھ فارسی شاعری کے موضوعات کو اردو میں پیش کر کے عوام وخواص سبھی کو متوجہ کر دیا۔اس طرح اردو شاعری پر بھی ان موضوعات خصوصاً تصوف کا اثر رہا جنہیں فارسی شاعری میں پیش کیا جاتا تھا۔بعد کے آنے والے شعرا جیسے میر، سودا، درد، غالب نے تصوف کے موضوع کو

اس طرح پیش کیا کہ ولؔی سے کافی آگے نکل گئے۔

☆ دبستان دہلی کے شعرا میں مرزا محمد رفیع سوؔدا، میر تقی میرؔ، میر عبدالحی تاباںؔ، انعام اللہ خاں یقیںؔ، میر محمد حسین کلیمؔ، خواجہ میر دردؔ، محمد میر سوزؔ، اشرف علی خاں فغاںؔ، میر ضیاء الدین حسین ضیاؔ، شیخ قیام الدین قائمؔ، جعفر علی حسرتؔ، سعادت یار خاں رنگیںؔ، ذوقؔ، اسداللہ خاں غالبؔ، مومن خاں مومنؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، محمد مصطفیٰ خاں شیفتہؔ، میر نظام الدین ممنونؔ، میر حسن تسکیںؔ، داغؔ، میر مہدی مجروحؔ، محمد حسین آزاد، اور الطاف حسین حالؔی وغیرہ دہلوی شعرا کہلائے۔

☆ موضوعات اور زبان کے علاوہ دبستان دہلی کے دیگر اثرات بھی اردو ادب پر مرتب ہوئے۔ دہلی کی بدحالی سے درباری شاعری کم ہوئی جس سے قصیدہ کو زوال ہوا۔ ریختی کو بھی زوال ہوا۔ البتہ غزل کو کافی ترقی ملی اور وہ اپنی معراج کو پہنچی۔ میر جیسا خدائے سخن شاعر نے موسیقیت، استعارہ، کنایہ کی جلوہ گری کی کہ بعد کی شاعری پر میرؔ کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ سنگلاخ زمینوں کی طرف شعرا کا رجحان کم ہوا۔ شعرا نے اپنے کلام میں تغزل کا خاص خیال رکھا۔

☆ دبستان دہلی کی شاعری میں موضوعات یا دیگر اثرات جو مرتب ہوئے ان میں تصوف، داخلیت، سادگی وصفائی، عشق حقیقی، عشق مجازی، نازک خیالی، نادر تشبیہات واستعارات اور خیال کی بلندی وغیرہ ہے جو دبستان دہلی کی خصوصیات بھی ہیں۔ زبان وبیان کا معاملہ ہو کہ موضوعات و پیش کش کا، دبستان دہلی کی ان خصوصیات کا اثر مابعد کی شاعری پر بھی رہا۔

5.5 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
شہود	:	حاضر ہونا
گردش	:	تغیر، چکر لگانا
مستعار	:	مانگا ہوا
تہمت	:	الزام
خودبیں	:	خود پسند
شرار	:	چنگاری
حباب	:	پانی کا بلبلہ
تغافل	:	جان بوجھ کر غفلت کرنا

5.6 نمونۂ امتحانی سوالات

5.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ دہلی میں ولؔی کا دیوان کب آیا؟

2۔ ابتدائی طور پر دبستان دہلی پر کس زبان کا اثر رہا؟

3۔ دبستان دہلی کی شاعری کو کتنے ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے؟

4۔ تصوف کس دبستان شاعری کی خصوصیت ہے؟

5۔ ریختہ کس زبان کا پرانا نام ہے؟

6۔ دریائے لطافت کس کی کتاب ہے؟

7۔ دبستان دہلی کے چند اہم شعرا کے نام تحریر کیجیے۔

8۔ تصوف سے متعلق میرؔ کا کوئی شعر تحریر کیجیے۔

9۔ خاقانی ہند کس شاعر کو کہا جاتا ہے؟

10۔ درج ذیل شعر کس شاعر کا ہے؟

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

5.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ولیؔ کی اردو شاعری کی مقبولیت کی وجوہات پر روشنی ڈالیے۔

2۔ دبستان دہلی کے مختلف ادوار میں جن موضوعات کا اثر رہا، ان کی نشاندہی کیجیے۔

3۔ دبستان دہلی کے اہم شعرا میرؔ و غالبؔ کی شاعری کا اردو شاعری پر کیا اثرات مرتب ہوئے، تحریر کیجیے۔

4۔ دردؔ کی شاعری پر تصوف کے اثرات پر مختصر روشنی ڈالیے۔

5۔ داخلیت اور حزن و یاس کے اثرات کو مثالوں سے واضح کیجیے۔

5.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ دبستان دہلی کے مختلف ادوار میں اردو شعر و ادب پر زبان کے کیا اثرات مرتب ہوئے، تحریر کیجیے۔

2۔ دبستان دہلی کے موضوعات کا اردو شعر و ادب پر کیسے اثرات مرتب ہوئے، مع مثال تحریر کیجیے۔

5.7 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	دلی کا دبستان شاعری	نورالحسن ہاشمی
2۔	دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر	محمد حسن
3۔	مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالیؔ
4۔	میر تقی میرؔ (مونوگراف)	مظفر حنفی

اکائی 6 : دبستانِ لکھنؤ کا تعارف

اکائی کے اجزا

6.0 تمہید

6.1 مقاصد

6.2 دبستانِ لکھنؤ کا سماجی و تہذیبی پس منظر

6.3 دبستانِ لکھنؤ کی خصوصیات

6.3.1 معاملہ بندی

6.3.2 رعایت لفظی

6.3.3 قافیہ پیمائی

6.3.4 مضمون آفرینی

6.3.5 پیچ دار تشبیہات و استعارات

6.3.6 ریختی

6.4 دبستانِ لکھنؤ کے اہم شعرا

6.4.1 شیخ قلندر بخش جرأت

6.4.2 انشا اللہ خاں انشاؔ

6.4.3 شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ

6.4.4 شیخ امام بخش ناسخؔ

6.4.5 خواجہ حیدر علی آتشؔ

6.5 دبستانِ لکھنؤ کے دیگر شعرا

6.6 اکتسابی نتائج

6.7 کلیدی الفاظ

6.8 نمونہ امتحانی سوالات

6.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

6.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

6.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
6.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

6.0 تمہید

’دبستان‘ فارسی زبان کا لفظ ہے، جس سے ادب میں اسکول یا مدرسہ مراد ہوتا ہے یعنی کسی علاقے یا مخصوص زمانے کے اکثر شعرا کا مشترکہ طرزِ سخن یا اسلوب بیان، جسے شعرا وادبا کی کثیر تعداد شعوری یا غیر شعوری طور پر تسلیم کر کے اس کی پیروی کو قابل قدر تصور کرتی ہو۔ اردو ادب میں خصوصاً چار دبستان مشہور ومعروف ہیں۔ دبستانِ دہلی، دبستان لکھنؤ، دبستان رامپور اور دبستان عظیم آباد۔ یہ چاروں دبستان اپنے درمیان امتیازات وافتراقات کے باوجود اہم تسلیم کیے جاتے ہیں اور اردو زبان وادب کے فروغ میں ان میں سے کسی کی بھی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے بالخصوص دہلی اور لکھنؤ کے دبستان تو ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں اگر کسی ایک کا ذکر مقصود ہو تو خواہی نخواہی دوسرے کا ذکر آ ہی جاتا ہے۔ گویا دبستان دہلی کی تفہیم دبستانِ لکھنؤ اور دبستانِ لکھنؤ کی تفہیم دبستانِ دہلی پر موقوف ہے۔ سردست ہمیں دبستانِ لکھنؤ کا ذکر مقصود ہے کہ دبستانِ لکھنؤ کیوں کر وجود میں آیا؟ اردو ادب میں اس کی اہمیت کیا ہے؟ اور اس کی خصوصیات کیا ہیں؟ جس طرح دہلی کی زبان میں سادگی، سلاست اور روانی اہم حیثیت رکھتی ہے اسی طرح لکھنؤ کی زبان تصنع، تکلفات اور خارجی لوازمات کے باعث منفرد مقام رکھتی ہے۔ لکھنوی شعرا نے محبوب کا سراپا بیان کرنے میں جس اسلوب کو اختیار کیا ہے وہ ان کے لیے تو باعث افتخار سمجھا جا سکتا ہے مگر دلی کے شعرا اسے باعثِ عار سمجھتے تھے۔ غرض یہ کہ دونوں دبستانوں کے مابین بعد المشرقین کے باوجود کسی کی اہمیت کو کم نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ جہاں ایک طرف لکھنوی شعرا وادبا پر عریانیت وفحاشی کے فروغ کے الزامات عائد ہوتے رہے ہیں وہیں اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ زبان کی اصلاح، ریختی کے فروغ اور صنعتوں کے استعمال میں لکھنوی شعرا نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

6.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ دبستان کے معانی ومفاہیم واضح کر سکیں۔
☆ دبستانِ لکھنؤ کا تعارف پیش کر سکیں۔
☆ دبستانِ لکھنؤ کی تشکیل کے اسباب بیان کر سکیں۔
☆ دبستانِ لکھنؤ کی خصوصیات مثالوں کے ساتھ سمجھا سکیں۔
☆ لکھنؤ کے نمائندہ شاعر جرأت کی شخصیت اور شاعری پر گفتگو کر سکیں۔
☆ انشا کی شاعری کی خصوصیات بیان کر سکیں۔
☆ مصحفی کے طرزِ سخن کے بارے میں اظہار خیال کر سکیں۔
☆ ناسخ کے کلام کی فنی خصوصیات بیان کر سکیں۔
☆ آتش کے کلام پر گفتگو کر سکیں۔

☆ دبستانِ لکھنؤ کے بعض دیگر شعرا کے بارے میں گفتگو کرسکیں۔

6.2 دبستانِ لکھنؤ کا سماجی وتہذیبی پس منظر

دبستانِ لکھنؤ سے مراد شعر وادب کا وہ اسلوب ہے جسے لکھنؤ کے شعرائے متقدمین نے اپنایا تھا جو اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر قدیم اردو شاعری اور دبستان دہلی سے مختلف ہے۔ لکھنؤ کے مرجعِ علم ودانش بننے سے قبل ہی علم وادب کے دو بڑے مرکز دہلی اور دکن پہلے ہی شہرت پا چکے تھے۔ لیکن جب دہلی میں قتل وغارت گری کا بازار گرم ہوا تو دہلی کے اہل علم وفضل نے دہلی سے ہجرت کو ترجیح دی اور دیکھتے ہی دیکھتے علم وادب کے بڑے بڑے ناموں سے دہلی خالی ہوگئی۔ اس طرح دوسرے مقامات خصوصاً لکھنؤ کو شعرا وادبا کی ہجرت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان مہاجر شعرا وادبا کا لکھنؤ کو ترجیح دینا دوسبب سے تھا۔ ایک تو دہلی سے لکھنؤ کی مسافت بالمقابل دوسرے محفوظ مقامات کے کم تھی دوسرا یہ کہ لکھنؤ میں مال ودولت کی فراوانی نے بھی انھیں اپنی طرف متوجہ کیا چوں کہ لکھنؤ کی ریاست اپنے آغاز سے ہی اہل علم ودانش کی قدر دان رہی ہے ایسے میں دہلوی شعرا کا لکھنؤ کی طرف ہجرت کرنا نہ صرف ان کی زندگی کے لیے بلکہ اردو ادب کے فروغ کے لیے بھی نہایت مفید فیصلہ ثابت ہوا۔

1707ء میں جب مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا انتقال ہوا تو مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹمانے لگا۔ ان کے جانشین تخت کے لیے آپس میں ہی لڑنے لگے۔ جاٹوں، مرہٹوں اور سکھوں نے بھی مرکز کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر سر اٹھانا شروع کردیا اور باقی کسر نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی نے پوری کردی اور اس طرح مغل سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔

مغل بادشاہ محمد شاہ نے 1722 میں سعادت علی خاں کو اودھ کا صوبیدار مقرر کیا مگر سعادت علی خاں نے مرکز کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خودمختاری کا اعلان کردیا اور اودھ کی خوشحالی کے لیے بھرپور جدوجہد کی جس کی وجہ سے اودھ میں مال ودولت کی فراوانی ہوگئی۔ سعادت علی خاں کے بعد ان کے جانشینوں صفدر جنگ، شجاع الدولہ نے بھی اودھ کی ترقی اور عوام کی فلاح وبہبود کے لیے کوششیں جاری رکھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند سالوں کے اندر ہی اودھ کی ریاست عیش ونشاط کا مرکز بن گئی۔ وہیں دوسری طرف دلی کے حالات روز بہ روز خراب ہوتے چلے گئے تو دلی کے شعرا وادبا نے دلی کو خیر باد کہنے میں ہی عافیت سمجھی اور لکھنؤ کا رخ کیا جن میں میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا، غلام ہمدانی مصحفی اور شیخ قلندر بخش جرأت کے نام خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ شعرا کی لکھنؤ آمد سے لکھنؤ کی ادبی محفلوں میں جان پڑ گئی اور اس طرح دبستان لکھنؤ بتدریج مستحکم ہوتا چلا گیا۔

اودھ کی ریاست میں یوں تو گیارہ حکمرانوں کا ذکر ملتا ہے۔ مگر سعادت علی خاں جنھیں ریاست اودھ کا بنیاد گزار ہونے کا شرف حاصل ہے اور ان کے بعد شجاع الدولہ، آصف الدولہ اور سعادت علی خاں دوم کے نام خصوصاً قابل ذکر ہیں جنھوں نے سلطنت اودھ اور فنون لطیفہ کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اودھ کی ریاست تقریباً ایک سو پینتیس (135) سال قائم رہی۔ ابتدا میں اس کا دارالسلطنت فیض آباد تھا۔ فیض آباد کی تعمیر و ترقی میں شجاع الدولہ اور ان کی اہلیہ بہو بیگم نے خاصی دلچسپی لی اور اسے ادبی وثقافتی اعتبار سے نئی پہچان عطا کی۔ جب دہلی اجڑی تو شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ دوسرے فنون سے متعلق فنکاروں اور مختلف پیشوں سے وابستہ افراد نے بھی لکھنؤ کا رخ کیا۔ شاہان اودھ بذاتِ خود ادبی وثقافتی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور اہل فضل وکمال کی بھرپور قدر دانی بھی کرتے تھے۔ شجاع الدولہ کے بعد جب آصف الدولہ نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو فیض آباد کے بجائے لکھنؤ کو دارالسلطنت بنایا، انھیں کے عہد میں لکھنؤ میں فن تعمیر کے اعلیٰ نمونے وجود میں آئے۔ امام باڑہ

اورشاہی محل انھیں کی یادگار ہیں۔ وہ خود بھی شاعر تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے اور شعرا کی پذیرائی بھی کرتے تھے۔ میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا اور میر سوز انھیں کے عہد میں لکھنؤ آئے۔ اودھ کی تاریخ میں آصف الدولہ اور ان کے بھائی سعادت علی خاں دوم کا دور عہد زریں سمجھا جاتا ہے۔ سعادت علی خاں دوم کے بعد غازی الدین حیدر نے بھی حکومت کی مگران کے عہد تک انگریزوں کا اثر ورسوخ بڑھنے لگا تھا۔ اودھ کے آخری حکمراں نواب واجد علی شاہ تھے جو اپنی رنگین مزاجی کے لیے خاصے مشہور تھے، لیکن اس کے برساتھ انہیں فنون لطیفہ سے بھی خاصی دلچسپی تھی وہ متعدد کتابوں کے مصنف ومولف تھے۔ اردو زبان کے ساتھ ساتھ فارسی زبان سے بھی شغف رکھتے تھے۔ واجد علی شاہ کے عہد تک اودھ کی سلطنت بھی اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ انگریزوں نے اس آخری نواب کو معزول کر کے مٹیا برج بھیج دیا اور اس طرح کی فراخ دلی وسخاوت، باہمی محبت واخوت، ادب دوستی اور اہل علم ودانش کی قدردانی وسرپرستی کرنے والا چراغ جسے برہان الملک سعادت خاں نے 1722 میں روشن کیا تھا وہ 1856 میں واجد علی شاہ کی معزولی کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گل کر دیا گیا۔ اگرچہ واجد علی شاہ کی اہلیہ بیگم حضرت محل نے اپنے بیٹے برجیس قدر کی بحالی کے لیے بھرپور جدوجہد کی مگر وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکیں حالاں کہ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے اعلیٰ ہمتی اور اولوالعزمی کا ثبوت دیتے ہوئے انگریزوں کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے اور بقدرِ استطاعت اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے کوشاں رہیں مگر نتیجہ مثبت نہ نکلا۔

شاہان اودھ میں برہان الملک، سعادت خاں، شجاع الدولہ، آصف الدولہ، سعادت علی خاں، غازی الدین حیدر اور واجد علی شاہ کے نام بھی تاریخ اودھ میں اہمیت واحترام کے قابل سمجھے جاتے ہیں اور ان کا یہ وقار نہ صرف امور مملکت کو بحسن وخوبی انجام دینے کے لیے بلکہ ادب نوازی، اہل فن کی قدردانی اور اپنے مخصوص معاشرتی نظام کے نفاذ کے لیے آج بھی قائم ہے۔ جیسا کہ ہر علاقے کی اپنی تہذیب ہوتی ہے جس کی بنا پر اس علاقے کی انفرادیت قائم ہوتی ہے اسی طرح لکھنؤ کی بھی اپنی منفرد تہذیبی روایت ہے جس کے اثرات آج بھی نمایاں طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ لکھنؤ کی تہذیب وشائستگی کی جھلک وہاں کے لباس، رہن سہن، طرز زندگی، عادات واطوار میں نمایاں طور پر ملتی ہے۔ لکھنؤ کے نوابین چوں کہ مسلکاً شیعہ تھے اس لیے وہاں کی تہذیب میں اہل تشیع سے متعلق رسوم وروایات، عقائد وتوہمات کی صاف جھلک دکھائی دیتی ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ دیگر اصناف شاعری کی بہ نسبت مرثیہ نگاری کو بے حد عروج حاصل ہوا۔ لکھنؤ میں طوائفوں کو معاشرے کا اہم جز سمجھا جاتا تھا اور ان کے کوٹھے پر بچوں کو آدابِ محفل اور شائستگی سیکھنے کے لیے بھیجا جاتا تھا اس کی اہم وجہ یہ تھی کہ امرا اور شریف الطبع افراد بھی طوائفوں کے یہاں آمد ورفت کو معیوب نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کے بازار، باغات، سڑکیں اور چوک وغیرہ بھی اپنی خاص پہچان رکھتے ہیں۔ لکھنؤ میں ایام عزا (محرم) کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ اسی لیے وہاں چھوٹے بڑے متعدد امام باڑے ہیں جن میں بعض ادبی اور تاریخی حیثیت کے حامل ہیں۔ لکھنؤ کے نوابوں وامرا کی طرح وہاں کے عوام بھی فنون لطیفہ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اسی لیے کبوتر بازی، بٹیر بازی، مرغبازی کے ساتھ ساتھ خطاطی، موسیقی اور مصوری سے وابستہ افراد بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ لکھنؤ اپنی منفرد تہذیبی، ثقافتی، ادبی اور تعمیری خصوصیات کے ساتھ شائستگی اور خوش مزاجی کے لیے بھی ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وہ خاکہ ہے جسے دبستان لکھنؤ کے تعارف میں اس کے سماجی اور تہذیبی پس منظر کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، جس سے وہاں کے ادبی مذاق کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

6.3 دبستان لکھنؤ کی خصوصیات

بیشتر نقادوں نے دبستانِ لکھنؤ کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ لکھنؤ میں دلی کے مقابلے میں خارجیت کا عنصر نمایاں ہے۔ واردات قلبی

اور جذبات واحساسات کی ترجمانی اور بیان کے بجائے شعرائے لکھنؤ کا زیادہ زور محبوب کے لوازم ظاہری اور متعلقات خارجی کے بیان پر ہے۔ دبستان لکھنؤ کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے یہاں کی شاعری میں نشاطیہ عنصر غالب نظر آتا ہے۔ لکھنؤ کی شاعری میں عورت کے حسن کا ذکر بھر پور ملتا ہے۔ اس کے لباس، زیور، جسمانی وضع قطع اور خدو خال کا ذکر جا بجا نظر آتا ہے۔ لکھنوی شاعری میں تصوف کے مضامین نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہاں کے رنگین ماحول میں نہ صوفیوں کا ذکر تھا اور نہ ہی صبر وقناعت کی تعلیم کا عنصر موجود ہے۔ زبان کے معاملے میں لکھنؤ والوں نے اہل دہلی سے اپنا الگ راستہ اپنایا۔ شعرائے لکھنؤ نے جذبات سے زیادہ الفاظ کی نوک پلک سنوارنے پر توجہ مبذول کی اور زبان میں لطافت وانفرادیت پیدا کرنے پر زور دیا۔ اس سے دبستان لکھنؤ کی زبان زیادہ دلآویز ہوگئی، جس طرح دلی کی تباہی اور غارت گری نے دہلوی شعرا کے یہاں دنیا کی بے ثباتی، قنوطیت، یاس وناامیدی جیسے عناصر پیدا کر دیے تھے اس کے برعکس لکھنؤ کا نشاطیہ ماحول شعرا وادبا کے لیے بہر طور سازگار ثابت ہوا۔ دبستان لکھنؤ کی تہذیب ومعاشرت دبستان دہلی سے بالکل الگ تھی جب سے اردو زبان پروان چڑھی دہلی ہر دور میں ہر طرح کی مصیبت سے دوچار رہی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جعفر زٹلی سے لے کر غالب اور داغ تک تمام ممتاز شعرائے دلی نے دلی کا مرثیہ لکھا۔ شعرائے دلی کے شہر آشوب اسی ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کے نالے اور آہ وفغاں اس کے گواہ ہیں۔ بادشاہ اور امرا وشرفا سے لے کر فقیر تک ہر شخص معاشی تنگدستی کا شکار تھا۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں طبیعت میں سوز وگداز اور حسرت وناامیدی کا پیدا ہو جانا یقینی ہو جاتا ہے اس کے برخلاف لکھنؤ میں آسائش وآرام کی تمام سہولتیں فراہم تھیں اور عیش وعشرت کا بازار گرم تھا۔ اس لیے وہاں کے سلاطین سے لے کر عوام میں تک سرمستی ورنگین مزاجی کا ہونا لازمی تھا۔ شعرا وادبا بھی سماج کا ہی حصہ ہوتے ہیں وہ بھلا اس سے کیسے بچ سکتے تھے لہٰذا اس ماحول کا عکس ان کے کلام میں بھی نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دلی میں تباہی وبربادی تھی تو لکھنؤ میں تعمیر وترقی کے سارے راستے کھلے تھے۔ دلی کی شاعری آہ وغم کی شاعری ہے تو لکھنؤ کی شاعری واہ اور رنگین مزاجی کی شاعری ہے۔ دبستان دہلی میں روحانی یا دلی جذبات کی کارفرمائی ہے تو دبستان لکھنؤ میں ظاہری حسن اور سراپے کا ذکر ہے۔ دلی کے شعرا نے حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا ان کی شاعری داخلی ہے اسی لیے ان کے یہاں روحانی اور متصوفانہ مضامین نظر آتے ہیں جب کہ لکھنؤ کے شعرا کے یہاں معاملہ بندی اور سراپا نگاری کی کثرت نظر آتی ہے۔ لکھنؤ کے نوابوں کی رنگین مزاجی کا اثر عوام سے لے کر شعرا پر بھی پڑا اور ان کے خیالات بھی اس قدر آلودہ ہو گئے کہ انفرادیت کے نام پر فحاشی عام ہوگئی اور فحش گوئی اور نسوانیت نے مل کر ''ریختی'' کی باقاعدہ شکل اختیار کر لی۔ ریختی میں عورتوں کے جذبات واحساسات کو انھیں کی زبان محاورے اور لب ولہجہ میں پیش کیا جاتا ہے۔

دبستان لکھنؤ کے شعرا نے اپنی تمام تر توانائی ظاہری خوب صورتی پر صرف کی، تکلف وتصنع کو لکھنوی تہذیب ومعاشرت میں زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ ناسخ کو استاد کی حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے زبان کی اصلاح کی تحریک شروع کی اور ہندی وسنسکرت کے الفاظ کو خارج کر کے عربی وفارسی کے الفاظ کو فوقیت دی۔ لکھنؤ کے شعرا کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے لغت پر زیادہ توجہ دی اور لغت کے مطابق ہی زبان کی ادائیگی پر زور دیا۔ سلاطین لکھنؤ کے شیعہ ہونے کی وجہ سے مرثیہ نگاری نے بہت ترقی کی۔ انیسؔ ودبیرؔ نے اسے بام عروج تک پہنچا دیا۔ زبان کے علاوہ معاملہ بندی، رعایت لفظی، صنعت گری، قافیہ پیمائی، مضمون آفرینی اور پیچ دار تشبیہات واستعارات کا استعمال وغیرہ یہ وہ فنی لوازمات ہیں جن سے لکھنؤ کی شاعری عبارت ہے۔ ذیل میں مذکورہ فنی لوازمات کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیا جائے گا۔

6.3.1 معاملہ بندی:

معاملہ بندی لکھنوی شاعری کا خاص جزو ہے، جس کے معنی ہیں عاشق و معشوق کے درمیان پیش آنے والے واقعات کا کھلے بندوں ذکر کرنا، جیسا کہ قبل ازیں ذکر ہوا کہ لکھنؤ کی فارغ البالی نے شعراوادبا کے خیالات میں بھی نمایاں تبدیلی پیدا کردی تھی جس کے نتیجے میں پست خیالی نے خاص جگہ بنالی تھی اس میں بھی دلی سے آئے جرأت نے خوب نام کمایا۔ معاملہ بندی کے نمونے کے طور پر ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیں، جس سے اندازہ ہوسکے کہ شعرا کس طرح کے خیالات کو فروغ دے رہے تھے:

کیا جانیے کمبخت نے کیا ہم پہ کیا سحر
جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم

کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کے وقت
ٹال کر کہنے لگا دن ہے ابھی، رات کے وقت

6.3.2 رعایتِ لفظی:

دبستانِ لکھنؤ کی ایک خصوصیت رعایت لفظی بھی ہے۔ لکھنؤ میں رعایت لفظی پر خاص توجہ دی گئی ہے کیوں کہ اس کے استعمال کو شعرا اپنی انفرادیت اور زورِ کلام کا تصور سمجھتے تھے۔ اسی لیے یہاں لفظی رعایتوں کی بھرمار ہے۔ بعض اوقات تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے شاعر کی مراد مفہوم کی ادائیگی کے بجائے رعایت لفظی کو منظوم کرنا ہو مثال ملاحظہ ہو:

قبر کے اوپر لگایا نیم کا اس نے درخت
بعد مرنے کے میری توقیر آدھی رہ گئی

وصل کی شب پلنگ کے اوپر
مثل چیتے کے وہ مچلتے ہیں

6.3.3 قافیہ پیمائی:

شعرا میں اپنی انفرادیت قائم کرنے کی اس قدر شدت تھی کہ دوسرے شعرا کو کمتر ثابت کرنے کے لیے سنگلاخ زمینوں کی تلاش میں ساری توانائی صرف کردیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنوی شاعری میں بے میل اور مشکل ردیف وقافیہ نے اصل شاعری کو پس پشت ڈال دیا۔ مثال دیکھیں:

لگی غلیل سے ابرو کی، دل کے داغ کو چوٹ
پر ایسی ہی کہ لگے تڑ سے جیسے زاغ کو چوٹ

فوج لڑکوں کی جڑے کیوں نہ تڑاتڑ پتھر
ایسی خبطی کو جو کھائے ہے کڑاکڑ پتھر

6.3.4 مضمون آفرینی:

مضمون آفرینی بھی لکھنؤ کی خاص پہچان ہے۔ اس میں شاعر پرانے اور روایتی مضامین کو ترک کر کے نئے مضامین پر زور دیتا ہے یا انھیں مضامین میں سے کچھ عجیب وغریب اور مبالغہ آمیز پہلو تلاش کر لیتا ہے۔ ایسے مضامین کی بنیاد جذبے کے بجائے واہمے پر ہوتی ہے۔ لکھنوی شعرا نے اس فن میں بھی کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔

اس نے پونچھا پسینہ روئے عالم تاب کا
بن گیا رومال کونہ چادر مہتاب کا

گلبرگ تر سمجھ کے لگا بیٹھی ایک چونچ
بلبل ہمارے زخم جگر کے کھرنڈ کو

6.3.5 پیچ دار تشبیہات واستعارات:

تشبیہ واستعارہ کو اردو شاعری میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور تقریباً ہر شاعر نے حسبِ استطاعت وضرورت ان کا استعمال بھی کیا ہے مگر دبستانِ لکھنؤ کے شعرا (باستثنائے معدودے چند) نے ان کا بے جا استعمال کر کے اپنے کلام کو بے لطف و بے مزا بنا دیا ہے۔ حد اعتدال سے متجاوز یا بے موقع تشبیہ واستعارے بھی کلام کے حسن کو متاثر کرتے ہیں جس کی مثالیں لکھنوی شعرا کے یہاں کثرت سے ملتی ہیں۔

کیاری ہر ایک اعتکاف میں ہے
اور آبِ رواں طواف میں ہے
سبزہ ہے کنارے آب جو پر
یا خضر ہے مستعد وضو پر

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دبستانِ لکھنؤ کی خصوصیات کئی جہات سے دبستان دلی کی خصوصیات سے یکسر مختلف ہیں۔ دبستانِ لکھنؤ کے شعرا نے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں نئی نئی تراکیب، مشکل ردیف وقوافی، مضمون آفرینی، معاملہ بندی، رعایت لفظی، نسائیت اور خارجی احساسات وکیفیات پر کافی زور دیا ہے۔ اس وجہ سے لکھنؤ کی شاعری میں آمد کے بجائے آورد کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ آتش کا یہ شعر لکھنوی شعرا کے فکر وفن کا ترجمان مانا جاتا ہے۔

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

اردو ادب میں دبستانِ لکھنؤ کی خدمات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ دبستانِ دہلی کی خصوصیات مسلم ہیں مگر لکھنؤ کی خصوصیات بھی امتیازی حیثیت رکھتی ہیں اس لیے یوں کہہ سکتے ہیں کہ دونوں دبستان اپنے اپنے امتیازات کے ساتھ اہمیت کے حامل ہیں۔

6.3.6 ریختی:

ریختی اردو شاعری کی ایک اہم صنف ہے۔ ریختی اس نظم کو کہتے ہیں جس میں عورتوں کی زبان، ان کے اسلوب اور خاص محاوروں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ دبستانِ لکھنؤ نے ریختی کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ بعض نقادوں نے ہاشمی بیجاپوری کو ریختی کا موجد کہا ہے، لیکن دکنی میں ہاشمی سے قبل سلطان محمد قلی قطب شاہ اور اس سے بھی پہلے بہمنی دور کے شعرا مشتاق اور لطفی کے یہاں ریختی ملتی ہے۔ مولانا آزاد اور کئی تذکرہ نگاروں نے رنگین اور انشا کو ریختی کا بانی بتایا ہے، جو دکنی ادب سے ناآشنائی کا نتیجہ ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ لکھنوی شعرا اور بالخصوص رنگین اور انشا نے ریختی کو نئی شکل عطا کی ہے اور آج جب ریختی کا ذکر کیا جاتا ہے تو رنگین اور انشا کے نام خود بہ خود زبان پر آجاتے ہیں۔ ریختی عام طور پر غزل کی شکل میں لکھی جاتی ہے اس میں عشق کے جذبات کے علاوہ خواتین کے روزمرہ مسائل اور مخصوص موضوعات کا اظہار عورتوں کی جانب سے عورتوں کی زبان اور لہجے میں کروایا جاتا ہے کہ اردو شاعری میں عشق کا اظہار ہمیشہ مردوں کی جانب سے ہوتا آیا ہے۔ ریختی کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں فحش نگاری اور شہوت انگیز باتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ رکاکت و ابتذال پسندی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ باتیں اردو شاعری کے مزاج کے خلاف ہیں مگر لکھنؤ کی رنگین فضا میں ان کا درآنا حسبِ حال معلوم ہوتا ہے۔ گویا ریختی کو لکھنوی معاشرت نے پھلنے پھولنے کا پورا موقع دیا، اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ریختی کا عروج وکمال دبستان لکھنؤ کا مرہونِ منت ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

میں وہ تو اوڑھنے کی نئیں کل کی اوڑھنی
باجی مجھے اڑھادو جھلا جھل کی اوڑھنی

گرمی کے مارے ناک میں آئی میری جان
انّا اڑھادے لاکے کوئی ہلکی اوڑھنی

(رنگیں)

6.4 دبستانِ لکھنؤ کے اہم شعرا

6.4.1 شیخ قلندر بخش جرأت:

جرأت کا معروف نام قلندر بخش اور اصل نام یحیٰ امان تھا۔ ان کے والد کا نام حافظ امان تھا۔ وہ غالباً 1748 میں دہلی میں پیدا ہوئے مگر جاٹوں اور ابدالی کے حملوں نے دلی میں شرفا کا جینا محال کردیا تھا اور لوگ نقلِ مکانی پر مجبور ہوگئے تھے۔ ایسے میں جرأت کا خاندان بھی ہجرت کر کے فیض آباد میں آباد ہوگیا۔ ناگفتہ بہ حالات کے سبب وہ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے تاہم فارسی زبان، علم طب، عروض وقواعد اور فن شعر گوئی سے بخوبی واقف تھے۔ انھیں علم نجوم میں بھی مہارت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ موسیقی سے بھی خاصی دلچسپی رکھتے تھے اور ستار بجانے میں ماہر تھے۔ جوانی میں ہی بینائی چلی گئی

تھی مگر ان پر یہ الزام بھی عائد کیا جاتا ہے کہ انھوں نے پردہ نشین گھرانوں میں بلاتکلف جانے کی غرض سے خود کو نابینا ظاہر کر رکھا تھا۔ جب 1775 میں آصف الدولہ نے دارالحکومت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کیا تو جرأت بھی فیض آباد سے لکھنؤ آ گئے اور شہزادہ سلیمان شکوہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ مصحفی اور انشا بھی سلیمان شکوہ دربار سے وابستہ تھے۔ جرأت نے ایک ضخیم کلیات اور مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں۔ کلیات میں غزلیں، رباعیات، گیت، مرثیے، سلام وغیرہ دیگر اصناف شاعری بھی موجود ہیں۔ ان کا انتقال 1809 میں ہوا۔

جرأت میں شعر گوئی کی صلاحیت فطری تھی۔ شروع میں وہ جعفر علی حسرت سے مشورۂ سخن لیتے تھے مگر مشق اور پختگی میں استاد کو پیچھے چھوڑ دیا اور دہلی اور لکھنؤ کی ہم آہنگی سے اپنی انفرادیت قائم کی۔ جرأت کا کلام زبان کے اعتبار سے صاف و شستہ ہے۔ بندش چست اور محاروں کو برمحل استعمال کرنے میں مہارت رکھتے تھے اگر چہ میر نے ان کی شاعری کو'چوما چاٹی' کی شاعری سے تعبیر کیا ہے مگر اس تحقیر و اہانت کے باوجود جرأت، میر اور مصحفی کے ہوتے ہوئے بھی مشاعروں میں زیادہ داد و تحسین وصول کرتے تھے اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میر و مصحفی دلی کی رنج و غم آمیز روایت ساتھ لائے تھے جو لکھنویت کے مزاج کے خلاف تھی کیوں کہ لکھنؤ اس وقت عیش و عشرت اور فرحت و انبساط کی محفل بنا ہوا تھا لہٰذا محبوب کی جدائی میں رونے اور آہیں بھرنے والے مضامین اہل لکھنؤ کی طبع نازک پر گراں گزرتے تھے۔ دوسری جانب جرأت اہلِ لکھنؤ کے رجحان کے مطابق محبوب کے ناز و ادا اس کے چھونے اور محسوس کرنے کے جذبات کی عکاسی کرتے تھے۔ اسی لیے ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ نواب آصف الدولہ جرأت کا دیوان ہر وقت اپنے سرہانے رکھتے تھے۔ جرأت نے غزل میں رندی، سرمستی اور خواہش پرستی کی جیتی جاگتی تصویریں کھینچ کر ایک جداگانہ رنگ پیدا کیا۔ انھوں نے عاشقی کے معاملات کو جس شوخی اور وضاحت سے بیان کیا وہی آگے چل کر دبستانِ لکھنؤ کی شاعری کا طرۂ امتیاز ٹھہرا۔

آنکھ لگتی نہیں جرأت مری اب ساری رات
آنکھ لگتے ہی یہ کیسا مجھے آزار لگا

الٰہی کیا علاقہ ہے وہ جب لیتا ہے انگڑائی
مرے سینے میں سب زخموں کے ٹانکے ٹوٹ جاتے ہیں

6.4.2 انشاءاللہ خاں انشا:

انشاءاللہ خاں انشاء 1752ء میں مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان دہلی میں آباد تھا۔ انشاء کے دادا نجف اشرف یا سمرقند سے ہجرت کر کے دہلی آئے تھے۔ ان کا خاندان دہلی میں طبابت کی وجہ سے خاص مقام رکھتا تھا۔ جب دہلی کے حالات خراب ہوئے تو انشاء کے والد سید ماشاء اللہ مرشد آباد چلے گئے، جہاں ان کی خوب پذیرائی ہوئی۔ مگر بنگال کے حالات خراب ہوتے ہی وہ وہاں سے بھی ہجرت کر کے نواب شجاع الدولہ کے پاس فیض آباد چلے گئے اور شجاع الدولہ کی وفات کے بعد پھر دہلی واپس آ گئے۔ انشاء کی تعلیم و تربیت پر ان کے والد نے خوب توجہ دی، وہ بلا کے ذہین اور فضل و کمال میں لاثانی اور ہفت زبان کے ماہر تھے اور مختلف علوم و فنون میں یکتائے روزگار تھے، جس کا انھیں خود بھی احساس تھا اس لیے ان کے معرکے بھی بہت مشہور ہیں۔ دہلی میں ان کا پہلا معرکہ عظیم بیگ سے ہوا اور جب وہ لکھنؤ پہنچے تو چوں کہ مصحفی پہلے سے ہی لکھنؤ میں اپنی شناخت قائم

کر چکے تھے لہٰذا انشاء کی مصحفی سے معرکہ آرائیاں شروع ہوگئیں، جن کی ادبی اور تاریخی حیثیت ہے۔

انشا نے شعرا کی روش عام سے ہٹ کر شاعری کی اور محض شاعر کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ اردو زبان کے ارتقائی سفر میں سنگ میل کی حیثیت سے بھی ممتاز حیثیت رکھتے ہیں بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ وہ واحد ایسے شاعر ہیں جنھوں نے شاعری میں طرح طرح کے لسانی تجربات کیے۔ اردو زبان کے قواعد پر لکھی گئی ان کی کتاب ''دریائے لطافت'' کو قواعد زبان کی پہلی کتاب مانا جاتا ہے۔ ان کی دوسری کتاب ''رانی کیتکی کی کہانی'' ہے جس میں عربی فارسی کا ایک بھی لفظ استعمال نہیں ہوا ہے۔ انھوں نے اردو میں ''سلک گہر'' لکھی جس میں ایک بھی منقوط حرف استعمال نہیں کیا، انھوں نے ایک ایسا قصیدہ بھی لکھا ہے جس میں پورے کے پورے مصرعے، عربی، فارسی، ترکی، پشتو، پنجابی، انگریزی، فرانسیسی وغیرہ میں ہیں۔ سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنا، ایسے شعر کہنا جن کا ایک مصرعہ غیر منقوط اور دوسرے مصرعے کے تمام الفاظ منقوط ہوں یا پھر ایسے شعر کہنا جن کو معنی کے اختلاف کے بغیر محض نقطوں کی تبدیلی کے بعد اردو کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی میں پڑھا جا سکتا ہو کوئی معمولی باتیں نہیں ہیں۔ اس کے لیے غیر معمولی علم و ذہانت درکار ہے۔ انشا ان سب باتوں میں مہارت رکھتے تھے۔ غالباً ان کے انھیں اوصاف کی وجہ سے محمد حسین آزاد نے انھیں اردو کا امیر خسرو کہا ہے مگر ایک سچائی یہ بھی ہے کہ خدا نے انھیں جن صلاحیتوں کا حامل بنا کر بھیجا تھا وہ انھیں مکمل طور پر بروئے کار نہیں لا سکے کیوں کہ سعادت علی خاں کی صحبت نے انھیں مسخرا باز بنا دیا تھا۔ وہ محض ان کی دلجوئی کا آلہ بن کر رہ گئے۔ بیتاب کا یہ قول سو فیصد درست ہے کہ ''انشا کے فضل و کمال کو ان کی شاعری نے کھو دیا اور ان کی شاعری کو سعادت علی خاں کی مصاحبت نے ڈبو دیا۔'' انشا کے آخری ایام انتہائی مفلسی اور کسمپرسی میں گزرے۔ انشائی شاعری مسلسل تجربات سے عبارت ہے۔ اس لیے اس میں کوئی مخصوص رنگ ابھر کر سامنے نہیں آتا۔ ان کی شاعری کی حیثیت تاریخی اور لسانی ہے۔ وہ کسی بھی روایت یا عصری روش کو خود کے لیے مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ اختراع پسند تھے اس لیے ہمیشہ کچھ نیا کرنے کی دھن میں لگے رہتے تھے۔ ان کے رنگ شاعری اور تجربات و اختراعات کو ''انشائیت'' سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔

نہ چھیڑ اے نکہت بادبہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

جذبۂ عشق سلامت ہے تو انشاء اللہ
کچے دھاگے سے بندھے آئیں گے سرکار بندھے

6.4.3 شیخ غلام ہمدانی مصحفی:

اصل نام شیخ غلام ہمدانی اور تخلص مصحفی تھا۔ اکثر محققین کے مطابق 1748 میں امروہہ میں پیدا ہوئے۔ وقت کی ستم ظریفی سے مجبور ہو کر دلی آئے مگر بدقسمتی نے ساتھ نہ چھوڑا البتہ اہل علم و دانش کی صحبتوں سے فیض یاب ہونے کا پورا موقع ملا۔ تلاش معاش کی غرض سے آنولہ، ٹانڈے اور ایک سال کے لیے لکھنؤ بھی گئے۔ اس وقت سودا فرخ آباد سے لکھنؤ پہنچ چکے تھے۔ مصحفی، سودا سے بہت متاثر ہوئے اور ایک سال بعد دلی واپس آ گئے۔ دلی کے مشاعروں میں خوب شرکت کرتے تھے۔ بسیار گوئی ان کی طبیعت کا حصہ تھی۔ انھوں نے دلی میں دو دیوان تیار کر لیے جس میں سے ایک چوری ہو گیا تھا۔

اے مصحفی شاعر نہیں پورب میں ہوا میں
دلی میں بھی چوری مرا دیوان گیا تھا

بارہ سال کے بعد دوبارہ لکھنؤ پہنچے تو لکھنؤ میں بساطِ ادب کا نقشہ ہی کچھ اور تھا، آصف الدولہ کا دور تھا جو اپنی فیاضی اور سخاوت کے لیے بہت مشہور تھے۔اس وقت لکھنؤ میں میر تقی میر کی آمد بھی ہو چکی تھی۔ میر سوز اور جرأت اپنا سکہ جمائے ہوئے تھے۔انشا بھی آ گئے تو مصحفی کے لیے خود کے لیے جگہ بنانا اور دشوار ہو گیا اور اس کے بعد انشا اور مصحفی کی چشمک شروع ہوئی جو ادبی اور تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔انشا لکھنؤ میں مصحفی کے حریف اور مدمقابل تھے مگر شاہانہ سر پرستی چوں کہ انشا کے ساتھ تھی اس لیے مصحفی انشا کی تاب نہ لا سکے۔جیسا کہ ذکر ہوا کہ مصحفی بسیار گو تھے ان کے آٹھ دیوان اردو اور ایک فارسی میں موجود ہیں اس کے علاوہ فارسی شعرا کا ایک تذکرہ اور دو تذکرے اردو شعرا کے بھی یادگار چھوڑے ہیں۔ان کی زندگی میں ایسا وقت بھی آیا کہ اپنے کلام کو فروخت کرنے لگے تھے۔مصحفی کی قادرالکلامی اور استادی سے کسی کو انکار نہیں، انھیں استادوں کا استاد کہنا بے جا نہ ہوگا۔ آتش، امیر، خلیق اور ضمیر وغیرہ ان کے خاص شاگرد ہیں۔مصحفی نے اپنے تذکروں میں ایہام گوئی پر سخت تنقید کی ہے۔وہ فصاحت و بلاغت کے دلدادہ تھے۔مصحفی چون کہ دلی والے تھے اور دلی کے حالات کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے لہٰذا یہ سمجھنا قطعی مشکل نہ ہوگا کہ دلی کے ناگفتہ حالات نے ان کی شاعری پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔تاہم لکھنوی مزاج سے بھی خود کو بچا نہ سکے۔اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ مصحفی کے کلام میں دلی اور لکھنؤ کا حسین امتزاج ملتا ہے۔کہیں وہ میر و سودا کے رنگ میں دکھائی دیتے ہیں تو کہیں جرأت کے پیروکار نظر آتے ہیں۔اس لیے اکثر ناقدین نے یہ لکھا ہے کہ ان کا خود کا کوئی مخصوص رنگ نہیں ہے۔غالباً 1824 میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔مصحفی کے متعلق مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایسے شاعر ہیں جن کو زندگی نے کھل کر ہنسنے یا رونے کا موقع نہ دیا۔اس سب کے باوجود وہ اردو ادب میں ایک مستند قادرالکلام اور استاد شاعر کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

مصحفی ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

آستیں اس نے جو کہنی تک چڑھائی وقتِ صبح
آ رہی سارے بدن کی بے حجابی ہاتھ میں

6.4.4 شیخ امام بخش ناسخ:

شیخ امام بخش ناسخ 1772 میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ایک رئیس تاجر نے انھیں اپنا بیٹا بنا لیا تھا اس لیے مفلوک الحالی سے دوچار نہیں ہونا پڑا ان کی پوری توجہ شاعری اور ورزش پر رہی۔ناسخ کو لکھنؤ اسکول کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔دراصل میر، سودا، جرأت و مصحفی وغیرہ اگرچہ لکھنؤ میں خاص جگہ بنا چکے تھے مگر ان شعرا کا تعلق چوں کہ دلی سے تھا اس لیے ان کے یہاں خالص لکھنویت نہیں پائی جاتی اس کے برعکس ناسخ لکھنوی مزاج لے کر پیدا ہوئے تھے۔غربت و افلاس کا سایہ بھی ان پر نہیں پڑا تھا اس لیے دہلوی سوز و گداز ناسخ کے یہاں مفقود ہے اور غالباً ناسخ کی مقبولیت کا راز بھی یہی ہے کہ اہل لکھنؤ جس خاص طرز حیات کے لیے جانے جاتے ہیں وہ سب سے زیادہ ناسخ کے یہاں ہی موجود ہے۔ناسخ کے

کلام میں لکھنؤ کی آورد نہیں بلکہ آمد ہے۔ دوسری طرف آتش جو مصحفی کے شاگرد ہونے کے سبب دلی کی خصوصیات کے بھی حامل تھے لہٰذا دونوں کے درمیان شاعرانہ معرکہ آرائیوں کا درپیش ہونا حسبِ حال معلوم ہوتا ہے۔

ناسخ کا سب سے بڑا کارنامہ ''اصلاحِ زبان'' مانا جاتا ہے۔ لکھنویت سے شاعری کا جو خاص رنگ مراد لیا جاتا ہے اور جس کا سب سے بڑا عنصر خیال بندی کہلاتا ہے وہ ناسخ اور ان کے شاگردوں کی کوشش و ایجاد کا نتیجہ ہے۔ ناسخ نے اپنی شاعری میں نئے نئے مضامین پیدا کیے ہیں، وہ خیال آفرینی میں بھاری بھرکم الفاظ استعمال کرتے ہیں، ان کی شاعری میں جذبات و احساسات کا فقدان ہونے کے ساتھ سادگی کی کمی بھی ہے وہ مشکل زمینوں اور طویل ردیفوں کے استعمال سے اپنی شاعری کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ناسخ نے ان خصوصیات پر مبنی نہ صرف شاعری کی بلکہ اپنی استادی بھی تسلیم کرائی ہے۔ ان کی اہمیت زبان کی صفائی اور متروکات کی باقاعدہ مہم چلانے کی وجہ سے بھی ہے۔ ناسخ نے قدما کی زبان کے فحش اور غیر فصیح الفاظ کو متروک قرار دیا اور ہندی و سنسکرت کے الفاظ کو خارج کر کے ان کی جگہ عربی اور فارسی الفاظ و تراکیب کو رواج دیا جس کی وجہ سے اردو شاعری میں ایک خاص قسم کا وقار پیدا ہوا۔ انھوں نے اردو میں مستعمل عربی، فارسی اور ہندی الفاظ کے لیے تذکیر و تانیث کے قاعدے وضع کیے اور محاورات درست کیے۔ اس وجہ سے انھیں متروکات کا ناسخ بھی کہا جاتا ہے۔ 1838 میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ ناسخ کے کلام کا بڑا حصہ شائع ہو چکا ہے جس میں غزلیں، رباعیاں، قطعات، تاریخیں اور ایک مثنوی بھی شامل ہے۔

تیری صورت سے کسی کی نہیں ملتی صورت
ہم جہاں میں تیری تصویر لیے پھرتے ہیں

دریائے حسن اور بھی دو ہاتھ بڑھ گیا
انگڑائی اس نے نشے میں لی جب اٹھا کے ہاتھ

6.4.5 خواجہ حیدر علی آتش:

آتش کا اصل نام خواجہ حیدر علی تھا اور ان کے والد کا نام علی بخش تھا۔ ان کے آبا و اجداد بغداد سے ہجرت کر کے دلی آئے تھے بعد میں شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد میں سکونت اختیار کر لی۔ وہیں 1778 میں آتش کی ولادت ہوئی۔ بچپن میں والد کے انتقال کی وجہ سے باقاعدہ تعلیم و تربیت نہ ہو سکی اس لیے مزاج میں شوریدہ سری اور بانکپن پیدا ہو گیا۔ انھوں نے فیض آباد کے نواب محمد تقی خاں کے یہاں ملازمت اختیار کر لی اور ان کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے۔ نواب صاحب چوں کہ مذاقِ سخن بھی رکھتے تھے اور فن سپہ گری کے بھی دلدادہ تھے اس لیے آتش ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ لکھنؤ میں علمی صحبتوں اور انشا و مصحفی کے ادبی معرکوں کو دیکھ کر آتش بھی شعر و شاعری کی طرف مائل ہوئے اور مصحفی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ کچھ دن بعد ہی نواب صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اور آتش بھی بے یار و مددگار ہو گئے مگر اس کے باوجود انھوں نے دربار سے وابستگی کا راستہ نہ اختیار کیا اور آخری عمر تک توکل و قناعت کو شعار بنائے رکھا۔ آخری عمر میں بینائی بھی چلی گئی۔ 1846 میں انتقال ہوا۔ آتش نے انتہائی سادہ زندگی بسر کی نہ کسی کی ہجو لکھی اور نہ ہی کسی کی شان میں کوئی قصیدہ لکھا۔ قلیل آمدنی اور تنگدستی کے باوجود خاندانی وقار قائم رکھا۔ آتش سپاہیانہ وضع قطع کے اتنے دلدادہ تھے کہ ہمیشہ تلوار کمر سے بندھی رہتی تھی اور اسی حالت میں مشاعروں میں بھی چلے جاتے تھے۔

آتش کوعمومی طور پر دبستان لکھنؤ کا نمائندہ شاعر مانا جاتا ہے لیکن ان کی شاعری میں دبستان دہلی کی خصوصیات بھی موجود ہیں چوں کہ وہ مصحفی کے شاگرد تھے اس لیے دہلویت کے اثرات استاد کی صحبتوں کے باعث ان کی شاعری میں نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر عشق و عاشقی کے شاعر ہیں لیکن لکھنوی رکاکت وابتذال پسندی سے انھوں نے خود کو دور رکھا ہے۔ ان کے یہاں لکھنویت کا رنگ ضرور ہے مگر دہلویت کی آمیزش بھی ہے۔ اگر ان کے یہاں اس طرح کے شعر ملتے ہیں:

شبِ وصل تھی چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا خدامہرباں تھا

تو اس نوعیت کے اشعار بھی ملتے ہیں:

کسی نے مول نہ پوچھا دلِ شکستہ کا
کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا

آتش عام طور پر اعلیٰ مضامین کو پسند کرتے ہیں، ان کے اشعار میں شوخی ومتانت اور دلفریبی نمایاں ہے۔ انھوں نے عام تشبیہات واستعارات سے الگ راہ اختیار کی ہے۔ ان کے اخلاقی اشعار میں بھی قلندرانہ انداز ملتا ہے۔

عجب قسمت عطا کی ہے خدانے اہل غیرت کو
عجب یہ لوگ ہیں غم کھا کے دل کو شاد کرتے ہیں

آتش اردو کے ان معدودے چند شعرا میں شمار ہوتے ہیں جن کی قدر ومنزلت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

6.5 دبستانِ لکھنؤ کے دیگر شعرا

مذکورہ شعرا دبستانِ لکھنؤ میں پنج رتن کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کے ذریعہ اس دبستان کی بنیاد پڑی اور اسے استحکام بھی حاصل ہوا۔ ان عناصر خمسہ کے ذکر کے بغیر نہ لکھنویت کا ذکر ممکن ہے اور نہ ہی لکھنویت کی شناخت قائم ہوسکتی ہے مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ دبستانِ لکھنؤ کا باب انھیں پر بند ہوجاتا ہے۔ مندرجہ بالا شعرا کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے، جنھوں نے دبستانِ لکھنؤ کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جن میں ہر ایک کا ذکر اس مختصر باب میں ممکن نہیں، لیکن ان میں بعض شعرا ایسے بھی ہیں جن کے ذکر کے بغیر یہ باب مکمل بھی نہیں ہوسکتا ہے۔ ایسے ہی شعرا میں ناسخ کے تلامذہ میں وزیر، برق اور رشک وغیرہ خاص اہمیت کے حامل ہیں، جنھوں نے اپنے استاد کی قائم کردہ روایت کی بھرپور پاسداری کی ہے۔ وزیر کا دیوان ان کے شاگردوں نے ان کے انتقال کے بعد ''دفتر فصاحت'' کے نام سے شائع کروایا نمونۂ کلام کے طور پر ایک شعر ملاحظہ ہو:

جب خفا ہوتا ہے تو یوں دل کو سمجھاتا ہوں میں
آج ہے نامہرباں، کل مہرباں ہوجائے گا

اسی طرح سے رشک بھی ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ پیرویٔ استاد میں فنِ غزل گوئی کا حق ادا نہ کرسکے کیوں کہ غزل ایجاد واختصار اور سوز و گداز کا تقاضا کرتی ہے مگر رشک کے یہاں ان اوصاف کی کمی ہے تاہم ان کی شاعرانہ صلاحیتوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ آتش کے شاگردوں میں دیا شنکر نسیم، شوق اور رند بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں ان میں بھی نسیم اپنی مثنوی ''گلزار نسیم'' کے سبب شہرتِ دوام کے حامل ہیں۔ گلزار نسیم کافی طویل

مثنوی تھی جسے ان کے استاد کے کہنے پر مختصر کر دیا گیا۔نسیم ابتدا میں غزلیں بھی کہتے تھے مگر ان کی ادبی شناخت کا وسیلہ ان کی مثنوی گلزار نسیم ہے۔نسیم کا رنگ غزل ملاحظہ ہو:

اب درد جگر ہو کے نکلتا ہے دہن سے
وہ جوش جو برسوں مرے سینے میں نہاں تھا

میر حسن کا نام بھی لکھنؤ کے دبستان میں احترام سے لیا جاتا ہے۔اگر چہ وہ دلی میں پیدا ہوئے مگر تیرہ سال کی عمر میں اپنے والد میر ضاحک کے ساتھ ترکِ وطن کر کے لکھنؤ آباد ہو گئے تھے۔ میر ضاحک خود بھی مرثیہ خوانی کی روایتوں کے امین تھے۔ میر حسن نے غزلیں، مرثیے، قصیدے، مثنویاں اور تذکرہ اپنی یادگار چھوڑی ہیں مگر ان کی شہرت دوام کا باعث مثنوی ''سحر البیان'' ہے۔ یہ مثنوی ان کی آخری مثنوی ہے اس لیے اسے ان کی زندگی کے تمام تر تجربات و مشاہدات کا نچوڑ کہنا بے جا نہ ہوگا۔سحر البیان اپنی سادہ بیانی، جذبات نگاری اور جزئیات بیانی کے سبب تاریخ مثنویات میں انفرادیت کی حامل ہے۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے نام مرثیہ نگاری کی حیثیت سے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ تاریخ مرثیہ نگاری انیسؔ و دبیرؔ کے ناموں کی شمولیت کے بغیر مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔ان دونوں شعرا نے مرثیہ نگاری کو ایک نئی جہت سے روشناس کروایا ہے اور مرثیہ خوانی کے اسلوب میں بھی اضافہ کیا ہے۔ان کی تربیت اور شاعرانہ شخصیت سازی بالترتیب خلیق و ضمیر کی سرپرستی میں ہوئی جو خود بھی مشہور مرثیہ نگار تھے۔ دونوں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے،جس سے مرثیہ نگاری کو بہت فروغ حاصل ہوا۔

مندرجہ بالا شعرا کے علاوہ دیگر شعرائے لکھنؤ کی ایک طویل فہرست ہے جن میں چکبست ، ثاقب،عزیز،امیر مینائی،محشر،آرزو اور اثر لکھنوی وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں جنھوں نے اپنے پیش روؤں کی پیروی میں نہ صرف لکھنویت کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے بلکہ اردو ادب کے سرمایہ میں بھی بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

6.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ اردو ادب میں دبستان دلی اور دبستان لکھنؤ کی اہمیت مسلم ہے۔ دونوں دبستانوں کے شعرا و ادبا نے اردو ادب میں بیش بہا اضافے کیے ہیں۔

☆ لکھنؤ کے مقامی شعرا اور ہجرت کر کے آنے والے بیرونی شعرا دونوں گروہوں کو نوابین کی سرپرستی حاصل رہی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے سلاطین فنونِ لطیفہ سے دلچسپی رکھتے تھے اور سخاوت و فراخ دلی میں کسی طرح کی جانب داری کو روا نہیں رکھتے تھے۔

☆ دبستان لکھنؤ کی خصوصیات میں تصنع و تکلف،لفظی صنعت گری،معاملہ بندی،محبوب کے سراپے کا کھلے بند اظہار،تشبیہات و استعارات کا استعمال اور قافیہ پیمائی وغیرہ کا خاصا دخل ہے،جس سے دبستان لکھنؤ عبارت ہے۔

☆ دبستان لکھنؤ میں نسائیت کے میلان کے تحت ریختی کو فروغ حاصل ہوا۔

☆ مظہر جان جاناں کے بعد ناسخ نے زبان کی اصلاح کی تحریک چلائی جس سے فحاشی اور متروکات کو ختم کرنے میں مدد ملی۔ ہندی اور سنسکرت الفاظ سے گریز کر کے زبان کی صفائی پر زور دیا گیا۔

☆ دبستان لکھنؤ میں غزل کے ساتھ مرثیہ کو بھی فروغ حاصل ہوا۔

☆ دبستان لکھنؤ کے بعض شعرا کی معرکہ آرائیوں کے سبب خواہی نہ خواہی اردو ادب کے سرمایہ میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

☆ دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شعرا میں جرأت، انشا، مصحفی، ناسخ، آتش، نسیم، شوق، رنگین وامیر مینائی وغیرہ امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ نمائندہ شعرا کی پیروی مابعد شعرا نے بھی روا رکھی جس کی وجہ سے لکھنوی خصوصیات بعد کے شعرا میں بھی پائی جاتی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ دبستان لکھنؤ کے شعرا کے لسانی تجربات، صنفی اختراعات اور زبانی اصلاحات نے اردو ادب میں بیش بہا اضافہ کیا ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

6.7 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
متقدمین	:	پرانے
فراخ دلی	:	سخاوت
اختراع	:	نئی چیز ایجاد کرنا
حسب استطاعت	:	حیثیت کے مطابق
ریختی	:	وہ نظم جو عورتوں کی زبان میں کہی جائے
ابتذال	:	بے ہودہ، ذلیل رکھنا
رکیک	:	حقیر، بے حیائی کی بات
پیش رووں	:	اپنے سے پہلے والے لوگ
مصاحبت	:	ساتھ، صحبت میں رہنا
فارغ البالی	:	معاشی تنگی نہ ہونا
مہاجر	:	ہجرت کرنے والا
بتدریج	:	دھیرے دھیرے
مبالغہ آمیز	:	مبالغہ سے بھرا ہوا
افلاس	:	غریبی
بسیار گوئی	:	زیادہ بولنا
متروکات	:	چھوڑی ہوئی چیزیں
ہم آہنگی	:	آپس میں مل جانا
مسلم	:	جسے تسلیم کرلیا گیا ہو

6.8 نمونہ امتحانی سوالات

6.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ فیض آباد کے بعد لکھنؤ کو دارالخلافہ کس نے بنایا؟

2۔ انگریزوں نے کس بادشاہ کو مٹیا برج بھیج دیا تھا؟

3۔ جرأت کا پورا نام کیا ہے؟

4۔ آتش کس کے شاگرد تھے؟

5۔ اصلاح زبان کی تحریک کس نے چلائی؟

6۔ آتش کا حریف شاعر کون تھا؟

7۔ مصحفی کی شاعرانہ چشمک کس شاعر سے تھی؟

8۔ مصحفی کا پورا نام کیا ہے؟

9۔ انیس و دبیر نے کس صنفِ شاعری کو فروغ عطا کیا؟

10۔ ''دریائے لطافت'' اور ''سلک گہر'' کا مصنف کون ہے؟

6.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ مصحفی کے بعض شاگردوں کا تعارف کرائیے۔

2۔ آتش کے کلام کی خصوصیات بیان کیجیے۔

3۔ اصلاح زبان کی تحریک پر ایک نوٹ لکھیے۔

4۔ انشا کی شعری خصوصیات بیان کیجیے۔

5۔ ناسخ کے اہم کارناموں پر نوٹ لکھیے۔

6.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ دبستانِ لکھنؤ کا سماجی و تہذیبی پس منظر بیان کیجیے۔

2۔ دبستانِ لکھنؤ کی شعری خصوصیات کیا ہیں؟ مثالوں سے سمجھائیے۔

3۔ دبستانِ لکھنؤ کے نمائندہ شاعروں کے بارے میں ایک نوٹ لکھیے۔

6.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری — ابواللیث صدیقی

2۔ لکھنؤ کی شاعری — محمد باقر شمس

3۔	لکھنؤ کے چند نامور شعرا	سید سلیمان حسین
4۔	لکھنؤ کا شعر و ادب	ڈاکٹر سید عبدالباری
5۔	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حسین
6۔	تاریخ ادب اردو	جمیل جالبی
7۔	قدیم لکھنؤ کی آخری بہار	مرزا جعفر حسین
8۔	لکھنؤ کی تہذیبی میراث	ڈاکٹر سید صفدر حسین
9۔	دربار اودھ کا اثر لکھنؤ کی شاعری پر	محمد اعظم خاں
10۔	لکھنؤ کے شعر و ادب کا معاشرتی و ثقافتی پس منظر	ڈاکٹر سید عبدالباری

اکائی 7: دبستان لکھنؤ کے شعروادب پر اثرات

اکائی کے اجزا

7.0 تمہید

7.1 مقاصد

7.2 دبستانِ لکھنؤ کا تشکیلی پس منظر

7.3 دبستانِ لکھنؤ کی اہم خصوصیات

7.3.1 خارجیت اور بیرون بینی

7.3.2 طویل غزلیں

7.3.3 نسائیت

7.3.4 رعایت لفظی

7.3.5 مضمون آفرینی

7.3.6 ابتذال وعریانی

7.3.7 محاورات والفاظ کا استعمال

7.4 شاعری پر دبستانِ لکھنؤ کے اثرات

7.4.1 غزل پر دبستانِ لکھنؤ کے اثرات

7.4.2 قصیدے پر دبستانِ لکھنؤ کے اثرات

4.7.3 مثنوی پر دبستانِ لکھنؤ کے اثرات

7.4.4 مرثیہ پر دبستانِ لکھنؤ کے اثرات

7.5 نثر پر دبستانِ لکھنؤ کے اثرات

7.5.1 داستان پر دبستانِ لکھنؤ کے اثرات

7.5.2 ڈرامے پر دبستانِ لکھنؤ کے اثرات

7.5.3 تذکرہ نگاری پر دبستانِ لکھنؤ کے اثرات

7.5.4 ناول پر دبستانِ لکھنؤ کے اثرات

7.6 اکتسابی نتائج

7.7 کلیدی الفاظ
7.8 نمونہ امتحانی سوالات
7.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
7.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
7.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
7.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

7.0 تمہید

'دبستان' کے لغوی معنی گلشن اور باغ وغیرہ کے ہیں لیکن اصطلاح میں دبستان سے مراد شعرا و ادبا کا وہ گروہ ہے جو علاقہ یا عہد کے اعتبار سے نظریات یا اندازِ بیان کی بنیاد پر دیگر علاقوں سے مختلف ہونے کے ساتھ منفرد امتیازات کا حامل بھی ہو۔ جو شعرا و ادباء کی اکثریت پر محیط ہو۔ یوں تو اردو ادب میں چار دبستان خاصے مشہور ہیں (دبستان دلی، دبستان لکھنؤ، دبستان رامپور اور دبستان عظیم آباد) ان میں سے ہر ایک کا اپنا جداگانہ رنگ ہے جو ایک کو دوسرے سے مختلف بناتا ہے مگر اول الذکر دو دبستان اپنے خاص رنگ کی وجہ سے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں جنھوں نے اردو ادب کے سرمایے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ جس طرح رات کی وضاحت کے بغیر دن کا تصور ممکن نہیں یعنی ہر چیز کو اس کی ضد کے ذریعہ ہی پہچانا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی دبستان کو سمجھنا ہے تو اس کے ساتھ دوسرے دبستان کا ذکر لازمی ہو جاتا ہے تاکہ ان کے درمیان حد فاصل کھینچنے میں آسانی ہو اور ان کی خصوصیات کو سمجھا جاسکے۔ دبستان لکھنؤ کو سمجھنے کے لیے دبستان دلی کا سمجھنا لازمی ہے اور دبستان دلی کو سمجھنے کے لیے اس عہد کو سمجھنا ضروری ہے جس عہد میں دلی کی شاعری یا نثر لکھی جا رہی تھی۔ ادب کی تخلیق میں اس عہد کی جھلک نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے کیوں کہ شاعر و ادیب بھی معاشرے کا ہی جزو ہوتا ہے اور یہ تو ممکن ہی نہیں کہ معاشرے میں بدعنوانیوں کا بازار گرم ہو اور شاعر و ادیب محبوب کے لب و رخسار کے قصیدے لکھتا رہے۔ عوام بھوک و افلاس میں مبتلا ہو اور شاعر و ادیب محبوب کی خم دار زلفوں میں ہی الجھا رہے۔ کسی بھی زبان کا قابلِ ذکر ادب اپنے معاشرے کا عکاس اور ترجمان ہوتا ہے۔ کیوں کہ شاعر و ادیب عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ حساس ہوتے ہیں وہ کسی بھی حادثہ یا واقعہ سے رونما ہونے والے اثرات کو پیشگی سمجھ لیتے ہیں۔ اب جب کہ یہ طے ہے کہ ادب اپنے سماج اور عہد کا ترجمان ہوتا ہے تو یہ سمجھنا چنداں مشکل نہیں ہونا چاہیے کہ دلی کا ادب جن حالات کا پروردہ ہے وہ کیا ہیں۔ نادر شاہ، احمد شاہ، جاٹ، مرہٹے اور سکھوں نے دلی کو مرکزِ قتل و غارت گری بنا رکھا تھا۔ مغلیہ سلطنت کا چراغ ستارۂ سحری کی مانند ٹمٹما رہا تھا جو کسی بھی وقت گل ہوسکتا تھا۔ عوام سے لے کر خواص تک ہر کوئی مشکلات سے دوچار تھا۔ دوسری طرف لکھنؤ کے حالات دلی کے حالات سے یکسر مختلف تھے۔ نوابینِ لکھنؤ کی فیاضی و سخاوت ضرب المثل تھی خواص و عوام ہر کوئی عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ان دو باتوں کی تفہیم پر مذکورہ دونوں دبستانوں کی تفہیم مبنی ہے کہ دلی کے ادب اور لکھنؤ کے ادب کے درمیان کیا فرق ہوگا اور کن نقوش کو مشعل راہ بنا کر شعرا و ادبا نے ادب کو تخلیق کیا ہوگا مگر دونوں کے امتیازات مسلم ہیں۔ اردو ادب کے فروغ میں کسی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس باب میں دبستان لکھنؤ کے شعر و ادب پر کیا اثرات مرتب ہوئے اور لکھنؤ کی خاص طرز حیات نے ادب کو کس طور پر متاثر کیا اور ان کے اثرات کو ادب نے

کس حد تک قبول کیا ان سب باتوں پر سیر حاصل گفتگو کی جائے گی۔

7.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ دبستان کے معانی و مفاہیم واضح کر سکیں۔

☆ دبستان لکھنؤ کا تعارف کرا سکیں۔

☆ دبستان لکھنؤ کی تشکیل کے اسباب بیان کر سکیں۔

☆ دبستانِ لکھنؤ کے امتیازات مثالوں کے ساتھ سمجھا سکیں۔

☆ دبستان لکھنؤ کے شعرا و ادبا پر گفتگو کر سکیں۔

☆ اصناف ادب (شعر و نثر) پر دبستان لکھنؤ کے اثرات کو سمجھا سکیں۔

☆ دبستان لکھنؤ اور دلی کو مثالوں کے ساتھ سمجھا سکیں۔

☆ اصلاح زبان کی تحریک کی وضاحت کر سکیں۔

☆ ریختی پر اظہار خیال کر سکیں۔

7.2 دبستانِ لکھنؤ کا تشکیلی پس منظر

دبستان لکھنؤ کا تشکیلی پس منظر سمجھنے کے لیے دلی کے حالات سے آ گہی ضروری ہے کیوں کہ دلی ہمیشہ سے مرکز کی حیثیت سے رہی پھر وہ خواہ ادب ہو یا حکومت دلی کی بات کا مطلب پورے ہندوستان کی بات، اردو زبان کی دلی آمد سے قبل بھی اہل دلی فارسی وغیرہ میں ادب تخلیق کر رہے تھے جب اردو نے درباری سرپرستی حاصل کر لی تو آہستہ آہستہ فارسی زوال پذیر ہونے لگی اور اپنے خیالات کی تبلیغ کا سب سے توانا ذریعہ اردو کو سمجھا جانے لگا۔ دوسری جانب اورنگ زیب کے انتقال کے بعد دلی کی حالت کسی غریب بیوہ جیسی ہوگئی وہ عظیم سلطنت جس کے سرے کشمیر سے کنیا کماری تک ملتے ہوں، دلی سے جاری ایک فرمان سے پورے ہندوستان کی تقدیر پلٹ جاتی ہو اسی دلی کے تخت پر نا اہل بادشاہوں کی تخت نشینی نے نہ صرف ان کا یا اہل دلی کا بلکہ پورے ملک کا مستقبل تاریک کر دیا تھا۔ شہزادے حصولِ تخت کے لیے ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کو جسمانی طور پر معذور بنا دیتا تھا تا کہ حکومت کرنے کا دعویدار نہ بن جائے کیوں کہ تیموری قوانین کے مطابق کسی معذور انسان کو بادشاہ بننے کا حق نہیں تھا مزید یہ کہ عیش کوشی اور عیاش طبیعت نے بھی انھیں ناکارہ بنا دیا تھا۔ چند شاطر امیر و وزیر عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر جسے چاہتے عہدہ اور منصب عطا کروا دیتے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ سے لے کر امیر و وزیر تک ہر کوئی عیش پرستی میں مبتلا ہو گیا اور سلطنت اندر سے کھوکھلی ہوتی چلی گئی۔ موقع کا فائدہ اٹھا کر جاٹوں، سکھوں اور مرہٹوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ مزید خرابی یہ ہوئی کہ اندرونی بغاوت کے ساتھ بیرونی طاقتیں بھی برسرِ پیکار ہوگئیں۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ ان کے حملوں سے مہینوں تک دلی خون میں ڈوبی رہتی، کئی کئی دن تک مسلسل فاقے ہوتے، شرفا کی عزتیں پامال ہوتیں، عورتوں کا تقدس ریزہ ریزہ کر دیا جاتا اور دلی کو آماجگاہِ کشت و خون بنایا جا رہا تھا مذکورہ حالات کو ذہن میں رکھ کر یہ سمجھنا قطعی مشکل نہیں رہ جاتا ہے کہ اس صورت میں خلق کیا جانے والا ادب کس نوعیت کا ہوگا۔ اس کی سمت کیا ہوگی اور کن باتوں کو اس میں

مرکزیت حاصل ہوگی۔ مفلسی ومفلوک الحالی نے ہر خاص وعام کو اپنے شکنجے میں لے رکھا تھا معاشی، معاشرتی اور تہذیبی ہر سطح پر دلی پستی کا شکار ہوتی چلی جارہی تھی وہ شہر جس نے عالم میں انتخاب ہونے کا شرف حاصل ہوا اس کے بارے میں میرؔ لکھتے ہیں:

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں
تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج و تخت کا

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

دلی کا ادب انھیں حالات کا ترجمان ہے جس میں یاس وناامیدی، سوز وگداز، داخلی کیفیات اور درد وغم کی بھرپور عکاسی نظر آتی ہے۔ جیسا کہ مذکور ہوا کہ شاعر وادیب بھی معاشرے کا ہی رکن ہوتے ہیں۔ اس لیے اپنے معاصر احوال وکوائف سے آنکھ چرا کر محبوب کے حسن وجمال کی تعریف میں مگن رہیں کم سے کم اس وقت کے حالات میں دلی کے اس عہد کے شعرا سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی لہٰذا میرؔ، سودا، ذوق، غالب، مومن کے کلام میں ان حالات کی واضح شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

(میر تقی میرؔ)

اس طرح کے بے شمار اشعار اردو شاعری میں بکھرے پڑے ہیں جو اٹھارہویں صدی کی دلی کا نوحہ اور استعارہ ہیں۔

سعادت علی خاں کو 1722 میں جب مغل بادشاہ محمد شاہ نے اودھ کا صوبیدار بنا کر بھیجا تو دلی کی حالت ناگفتہ بہ تھی اور بادشاہ بھی اندرونی طور پر کمزور تھے۔ موقع کا فائدہ اٹھا کر سعادت علی خاں نے انگریزوں کے اشارے پر مرکز سے بغاوت کر کے خودمختاری کا اعلان کر دیا اور چوں کہ وہ دلی اور مغل بادشاہوں کی داخلی حالت اور طاقت وکمزوری سے بخوبی واقف تھے اس لیے انھوں نے ایک ایسی سلطنت کے قیام کی کوشش کی جو پرامن ہونے کے ساتھ طاقت ور بھی ہو جس میں عہدے اور منصب پر اہل لوگوں کو بٹھایا جائے اہل علم ودانش کو حسب مرتبہ اہمیت دی جائے۔ حالاں کہ سعادت علی کو معاشی طور پر لکھنؤ کو مستحکم بنانے میں اتنی جدوجہد نہیں کرنی پڑی ہوگی جتنی شاید دلی کو مستحکم بنانے میں پڑتی کیوں کہ لکھنؤ بیرونی یا اندرونی حملوں سے اتنا متاثر نہیں ہوا تھا جتنا کہ دلی۔ کیوں کہ دلی کی حیثیت مرکزی تھی اس لیے ہر کسی کی نظر دلی پر ہی جمی رہتی تھی جس کے نتیجہ میں دلی والے ہر آفت وناگہانی مصیبت کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ دوسری جانب اہل لکھنؤ حالات کے سرد وگرم سے بے نیاز معمول کے مطابق زندگی بسر کر رہے تھے۔ جب سعادت علی خاں نے خودمختاری کا اعلان کیا اور اہل فضل وکمال پر خاطر خواہ توجہ دی تو لکھنؤ کے قرب وجوار کے علاوہ دور دراز سے بھی اہل فن نے لکھنؤ کی جانب ہجرت شروع کر دی کیوں کہ کچھ ہی دنوں میں لکھنؤ معاشی طور پر بہت مضبوط ہو چکا تھا اور لکھنؤ کے نواب چوں کہ خود بھی فنون لطیفہ سے دلچسپی رکھتے تھے اس لیے شعرا وادبا، فن تعمیر کے ماہرین، موسیقی کے ماہرین اور دیگر فنون لطیفہ سے متعلق افراد کی لکھنؤ آمد نے یہاں کی فضا کو مزید پرمسرت بنا دیا اور شعر وادب کی محفلیں جمنے لگیں۔

ریاست اودھ کا دور تقریباً گیارہ حکمرانوں اور ایک سو پینتیس برسوں پر مشتمل ہے ان حکمرانوں میں کچھ بہت اچھے حکمران بھی ہوئے ہیں۔ سعادت علی خاں جنہیں ریاست اودھ کا بانی ہونے کا شرف حاصل ہے سے لے کر نواب شجاع الدولہ، آصف الدولہ، نواب سعادت علی خاں دوم اور نواب واجد علی شاہ وغیرہ تاریخی حیثیت کے علاوہ ادبی حیثیت بھی رکھتے ہیں، جنھوں نے ادب کے فروغ میں شعرا و ادبا کی بھرپور سرپرستی کی۔ شجاع الدولہ کے عہد تک فیض آباد کو دارالسلطنت کی حیثیت حاصل تھی مگر آصف الدولہ نے اپنا دارالسلطنت لکھنؤ کو بنایا۔ لکھنؤ کے حکمران بذات خود بھی ادبی وثقافتی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے اور فن کاروں کی قدردانی بھی کرتے تھے۔ ان حالات میں دوسرے شہر کے فن کاروں کا لکھنؤ کو ہجرت کرنا عین فطری معلوم ہوتا ہے۔ آصف الدولہ کے دور میں فن تعمیر کے بھی اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ امام باڑہ اور شاہی محل انھیں کے دور کی یادگار ہیں۔ آصف الدولہ کی فیاضی وسخاوت اور اہل فضل وکمال کی قدردانی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ میر سوز، میر تقی میرؔ اور مرزا محمد رفیع سودا انھیں کے دور میں دلی سے ہجرت کر کے لکھنؤ آئے تھے۔ آصف الدولہ خود بھی اردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ ان کے بھائی نواب سعادت علی خاں دوم بھی ادب پرور حکمراں تھے۔ مگر ان کے بعد نواب غازی الدین حیدر کے عہد میں انگریز اپنا اثر رسوخ بڑھانے لگے جو اودھ کی ریاست کے لیے شگون بد ثابت ہوا۔ اودھ کے آخری حکمراں نواب واجد علی شاہ تھے جو اپنی رنگین مزاجی کے لیے مشہور تھے۔ وہ خود بھی کئی کتابوں کے مصنف اور مولف تھے مگر ان کے عہد تک انگریز اتنے طاقت ور ہو چکے تھے کہ نواب واجد علی شاہ کو معزول کر کے مٹیا برج بھیج دیا گیا ان کے بعد ان کی اہلیہ بیگم حضرت محل نے اگرچہ اپنے بیٹے برجیس قدر کے حقوق کی بازیابی کے لیے کافی جدوجہد کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکیں۔ اور اس طرح اودھ کی ایک خوش حال اور ادب پرور ریاست ایک زمانے تک علمی، ادبی، ثقافتی اور تہذیبی سرپرستی کرنے کے بعد 1857 میں ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ اس ریاست کے خاتمے کے اسباب بھی تقریباً مغل سلطنت کے اسباب سے ملتے جلتے ہیں بلکہ بعض معاملات میں نوابان اودھ شاہان دہلی سے بھی تجاوز کیے ہوئے تھے جن میں عیش پرستی اور رنگین مزاجی کو خاصا دخل ہے۔

سطورِ بالا کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دبستان لکھنؤ کا تشکیلی پس منظر کیا تھا؟ اور شعروادب پر اس کے اثرات کس نوعیت کے ہوں گے؟ نیز زندگی کے نشیب وفراز پر اس نے کیا اثر ڈالا؟ ساتھ ہی اس کے خاتمے کے اسباب وعلل کو بھی سمجھنے میں مدد ملے گی۔ اگرچہ دبستان لکھنؤ، دبستان دلی سے ہر اعتبار سے مختلف ہے۔ ہر مقام کی ایک تہذیب ہوتی ہے جو اس مقام کو دوسرے مقامات سے منفرد بناتی ہے۔ اسی طرح لکھنؤ کی بھی اپنی جداگانہ تہذیب ہے جو اسے نہ صرف دلی بلکہ دوسری جگہوں سے بھی الگ بناتی ہے۔ اس تہذیب کی جھلک وہاں کے لباس، طرز معیشت ومعاشرت، آداب محفل، رسوم ورواجات، عقائد وتوہمات، عادات واطوار یہاں تک کہ کھانے پینے میں بھی صاف دکھائی دیتی ہے۔ نوابوں اور عوام کے عیش پرست ہونے کے سبب لکھنوی معاشرے میں طوائفوں کو بھی خاص اہمیت حاصل تھی۔ ان کے کوٹھے کو آداب وشائستگی کی تربیت گاہ سمجھا جاتا تھا اس لیے بچوں کو تربیت سیکھنے کے لیے وہاں بھیجا جاتا ہے۔ شریف الطبع افراد بھی طوائفوں کے کوٹھے پر جانے کو معیوب نہیں سمجھتے تھے۔ لکھنؤ کے باغات، چوک چوراہے، سڑکیں، بازار وغیرہ ہر ایک چیز نفاست وشائستگی کی عمدہ مثال مانی جاتی ہے۔ اہل لکھنؤ کبوتر بازی، بٹیر بازی، مرغ بازی، پتنگ بازی کے علاوہ موسیقی، خطاطی اور موسیقی وغیرہ دیگر فنونِ لطیفہ سے بھی خاصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ بالخصوص شاعری میں تو دبستان لکھنؤ کی الگ شناخت ہے اور اردو ادب کے بڑے بڑے اور معتبر ومستند شعرا کی ایک طویل فہرست ہے جن میں مہاجر شعرا سے لے کر بے شمار مقامی شعرا ہیں۔ میرؔ، سودا، مصحفیؔ، جرأتؔ، انشا، ناسخؔ، آتشؔ، میر حسن، انیسؔ، دبیرؔ وغیرہ لاتعداد ممتاز شعرا کی موجودگی نے دبستان لکھنؤ میں اردو شاعری کو

کمال عروج تک پہنچا دیا تھا۔غرض یہ کہ لکھنؤ اپنی منفرد تہذیبی و ثقافتی اور ادبی و تعمیری خصوصیات کے ساتھ شائستگی اور خوش مزاجی و رنگین مزاجی کے لیے جداگانہ شناخت رکھتا ہے۔

7.3 دبستان لکھنؤ کی اہم خصوصیات

دبستان لکھنؤ کی سب سے اہم خصوصیت نشاطیہ عنصر ہے جو دیگر تمام خصوصیات کی کلید ہے۔اس بات پر تقریباً ہر نقاد و مورخ متفق ہے کہ لکھنؤ کی شاعری میں داخلی عنصر کے بجائے خارجی عنصر کی کارفرمائی زیادہ ہے جیسا کہ سطور گذشتہ میں مذکور ہوا کہ دلی ہمیشہ سے مصائب و آلام کی آماج گاہ رہی ہے، ہر طرف موت کا تماشا دیکھتے دیکھتے شاعروں میں دنیا کی فنائیت کا تصور بڑھتا چلا گیا اور متصوفانہ مضامین کو جگہ دی جانے لگی۔ دوسری جانب لکھنؤ عیش و عشرت کا مرکز بنا ہوا تھا جہاں دوسرے مقامات سے شعرا و ادبا ترکِ وطن کر کے لکھنؤ کی ادبی فضا میں مزید چار چاند لگا رہے تھے۔ یہ لکھنؤ کی خوشحالی اور پر امن زندگی کی ترجمانی کر رہا ہے۔لکھنؤ کی شاعری میں عورت کے حسن کا بھرپور ذکر ملتا ہے، اس کے لباس، زیور اور اعضائے جسمانی کو بھی بڑی اہمیت دی گئی ہے۔لکھنؤ کی شاعری میں تصوف کے مضامین نہ ہونے کے برابر ہیں کیوں کہ یہاں کی رنگین زندگی میں تصوف کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ دبستان لکھنؤ کی شاعری زبان کے نقطۂ نظر سے زیادہ دلکش اور پر کشش ہے۔ زبان کے معاملے میں اہل لکھنؤ نے دلی والوں سے اپنا راستہ الگ بنایا تھا جسے محض لکھنویت سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔شعرائے لکھنؤ نے خیالات سے زیادہ الفاظ کی نوک پلک سنوارنے پر توجہ دی جس کی وجہ سے دبستان لکھنؤ کی زبان زیادہ دلآویز ہوگئی، دبستان دلی کے شعرا میں حالات کی نوحہ گری اور بے اطمینانی اور فنائیت کا احساس غالب ہے۔ اس کے برخلاف لکھنؤ کے شعرا میں عیش پسندی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ دلی میں داخلیت پر زیادہ توجہ دی گئی تو لکھنؤ میں خارجیت کا بول بالا رہا ہے۔ دلی میں دل کی ترجمانی ملتی ہے تو لکھنؤ میں دماغ کی کارفرمائی ہے جس کے سبب تصنع کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس فرق کو سمجھنے کے لیے دونوں دبستانوں سے دو دو مثالیں پیش کی جارہی ہیں:

اے وائے انقلاب زمانے کے جور سے
دلی ظفر کے ہاتھ سے پل میں نکل گئی

دلی ہوئی ہے ویراں سونے کھنڈر پڑے ہیں
ویران ہیں محلے سنسان گھر پڑے ہیں

جمنا میں کل نہا کر جب اس نے بال باندھے
ہم نے بھی اپنے جی میں کیا کیا خیال باندھے

ان اشعار کی روشنی میں اس بات کا اندازہ لگانا بہت آسان ہو جاتا ہے کہ دلی اور لکھنؤ کی شاعری میں کیا نمایاں امتیازات ہیں۔لکھنؤ کی ابتدائی شاعری شعرائے دلی کے زیر اثر سوز و گداز، داخلیت اور دہلوی رنگ لیے رہی مگر آہستہ آہستہ اس میں کمی آنے لگی۔ مصحفی اور انشا کے زمانے تک دہلی کی داخلیت اور جذبات نگاری اور لکھنؤ کی خارجیت اور رعایت لفظی ساتھ ساتھ چلتی رہیں لیکن ان کے بعد لکھنؤ کی اپنی خاص زبان اور لب و لہجہ نمایاں

ہوتا چلا گیا۔لکھنوی شعرا کا زور واردات قلبی اور جذبات واحساسات کے بیان وترجمانی کے بجائے محبوب کے لوازم ظاہری اور متعلقات خارجی کے بیان پر ہے۔اس کے علاوہ نسائیت ،صنعت گری، مضمون آفرینی اورطویل غزلیں یہ وہ عناصر ہیں جن سے لکھنؤ کی شاعری عبارت ہے۔ ذیل میں مذکورہ خصوصیات پر قدرے تفصیل سے گفتگو کی جائے گی تا کہ دبستان لکھنؤ کی اہم خاصیتوں سے آگہی حاصل ہوسکے۔

7.3.1 خارجیت اور بیرون بینی:

جہاں دلی کی شاعری فکروفلسفہ سے لبریز ہے وہیں لکھنؤ کی شاعری میں فکروفلسفہ کا فقدان ہے جس کے نتیجے میں یہاں گہرائی مفقود ہے اور ظاہرداری پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ درون بینی سے لکھنؤ کے شعرا بہت دور دکھائی دیتے ہیں۔ وقارعظیم نے لکھا ہے کہ لکھنویت تکلف اور تصنع کا دوسرا نام ہے۔ جہاں شاعر محسوسات اور واردات کی سچی دنیا کو چھوڑ کر خیال کی بنی ہوئی اور رنگین فکر کی پیدا کی ہوئی پر پیچ راہوں پر چل کر خوش ہوتا ہے۔اس کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ لکھنؤ کی ساری زندگی میں ظاہر پر اس قدر زور تھا کہ شعرا کو دروں بینی کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ ایسے میں دل کی کھڑکی کھول کر میرؔ کی طرح اپنی ذات کے اندر کون جھانکتا ہے۔ جب انھیں عیش وعشرت اور آرائش وزیبائش کی محفلوں سے فرصت ہی نہیں تھی۔

طرفہ چمن حسن میں ہے نخل ترا قد
کرتہ تو ہے اے سرو رواں مولسری کا

آنکھیں نرگس چہرہ گل گیسو ہیں سنبل سروقد
عکس ہے آئینہ خانہ صاف گلشن ہو گیا

7.3.2 طویل غزلیں:

دبستان لکھنؤ کی ایک اور خصوصیت طویل غزلیں لکھنا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ شعرا اپنے معاصرین پر سبقت لے جانے کی غرض سے طویل غزلیں لکھتے ہوں گے کیوں کہ اس میں قافیہ پیمائی کی آزمائش ہوتی ہے۔طویل غزلوں سے اپنی شاعرانہ قدرت کا اظہار بھی مقصود ہوتا تھا۔ بعض شعرا کے یہاں تو دوغزلہ اور سہ غزلہ کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ اگرچہ طویل غزلوں کی ابتدا جرأتؔ و مصحفیؔ سے ہوتی ہے جو دلی سے ہجرت کر کے آئے تھے مگر ان کی اتباع میں لکھنوی شعرا ان سے بہت آگے نکل گئے۔ دوسری وجہ یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اس دور میں فی البدیہ اور پُرگوئی کو شاعری کی معراج تصور کیا جاتا تھا اس لیے بھی شعرا اس جانب متوجہ ہوئے کیوں کہ طویل غزلوں میں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ بھرپور انداز میں ہوسکتا ہے۔

7.3.3 نسائیت:

نسائیت بھی دبستان لکھنؤ کی اہم خاصیت ہے۔ یوں تو اردو شاعری میں عورت کو ہمیشہ مرکزیت حاصل رہی ہے بالخصوص غزل کا تصور ہی عورت کے بغیر ممکن نہیں سمجھا جاتا مگر دبستان لکھنؤ میں عورت کو جس ناز وادا یا بازاری جنس کے طور پر پیش کیا گیا ہے اس کی مثال پوری اردو شاعری میں خال خال ہی نظر آئے گی۔ دوسری جانب لکھنؤ کے عیش پرور ماحول نے مردوں کو مردانہ خصائل سے محروم کر رکھا تھا اور ان کے مردانہ خیالات وجذبات کو اس قدر کمزور کر رکھا تھا کہ ان کے جذبات وخیالات اور زبان پر بھی نسائیت طاری ہوگئی اور ریختہ کے جواب کے طور پر ریختی نے باقاعدہ ایک صنف

کی حیثیت اختیار کرلی۔ دبستان لکھنؤ میں ریختی کے آغاز کا سہرا عام طور پر سعادت یار خاں رنگین کے سر بندھتا ہے۔ درحقیقت اس صنف کا آغاز دکن میں ہوا تھا رنگین کے بعد انشا اور دیگر شعرا نے بھی اس کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان شعرا کے یہاں ریختی کے جو نمونے ملتے ہیں ان میں عورتوں کے نفسانی جذبات اور ان کے خاص محاورات کی بھرمار ہے جو لکھنوی شعرا کی پست خیالی اور ابتذال پسندی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ لکھنوی سوسائٹی میں جو عورت کو شاعری میں مرکزی حیثیت دی گئی ہے وہ شریف النفس، عفت مآب یا پردہ نشین خاتون نہیں بلکہ بازاری عورت یا کوٹھے پر بیٹھنے والی طوائف ہے اس لیے شعرا نے جن عورتوں کے جذبات و خیالات کی ترجمانی نسائی انداز میں کی ہے وہ کوئی گھریلو دوشیزہ یا شریف خانوادے کی بہو بیٹی نہیں بلکہ یہی بازاری عورت یا طوائف ہے۔

7.3.4 رعایت لفظی:

رعایت لفظی بھی دبستان لکھنؤ کی اہم خصوصیت ہے جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے کہ لکھنؤ کا معاشرہ تصنع اور تکلف سے مملو تھا اس لیے ظاہر داری یہاں جزو لاینفک کی حیثیت رکھتی تھی۔ رعایت لفظی کی بنیاد پر شعرا طنز اور تفریح کے اسباب پیدا کرتے ہیں۔ لکھنؤ کا معاشرہ خوش مزاج محفلوں اور مجلسوں کا دلدادہ تھا اور مجلسوں میں وہی لوگ کامیاب ہوسکتے ہیں جنھیں زبان پر قدرت حاصل ہو اور لفظوں کی بازی گری میں ماہر ہوں، ایک لفظ کو دوسرے لفظ سے جوڑنے اور لفظوں کے معانی سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ لکھنؤ میں چوں کہ لفظی رعایتوں کا بڑا دخل رہا ہے، رؤسا اور امرا باقاعدہ طور پر تُک بندی کے لیے ملازم رکھتے تھے۔ لہٰذا شعرا بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، اسی بنا پر لکھنوی شاعری میں رعایت لفظی کی بہتات ہے بلکہ بعض اوقات تو صرف رعایت لفظی کو منظوم کرنے کے علاوہ شاعر کی کوئی غرض نہیں ہوتی تھی۔

ہندو پسر کے عشق کا کشتہ ہوں باغباں
لالہ کا پھول رکھنا امانت کی قبر پر

زلفِ صنم پہ غیر کا قبضہ مدام ہے
اب تک وہی یزید وہی ملک شام ہے

(امانتؔ)

7.3.5 مضمون آفرینی:

مضمون آفرینی بھی دبستان لکھنؤ کا خاص وصف ہے۔ مضمون آفرینی میں بھی شعرائے لکھنؤ نے کمال درجہ کی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ مضمون آفرینی کا مطلب ہوتا ہے کسی روایتی یا قدیم مضمون میں سے کوئی انوکھا اور عجیب وغریب مفہوم نکالنا۔ ایسے مضامین کی بنیاد جذبے کے بجائے تخیل اور واہمے پر ہوتی ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

چشم بددور آج آتے ہیں نظر کیا گال صاف
سبزۂ خط کیا غزالِ چشم کا چارہ ہوا

جو میٹھی میٹھی نظروں سے وہ دیکھے
کہوں آنکھوں کو میں بادام شیریں
(ناسخ)

7.3.6 ابتذال وعریانی:

محبوب کے بیان میں جس عریانی وہرزہ گوئی کی شروعات جراَت وانشانے کی تھی، اسے ناسخ اوران کے شاگردوں نے رکاکت وابتذال اورغلو کی حدتک پہنچادیا۔لکھنوی شعرانےمحبوب کے سراپے کے بیان میں نہ صرف یہ کہ اس کے اعضائے جسمانی کی تصویرکشی کی بلکہ اسے سرتاپا بے نقاب بھی کردیا۔مولاناعبدالسلام ندوی نےلکھنؤ کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے''شعرالہند'' میں لکھاہے کہ:

''لکھنؤ کےشعراکےدواوین سےعورتوں کے زیورات وپوشاک اورسامان آرائش کی مفصل فہرست مرتب کی جاسکتی ہے۔زنانہ الفاظ ومحاورات کےغلبہ سےبھی اندازہ ہوتاہے کہ معاشرے کےاعصاب پرعورت کس طرح سوارتھی اوروہ عورت کس مزاج وافتادطبع اوراخلاقی رتبہ کی حامل تھی۔''

معاشرے کےاسی پست ذوق اورغیرمہذب رویے کادوسرانام ابتذال ورکاکت ہے۔اسی شعری رویہ پریعنی نسائیت اورعریانیت پرریختی کی بنیادپڑی جس میں بازاری عورتوں کےمبتذل جذبات سوقیانہ وعامیانہ انداز میں بیان ہوتے ہیں۔

اس کاقطعی یہ مطلب نہیں ہے کہ پوری لکھنوی شاعری یاتمام لکھنوی شعرافحش نگاری کی اس صف میں شمار ہوتے ہیں اس کے برخلاف ایسے اشعاربھی ملتے ہیں جن کےسرے دبستان دلی سے جاملتے ہیں اورسوز وگداز،حزن وغم،واردات قلبی اورداخلی احساسات کےمعاملے میں دلی کےشعرا کےہم پلہ ہیں۔چندمثالیں ملاحظہ ہوں:

رشک سے نام نہیں لیتے کہ سن لے نہ کوئی
دل ہی دل میں اسے ہم یاد کیا کرتے ہیں

تاب سننے کی نہیں بہرخدا خاموش ہو
ٹکڑے ہوتا ہے جگرناسخ تری فریاد سے

حرم کواس لیے اٹھ کر نہ بت کدے سے گئے
خداکہے گا کہ جورِ بتاں اٹھانہ سکا

7.3.7 محاورات والفاظ کااستعمال:

دبستان دلی کےشعرامحاوروں اورروزمرہ کااستعمال بہ کثرت کرتے ہیں محاوروں اورروزمرہ کےاستعمال سے بات میں وزن پیداہوتاہےاور ساتھ ہی مفاہیم کی ادائیگی اورمطالب کی تفہیم میں بھی آسانی ہوتی ہے۔دہلوی شعراچوں کہ سادگی،روانی اورسلاست کے قائل ہیں اورقاری کومن

وعن اپنے خیالات کا شریک کار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔اس کے برعکس لکھنوی شعرا تصنع ،تکلف اور تشبیہ واستعارہ کے استعمال کو قابل قدر سمجھتے ہیں اس لیے اصل مقصد قاری کی گرفت میں نہیں آتا ہے۔ایسا نہیں ہے کہ لکھنوی شعرا محاورے کے استعمال کو سرے سے خارج کر دیتے ہوں محاوروں کا استعمال اہل لکھنؤ بھی کرتے ہیں مگر ان میں اور دہلوی شعرا میں امتیازی فرق یہ ہے کہ دہلوی شعرا محاورے کا استعمال بوقت ضرورت کرتے ہیں اور اہل لکھنؤ بغرض شوق کرتے ہیں۔

7.4 اردو شاعری پر دبستانِ لکھنؤ کے اثرات

دبستانِ لکھنؤ کی خصوصیات کے زمرے میں یہ بات کہی جا چکی ہے کہ ہر شاعر و ادیب اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے اور شعر و ادب اپنے ماحول اور معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ریاست اودھ نے جس طرح زندگی کے تمام شعبوں میں تبدیلی پیدا کر دی تھی، اور کوئی ایک شعبہ ایسا نہ تھا جس نے خاطر خواہ اثرات قبول نہ کیے ہوں، خواہ وہ آدابِ محفل ہوں یا طرزِ تکلم، اندازِ خورد و نوش ہو یا وضع لباس غرض کہ ریاست اودھ کے قیام سے ساکنانِ اودھ کی زندگی یکسر بدل گئی تھی۔ان حالات میں معاشرے کی تبدیلیوں کا اثر بھلا ادب پر کیوں نہ پڑتا جب کہ سچائی یہ ہے کہ وہی ادب سچا اور دیرپا ہوتا ہے جس میں زمانے کے ساتھ چلنے کی سکت ہو، جو اپنے سماج کا سچا نمائندہ ہو، جو حالاتِ حاضرہ کا مبصر ہو۔اس اصول کی روشنی میں جب ہم اردو ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی تمام معتبر و مستند زبانوں کے ادب کی طرح اردو زبان کے ادب میں بھی زندہ رہنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے کیوں کہ دکنی ادب سے لے کر دبستان دلی اور اس کے بعد دبستانِ لکھنؤ سے لے کر عصر حاضر تک اردو ادب نے زمان و مکان کی حد بندیوں کو عبور کر کے خود کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ ہر تہذیبی بساط پر خود کو مستحکم بھی بنایا ہے۔

جب اردو ادب کا مطالعہ دبستانِ لکھنؤ کی زمانی و مکانی قیود میں رہ کر کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ مذکورہ دبستان نے بھی اردو ادب پر (بشمول شاعری ونثر) گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔شاعری اور بالخصوص غزل اور مرثیہ میں تو کئی اعتبار سے نئے نئے تجربات، مضامین، تراکیب اور اختراعات کا اضافہ بھی ہوا۔ذیل کی سطور میں اس موضوع پر قدرے تفصیل سے گفتگو کی جائے گی تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ کن اصناف نے امتیازی طور پر دبستان لکھنؤ کے اثرات قبول کیے ہیں حالاں کہ خصوصیات والے باب میں اس پر سیر حاصل گفتگو کی جا چکی ہے کہ دبستان لکھنؤ کے زیر اثر اردو شاعری میں تصنع وتکلف، خارجیت و بیرون بینی، الفاظ و محاورات، مضمون آفرینی وقافیہ پیمائی اور تشبیہات و استعارات کو خاص مقام حاصل تھا اور شعرائے لکھنؤ اسی کو طرہ امتیاز سمجھ رہے تھے جس کے بعض فائدے جیسے اردو شاعری میں نئے نئے مضامین و اسالیب کا اضافہ ہوا، سنگلاخ زمینیں وضع کی گئیں اور زبان میں نئے تجربات و اختراعات بھی کیے گئے اس کے باوجود بعض امور میں نقصان بھی ہوا کہ زبان کی سلاست، روانی، سادگی اور داخلیت مجروح ہوتی چلی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری برائے شاعری بن کر رہ گئی اس کا زندگی سے رشتہ کمزور ہوتا چلا گیا۔

7.4.1 اردو غزل پر دبستانِ لکھنؤ کے اثرات:

غزل ایک ایسی توانا اور دلفریب صنفِ سخن ہے جس میں دیگر اصنافِ سخن کے مقابلے میں زندہ رہنے کی صلاحیت سب سے زیادہ ہے۔اسی لیے لاتعداد اعتراضات اور شدید تنقیدوں کے باوجود اس نے خود کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ تہذیبی اور ثقافتی روایتوں سے خود کو وابستہ رکھ کر مزید مستحکم بھی بنایا ہے۔اردو کی تمام اصناف شاعری میں غزل وہ واحد صنف ہے جس میں اثر قبول کرنے کے عناصر سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں اور جو زمان و مکان کی قیود میں رہنے کے باوجود خود کو ہر سانچے میں ڈھال لیتی ہے۔غزل کے رموز وعلائم میں اتنی لچک اور اس کے موضوعات میں اتنی وسعت ہے کہ یہ

ہر طرح کے ماحول سے مانوس ہوجاتی ہے مگر غزل کا مرغوب ومحبوب موضوع عشق ہے مگر یہ عشق بھی عجیب شے ہے رند اور صوفی دونوں کو یکساں اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے۔کوئی مجاز کو مرکز توجہ بناتا ہے تو کوئی حقیقت کے بحر بیکراں میں غوطہ زن ہوجاتا ہے لیکن عشق وعاشقی کی اس داستان میں فن کار کی افتادِ طبع،مزاج کی ساخت،اس کا ذوقِ اخذ وانتخاب اس کی ذہنی کیفیت اور اس کا سماجی وتہذیبی پس منظر سب جھلکتے ہیں۔غزل کی ہیئت داخلی اور خارجی دونوں طرح کے مضامین کو گوارا کرنے کے لیے تیار رہتی ہے۔البتہ داخلی کیفیات اور درون بینی سے غزل کا خاصا لگاؤ ہے مگر شعرائے لکھنؤ نے اسے خارجی کیفیات اور محبوب کے اعضائے جسمانی،ملبوسات اور معاملات ظاہری کا ترجمان بنایا جو اس معاشرے کا تقاضا بھی تھا۔دلی کا شاعر محبوب کے فراق میں سوز وگداز کا مرقع بن جاتا ہے جب کہ لکھنؤ کا شاعر اسی کیفیت کا اس انداز میں بیان کرتا ہے۔

حوروں کے عوض مجھے الٰہی

دنیا میں تو ایک نازنیں دے

کب مجھ کو بہشت کی ہے خواہش

جو کچھ دنیا ہے سو یہیں دے

اس نوع کی شاعری سے لکھنوی غزل کا دامن بھرا ہوا ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ لکھنویت کا اثر سب سے زیادہ غزل نے ہی قبول کیا اور جتنی بھی خصوصیات دبستان لکھنؤ کی شمار کی جاسکتی ہیں وہ سب غزل کی ہی مرہون منت ہیں کیوں کہ ہر صنف کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں کبھی ہیئتی سطح پر تو کبھی موضوعاتی سطح پر،غزل ہیئتی سطح پر تو کسی تبدیلی کو قبول نہیں کرتی مگر موضوعاتی سطح پر دیگر تمام اصناف سخن کا بار اٹھا سکتی ہے خواہ مرثیہ کا سوز وگداز اور حزن وغم ہو یا قصیدے کا پرشکوہ لہجہ،مثنوی کی سلاست وروانی ہو یا حمد ونعت ومنقبت کے مذہبی موضوعات غرض کہ غزل میں حد درجہ تنوع پایا جاتا ہے۔جس کے سبب دبستانِ لکھنؤ میں سب سے زیادہ متاثر ہونے والی صنف غزل بن گئی۔

7.4.2 اردو قصیدے پر دبستانِ لکھنؤ کے اثرات:

قصیدہ بظاہر موضوع کے اعتبار سے ذی حیثیت اشخاص کی مدح یا کم مرتبہ افراد واشیاء کی ہجو یا مذہبی رہنماؤں کی منقبت پر مشتمل ہوتا ہے لیکن مواد کے اعتبار سے یہ اپنے عہد کے طرز فکر،معتقدات اور نظریات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔قصیدہ پر ایرانی اثرات سب سے زیادہ مرتب ہوئے یوں تو مغل عہد سے ہندوستانی تہذیب ومعاشرت ایران کے مسلسل اثرات قبول کررہی تھی لیکن زندگی اور ادب کے بعض شعبوں میں یہ اثرات زیادہ نمایاں تھے مثلاً دربار کے آداب واطوار،امرا و روسا کی مجلسی زندگی،نشست وبرخاست اور خورد ونوش پر ایرانی تمدن کے گہرے اثرات تھے۔اسی طرح ادب پر بھی ایرانی فارسی زبان کا اثر تھا۔ادب کی جس صنف میں دربار کے مزاج ومذاق کی رعایت پوری طرح ملحوظ رکھی جاسکتی ہے۔وہ قصیدہ نگاری تھی اس لیے کہ یہ بنیادی طور پر عوام کے بجائے خواص کے لیے تخلیق کیا جاتا تھا۔قصیدے کی صنف اس اعتبار سے بھی درباری مذاق سے ہم آہنگ تھی کہ اس میں شعرا کو فکری زور آزمائی کے بھرپور مواقع ملتے تھے جس کی بنیاد پر بادشاہ وامرا کی جانب سے انعام واکرام کی بارشیں ہوتی تھیں۔ یہ سلسلہ اردو زبان کی ابتدا سے لے کر لکھنؤ کے رنگین ماحول تک جا پہنچا،جہاں سودا،مصحفی،انشا،میرحسن،جعفر علی حسرت وغیرہ کے علاوہ دیگر شعرائے لکھنؤ نے اپنی اپنی مخصوص اصناف میں مہارت بہم پہنچانے کے ساتھ قصیدہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی۔قصیدہ نگاری یوں بھی مبالغہ آمیزی اور تشبیہات واستعارات کا دفتر مانی جاتی ہے ایسے میں لکھنؤ کی پرتکلف وتصنع فضا نے شعرا کو مزید مہمیز کیا۔مگر بعض لکھنوی شعرا نے قصیدے جیسی مہتم

بالشان صنف کو ریختی کے ڈھب میں لکھ کر اسے رکاکت وابتذال کی حد تک پہنچا دیا۔ رنگین کے دو قصیدوں کے مطلع بطور نمونہ پیش کیے جا رہے ہیں، جس سے اندازہ لگانا آسان ہو جائے گا کہ لکھنوی شعرا نے کس طرزِ تحریر کو طرہ امتیاز سمجھ رکھا تھا۔

کہے ہے شاہِ برہمنہ سے کوئی دل کا غم　　　کہیں طبق کوئی پریوں ہی کا اٹھائے ہے

نہ شیخ سدو کا بھائی ہے مجھ کو کچھ بھی الم　　　غرض نہ ننھے میاں سے نہ زین خاں سے کام

مداحی میں بھی لکھنوی شعرا غلو کی حد تک مبالغہ کا استعمال کرتے ہیں۔

ہیں نمک پروردہ تیرے آدم وجن وپری　　　حق تعالیٰ نے عطا کی ہے تجھ کو سروری

ریاست اودھ کے آخری دور تک شعرا کی توجہ قصیدے کی جانب سے ہٹنے لگی اور شعرا نے اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لے غزل کو ہی آلۂ کار بنایا۔ لکھنؤ میں قصیدے کے زوال کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں جیسے بادشاہوں کا اپنی تعریف نہ کروانا کیوں کہ وہ شعر وادب کو تفنن طبع کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مرثیہ کے بڑھتے رواج نے قصیدے کی چمک ماند کر دی ہو۔

7.4.3 اردو مثنوی پر دبستان لکھنؤ کے اثرات:

مثنوی انسانی تہذیب وتمدن کی داستان بیان کرنے اور معاشرے کے جلوۂ صد رنگ کی عکاسی کرنے کی سب سے زیادہ اہلیت رکھتی ہے۔ اردو مثنوی کی ہیئت فارسی کی ساختہ وپرداختہ ہے۔ فارسی کی مقرر کردہ بحور میں ہی اردو مثنوی نگار شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔ مثنوی میں تاریخی واقعات، جذباتِ انسانی اور مناظر فطرت متوازن طریقہ سے ترکیب کھاتے ہیں، چناں چہ اس میں تاثر انگیزی کی صلاحیت بھی ہے اور تصویر کشی کا ہنر بھی۔ جیسا کہ مذکور ہوا کہ دبستان لکھنؤ نے تمام اصناف سخن کو اپنے دامن میں لے رکھا تھا بعینہٖ یہی معاملہ مثنوی کے ساتھ ہوا بلکہ اردو کی عظیم مثنویاں اسی عہد کی پیداوار ہیں کیوں کہ مثنوی نگاری جس خاص قسم کی معاشرتی زندگی کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ عہد اس معاشرتی نظام کی عمدہ مثال ہے۔ عظیم آباد میں راسخ اور دلی میں میر اثر مسلسل مثنوی نگاری میں مصروف تھے۔ ادھر فیض آباد میں میر حسن، سحر البیان کی تخلیق میں مصروف تھے۔ صنف مثنوی میں امور قدر مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہیرو کا بادشاہ زادہ ہونا اور ہیروئن کا شہزادی یا جنوں کے بادشاہ کی بیٹی ہونا اس کے علاوہ مافوق الفطرت کردار و واقعات سے اردو مثنویاں بھری پڑی ہیں۔ سحر البیان سے لے کر گلزار نسیم تک تقریباً ہر مثنوی کا خمیر انھیں کردار کو ذہن میں رکھ کر گوندھا گیا ہے۔ دبستانِ لکھنؤ کے شعرا چوں کہ اپنی بسیار گوئی کے لیے بھی مشہور ہیں اس لیے شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہوگا جس نے مثنوی نگاری میں طبع آزمائی نہ کی ہو خواہ مہاجر شعرا میں میر تقی میرؔ، جرأتؔ، مصحفیؔ وغیرہ ہوں یا مقامی شعرا میں ناسخؔ اور ان کے شاگرد ہوں۔ مثنوی نگاری میں سب نے اپنے اپنے جوہر دکھائے ہیں اور بعض مثنوی نگاروں نے دیگر اصناف سخن کی طرح مثنوی کو بھی لکھنوی رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔

مرزا شوق کی مثنویاں بھی اسی عہد کی یادگار ہیں ان کی مثنویوں میں عورت کو جس نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے، وہ لکھنویت کی ہی دین ہے۔ شوق نے اپنی مثنویوں کے لیے جس طرح کے واقعات کا انتخاب کیا ہے، اس میں ان کے ماحول کی رنگینی کے ماسوا خود ان کی رنگین مزاجی کا بھی بڑا دخل ہے۔ اسی عہد کے ایک بڑے مثنوی نگار اسعد اللہ خاں قلق ہیں۔ انھوں نے واجد علی شاہ کے عہد میں ''قلق نامہ'' لکھا۔ اس مثنوی میں وہ وصل کی تفصیلات مزے لے کر بیان کرتے ہیں، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ لکھنوی معاشرت میں لمس ولذت کی تمنا اور تلذذ پسندی اکثر شعرا کا شعار رہی ہے اس لیے کسی ایک کو اس کے لیے موردِ الزام ٹھہرانا مناسب نہ ہوگا۔ واجد علی شاہ نے اپنی بعض مثنویوں میں موسیقی کے ساز وسامان اور اصطلاحات کو مفصل

طور پر بیان کیا ہے۔

الغرض اس عہد کی تمام مثنویاں اپنے تمدن اور سوسائٹی کی سچی ترجمان ہیں اور معاشرے کے ایک خاص طبقہ کے لعب ولہو کو من وعن پیش کرتی ہیں۔ان میں دیا شنکر نسیم کی مثنوی ''گلزارنسیم' امتیازی حیثیت کی حامل ہے۔

7.4.4 اردو مرثیہ پر دبستانِ لکھنؤ کے اثرات:

اس عہد میں غزل اور مثنوی کے ساتھ جس صنف کو زیادہ توجہ حاصل ہوئی وہ مرثیہ نگاری ہے۔ بلکہ اس کا ذخیرہ کیفیت وکمیت کے اعتبار سے دیگر کئی اصناف سے کہیں زیادہ وقیع اور وسیع ہے۔مرثیہ کا غیر معمولی فروغ اودھ کے مخصوص معاشرتی وتہذیبی اسباب کا مرہون منت ہے۔نوابانِ اودھ مسلک کے اعتبار سے شیعہ تھے،اور واقعۂ کربلا کی یاد تازہ رکھنا اور اس سے تاثیر وتاثر حاصل کرنا موجب ثواب ونجات سمجھتے تھے۔مرثیہ نگاری اور بالخصوص شاعری میں کربلائی واقعات کی تاریخ نہایت پرانی ہے۔دکن سے ہوتے ہوئے مرثیہ نے دلی اور پھر لکھنؤ کا سفر کیا اور اس طرح اس صنف کی سرپرستی ان ہاتھوں میں پہنچ گئی جو خود کو اس کا سب سے زیادہ حق دار سمجھتے تھے۔دلی میں مسکین،حزیں اور غمگین نے محمد شاہ کے عہد میں جو مراثی لکھے۔ان میں شہدائے کربلا کے خدوخال اس عہد کے دہلوی معاشرہ کے چوکھٹے میں فٹ کرنے کی کوشش کی۔مسکین نے سیکڑوں مرثیے لکھے اور مرثیہ کے علاوہ کسی دوسری صنف کو ہاتھ تک نہ لگایا،اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد کے معاشرے میں اس صنف کی مقبولیت اور اس موضوع سے عوام کا جذباتی رشتہ کیسا تھا۔جب دلی کے اجڑنے کے بعد لکھنؤ کو مرکزیت حاصل ہوئی تو اس صنف نے حد درجہ فروغ حاصل کرلیا تھا،جس میں بعض دیگر شعرا کے علاوہ میر خلیق اور میر ضمیر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔انھوں نے مرثیہ نگاری کو باقاعدہ عروج عطا کیا۔ان کے شاگردوں میں خاص طور سے میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے جو گراں قدر اضافے کیے ہیں ان کے بغیر اردو مرثیہ نگاری کی تاریخ ہی مکمل نہیں ہوسکتی۔

میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی مرثیہ نگاری کا دور لکھنؤ کی ثقافتی زندگی کے عروج کا دور تھا اور اس تمدن نے شعروادب کی جن اصناف کی آبیاری کی تھی، یہ ان کے نقطۂ عروج کا زمانہ تھا۔انیسؔ کے دور میں شعر کا بنیادی منصب شاعر کے نزدیک اپنی طاقتِ لسانی سے سامعین کو مرعوب کرنا اور زبان وبیان کے حسن سے ان کو محفوظ کرنا تھا۔انیسؔ خود اپنا مقصد ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں:

دبدبہ بھی ہو مصائب بھی ہوں توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہو رقت بھی ہو تعریف بھی ہو

انیسؔ کی فن کارانہ صلاحیتوں کی ہماری ادبی تنقید کی تاریخ میں سبھی نقادوں نے بڑی تعریف کی ہے۔انسانی جذبات کی تصویر کشی میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔میر انیسؔ جس معاشرے کے لیے لکھ رہے تھے،اس کے کچھ تقاضے تھے۔اس لیے خواہی نہ خواہی انیسؔ ودبیرؔ کو بھی وہی راہ اختیار کرنا پڑی جوان کے پیشرووں کی تھی۔مرثیہ نگاری اگرچہ ایک مذہبی صنف تصور کی جاتی تھی مگر اس صنف میں تخیل کا بڑا دخل ہے۔بعض اوقات مرثیہ نگاروں نے ان عظیم کرداروں کو جن سے واقعۂ کربلا عبارت ہے،لکھنویت کے لبادہ میں پیش کر دیا ہے۔خاندان امام حسین کے بچوں کے متعلق اس بند سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھیں نے کس طرح خاندانِ رسالت کے بچوں کو لکھنوی تہذیب ومعاشرت کا پتلا بنا کر پیش کیا ہے۔

منھ بھولا بھالا گوندھے ہوئے گیسوؤں کے بال ماتھا تو رشک بدر بھویں غیرتِ ہلال
رخسار روشنی میں فزوں آفتاب سے

کانوں کے بندے ہل رہے تھے اضطراب سے

یہ صرف انیس و دبیر ہی نہیں بلکہ تمام لکھنوی مرثیہ نگار شعرا کا حال ہے کہ انھوں نے مرثیوں میں لکھنوی معاشرت کو بھرپور انداز میں پیش کیا ہے اور کربلا کے واقعات کو لکھنؤ کے معاشرتی وتمدنی تقاضوں سے ہم آہنگ کرکے اپنے مراثی میں پیش کیا ہے۔ حاصل کلام کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس صنف سخن نے بھی اس عہد کے جملہ رجحانات کی نہایت دلکش اور بھرپور ترجمانی کی ہے بلکہ بعض معاملات میں دیگر اصناف شاعری پر سبقت حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوئی ہے۔

7.5 اردو نثر پر دبستانِ لکھنؤ کے اثرات

7.5.1 اردو داستان پر دبستان لکھنؤ کے اثرات:

دبستان لکھنؤ نے جس طرح سے اردو شاعری کو متاثر کیا اسی طرح اردو نثر پر بھی تاریخی اثرات مرتب کیے اور بعض اصناف کا قابل ذکر سرمایہ اسی دور کی یادگار رہے۔ نثری ادب میں داستان کو اولیت ہے جس نے دبستان لکھنؤ کے زیر اثر بہت سی تبدیلیوں کو قبول کیا اور بہت سے تجربات بھی کیے۔ اردو نثر میں یہ دور داستانوں کے شباب کا دور کہا جا سکتا ہے۔ اس دور میں اتنی داستانیں وجود میں آئیں کہ دوسری نثری اصناف اس کے سامنے بحیثیت کمیت بہت کمتر معلوم ہوتی ہیں۔ اس عہد کی داستان لکھنؤ اور فیض آباد کے مخصوص مزاج و ماحول سے زبردست مطابقت رکھتی ہے۔ نوطرز مرصع لکھنؤ کی پہلی داستان ہے جو 1781 میں لکھی گئی۔ اس کے مصنف عطاحسین تحسین ہیں۔ نوطرز مرصع کی داستان فارسی کے قصہ چہار درویش سے ماخوذ ہے لیکن اس کی تزئین وآرائش تحسین کے عہد کے مذاق کی جھلک پیش کرتی ہے۔ تحسین کے عہد میں فارسی انشاپردازوں کا تتبع اردو نثر میں بھی کیا جارہا تھا۔ تحسین نے اپنی داستان کو دلچسپ بنانے کے لیے اپنے عہد کے ان تمام مروجہ طریقوں سے کام لیا جو لوگوں کا دل جیتنے کے لیے ضروری تھے۔ مثلاً داستان میں عبارت آرائی بھی ہے اور شعروشاعری کا چٹخارا بھی، حسن وعشق کے رمزیہ چھینٹے بھی ہیں اور مافوق الفطری عناصر کی کارفرمائی بھی۔ غرض یہ کہ نوطرز مرصع تصنع وتکلفات سے لبریز داستان ہے جو لکھنؤ کی تہذیب ومعاشرت کی عکاس ہے۔ نوطرز مرصع کے بعد اٹھارہویں صدی میں دوسرا کوئی قابل ذکر داستانی کارنامہ لکھنؤ میں نظر نہیں آتا البتہ فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام جس طرز اور اسلوب کو فروغ دیا جارہا تھا اس کے برعکس میر شیر علی افسوس نے جو لکھنؤ سے کلکتہ گئے تھے ''گلستان سعدی'' کا اردو ترجمہ کیا جس کا نام تھا 'باغ اردو' افسوس چوں کہ لکھنوی معاشرت کے پروردہ تھے اس وجہ سے فورٹ ولیم کی سادہ نگاری کے ماحول میں بھی رنگین ومقفیٰ عبارت کو برقرار رکھے ہوئے تھے۔ اس ترجمہ کی عبارت پیچیدہ ہے میرامن کے برعکس ان کی تحریروں پر عربی وفارسی کے الفاظ وتراکیب، اضافتوں، بندشوں اور طرز انشا کے اثرات نمایاں ہیں۔

''رانی کیتکی کی کہانی'' اردو کی مختصر ترین طبع زاد داستان ہے جسے انشا نے لکھا ہے اس میں اس بات کا التزام رکھا گیا ہے کہ سنسکرت، عربی اور فارسی کا کوئی لفظ داخل نہ ہو پائے۔ اس کا محرک بھی ندرت طبع اور زبان دانی وقوت اظہار کا کرشمہ دکھانا ہے۔ اس کے اسلوب پر ان کے مزاج کے شعبدہ بازی غالب ہے جو اور تحریروں میں ملتی ہے۔ اس کہانی کو لکھنے کی غرض وہ خود لکھتے ہیں ''ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات دھیان میں چڑھ آئی کہ کوئی کہانی ایسی کہیے جس میں ہندی چھٹ کسی بولی کا پٹ نہ ملے باہری اور گنواری کچھ اس کے ساتھ نہ ہو۔'' لکھنؤ کی سب سے نمایاں اور کامیاب نثری تخلیق رجب علی بیگ سرور کی ''فسانۂ عجائب'' ہے۔ جو غازی الدین حیدر کے عہد میں 1824 میں لکھی گئی اور یہ سچ ہے کہ یہ داستان لکھنؤ کے مخصوص

رنگ میں پوری طرح سے رنگی ہوئی ہے۔لکھنؤ کی ثقافت ومعاشرت اوراودھ کے دربار کے انداز واطواراور بازاروں کی چہل پہل اورعوام وخواص کے مزاج کی بہترین عکاس ہے۔فسانۂ عجائب کے متعلق علی عباس حسینی نے لکھا ہے کہ''فسانۂ عجائب لکھنؤ کی حقیقی زندگی کا مرقع ہےاوراس تہذیب وذہنیت کا نقشہ ہے جواس وقت دارالسرور (لکھنؤ) میں محبوب ومقبول تھی۔'' فسانۂ عجائب کے علاوہ اوربھی بہت سی داستانیں اس عہد میں لکھی گئیں جن کا ذکر یہاں ممکن نہیں۔دبستان لکھنؤ نے جس طرح شاعری میں نمایاں کردارادا کیا ہے اسی طرح نثری اصناف بالخصوص داستانی ادب میں بھی گراں قدراضافہ کیا ہے اس عہد کی داستانوں میں لکھنوی تہذیب ومعاشرت کی واضح شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔

7.5.2 اردوڈرامے پر دبستانِ لکھنؤ کے اثرات:

ڈراماوہ خاص صنف ہے جس کا آغاز اورنشوونما لکھنؤ میں ہوا۔ یہ صنف بھی داستان،مثنوی،مرثیہ،قصیدہ اورریختی کی طرح لکھنؤ کے مزاج و ماحول کے فطری تقاضے کے طور پر پروان چڑھی اوراسے اپنی اندرونی ساخت اورمواد کے اعتبار سے لکھنؤ میں نہایت سازگار ماحول ملا۔اردوڈرامے کی بنیاد ہندی ناٹک ہے یایوں کہہ سکتے ہیں کہ اردوڈرامے کا مخرج وماخذ ہندی ناٹک ہے جس سے تحریک پاکراردوڈراماوجود میں آیا۔اردوڈرامے کے معماراول ریاست اودھ کے آخری تاجدارواجدعلی شاہ ہیں جنھیں رقص،موسیقی،ڈرامانگاری اورشاعری سے خاص دلچسپی تھی۔واجدعلی شاہ نے ولی عہدی کے زمانے میں ہی اپنے ناچ گانے کے شوق کی تکمیل کے لیے حسین وخوش گلوطوائفوں کوڈھونڈ ھ ڈھونڈ ھ کرجمع کرنا شروع کردیا تھااوران کی تربیت کا بھی خاص اہتمام کیا تھا۔ڈرامانگاری سے انھیں جذباتی حدتک دلچسپی تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ خودڈرامے میں جوگی کا کردارادا کرتے تھےاور یہ خاص ڈراماحضور باغ میں ہوتا تھا۔جس میں ان کی منظورنظرعورتیں،خادمائیں اوربیگمات شامل ہوتی تھیں۔اس دور میں ڈرامانگاری کے حوالے سےامانت بھی خاص مقام رکھتے ہیں ان کا ڈررا ما''اندرسبھا''عوام میں بہت مقبول تھا۔

الغرض اس عہد میں واجدعلی شاہ اورامانت لکھنوی کے ڈرامے اپنے عہد کے معاشرے کی محرومیوں،نارسائیوں اورکمزوریوں کو پوری طرح عیاں کرتے ہیں۔خواب دیکھنے،خوابوں کی دنیا میں زندگی گزارنے،پرستان اورطلسمات کا چکرلگانے کا سوداہرسر میں تھا،جس کواس دور کے ڈرامانگاروں نے بڑے سلیقے سے اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے۔ڈرامانگاری کے میدان میں واجدعلی شاہ اورامانت لکھنوی کی کاوشیں اس عہد کے معاشرے کے مذاق کی ترجمان ہیں اوراس رنگین وزریں ماحول کے ذوق خودفراموشی کونمایاں کرتی ہیں۔ڈرامانگاری کے حوالے سے یہ وہ کاوشیں تھیں جن پرآگے چل کر اردوڈرامے نے ایک مستحکم عمارت تعمیر کی لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردوڈرامے کی تعمیروترقی میں دبستان لکھنؤ نے اہم کردارادا کیا ہے۔

7.5.3 تذکرہ نگاری پر دبستان لکھنؤ کے اثرات:

اس دور میں فارسی میں کافی تذکرے لکھے گئے۔ کچھ تذکرے اردو میں بھی لکھے گئے۔اردو تذکرہ نگاری میں میر کے تذکرے''نکات الشعرا'' کو اولیت حاصل ہے۔اس کے بعد جوبھی تذکرے لکھے گئے انھیں اسی کا تتبع سمجھنا چاہیے۔اودھ میں سب سے پہلا تذکرہ میرحسن نے 1775 میں''تذکرہ شعرائے اردو'' کے نام سے لکھا جس میں دلی کے مہاجر شعرا کے احوال درج ہیں۔میرحسن کے سامنے میر کا تذکرہ''نکات الشعرا''اورقائم چاندپوری کا تذکرہ''مخزن نکات''بطورنمونہ موجود تھے۔تذکرہ نگاری کی محرکات میں شعرا کی آپس کی چشمک کوکلیدی حیثیت حاصل ہے۔گروہ بندی نے شعرا کو تذکرے لکھنے پرمجبور کیا تاکہ اپنے گروہ کومستندومعتبر بنا کرپیش کرسکیں۔مصحفی کا تذکرہ''تذکرۂ ہندی'' بھی ان کے قیام لکھنؤ کے زمانے میں ہی وجود میں آیا۔سعادت خاں ناصر کا ایک تذکرہ''خوش معرکہ زیبا'' بھی قابل ذکر ہے۔جو 1846 میں لکھا گیا مگرریاست اودھ کے خاتمے کے بعد منظرعام پر

آیا۔ان تذکروں کے مطالعے سے نہ صرف شعرا کے احوال سے آگہی حاصل ہوتی ہے بلکہ اس عہد کی بھرپور عکاسی بھی ملتی ہے۔

7.5.4 اردو ناول پر دبستان لکھنؤ کے اثرات:

اردو ناول جس وقت وجود میں آیا اس وقت تک ریاست اودھ کا خاتمہ ہو چکا تھا اس لیے اردو ناول کو شاہان اودھ کی سرپرستی حاصل نہ ہوسکی مگر اٹھارہویں صدی میں لکھنؤ میں لکھے گئے ناولوں میں لکھنؤ کی لٹی پٹی تہذیب کے آثار ملتے ہیں۔اس کا سب سے بڑا نمونہ رسوا کا ناول ''امراؤ جان ادا'' ہے۔امراؤ جان ادا کے مطالعہ سے لکھنؤ کی مٹ چکی تہذیب جس میں طوائفوں کو خاص مقام حاصل تھا، آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے رسوا نے اسی معاشرت کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی۔ ہولکھنؤ کے ناول نگاروں میں رسوا کے علاوہ شرر بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ اردو ناول کو اگرچہ وہ عہد میسر نہ آیا مگر اس عہد کے اثرات لکھنؤ کے بعض ناولوں پر نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ اس عہد کی نثری تخلیقات کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح دبستان لکھنؤ نے اردو شاعری پر جس نوع کے اثرات مرتب کیے وہی نثر پر بھی کیے۔وہ جملہ رجحانات جو اس عہد کے معاشرے اور ثقافت میں موجود ہیں ہو بہو وہی رجحانات اردو کی نثری تخلیقات میں بھی منعکس ہوتے ہیں۔

7.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ اردو ادب میں دبستان دلی اور دبستان لکھنؤ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔مذکورہ دبستانوں نے اپنے اپنے طور سے اردو ادب کے سرمایے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

☆ دبستانِ لکھنؤ کے پروان چڑھنے میں نوابین لکھنؤ کا بھی اہم کردار ہے کیوں کہ وہ فنون لطیفہ سے بے حد دلچسپی رکھتے تھے اور ادبی وثقافتی سرگرمیوں میں خود بھی حصہ لیتے تھے۔دوسری بات یہ کہ لکھنؤ کے حکمرانوں نے دبستان لکھنؤ کی تشکیل اور ترقی میں کسی طرح کی جانب داری یا تعصب کو روا نہیں رکھا وہ جتنا مقامی شعرا کو اہمیت دیتے تھے اتنی ہی مہاجر شعرا کی بھی پذیرائی کرتے تھے۔

☆ دبستانِ لکھنؤ کی دیگر خصوصیات کے ساتھ خارجیت، نسائیت، طویل غزلیں اور مضمون آفرینی وغیرہ قابل ذکر خصوصیات ہیں جن کی تفہیم کے بغیر دبستان لکھنؤ کی تفہیم ممکن ہی نہیں۔

☆ دبستانِ لکھنؤ کی ایک اہم ایجاد 'ریختی' ہے جسے پروان چڑھانے میں شعرائے لکھنؤ کا خاص رول ہے۔

☆ تحریک اصلاح زبان بھی دبستانِ لکھنؤ کی خاص دین ہے جسے ناسخ اور ان کے شاگردوں نے عام کیا۔اصلاح زبان کے نام پر ہندی اور سنسکرت کے الفاظ ترک کرنے کی ترغیب دی گئی اور ان کی جگہ عربی وفارسی الفاظ کو داخل کیا گیا۔

☆ دبستانِ لکھنؤ نے شاعری اور بالخصوص غزل اور مرثیہ کو بہت فروغ دیا۔

☆ دبستانِ لکھنؤ کے اہم شعرا میں جرأت، مصحفی، انشا، ناسخ اور آتش ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

☆ دبستانِ لکھنؤ کے شعرا نے قطع نظر بعض منفی رویوں کے اردو ادب پر اور بالخصوص اردو شاعری پر گہرے اور دیرپا اثرات مرتب کیے ہیں، جن سے انکار ممکن نہیں۔حاصل کلام یہ کہ دبستانِ لکھنؤ اردو ادب کا ایک عظیم مرکز ہے جس کے دامن میں گراں قدر ادبی خزانہ ہے۔اردو ادب

کی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک اس میں دبستانِ لکھنؤ کا ذکر شامل نہ کرلیا جائے۔

7.7 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
بیش قیمتی	:	بہت قیمتی
گراں قدر	:	جس کی بہت اہمیت ہو
سطور	:	سطر کی جمع (لائن)
توہمات	:	وہم کی جمع
عقائد	:	عقیدہ کی جمع
مستند	:	جس کی اہمیت مسلم ہو
من وعن	:	ہو بہو
فنائیت	:	ختم ہو جانا
مبتذل	:	حقیر، ذلیل، گھٹیا
فقدان	:	کمی
فی البدیہ	:	فوراً، بروقت
عناصر	:	اصلی اجزا
آماج گاہ	:	نشانہ، ہدف، میدان جنگ
پروردہ	:	پلا ہوا، پالا ہوا
افلاس	:	غربت، غریبی
احوال وکوائف	:	حالات
معیوب	:	جس میں کوئی عیب ہو
خصائل	:	عادتیں
عفت مآب	:	عزت دار
دوشیزہ	:	کنواری لڑکی
نسائی	:	عورتوں سے متعلق

خال خال	:	کہیں کہیں، بہت کم
سوقیانہ	:	بازاری
ہم پلہ ہونا	:	برابر ہونا
مفقود	:	کسی چیز کا کم ہونا، نہ ہونے کے برابر
بدشگون	:	منحوس
تخصصات	:	خصوصیت، پہچان
نشاطیہ	:	فرحت وشادمانی کا
ضرب المثل	:	وہ جملہ یا قول جو مثال کے طور پر مشہور ہو، کہاوت

7.8 نمونہ امتحانی سوالات

7.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ اصلاح زبان کی تحریک کس نے چلائی؟

2۔ انگریزوں نے کس بادشاہ کو مٹیا برج بھیجا تھا؟

3۔ دبستانِ لکھنؤ کا بانی کس شاعر کو کہا جاتا ہے؟

4۔ ریختی کا آغاز کہاں ہوا؟

5۔ رجب علی بیگ سرور کی شہرہ آفاق داستان کون سی ہے؟

6۔ مثنوی سحرالبیان کس نے لکھی ہے؟

7۔ لکھنؤ کو دارالحکومت کس بادشاہ نے بنایا تھا؟

8۔ لکھنؤ کا شاہی محل اور امام باڑہ کس بادشاہ کے عہد کی یادگاریں ہیں؟

9۔ ریاست اودھ میں کل کتنے حکمران گزرے ہیں؟

10۔ ریاست اودھ تقریباً کتنے سال تک چلی ہے؟

7.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ نسائیت پر ایک نوٹ لکھیں۔

2۔ اصلاح زبان کی تحریک سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ وضاحت کیجیے۔

3۔ رعایت لفظی سے کیا مراد ہے؟ ایک نوٹ لکھیے۔

4۔ ریختی کی خصوصیات پر ایک نوٹ لکھیے۔

5۔ دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شاعروں پر ایک نوٹ لکھیے۔

7.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ دبستانِ لکھنؤ کا تشکیلی پس منظر بیان کیجیے۔

2۔ دبستانِ لکھنؤ کی اہم خصوصیات مثالوں کے ساتھ لکھیے۔

3۔ دبستانِ لکھنؤ کے زیر اثر زیادہ فروغ پانے والی اصنافِ شاعری پر اظہار خیال کیجیے۔

7.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	لکھنؤ کا دبستان شاعری	ابواللیث صدیقی
2۔	لکھنؤ کی شاعری	محمد باقر شمس
3۔	لکھنؤ کے چند نامور شعرا	سید سلیمان حسین
4۔	لکھنؤ کا شعر و ادب	ڈاکٹر سید عبدالباری
5۔	تاریخ ادب اردو	جمیل جالبی
6۔	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حسین
7۔	قدیم لکھنؤ کی آخری بہار	مرزا جعفر حسین
8۔	لکھنؤ کی تہذیبی میراث	ڈاکٹر سید صفدر حسین
9۔	دربارِ اودھ کا اثر لکھنؤ کی شاعری پر	محمد اعظم خاں
10۔	لکھنؤ کے شعر و ادب کا معاشرتی و ثقافتی پس منظر	ڈاکٹر سید عبدالباری

بلاک III : اردو کے علمی و ادبی ادارے

اکائی 8 : فورٹ سینٹ جارج کالج

اکائی کے اجزا

8.0 تمہید
8.1 مقاصد
8.2 فورٹ سینٹ جارج کالج
8.2.1 کالج کا قیام
8.2.2 کالج کے اغراض و مقاصد
8.2.3 کالج کے تعلیمی شعبہ جات
8.2.4 کالج کا شعبۂ تصنیف و تالیف
8.2.5 کالج کا پریس
8.2.6 کالج کا کتب خانہ
8.2.7 کالج کی دیگر سرگرمیاں
8.3 کالج کے اہم مصنفین اور ان کی ادبی خدمات
8.3.1 تراب علی نامؔی
8.3.2 سید حسین شاہ حقیقتؔ
8.3.3 حسن علی ماہلی
8.3.4 منشی غلام حسین معاون خان
8.3.5 قاضی ارتضا علی خاں خوشنودؔ
8.3.6 مفتی محمد تاج الدین حسین خاں بہجتؔ
8.3.7 مرزا عبدالباقی وفاؔ
8.3.8 محمد مہدی واصفؔ
8.3.9 سید تاج الدین

8.3.10 منشی سید غلام دستگیر
8.3.11 منشی محمد ابراہیم بیجا پوری
8.3.12 کالج کے انگریز مصنفین
8.4 کالج کی اردو خدمات
8.5 اکتسابی نتائج
8.6 کلیدی الفاظ
8.7 نمونہ امتحانی سوالات
8.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
8.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
8.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
8.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

8.0 تمہید

انگریز شمالی ہندوستان میں 1600ء کے آس پاس تجارت کی غرض سے آئے اور دھیرے دھیرے ہندوستان پر حکومت کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ اسی منصوبے کے تحت 1600ء میں ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' قائم کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرپرستی میں ہندوستان میں دو اہم کالج قائم کیے گئے۔ پہلا فورٹ ولیم کالج، کلکتہ اور دوسرا فورٹ سینٹ جارج کالج، مدراس۔ ان دونوں کالجوں کو قائم کرنے کا مقصد انگریز عہدے داروں کو اردو سکھانا تھا، لیکن فورٹ سینٹ جارج کالج کو فورٹ ولیم کالج پر ایک طرح کی برتری حاصل تھی کیونکہ یہاں پر صرف منشی (Writers) ہی نہیں آتے تھے بلکہ وکلا اور ججوں کی بھی ٹریننگ ہوتی تھی۔ ساتھ ہی فورٹ سینٹ جارج کالج میں اردو زبان و ادب کے علاوہ دیگر علوم وفنون پر بھی کتابیں تصنیف و تالیف کی جاتی تھیں نیز اس کالج میں دکنی زبان و ادب پر بھی خاصا کام ہوا ہے۔ ذیل میں فورٹ سینٹ جارج کالج کے تمام اہم پہلوؤں پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

8.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ فورٹ سینٹ جارج کالج کے قیام کے پر روشنی ڈال کر سکیں۔
☆ فورٹ سینٹ جارج کالج کے اغراض و مقاصد بیان کر سکیں۔
☆ فورٹ سینٹ جارج کالج کے مختلف تعلیمی شعبہ جات سے کا تعارف کرا سکیں۔
☆ فورٹ سینٹ جارج کالج کے شعبۂ تصنیف و تالیف کے متعلق معلومات کا اظہار خیال کر سکیں۔
☆ فورٹ سینٹ جارج کالج کے پریس اور کتب خانے کی تفصیلات پیش کر سکیں۔

☆ فورٹ سینٹ جارج کالج کی دیگر سرگرمیوں پر گفتگو کرسکیں۔
☆ فورٹ سینٹ جارج کالج کے اہم مصنفین اوران کی ادبی خدمات کا جائزہ لےسکیں۔
☆ فورٹ سینٹ جارج کالج کی اردوخدمات کا تنقیدی تجزیہ کرسکیں۔

8.2 فورٹ سینٹ جارج کالج

8.2.1 کالج کا قیام:

راجہ چندر گیری سے سالانہ پٹہ پر چینا پٹن (مدراس) میں حاصل کی ہوئی زمین پر23/اپریل1640ءکوایک بندکوٹھی کی تعمیر شروع ہوئی۔اس کی بنیاد دراصل سینٹ جارج ڈے پررکھی گئی تھی اس لیےاس دن کی مناسبت سے اس کوٹھی کا نام فورٹ سینٹ جارج رکھا گیا۔یہ کوٹھی 1643ءمیں بن کر تیار ہوئی۔راجہ چندر گیری کو جب عبداللہ قطب شاہ نے معزدل کیا تو انگریزوں نے 1645ءمیں عبداللہ قطب شاہ سے پھر پٹہ کی باضابطہ سالانا ایک ہزاردوسو پگوڈا پر تجدید کروالی۔1652ءمیں مدراس پٹنم کو علاحدہ پریسیڈنسی بنادیا گیا۔1959ءمیں کارومنڈل ساحل اور بنگال کی ساری کوٹھیاں اس کے ماتحت کردی گئیں۔مدراس پٹنم کی زمین ہندوستان کی زمین پر انگریزوں کی پہلی ملکیت تھی۔اس کو خرید کر انگریزوں نے شہر مدراس کی بنیاد نہیں ڈالی بلکہ اپنی حکمرانی کی بنیاد ڈال دی۔

فورٹ سینٹ جارج مدراس کی تعمیر کے دوسال بعد 1645ءمیں پادری فادر ابراہیم نے فورٹ سینٹ جارج کے اندر مدراس کے پہلے پبلک اسکول کی بنیاد ڈالی۔ایسٹ انڈیا کمپنی ابتدا میں صرف تجارتی اغراض کے لیے قائم ہوئی۔اس کمپنی کو چلانے کے لیے مختلف عہدے دار تھے۔ان عہدے داروں میں منشی کے عہدے کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ابتدا میں منشی کی قابلیت کا معیار محدود تھا،لیکن انہیں سیول (کشوری) اور ملٹری (فوجی) دونوں کی ذمے داریاں پوری کرنی پڑتی تھیں۔1647ءکے قانون کے تحت منشیوں کا تقرر پانچ سال کے لیے سالانہ دس پونڈ پر ہونے لگا۔پھر اس مدت کو پورا کر لینے کے بعد انہیں تین سال کے لیے سالانہ بیس پونڈ پر دوبارہ رکھا جاتا تھا۔یہ رائٹرس (Writers) جو ہندوستان پہنچ رہے تھے وہ مقامی زبانوں اور ہندوستانی تہذیب وتمدن سے بالکل بیگانہ تھے۔ان کی تعلیم وتربیت کا انگلستان یا ہندوستان میں کوئی انتظام نہیں تھا۔اس لیے مدراس کے انگریز گورنر مسٹر جوزف کلٹ (Mr. Joseph Collect) نے 1717ءمیں فورٹ سینٹ جارج اسکول یعنی کہ رائٹرس کالج (Writer's College) کی بنیاد ڈالی۔اس طرح فورٹ سینٹ جارج اسکول یا رائٹر کالج کمپنی کا وہ پہلا ادارہ تھا جہاں منشیوں کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام کیا گیا۔یہ ادارہ فورٹ سینٹ جارج کوٹھی کے احاطے ہی میں برسوں قائم رہا اور یہی آگے چل کر فورٹ سینٹ جارج کالج کے نام سے مشہور ہوا،جس میں بہت سے ادبی کارنامے انجام پذیر ہوئے۔

8.2.2 کالج کے اغراض ومقاصد:

فورٹ سینٹ کالج انگریزوں کے ذریعے قائم کردہ ہندوستان کا دوسرا بڑا ادارہ تھا۔1800ءمیں انگریوں نے کلکتہ میں ایک کالج 'فورٹ ولیم کالج' کے نام سے قائم کیا تھا۔اس کالج کو قائم کرنے کا بنیادی مقصد انگریز عہدے داروں کو اردو سکھانا تھا۔اس لیے یہاں آسان اردو زبان میں کتابیں تیار کروائی گئیں،جس سے انگریز افسروں کو کافی مدد ملی۔

شمالی ہند میں جس طرح فورٹ ولیم کالج،کلکتہ ایک اہم علمی مرکز تھا اسی طرح جنوبی ہند میں فورٹ سینٹ جارج کالج،مدراس بھی ایک اہم

علمی ادارے کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔فورٹ سینٹ جارج کالج کا ذکر اُردو ادب کے مورخین نے نہیں کیا حالاں کہ یہ کالج انیسویں صدی کے تین چار دہائیوں تک دکنی اُردو کی ترویج اور اشاعت کا ایک اہم مرکز تھا۔اس کالج کے مقاصد بھی وہی تھے جو فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے تھے۔ان دونوں اداروں کا مقصد جونیر سیول ملازمین کی تعلیم و تربیت اور انہیں ہندوستانی زبانوں سے واقف کروانا تھا۔

فورٹ ولیم کالج پر فورٹ سینٹ جارج کالج کو ایک طرح سے تفوق حاصل تھا وہ یہ کہ یہاں ادب کے ساتھ ساتھ قانون، ریاضی اور عربی و فارسی و دکنی کے علاوہ دوسری ملکی زبانوں کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔اس لیے یہاں پر صرف منشی (رائٹر) ہی نہیں آتے تھے بلکہ وکلا، اور ججوں کو بھی تربیت دی جاتی تھی۔

8.2.3 کالج کے تعلیمی شعبہ جات:

فورٹ سینٹ جارج کالج کا شعبۂ تعلیم دکنی' ہندوستانی' اُردو' عربی' فارسی' سنسکرت' تلگو' ملیالم' کنڑی اور تامل زبان کے شعبوں کے علاوہ قانون اور ریاضی کے شعبوں پر مشتمل تھا۔تراب علی نامی اس کالج کے شعبۂ عربی' فارسی اور اُردو کے صدر تھے۔حسن علی ماہلی شعبہ فارسی اور ریاضی میں استاد تھے۔منشی شمس الدین احمد' منشی ابراہیم بیجاپوری' منشی مظفر' محمد مہدی واصفؔ' مرزا عبدالباقی وفاؔ' سید تاج الدین تاج اور غلام دستگیر وغیرہ برسوں اس کالج میں درس وتدریس کی خدمت بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔اس تعلیمی ادارہ میں کام کرنے والے اساتذہ کو عام طور پر ''منشی'' کے لقب سے موسوم کیا جاتا تھا۔جو اس دور میں ارباب علم وعمل کے لیے مخصوص تھا۔کالج کے شعبۂ تعلیم میں اساتذہ کی کمی تھی کیونکہ اس دور کے علما شعرا اور ادبا ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کو اپنے لیے کوئی عزت کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے۔کالج کے قائم ہونے کے بعد بھی کالج کے ذمہ دار کافی دنوں تک اس فکر میں رہے کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں سے ارباب کمال کو بلا کر کالج کے شعبہ کو وسعت دی جائے۔اس طرح تراب علی نامی' حسن علی ماہلی' منشی ابراہیم بیجاپوری اور مرزا عبدالباقی وفاؔ وغیرہ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے مدراس آئے تھے اور یہ سب فورٹ سینٹ جارج کالج سے وابستہ تھے۔حسن علی ماہلی کے متعلق محققین کا بیان ہے کہ وہ اپنے وقت کے زبردست مشاہیر علما میں تھے۔عالم یگانہ وفاضل فرزانہ تھے۔علم عربی وفارسی میں منتخب زمانہ تھے۔مرزا عبدالباقی وفاؔ کے متعلق ''اشارات بینش'' کے مصنف سید محمد بینش رقم طراز ہیں کہ وفاؔ اہل زبان' فصیح البیان صاحب کمالات تھے۔علم عربیہ اور مختلف علوم وفنون میں بہرہ وافر رکھتے تھے۔مدراس میں ان کے جیسا باکمال ولایت سے کم آیا ہوگا۔

فورٹ سینٹ جارج کالج میں مقامی علما اور شعرا بھی درس وتدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ان میں منشی شمس الدین احمد' منشی مظفر' مہدی واصفؔ' غلام دستگیر، محمد خاں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔خصوصاً مہدی واصف جو سترہ سال فورٹ سینٹ جارج کالج سے وابستہ رہے۔تین سو کتابوں کے مصنف یا مولف تھے۔ان سب حضرات کی موجودگی سے اس کالج کا چرچا سارے ہندوستان میں ہونے لگا۔چناں چہ منشی شمس الدین احمد اپنی مشہور کتاب ''حکایات الجلیلہ ترجمہ الف لیلہ ولیلہ'' کے دیباچہ میں رقم طراز ہیں'' چرچا ہر ایک علم کا یہاں تک بڑھا کہ بلدہ مدراس مخزن ومعدن سب علوم کا بن گیا۔''

فورٹ سینٹ جارج کالج میں تامل کے لیے چدامبرا اور ستوسوامی پلے، کنڑ کے لیے بی۔جی۔بابنگلوں اور ملیالم کے لیے سی۔ایم۔رش کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔اس کالج کے اے۔ڈی۔کیمبل نے تلگو زبان کی قواعد لکھی۔تامل اسکالر Beschi نے شیخ چلی ٹامل میں لکھی اور ملیالم کے اسکالر M.Whish نے ملیالی ڈکشنری پر کام کیا۔

8.2.4 کالج کا شعبۂ تصنیف وتالیف:

فورٹ سینٹ جارج کالج میں تصنیف وتالیف کا ایک علاحدہ شعبہ تھا جہاں سے ہندوستانی (اُردو) دکنی، عربی، فارسی اور دیگر مقامی زبانوں میں ادبی تصانیف کے علاوہ مختلف مفید اور دلچسپ موضوعات پر لکھی ہوئی کتابیں شائع ہوئیں قانون اور ریاضی کی متعدد کتابیں بھی کالج کی جانب سے طبع ہوئی تھیں۔ صرف ونحو، لغت، قواعد، داستان، تاریخ، سوانح اور اخلاقیات جیسے موضوعات پر دکنی میں خاص طور پر کئی کتابیں لکھی گئیں۔ اس کالج کی اُردو مطبوعات ومخطوطات جو دستیاب ہوئے ہیں وہ زیادہ تر دکنی زبان میں ہیں۔ حکایات الجلیلہ ترجمہ الف لیلہ ولیلہ، دکنی انوار سہیلی، سنگھاسن بتیسی، گلستان اور بعض دیگر کتابوں کی زبان کو ان کے مترجمین دکنی قرار دیتے ہیں۔ پروفیسر مسعود حسین خان نے منشی ابراہیم بیجاپوری کی ''دکنی انوار سہیلی'' کو ''قدیم اُردو کا آخری بڑا نثری کارنامہ قرار دیا ہے۔''

اس موقع پر اس کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ اس کالج کے بعض مصنفین جیسے سید تاج الدین اور منشی مظفر اپنی تصانیف کو دکنی کے بجائے ''کرناٹکی محاورہ'' سے موسوم کرتے ہیں' ملکہ زماں وکام کندلہ'' کے مترجم نے بھی اپنی زبان کو' کرناٹکی محاورہ'' سے موسوم کیا ہے۔ تامل ناڈو کا صوبہ پہلے صوبہ کرناٹک کہلاتا تھا اس لیے وہاں کی دکنی زبان' کرناٹکی محاورہ'' سے موسوم کی جانے لگی تھی۔

8.2.5 کالج کا پریس:

فورٹ سینٹ جارج کالج کا اپنا پریس (مطبع) بھی تھا جہاں سے اکثر کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اس پریس سے سب سے پہلی کتاب ڈاکٹر ہنری ہیرس (Dr. Henry Harris) کی ہندوستانی زبان کا تجزیہ اور اس کی قواعد ولغت (Analysis grammar & Dictionary of Hindustani Language) ہے جو 1791ء میں شائع ہوئی۔ اس میں جنوبی ہند میں بولی جانے والی اُردو یا دکنی الفاظ کا بھی اچھا ذخیرہ ملتا ہے۔ ڈاکٹر ہنری ہیرس کا یہ کارنامہ گل کرسٹ کے کارنامے سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ لغت اب کم یاب بلکہ نایاب ہے۔ اس کتاب کے علاوہ تراب علی نامی کی ''وسیط النحو''، منشی محمد ابراہیم بیجاپوری کی ''دکنی انوار سہیلی'' سید امیر حیدر بلگرامی کی ''منتخب الصرف'' قاضی ارتضا علی خاں کی ''فرائض ارتضیہ'' اور ''نقود الحساب'' وغیرہ اسی کالج کے پریس سے شائع ہوئی تھیں۔

نصابی کتابیں کالج پریس کے علاوہ مقامی مطبعوں سے بھی شائع ہوئی تھیں۔ چناں چہ مدراس کے مشہور مطبع ''اعظم الاخبار'' سے پانچ کتابیں دو جلدوں میں شائع ہوئی تھیں۔ پہلی جلد میں اخلاق ہندی اور چہار درویش اور دوسری جلد میں اخوان الصفا بکاولی اور گلستان نامی کتابیں شامل تھیں۔ پھر مدراس کے قدیم مطبع ''جامع الاخبار'' سے بھی کتابیں علاحدہ علاحدہ کتابی صورت میں شائع ہوئی تھیں۔ اس مطبع سے فورٹ سینٹ جارج کالج کے طلبہ کے لیے رسالہ گلکرسٹ سرکیولر آرڈرس، رسالہ حروف تہجی، قانون خرد کورٹ مدراس، قواعد لشکری، گلستان سہ باب، میزان الحساب، عربی حکایت لطیفہ، تعلیم نامہ، صفت التحریر جیسی مفید کتابیں شائع ہوئی تھیں۔

''پرنٹنگ پریس ان انڈیا'' کے مصنف اے۔ کے۔ پرولکر کا بیان ہے کہ کنڑا اور تلگو زبان کی چھپائی کی ابتدا بھی فورٹ سینٹ جارج کالج کے مطبع سے ہوئی۔ 1820 میں اسی مطبع سے اے۔ ڈی۔ کیمبل (A.D. Campbell) کی تلگو زبان کی قواعد شائع ہوئی تھی۔

8.2.6 کالج کا کتب خانہ:

فورٹ سینٹ جارج کالج کے تحت ایک شاندار کتب خانہ بھی تھا۔ اس کتب خانہ کے کیٹلاگوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تامل،

تلگو، کنڑی، مرہٹی، ملیالم، سنسکرت، بنگالی، اڑیا، ہندی، برمی اور جادی زبانوں کے ساتھ اُردو ودکنی زبان کی بھی بے شمار کتابیں تھیں۔اس کتب خانہ کی بعض دکنی کتابوں کا تذکرہ حکیم شمس اللہ قادری نے بھی کیا ہے۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں کہ ''شیخ عین الدین گنج العلم کے رسائل نیز شمس العشاق اور شاہ میراں جی کی دکنی تصانیف گل باس وجل ترنگ فورٹ سینٹ جارج کالج کے کتب خانے میں موجود تھیں۔

ولیم ٹیلر (William Taylor) نے اس بے نظیر کتب خانے کے جملہ مخطوطات کے دو ضخیم کیٹلاگ (فہرست کتب) مدراس کے فورٹ سینٹ جارج گزٹ پریس سے شائع کیے تھے۔ پہلی جلد جو (678) صفحات پر مشتمل ہے۔ 1857ء میں شائع ہوئی جب کہ دوسری جلد جس کے (864) صفحات ہیں۔ 1860ء میں طبع ہوئی۔ ولیم ٹیلر نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ فورٹ سینٹ جارج کالج کے کتب خانہ میں مخطوطات کے تین شاندار ذخیرے تھے۔ یہ ذخیرے (1) میکنزی (2) ایسٹ انڈیا ہاؤس اور (3) براؤن کلکشن کے ناموں سے موسوم تھے۔ کرنل میکنزی (Col Mackenzie) جو سرویر جنرل آف انڈیا کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کا ذخیرہ میکنزی کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ ذخیرہ بہت قیمتی سمجھا جاتا تھا۔ ولیم ٹیلر نے اس ذخیرے کے بارے میں لکھا ہے:

''ہندوستان سے متعلق تاریخی دستاویزات کا اتنا بیش قیمت ذخیرہ یورپ یا ایشیا میں آج تک کسی فردواحد نے جمع نہیں کیا۔''

غرض فورٹ سینٹ جارج کالج کی وجہ سے نہ صرف اُردو زبان بلکہ دکنی زبان وادب کا نثری ادب پیدا ہوا اور اس کی اشاعت کے ذرائع بھی مہیا ہوئے اور طباعت کی سہولتوں کے باعث بہت ہی قلیل عرصہ میں یہاں کی کتابیں خاص وعام میں شوق سے پڑھی جانے لگیں۔اس طرح اس کالج کی بدولت آسان، سلیس اور عام فہم نثر نگاری کی ایک شاندار روایت قائم ہوئی۔

8.2.7 کالج کی دیگر سرگرمیاں:

فورٹ سینٹ جارج کالج کا انتظامی بورڈ اچھی تصنیف پر مصنف کی حوصلہ افزائی کرتا اور انہیں انعام واکرام سے نوازا کرتا تھا۔ چناں چہ قاضی ارتضا علی خان کو ''نقو دالحساب'' پر ایک ہزار ہُن انعام دیے گئے۔ تراب علی نامی کو بھی ''وسیط النحو'' پر ایک معقول معاوضہ ملا تھا۔ مہدی واصف کے مشہور عربی تذکرہ ''حدیقتہ المرام فی تذکرۃ العلماء الاعلام'' سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاوضہ سات ہزار روپے تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے عہدہ داروں کو مقامی زبانیں سیکھ کر امتحان میں کامیابی حاصل کرنے پر انعام واکرام اور معقول خدمتوں سے سرفراز کرتی تھی۔ چناں چہ گورنر مدراس سرہنری پاٹنجر (Sir Henry Pottinger) نے سپریم گورنمنٹ کے حکم پر ایک اعلان ''یونیڈ سروس گزٹ'' میں شامل کروایا تھا۔ اس اعلان کو مدراس کے مشہور اُردو اخبار ''اعظم الاخبار'' نے 22/اپریل 1852ء کو اس طرح شائع کیا تھا۔

''یونیڈ سروس گزٹ میں لکھا ہے کہ مدراس کے گورنر سرہنری پاٹنجر صاحب بہادر سوپریم گورنمنٹ کے حکم موافق اس ملک کے تمامی شمشیر بند سرداروں کو اطلاع دیتے ہیں کہ اگر کوئی سرداران سات زبانوں میں سے دو زبان یا زیادہ سیکھ کر امتحان دیوے تو اس کو سرکار کی طرف سے ایک مشت ہزار روپے ملیں گے سوائے اس کے وے (وہ) لوگ معقول خدمتوں پر مامور ہووئیں گے۔''

مقامی زبانیں سیکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ فورٹ سینٹ جارج کالج کے اکثر سولجر (سپاہی) ہندوستانی (اُردو/دکنی) اور فارسی وغیرہ سے اچھی طرح واقف ہو گئے تھے اور روانی کے ساتھ ان زبانوں میں گفتگو کر سکتے تھے۔

8.3 کالج کے اہم مصنفین اوران کی ادبی خدمات

8.3.1 تراب علی نامؔی:

مولوی تراب علی نامی کا شمار فورٹ سینٹ جارج کالج کے اہم مصنفوں میں ہوتا ہے۔وہ ایک بڑے عالم وفاضل استاد تھے۔ان کا اصل نام تراب علی تھا۔تراب علی کا سلسلۂ نسب حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ملتا ہے۔ان کے والد کا نام شیخ نصرت اللہ عباسی تھا، جو خیرآباد(اودھ) کے رہنے والے تھے۔تراب علی کی پیدائش 1779ء مطابق 1193ھ میں خیرآباد میں ہوئی۔انہوں نے ابتدائی تعلیم خیرآباد میں پائی۔اس کے بعد ہرگام (ضلع سیتاپور) میں علامہ سید غلام امام رضوی سے علوم منقول (دینی علوم) حاصل کیے۔تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد تراب علی نے شاعری کی طرف توجہ مبذول کی۔شاعری کے لیے مرزا محمد حسن قتیل کی شاگردی اختیار کی اور اپنا تخلص نامؔی اختیار کیا۔

تراب علی نامی نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایسٹ انڈیا کمپنی، کلکتہ سے کیا۔کچھ سال اس کمپنی میں ملازمت کرنے کے بعد ایک یوروپین افسر ابراہیم لوکٹ(Capt. Abraham Locket) کے ہمراہ سیاحت کی غرض سے بیرون ملک گئے اور دوسال کی مدت میں اصفہان، شیراز، عراق اور عرب جیسے بڑے ممالک کی سیاحت کی۔وہاں سے واپس ہونے کے وہ مدراس پہنچے اور 1813ء میں فورٹ سینٹ جارج کالج میں خدمات انجام دینے لگے۔یہاں پر وہ ایک عرصے تک شعبۂ عربی، فارسی اور ہندوستانی (اردو) کے صدر شعبہ رہے۔اس بات کی تصدیق ان کی کتاب ''وسیط النحو'' سے ہوتی ہے۔اس کتاب کے سرورق پر انگریزی میں یہ تفصیل درج ہے:

MOULUVEE TOORAB ALEE, HEAD ARABIC, PERSIAN AND

HINDOOSTANEE IN THE COLLEGE OF FORT SAINT GEORGE

تراب علی نامی مختلف علوم کے ماہر تھے، جس کی وجہ سے کالج میں ان کی بڑی اہمیت تھی۔انہوں نے اس زمانے کے بڑے بڑے انگریز افسروں کو عربی، فارسی اور اردو زبانیں سکھائیں نیز علوم عقلی ونقلی کی تعلیم بھی دی۔نواب اعظم نے اپنے مشہور تذکرے ''گلزار اعظم'' اور قدرت اللہ قدرتؔ نے اپنے تذکرے ''نتائج الافکار'' میں لکھا ہے کہ ''نامی کی تعلیم وتربیت سے اکثر طلبا نے فیض اٹھایا تھا اور بڑی ترقی کی تھی۔ان میں سے بعضوں کو اضلاع میں مفتی اور قاضی جیسی خدمتیں بھی ملی تھیں۔'' نامی کو اپنے ہم وطنوں سے بہت لگاؤ تھا۔انہوں نے خیرآباد کے کئی افراد کو فورٹ سینٹ جارج کالج میں ملازمت بھی دلوائی، جن میں تاج الدین بہجتؔ، سید حمید الدین، خلیل الدین اشکؔ وغیرہ شامل ہیں۔

تراب علی نامؔی نہ صرف ایک بڑے عالم تھے بلکہ ایک دین دار اور خدا پرست شخص بھی تھے۔مہدی واصف اپنے تذکرے ''حدیقۃ المرام'' میں لکھتے ہیں کہ ''نامؔی ایک خداترس آدمی تھے، دین کے معاملات میں پختگی رائے رکھتے تھے۔برہنہ شاہ مشائخ سے انہیں عقیدت تھی............آخری عمر میں انہیں حج وزیارت کا شوق ہوا۔1825ء مطابق 1241ھ میں وہ حرمین شریف کی زیارت کے لیے روانہ ہوئے۔'' نامؔی 1826ء میں حج و زیارت سے فارغ ہوکر ہندوستان واپس آرہے تھے کہ راستے میں انہیں پیچش کی شکایت ہوگئی۔دھیرے دھیرے ان کا مرض بڑھتا گیا اور اسی سال یعنی کہ 1826ء مطابق 17 ربیع الاول کو سری رنگ پٹن میں ان کا انتقال ہوگیا اور انہیں ٹیپو سلطان کے گنبد کے چبوترے پر دفن کیا گیا۔

تراب علی نامؔی ایک اچھے معلم ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین ادیب بھی تھے۔انہوں نے عربی اور فارسی میں کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے تراجم کا بھی کام کیا ہے۔ان کی مشہور کتابوں میں ''درالمنظوم''، ''نحو میں''، ''وسیط النحو''، ''رسالہ حکایتی چند'' اور ''ایران وعرب اور

عراق کا سفر نامہ'' کا نام لیا جاتا ہے، جو نامیؔ کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔

8.3.2 سید حسین شاہ حقیقتؔ:

سید حسین شاہ حقیقتؔ بلخ (ترکستان) کے ایک ممتاز خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے، جن کا سلسلۂ نسب حضرت سید الشہدا امام حسینؓ سے ملتا ہے۔ ڈاکٹر لطیف حسین ادیبؔ کا بیان ہے کہ حقیقت، سید عرب شاہ کے منجھلے فرزند اور حضرت عبداللہ، لقب بہ مظلوم کی اولاد میں سے تھے۔ سید حسین شاہ کے والد سید عرب شاہ احمد شاہ ابدالی کے حملۂ ہندوستان کے بعد بریلی تشریف لائے اور یہیں حکیم میر محمد نواز کی دختر سے شادی کی۔ انہیں کے بطن سے 1772ء میں سید حسین شاہ پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش کے تقریباً آٹھ سال کے بعد ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ والد کے انتقال کے بعد سید حسین شاہ کی پرورش و پرداخت ان کے نانا نے کی۔ سید حسین شاہ نے جو بھی تعلیم پائی وہ ان کے نانا حکیم میر محمد نواز کی شفقت کا نتیجہ ہے۔

حکیم میر محمد نواز 1780 کے آس پاس بریلی سے کانپور گئے اور وہاں پر منشی گیری کے عہدے پر فائز ہوئے اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ (جس میں سید حسین شاہ بھی شامل تھے) کانپور میں رہنے لگے۔ سید حسین شاہ چودہ پندرہ برس کی عمر میں کانپور سے لکھنؤ چلے گئے اور جرأت کے ادبی حلقے میں داخل ہو گئے۔ ابتدا میں جرأت کی غزلوں کی کتابت کرتے تھے اس کے بعد ترک سواروں میں ملازمت کر لی۔

> ''جب مسٹر گوڈ (Mr. GOOD) کمشنر مقرر ہو کر مدراس آئے تو وہ کلکتہ سے سید حسین شاہ حقیقت کو بھی پانچ سو روپیہ ماہوار مشاہرہ پر ساتھ لائے تھے۔ وہ ہمیشہ حقیقتؔ کو اپنے ساتھ رکھتے تھے کہیں دوسری جگہ رہنے نہیں دیا اپنے ہی بنگلہ میں ان کی رہائش کا انتظام کیا تھا۔ جب حقیقتؔ کا مسٹر گوڈ کے بنگلہ پر انتقال ہوا تو مسٹر گوڈ کو بڑا رنج و ملال ہوا۔ انہوں نے اس غم میں سیاہ پارچہ علامت غم کے طور پر بازو پر باندھ لیا تھا۔''

(تذکرہ جواہر الہند مخطوطہ، بحوالہ: افضل الدین اقبال، فورٹ سینٹ جارج کالج، معین پبلی کیشنز، 1979، ص 48)

سید حسین شاہ حقیقتؔ کا انتقال 1834 میں مدراس میں ہوا۔ اس بات کی تصدیق سید علی خاں نے اپنے تذکرہ ''بزمِ سخن'' میں کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''حقیقتؔ مدراس میں فوت ہوئے اور وہیں کی خاک میں آسودۂ خواب ہوئے۔''

سید حسین شاہ حقیقتؔ ایک خوش فکر شاعر تھے۔ ان کا تخلص حقیقتؔ تھا اور انہیں جرأت سے تلمذ حاصل تھا۔ جرأت کے انتقال کے بعد حقیقتؔ نے نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور کی شاگردی اختیار کی۔ انہوں نے حقیقتؔ کے کلام کو دل کش بتایا ہے۔ مدراس میں سید حسین شاہ حقیقتؔ نے بہت سے لوگوں کی رہنمائی کی۔ ان کے شاگردوں میں سید ابوالحسن حیرتؔ، شائق علی خاں شائق، عبدالقادر اظہرؔ، نواب حشمت جنگ حشمت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ سید حسین شاہ حقیقتؔ کے جملہ تصانیف کی تعداد نو ہے، جن کے نام حسب ذیل ہیں:

1۔ صنم کدہ چین	2۔ جذب عشق	3۔ تحفۃ العجم
4۔ خزینۃ الامثال	5۔ تذکرۂ احباء	6۔ مثنوی ہشت گلزار
7۔ مثنوی ہیرا من طوطا	8۔ ہفت نسخہ	9۔ دیوان

مختصر یہ کہ سید حسین شاہ حقیقتؔ ایک خوش فکر شاعر تھے۔ان کے اشعار میں روانی، بے ساختگی، سلاست اور شیرینی ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں سید حسین شاہ حقیقتؔ ایک غزل گو سے زیادہ مثنوی نگار کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں۔

8.3.3 حسن علی ماہلی:

حسن علی ماہلی (ماہل اعظم گڑھ، اتر پردیش کی ایک مشہور بستی ہے) شیخ نوازش علی انصاری ماہلی کے فرزند تھے۔ان کے جد اعلیٰ شاہ فتح اللہ انصاری بادشاہ تغلق کے عہد حکومت میں آئے اور کچھ عرصہ یہاں پر رہے۔ پھر سیر و سیاحت کی غرض سے تمام اہل وعیال کے ساتھ شہر جون پور چلے گئے، جو اس وقت سلاطین شرقیہ کا دارالحکومت تھا۔ان کے وعظ ونصیحت اور اوصاف حمیدہ کی شہرت ہوئی تو وہاں کے بادشاہ نے خود آ کر ان سے جامع مسجد میں ملاقات کی اور پرگنہ ماہل کے چند مواضع جو جونپور کے علاقے میں تھے، بطور جاگیر عطا کیے۔تبھی سے ان کی اولادیں اس جاگیر میں سکونت پذیر ہوئیں۔ان میں سے بعض نے معلّمی اختیار کی، بعض نے توکل وقناعت کی زندگی پسند کی اور بعض نے امرا و سلاطین کی ملازمت سے عزت حاصل کی۔

حسن علی ماہلی کی پیدائش 1196ھ مطابق 1782 میں ماہل میں ہوئی۔ان کی ابتدائی تعلیم بنارس میں ہوئی۔ بنارس میں انہوں نے سراج الدین خاں آرزو اور شیخ علی حزیںؔ کے مشہور شاگرد ملا محمد عمر سے فارسی پڑھی۔اس کے بعد مختلف مقامات پر علوم مروجہ کی تحصیل کی اور خصوصاً ریاضی میں مولوی برکت الہ آبادی سے استفادہ کیا اور پچیس سال کی عمر میں علوم عقلیہ ونقلیہ سے فارغ ہو کر کلکتہ گئے اور وہاں تقریباً بارہ سال تک تدریسی خدمات انجام دیں اور 1816ء میں اربابِ حکومت کے طلب کرنے پر مدراس آئے اور سرکاری کمپنی کے فورٹ سینٹ جارج کالج میں مدرس مقرر ہوئے۔ یہاں انہوں نے بیس سال سے زائد عرصے تک درس وتدریس کے فرائض انجام دیں۔اس طرح حسن ماہلی 1836ء تک فورٹ سینٹ جارج کالج سے وابستہ رہے۔ یہاں سینکڑوں طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔وہ اپنے وقت کے ایک کامیاب مدرس سمجھے جاتے تھے۔حسن علی ماہلی 1836ء میں صدر مفتی بنائے گئے۔ چار سال اس عہدے پر رہ کر 1842 کو راہی عدم ہوئے۔

حسن علی ماہلی نے فورٹ سینٹ جارج کے زمانۂ قیام میں عربی اور فارسی کے متعدد رسالے اپنی یادگار چھوڑے، جن میں رسالہ ''تبصرۃ الحکمۃ'' طبیعات والٰہیات میں اور ''منتخب التحریر'' علم ریاضی میں قابل ذکر ہیں۔ان کے علاوہ تکسیر و جفر اور رمل وغیرہ میں بھی انہوں نے چند رسالے لکھے تھے جو اب نایاب ہیں۔ان کے رسالوں کے ناموں کا بھی اب پتہ نہیں چلتا۔ ''تبصرۃ الحکمۃ'' کا ایک قلمی نسخہ حیدرآباد کے کتب خانہ سعیدیہ میں موجود ہے۔

حسن علی ماہلی تمام علوم عقلیہ ونقلیہ میں استاد یگانہ تو تھے ہی، اس کے ساتھ وہ ایک کامیاب شاعر کی حیثیت سے بھی مشہور تھے۔حسن ان کا تخلص تھا۔وہ کبھی کبھی شعر کہتے تھے، لیکن طبیعت موزوں پائی تھی اس لیے جو کچھ کہتے اچھا کہتے تھے۔ان کے تلامذہ میں ایسے شاعروں کی کثیر تعداد تھی، جو انیسویں صدی عیسوی میں جنوبی ہند کے آسمان شعر پر نمایاں تھے۔حسن ماہلی اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔نصیر الدین ہاشمی نے ''مدراس میں اردو'' میں ان کے اردو مرثیہ کے کچھ اشعار بطور نمونہ درج کیے ہیں، جو ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں۔اشعار ملاحظہ ہوں:

محرم کا چندر آیا شہا کا دُولہ دکھانے کو
محباں کے جگر میں فلک خنجر لگانے کو

ہے کرنا دل میں دایئم یوغم یاراں حسینا کا
کہ ہردم یاد میں روز و آپس کا تن گلانے کو

کہ ویسے شاہ اوپر کیا کیا ہے ظلم اور ملعون
او سے دوزخ کیا حق نے جنم سالم جلانے کو

8.3.4 منشی غلام حسین معاونؔ خان:

غلام حسین معاون خان کے خطاب سے سرفراز تھے۔وہ محمد شریف الدین کے فرزند تھے۔ان کے اسلاف کا وطن دارالنور محمد پور ارکاٹ تھا۔محمد شریف الدین ،نواب امیرالامراد بہادر فرزند نواب محمد علی خان والا جاہ رئیس ارکاٹ کے پاس ملازم تھے۔اس وجہ سے شریف الدین نے مدراس میں سکونت اختیار کر لی تھی۔یہیں 1784ء میں غلام حسین معاون خان پیدا ہوئے۔ان کا تاریخی نام غلام حسین تھا۔

معاون نے سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد کتب فارسی اپنے ایک عزیز مولوی عبدالقادر طرازؔ اور محمد جعفر سے پڑھیں اور فارسی زبان میں اچھی استعداد پیدا کی۔معاونؔ نے انگریزی زبان میں بھی کافی دستگاہ اور لیاقت پیدا کر لی تھی۔امتحان میں کامیاب ہو کر سند حاصل کرنے پر حکومت نے ان کو فورٹ سینٹ جارج کالج میں انگروں کو پڑھانے پر مامور کیا تھا۔

معاونؔ عرصۂ دراز تک فورٹ سینٹ جارج کالج سے وابستہ رہے۔اس کے علاوہ چنگل پیٹ، قلعہ ترپاسور وفرنگی گنڈہ اور دیگر اضلاع متفرقہ متعلقہ مدارس میں بھی منشی گری اور ترجمہ نویسی کی خدمات انجام دیں۔1842ء میں کمپنی کی ملازمت ترک کر کے دبیرالملک بہادر کے حسن توسل سے نواب محمد غوث خاں اعظم کی سرکار میں امور متعلقہ کچہری انگریزی میں مامور ہوئے۔پھر رفتہ رفتہ اپنی ذاتی قابلیت اور اپنے فطری جوہروں کی وجہ سے مترجمی اور سررشتہ داری کی خدمات پر مامور ہوئے اور معاونؔ خاں کے خطاب سے سرفراز کیے گئے اور مشاہرے میں اضافہ بھی ہوا۔

منشی غلام حسین کو شاعری سے بڑی دلچسپی تھی۔معاونؔ ان کا تخلص تھا۔معاونؔ بزم ''مشاعرہ اعظم'' میں بھی وہ ہمیشہ شریک ہوا کرتے تھے۔معاونؔ کا انتقال 1851ء میں فرنگی گنڈہ میں ہوا، جو شہر مدراس سے آٹھ میل دوری پر واقع ہے۔تذکرہ ''گلزار اعظم'' اور تذکرہ ''اشارات بینش'' میں معاونؔ کی تصنیف وتالیف کا کوئی تذکرہ نہیں ہے البتہ ان تذکروں میں ان کے کچھ فارسی اشعار بطور نمونہ درج ہیں۔فورٹ سینٹ جارج کالج کے انگریز مصنف ڈاکٹر ایڈورڈ بالفور کی مشہور اردو کتاب ''اصول فن قبالت'' پر منشی غلام حسین معاونؔ نے نظر ثانی کی تھی اور اسے اطبا اور طلبا دونوں کے لیے عام فہم اور سلیس بنایا تھا۔

8.3.5 قاضی ارتضا علی خاں خوشنودؔ:

قاضی ارتضا علی خاں خوشنود 1783ء میں قصبہ گوپامئو، (اس وقت مؤضلع ہردوئی کا حصہ تھا) اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ان کا اصل نام ابو محمد ارتضا علی خاں تھا۔ان کے والد کا نام غلام احمد مجتبیٰ المخاطب بہ مصطفیٰ علی خاں بہادر قاضی تھا،جن کا سلسلہ نسب اٹھائیس واسطوں سے حضرت ناصرالدین محمد بن عبداللہ بن عمر بن خطاب خلفیہ ثانی تک پہنچتا ہے۔حضرت ناصرالدین محمد حضرت سیدنا امام حسینؑ کے نواسے تھے۔

قاضی غلام احمد مجتبیٰ المخاطب بہ مصطفیٰ علی خاں بہادر 1785ء میں اتر پردیش سے مدراس آئے اور نواب محمد علی والا جاہ کی سرکار میں ملازم

ہوئے۔نواب ممدوح نے مصطفیٰ علی خاں بہادر کا خطاب دیا اور اپنے آبائی وطن گوپامئو کے سرکاری مدرسہ میں مدرسی کی خدمت عطا فرما کر وہاں بھیج دیا۔ جہاں انہوں نے اپنی عمر کا ایک حصہ درس وتدریس میں گزارا۔

نواب محمد علی خاں والا جاہ کی وفات کے بعد جب نواب غلام حسین خاں عمدۃ الامرا بہادر کرناٹک کی مسند پر بیٹھے تو انہوں نے مصطفیٰ خاں بہادر کو دوبارہ مدراس بلوائے اور وہ کچھ عرصہ یہاں رہنے کے بعد گوپامئو واپس چلے گئے۔ پھر 1801ء میں نواب عمدۃ الامرا بہادر کی رحلت کے بعد تیسری مرتبہ مدراس بلوایا۔ یہاں مقیم رہو گئے۔اس اثنا میں ارباب حکومت نے ان کو نتھرنگر (ترچنا پلی) کا قاضی مقرر کیا۔

1810ء میں ابوعلی محمد ارتضا علی خاں اپنے والد سے ملنے مدراس آئے اور یہاں پر پانچ چھے سال تک درس وتدریس اور تالیف کتب میں مشغول رہے۔گمان غالب یہی ہے کہ ان کا یہ وقت فورٹ سینٹ جارج کالج ہی میں گزرا۔مولف تذکرہ ''علمائے ہند'' کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مدراس آنے کے بعد ارتضا علی خاں درس علوم میں مشغول رہتے تھے۔حیدرآباد کے رہنے والے فیاض الدین نظامی قاضی ارتضا علی خاں کے سانحہ وفات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ '' آپ کا سانحہ وفات بھی ایک پر اسرار داستان سے کسی طرح کم نہیں۔آپ حج بیت اللہ سے سرفرازی حاصل کرنے کے بعد جب واپس ہورہے تھے اور ''حدیدہ'' (بحر احمر کا ایک ساحلی علاقہ) تک پہنچنے کے لیے ابھی ایک دن اور ایک رات کی مسافت باقی تھی کہ بروز جمعہ بوقت اشراق آپ کا آفتابِ حیات ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔''

قاضی ارتضا علی خاں کئی مفید اور گراں قدر تصنیفات کے مالک ہیں۔ان کے علمی کارناموں میں بہت سی تعلیقات، شرح اور حواشی بھی شامل ہیں۔قاضی ارتضا علی خاں کی دو کتابیں ''نقود الحساب'' اور ''فرائض ارتضیہ'' دکن میں خاص طور سے بہت مقبول ہوئیں۔ یہ دونوں کتابیں فورٹ سینٹ جارج کالج کے پریس سے شائع ہوئی تھیں۔قاضی ارتضا علی خاں کو شعروسخن سے بھی دلچسپی تھی۔ان کا تخلص خوشنودؔ تھا۔نواب محمد غوث خاں اعظم کا بیان ہے کہ خوشنودؔ کبھی کبھی عربی، فارسی اور ہندی (اردو) میں شعر کہتے تھے۔حیدرآباد کے کتب خانہ سعیدیہ میں قاضی ارتضا علی خاں کی 33 سے زائد عربی وفارسی کی قلمی اور مطبوعہ کتابیں موجود ہیں۔

8.3.6 مفتی محمد تاج الدین حسین خاں بہجتؔ:

محمد تاج الدین بہجتؔ کی پیدائش 1799ء میں مدراس میں ہوئی۔ان کے والد کا نام غیاث الدین حسین خاں تھا۔عام طور پر بیس سال کی عمر میں لوگ اعلیٰ تعلیم کی طرف گامزن ہوتے ہیں، لیکن بہجتؔ نے اس عمر میں تعلیم حاصل کرنے کا سلسلہ شروع کیا اور بارہ سال تک فورٹ سینٹ جارج کالج میں مولوی تراب علی نامی اور مولوی عبدالودود عاشقؔ سے علوم عربی و فارسی وغیرہ کی تحصیل کی۔ اس طرح بہجت 1234ھ سے 1246ھ تک فورٹ سینٹ جارج کالج سے وابستہ رہے۔مولف ''سخنوران بلند فکر'' کا بیان ہے کہ بہجتؔ بتیس (32) سال کی عمر میں تعلیم سے فارغ ہوئے۔ان میں فارسی زبان کی قابلیت اعلیٰ درجے کی تھی۔

محمد تاج الدین بہجتؔ فورٹ سینٹ جارج کالج سے فارغ التحصیل کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے دوسو روپے ماہوار کے مشاہرے پر اضلاع چنگل پیٹ، میکا کول اور پالم کوٹہ میں مفتی مقرر ہوئے۔ برسوں ان خدمات پر فائز رہے اور اپنے مفوضہ امور کو بخوبی انجام دیتے رہے۔بہجتؔ کا انتقال 1855ء میں ضلع ترناویلی میں ہوا۔

محمد تاج الدین بہجتؔ نے کئی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، جن میں رسالہ فن حرف، رسالہ فن قواعد مسمّی بہ تاج القواعد، رسالہ فن عروض وقافیہ

مسمیٰ بہ ''مجمع البحرین'' اورشرح گلستان بنام چمنستان اہم ہیں۔ان کتابوں کے علاوہ انہوں نے 'قاضی مبارک کی شرح مسلم' پرعربی میں شبیہ بھی لکھا تھا۔بہجتؔ کی دو اردو کتابوں ''اظہرالصلاح'' اور ''مرصادالمشتاقین'' کا ذکر ملتا ہے۔

بہجتؔ نے بڑی موزوں طبیعت پائی تھی۔ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ یہاں بہجتؔ کی ایک غزل کے کچھ اشعار پیش کیے جا رہے ہیں، جو اسٹیٹ لائبریری، حیدرآباد کی ایک بیاض میں موجود ہیں۔اشعار ملاحظہ ہو:

سن لیں چرچا تیرے گر حسن کا اے حور نژاد
آئیں پریوں کے پری اپنے پرستان کو چھوڑ

جان بھی جائے اگر مجھ سے پریشان کو چھوڑ
ہم نشین میں نہ اٹھو نگا یہ پری شان کو جھوڑ

ہم کو تم گھر سے نکالو تو نکالو پر جان
دل نہ نکلے گا تیرے کوٹھری دالان کو چھوڑ

رشک اغیار کا ہے خانہ خراب آہ اے دل
جاتے ہیں یار کے ہم کوٹھری دالان کو چھوڑ

فکر میں عاشق بیمار کفن کے ہے لگا
جائے بیچارہ کہاں پھر تیرے دامان کو چھوڑ

8.3.7 مرزا عبدالباقی وفاؔ:

مرزا عبدالباقی وفاؔ فورٹ سینٹ جارج کالج میں مدرس کی حیثیت سے مامور تھے۔مولف تذکرہ شعرائے اردو کا بیان ہے کہ ''مرزا عبدالباقی وفاؔ منشی گری کا پیشہ کرتے تھے۔یعنی نوجوانانِ فرنگ کو فارسی اور اردو پڑھاتے تھے۔'' وفاؔ کے حالات زندگی تذکرہ ''گلزار اعظم'' میں درج ہیں۔اس تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا عبدالباقی الشریف الرضوی 1799ء میں بغداد شریف میں پیدا ہوئے۔ان کے والد مرزا شفیع خاں بلدہ گلپایگان میں وزیر تھے۔ان کے بزرگانِ سلف کا وطن اولاً عراق وعرب اور ثانیاً خراساں واصفہان تھا۔مرزا عبدالباقی بیس سال تک اپنے والد مرزا محمد شفیع خاں کی خدمت میں علومِ متداولہ کی تربیت پاتے رہے۔والد کے انتقال کے بعد تحصیلِ علم کے لیےاصفہان گئے اور وہاں کے جید علما سے مستفید ہوئے اور سند علوم وفنون حاصل کی۔وہ 1817ء میں سیر وسیاحت کے لیے نکلے۔ایران کی سیاحت کے بعد حیدرآباد دکن آئے۔یہاں برسوں منیر الملک بہادر کی خدمت میں عزت وآبرو کے ساتھ رہے۔چندروز بعد نواب ناصرالدولہ بہادر کے دربار میں باریاب ہوئے اور ان کے ندیم

وطبیب مقرر ہوئے۔

1831 میں مرزا عبدالباقی وفاؔ مدراس گئے اور سرکاری کمپنی میں منشی گری کی خدمت پر مامور ہوئے۔ مدراس میں وفاؔ کے علم و لیاقت کی خوب شہرت ہوئی۔ مولف تذکرہ ''اشارات بینش'' کا بیان ہے کہ وفاؔ نہایت فصیح البیان اور صاحب فضل و کمال تھے۔ علوم عربیہ اور دیگر فنون میں قدرت رکھتے تھے۔ کرناٹک میں ان جیسے باکمال لوگ بہت کم آئے۔

مرزا عبدالباقی شاعر بھی تھے۔ ان کا تخلص وفاؔ تھا۔ محمد کاظم والہؔ اور فتح علی خاں صباؔ ملک الشعرا ایران سے شاعری خصوصاً قصیدہ گوئی میں اصلاح لی۔ وفاؔ اپنی سرکاری مصروفیات کے باوجود نواب کرناٹک محمد غوث خاں اعظمؔ کی مشہور بزم ''مشاعرہ اعظم'' کے رکن بھی رہے۔ وہ طرحی و غیر طرحی غزلیں خوب کہتے تھے اور محاورات فارسی کے سلسلے میں جب بحث ہوتی تو وفاؔ ''حَکَم'' مقرر کیے جاتے۔ نواب ممدوح کی خواہش پر وفا نے مشہور ترکی کتاب ''مجالس النفائس'' کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کتاب کا ایک مخطوطہ گورنمنٹ اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری مدراس میں موجود ہے۔

مرزا عبدالباقی وفاؔ کو فن خطاطی میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ وہ ''خوشنویس ہفت قلم'' کہلاتے تھے۔ وفاؔ نے 11/دسمبر 1856ء کو وفات پائی۔ مدراس کے ایک مشہور اخبار ''امیر الاخبار'' میں وفاؔ کے انتقال کی خبر اس طرح شائع ہوئی تھی۔

> ''افسوس ہے کہ گورنمنٹ ایجنٹ کے منشی مرزا عبدالباقی صاحب شریف الرضوی المتخلص بہ وفاؔ جو کہ عربی وفارسی اور علوم متنوعہ میں بہرہ شایستہ رکھتے تھے اور 35 سال تک نوکری سرکار انگریزی کی سو۔ آٹھویں ماہِ حال روزِ شنبہ وقت شکایت تپ و بخار سے انتقال فرمائے۔ اب یہاں سے از روئے ''تعلیم الاخبار'' یہ واضح ہوتا ہے کہ دوسرے روز نواب مجیدالدولہ مرحوم کے باغ میں ان کا مدفن ہوا۔ مرزا صاحب مرحوم عین حیات میں صلابت خاں صاحب کو اپنا وصی اور بڑے میاں صاحب کو مختار کار بنائے تھے اور یہ وصیت فرمائے تھے کہ بعد میرے میرا مال و متاع چار وارثوں پر تقسیم کریں۔ اول ہمشیرہ جو ساکن کربلا ہیں، دوسری بی بی، تیسری دختر کلاں، چوتھی دختر خرد جو عورت مطلقہ سے ہے۔''

(امیر الاخبار، نمبر 5، جلد 3، مورخہ 11/دسمبر 1856)

8.3.8 محمد مہدی واصفؔ:

فورٹ سینٹ جارج کالج کے ارباب قلم میں مہدی واصف بے حد مشہور ہیں وہ نہ صرف اُردو، فارسی، عربی، ترکی، انگریزی، فرنچ بلکہ متعدد دیسی زبانوں جیسے تلگو، مرہٹی، تامل، ملیالم اور سنسکرت سے واقف تھے۔ وہ مختلف زبانوں کے ادیب، مصنف، مرتب اور مترجم تھے۔ ایک لغت نویس کی حیثیت سے بھی ان کی بڑی اہمیت ہے۔ مہدی واصف موصل (عراق) کے صدیقی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ 1802ء میں مدراس میں پیدا ہوئے۔ فطری ذکاوت نے انہیں مختلف السنہ پر حاوی کیا تھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد تراب علی نامی کے توسط سے سترہ سال کی عمر میں فورٹ سینٹ جارج کالج سے وابستہ ہوئے اور سترہ سال تک اپنی خدمات انجام دیں پھر وظیفہ لے کے اس کو چھوڑا۔ اس طرح مہدی واصف 1818ء سے 1835ء تک فورٹ سینٹ جارج کالج سے وابستہ رہے۔ پھر درس و تدریس اور تالیف و ترجمہ میں ہمہ تن مصروف رہے پھر نواب محمد غوث خان کے دربار سے وابستہ ہوئے۔ محکمہ عالیہ میں ترجمے کی خدمات انجام دیں۔ 1855ء میں حیدرآباد آئے اور مدرسہ دارالعلوم میں عربی استاد کی حیثیت

سے اپنی خدمات انجام دیں۔آخر 1873ء میں حیدرآباد میں وفات پائی۔ابومحمد عمر الیافعی کا بیان ہے کہ مہدی واصفؔ تقریباً تین سو کتابوں کے مصنف یا مولف تھے۔واصفؔ نے ساری زندگی اپنے بزرگوں کی علمی روایات کے تسلسل کو آگے بڑھانے میں گزاردی۔

مہدی واصفؔ نے''انگریزی' ہندوستانی اور فارسی لغت''مرتب کی جو 1851ء میں مدراس سے شائع ہوئی 1843ء میں ''دلیل ساطع'' شائع ہوئی جو سنسکرت' ہندی' فارسی' اُردو لغت ہے۔1851ء میں فارسی اُردو لغت' مناظر اللغات'' کے نام سے مرتب کی۔1844ء میں ''مجمع الامثال'' مرتب کی جو قدیم وجدید امثال پر ایک عمدہ کتاب ہے۔

مہدی واصف ایک قادر الکلام شاعر تھے ان کے دو دیوان ایک دیوان''مسکین''اور دوسرا' نعتیہ دیوان''روضۂ رضوان'' ہے یہ دونوں دیوان شائع ہو چکے ہیں۔واصفؔ کا فارسی دیوان''دیوان واصفؔ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔مہدی واصف فارسی اور اُردو دونوں میں فکر سخن کرتے تھے فارسی میں واصفؔ اور اُردو میں مسکینؔ تخلص کرتے تھے۔وہ مثنوی گو بھی تھے۔واصف ایک تذکرہ نویس بھی تھے فارسی میں معدن الجواہر اور عربی میں حدیقتہ المرام فی تذکرہ العلماء الاعلام ان کی یادگار ہیں انہوں نے کئی عربی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کیا۔

فورٹ سینٹ جارج کالج کے نصاب میں مہدی واصف کی فارسی حکایات دل پسند' لطائف عجیبہ اور حکایات نادرہ شامل تھیں۔مہدی واصف نے عربی حکایات کا اُردو ترجمہ''حکایات لطیفہ'' کے نام سے کیا تھا۔یہ کتاب فورٹ سینٹ جارج کالج کے دکنی نصاب میں شامل تھی۔

مہدی واصف نے ضروریات زمانہ کومحسوس کر کے دینی اور اسلامی علوم کی مختلف کتابوں کو اُردو میں منتقل کیا۔مہدی واصف نے اُردو زبان و ادب کی بیش بہا خدمت انجام دی،ان کے ادبی کارنامے ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھے جائیں گے۔

8.3.9 سید تاج الدین:

سید تاج الدین فورٹ سینٹ جارج کالج میں انگریزوں کو اردو زبان سکھانے پر مامور تھے۔وہ اردو، تامل، عربی اور فارسی کے علاوہ انگریزی زبان سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ان کے حالات کسی ادبی تاریخ میں نہیں ملتے۔صرف مولوی نصیر الدین ہاشمی نے فہرست مخطوطات کتب خانہ آصفیہ میں ان کا مختصر سا ذکر کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''سید تاج الدین مدراس کے متوطن تھے۔عربی فارسی کے ساتھ انگریزی سے بھی واقف تھے۔
> انگریزوں کو اردو تعلیم دیا کرتے تھے۔مدراس کے جامع الاخبار'' سے ان کا تعلق تھا۔''

(نصیر الدین ہاشمی،اردو مخطوطات کتب خانہ آصفیہ،جلد اول،ص 20)

حالیہ عرصے میں پروفیسر یوسف کوکن نے اپنے انگریزی مقالے میں سید تاج الدین کا ذکر کیا ہے اور ان کی اردو،تامل،عربی اور فارسی تصانیف کے نام گنوائے ہیں،لیکن ان کے حالات زندگی اس مقالے میں بھی موجود نہیں ہے۔یوسف کوکن نے سید تاج الدین کی اردو کتابوں میں''تاج نامہ''اور''عقاید'' کا ذکر کیا ہے۔بعد کی تحقیق سے ان کی ایک اور اردو تصنیف''گل دستہ ہند'' کا پتہ چلتا ہے۔یہ ان کے اردو کارناموں میں خاص طور سے قابل ذکر ہے۔اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

''گل دستہ ہند'' ہندوستان کی ایک مختصر تاریخ ہے،جس کو مولف نے مولسورتھ کی اعانت سے بعض انگریزی اور فارسی تاریخوں سے مرتب کیا ہے۔دیباچہ میں اس امر کی وضاحت کردی گئی ہے کہ تاریخ''کرناٹکی محاوروں'' میں ترجمہ کی گئی ہے۔اس تاریخ کو لکھنے کے لیے اس کتاب کو چار

ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں تاریخ کی ابتدا ہوئی ہے، جس میں سامانی خاندان کا ذکر ہے۔اس باب میں سلطان محمود تک کی تاریخ درج ہے۔ دوسرے باب میں سلطان مسعود شاہ فرزند سلطان محمود سے لے کر سلاطین دہلی خاندان کے غلامان تک کے تاریخی حالات و واقعات شامل ہیں۔تیسرے باب میں دہلی کے پٹھان بادشاہوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔اسی طرح چوتھے باب میں مغل بادشاہوں کا ذکر کیا گیا ہے۔لارڈ لیک شمشیر الملک کے بیان پر اس تاریخ کا اختتام ہوا ہے۔دیباچہ میں اس بات کی بھی صراحت کی گئی ہے کہ 1264ھ مطابق 1848ء میں منشی غلام دستگیر نے مدراس کے مطبع جامع الاخبار میں اس کتاب کو طبع کروایا تھا۔

8.3.10 منشی سید غلام دستگیر:

منشی سید غلام دستگیر فورٹ سینٹ جارج کالج میں معلم کی حیثیت سے مامور تھے۔ان کے حالات تذکرہ ''گلزار اعظم'' میں درج ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ 1217ھ مطابق 1802 میں مدراس میں پیدا ہوئے اور یہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔فارسی کی کتابیں اپنے والد سید عبدالقادر سے بڑھیں اور کتب عربی مولوی عبدالرحمٰن و مولوی سید محمد معروف قاضی القضات مما لک محروسہ مدراس اور مولوی عبدالقادر حسینی سے پڑھیں۔اپنے ایک عزیز مولوی سید محی الدین سے انگریزی سیکھی اور اس میں اچھی مہارت پیدا کی۔

تذکرہ ''گلزار اعظم'' سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی سید غلام دستگیر فورٹ سینٹ جارج کالج میں انگریزی کے استاد تھے،لیکن اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ اس کالج سے کب وابستہ ہوئے اور کب تک اس کالج میں اپنی خدمات انجام دیں۔اس کالج کی ملازمت کے بعد وہ کچھ عرصہ گورنمنٹ کے دارالانشا میں مترجم کی حیثیت سے مامور ہوئے۔پھر 1254ء مطابق 1838ء میں سپریم کوٹ منتقل ہوئے۔دستگیر کی تاریخ وفات کا پتہ نہیں چلتا۔ پروفیسر کوکن لکھتے ہیں کہ وہ یکم شعبان 1280ھ مطابق 11/جنوری 1846ء کو حج وزیارت کے لیے روانہ ہوئے تھے،جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دستگیر 1846ء تک حیات تھے۔

منشی سید غلام دستگیر کو شاعری سے بڑی دلچسپی تھی۔ان کا تخلص دستگیر تھا۔وہ کبھی کبھی فکر سخن کرتے تھے۔تاریخ گوئی کا انہیں بڑا شوق تھا اور اس فن میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔

8.3.11 منشی محمد ابراہیم بیجاپوری:

فورٹ سینٹ جارج کالج کے مصنفین میں منشی محمد ابراہیم بیجاپوری اپنے ترجمے ''دکنی انوار سہیلی'' کی وجہ سے خاص طور پر ممتاز و معروف ہیں۔یہ ترجمہ فورٹ سینٹ جارج کالج کے فوجی افسروں کے لیے کیا گیا تھا اور فورٹ سینٹ جارج کالج کے انتظامی بورڈ کی جانب سے یہ کتاب کالج ہی کے پریس سے 1240 مطابق 1824ء میں شائع ہوئی تھی۔دکنی انوار سہیلی جو چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ٹائپ کے حروف میں شائع ہوئی ہے۔آخر میں فرہنگ ہے۔انوار سہیلی ایک مقبول عام کتاب ہے اس کا دنیا کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔اس کی حکایتوں نے ہر ملک کے شعر و ادب پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں اس کتاب میں حکومت کے رموز اور اخلاقی نصیحتوں کو کہانیوں کے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔انوار سہیلی اگرچہ پندو موعظت، اخلاق و تہذیب پر لکھی ہوئی کتاب ہے لیکن اس کی تمام حکایتوں اور مثالوں کا مقصد ادب، تربیت اور تزکیۂ نفس ہے۔دکنی انوار سہیلی اگرچہ ترجمہ ہے لیکن مترجم نے اس محنت اور خوبی سے ترجمہ کیا ہے کہ انہیں مترجم کے بجائے مولف کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔دکنی انوار سہیلی بقول منشی ابراہیم بیجاپوری مسلسل تین سال کی شبانہ روز کو چہ گردی، عرق ریزی اور جانفشانی کا نتیجہ ہے۔

8.3.12 کالج کے انگریز مصنفین:

فورٹ سینٹ جارج کالج کے انگریز مصنفین میں ڈاکٹر ہنری ہارس (Henry Harris)الکساانڈر ڈنکس کیمبل (A.D. Campbell)' تھامس روبک(Thomos Reobuck) کیپٹن گرین آوے(Capt. Greenaway)اورڈاکٹر ایڈورڈ بالفور (Edward Balfour) قابل ذکر ہیں۔ چند انگریز مصنفین کا ذکر درج ذیل ہے۔

ڈاکٹر ہنری ہیرس:

ڈاکٹر ہنری ہیرس فورٹ سینٹ جارج اسکول رائٹرس کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ 1785ء میں افواج مدراس میں اسسٹنٹ سرجن مقرر ہوئے۔ 1791ء میں انگریزی و ہندوستانی وانگریزی لغت مع گرامر (Analysis, Grammar and Dictionary of Hindustani Language) کے نام سے مدراس سے شائع کی، جوگل کرسٹ کی لغت سے بہتر ہے۔گل کرسٹ نے اس لغت کی تیاری میں ڈاکٹر ہنری ہارس کی محنت اورعرق ریزی کی داددی ہے اورلکھا ہے کہ یہ کتاب ہندوستانی زبان سے مولف کی کما حقہ واقفیت کا نا قابل تردید ثبوت فراہم کرتی ہے۔

تھامس روبک:

تھامس روبک فورٹ سینٹ جارج اسکول/ رائٹرس کالج کے فیض یافتہ تھے۔افواج مدراس کے ایک افسر تھے۔لفٹیننٹ سے کیپٹن کے درجے تک ترقی کی تھی۔ان کو اُردو زبان سے خاص دلچسپی تھی۔انہوں نے متعدد کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن میں برٹش انڈیا مانیٹر (British India Monitor) کی دوجلدیں قابل ذکر ہیں۔ یہ کتاب مدراس سے شائع ہوئی تھی اورفورٹ سینٹ جارج کالج کے نصاب میں شامل تھی۔ روبک کی ''لغت جہاز رانی'' بھی مشہور ہے اس میں بحریہ اور جہاز رانی کی تمام اصطلاحیں اورالفاظ انگریزی اوراُردو میں دیے گئے ہیں۔ایسے الفاظ اور جملوں کا بھی کثیر ذخیرہ ہے جوانگریزی کمانداروں کومیدان جنگ اور بیرکس میں ہندوستانی سپاہیوں کے ساتھ بول چال میں کارآمد ہوسکتے ہیں۔ روبک کی ایک اورکتاب ترجمان ہندوستان(Hindustani Interpreter) بھی قابل ذکر ہےاس میں قواعد زبان اُردو کے ابتدائی مسائل کا ذکر ہے یہ کتاب لندن اور پیرس سے شائع ہوئی ہے۔اہل یورپ کواُردوزبان کی تحصیل میں ان کتابوں سے بہت مدد ملتی رہی ہے۔

ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی ہندوستانی لغت میں تھامس روبک نے بھی دوسال رخصت لے کران کا ہاتھ بٹایا تھا۔ بعد میں تھامس روبک کی خدمات فورٹ ولیم کالج کلکتہ نے حاصل کرلیں۔

کیپٹن گرین اوے:

گرین اوے(Greenaway) افواج مدراس میں کیپٹن کے عہدہ پر مامور تھے۔ان کا تعلق فوج کی (46) چھالیسویں رجمنٹ سے تھا۔ وہ فورٹ سینٹ جارج کالج کے فارغ التحصیل تھے۔دکنی میں مہارت تھی، وہ شاعر بھی تھے۔ان کی ایک کتاب ''علی بابا چالیس چور'' دستیاب ہوئی ہے۔ جواُردو دواولین ڈراما ہے۔ یہ ڈراما 1852ء میں ''تعلیم الاخبار پریس'' مدراس سے شائع ہوا۔ 1984ء میں افضل الدین اقبال نے اسے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ڈاکٹر گیان چند نے اس کی اشاعت پرلکھا کہ ''اب اندرسبھا'' گوپی چند جالندھر' بلبل بیمار' خورشید' سجاد سنبل اورصولت عالم گیری اُردو کے پہلے ڈرامے کے مقابلے سے خارج ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب اُردو ڈرامے کی تحقیق میں غیرمعمولی اہمیت کی حامل ہے۔''

ڈاکٹر ایڈورڈ بالفور:

اُردوداں طبقہ میں جس طرح کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کے گلکرسٹ کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔اسی طرح مدراس کے فورٹ سینٹ

جارج کالج کے ڈاکٹر ایڈورڈ بالفور کا نام بھی ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ڈاکٹر بالفور فورسینٹ جارج کالج سے بھی وابستہ رہے۔وہ کالج کے بورڈ آف اگزامنر کے ممبر بھی رہے۔مدراس کے مسلمانوں میں جدید تعلیم کی ترویج کے لیے ایک انجمن ''مجمع علم وہنر'' کے نام سے قائم کی تھی۔کتب خانہ عام اہل اسلام (محمڈن پبلک لائبریری) اور مدرسہ اعظم مدراس کے قیام میں بھی بالفور کا بڑا حصہ ہے۔بالفور نے کئی کتابیں لکھیں جن میں درج ذیل قابل ذکر ہیں۔(1) گلدستۂ سخن (2) کتاب علم نجوم (3) اُردو اور انگریزی میں دنیا کے اعداد و شمار کا نقشہ (4) علم ہیئت کا رسالہ (5) رسالۂ علم کیمیا (6) اصول فن قبالت (Outlines of Midwifery)۔''اصول فن قبالت'' اہل فرنگ کے طبیبوں کی پہلی کتاب ہے جس کا اُردو میں ترجمہ ہوا۔ یہ کتاب ڈاکٹر بالفور کا ایک بہترین علمی کارنامہ ہے۔

8.4 کالج کی اردو خدمات

ہندوستان کی تاریخ کا یہ وہ زمانہ ہے جب کہ سلطنت مغلیہ کے اقتدار کو زوال آچکا تھا سرکاری زبان کی حیثیت سے فارسی کی وہ منزلت باقی نہیں رہی تھی جو مسلمانوں کے عروج واقبال کے زمانے میں تھی۔اس وقت سارے ہندوستان میں اُردو ہی ایک ایسی زبان تھی جو عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی اس لیے ایسٹ انڈیا کمپنی نے دوسری ملکی زبانوں کے مقابلے میں اُردو کی زیادہ سرپرستی کی اور جہاں فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی میں کتابیں تیار کی جارہی تھیں وہیں فورٹ سینٹ جارج کالج میں اُردو کی قدیم شکل ''دکنی'' کا پرچار ہورہا تھا اور اس کی توسیع واشاعت سے خاطر خواہ دلچسپی لی جارہی تھی۔

انگریزوں نے اُردو میں اپنے ادب کو منتقل کرنے کے بجائے فارسی اور سنسکرت وغیرہ کی مقبول کتابوں کا دکنی میں ترجمہ کروایا اسکی وجہ یہ تھی کہ ایک طرف تو خود اہل ہند خصوصاً دکن اور جنوبی ہند کے لوگوں کے ذریعے ان میں دلچسپی لی جاتی تھی اور دوسری طرف دکن اور جنوبی ہند کے مذاق و خیالات کو سمجھنے میں ان سے کافی مدد مل سکتی تھی۔اس طرح کمپنی کے زیر اثر ہندوستان میں اور خصوصاً دکن اور جنوبی ہند میں اُردو نثر نگاری کی تحریک آگے بڑھی۔اُردو نثر کے فروغ واشاعت میں انگریزوں کا جو حصہ رہا اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے فورٹ سینٹ جارج کالج کو مکمل افادی بنیاد پر قائم کیا تھا نظمائے کمپنی کا اصل منشا مدراس میں چند ارباب قلم کو یکجا کرکے ان سے اپنے انگریز اہل کاروں اور عہدہ داروں کے لیے ایسی سلیس درسی کتابیں لکھوانا تھا جن کا انداز بیان شاعرانہ نزاکتوں اور لفظی موشگافیوں کی بجائے سیدھا سادہ اور عام فہم ہو۔کالج کے ارباب مقتدر نے چوں کہ عربی فارسی اور دیسی زبانوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی اور دکنی زبانوں کو بھی نصاب میں شامل کیا تھا اس لیے فورٹ سینٹ جارج کالج کی طرف سے ان تمام زبانوں کی کتابوں کی اشاعت عمل میں آتی رہی۔ اگر چہ فورٹ سینٹ جارج کالج کے قائم ہونے سے پہلے ہی صوبہ کرناٹک (تامل ناڈو) میں اُردو تصانیف کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا لیکن کوئی باقاعدہ اور منظّم تحریک موجود نہ تھی۔مصنفین اپنے طور پر تصنیف وتالیف میں مصروف تھے اور نثر کے مقابلے میں نظم کی طرف اہل قلم زیادہ مائل تھے۔فورٹ سینٹ جارج کالج کی ذمے دار شخصیتوں نے سلیس اور عام فہم نثر نگاری کا مقصد متعین کرکے کام شروع کیا تھا وہ کالج کے اساتذہ سے آسان زبان میں کتابیں لکھوارہے تھے اس طرح فورٹ سینٹ جارج کالج جنوبی ہند کا وہ پہلا علمی وادبی ادارہ تھا جو دکنی زبان میں فروغ واشاعت کے لیے باقاعدہ اور منظّم طریقے پر کام کررہا تھا۔اس طرح اس کالج نے آسان، سلیس اور عام فہم نثر نگاری کی ایک شاندار روایت قائم کردی۔

8.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ راجہ چندر گیری سے سالانہ پٹہ پر چینا پٹن (مدراس) میں حاصل کی ہوئی زمین پر 23/اپریل 1640ء کو ایک بند کوٹھی کی تعمیر شروع ہوئی۔ اس کی بنیاد چوں کہ سینٹ جارج ڈے پر رکھی گئی تھی اس لیے اس دن کی مناسبت سے اس کوٹھی کا نام فورٹ سینٹ جارج رکھا گیا۔

☆ فورٹ سینٹ جارج مدراس کی تعمیر کے دو سال بعد 1645ء میں پادری فادر ابراہیم نے فورٹ سینٹ جارج کے اندر مدراس کے پہلے پبلک اسکول کی بنیاد ڈالی۔

☆ فورٹ سینٹ کالج انگریزوں کے ذریعے قائم کردہ ہندوستان کا دوسرا بڑا ادارہ تھا۔ اس پہلے انگریوں نے کلکتہ میں ایک کالج 'فورٹ ولیم کالج' کے نام سے قائم کیا تھا۔ اس کالج کو قائم کرنے کا بنیادی مقصد انگریز عہدے داروں کو اردو سکھانا تھا۔ اس لیے یہاں پر آسان اردو زبان میں میں کتابیں تیار کروائی گئیں، جس سے انگریز افسروں کو کافی مدد ملی۔

☆ فورٹ سینٹ جارج کالج کا شعبۂ تعلیم دکنی' ہندوستانی' اُردو' عربی' فارسی' سنسکرت' تلگو' ملیالم' کنڑی اور تامل زبان کے شعبوں کے علاوہ قانون اور ریاضی کے شعبوں پر مشتمل تھا۔

☆ فورٹ سینٹ جارج کالج کے تحت ایک شاندار کتب خانہ بھی تھا۔ اس کتب خانہ کے کیٹلاگوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تامل' تلگو' کنڑی' مرہٹی' ملیالم' سنسکرت' بنگالی' اڑیا' ہندی' برمی اور جاری زبانوں کے ساتھ اُردو و دکنی زبان کی بھی بے شمار کتابیں تھیں۔

☆ فورٹ سینٹ جارج کالج کا انتظامی بورڈ اچھی تصنیف پر مصنف کی حوصلہ افزائی کرتا اور انہیں انعام و اکرام سے نوازا کرتا تھا۔ چناں چہ قاضی ارتضا علی خان کو ''نقود الحساب'' پر ایک ہزار ہُن انعام دیے گئے۔ تراب علی نامی کو بھی ''وسیطہ النحو'' پر ایک معقول معاوضہ ملا تھا۔ مہدی واصف کے مشہور عربی تذکرہ ''حدیقۃ المرام فی تذکرۃ العلماء الاعلام'' سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاوضہ سات ہزار روپے تھا۔

☆ کالج میں ہندوتانی اور انگریز دونوں مصنفین اپنی خدمات انجام دی ہیں۔ ہندوستانی مصنفین میں تراب علی نامؔی، سید حسین شاہ حقیقتؔ، حسن علی ماہلی، منشی غلام حسین معاون خان، قاضی ارتضا علی خاں خوشنودؔ، مفتی محمد تاج الدین حسین خاں بہجتؔ، مرزا عبدالباقی وفاؔ، محمد مہدی واصفؔ، سید تاج الدین، منشی سید غلام دستگیر، منشی محمد ابراہیم بیجاپوری وغیرہ کا نام کافی اہم ہیں۔

8.6 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
منشی	:	رائٹر، لکھنے والا
سامراجی	:	شہنشاہیت پسند، شہنشاہی حکومت کا حامی
مخزن	:	خزانہ، گودام
مطبع	:	پریس، چھاپاخانہ
السنہ	:	لسان کی جمع، زبانیں

ودیاساگر	:	علم کا سمندر، بحرالعلوم
سیول	:	کشوری
ملٹری	:	فوجی
بادی النظر میں	:	سرسری نظر میں، ابتدائی نظر میں
فاضل فرزانہ	:	زیادہ پڑھا ہوا، عاقل
بلدہ	:	شہر، نگر، قصبہ
تفوق	:	برتری، بڑائی، ترجیح
وے	:	وہ
عرق ریزی	:	کمال محنت، نہایت ہی جانفشانی
علوم عقلیہ	:	وہ علوم جن میں موجودات کے تصور سے بحث کی جاتی ہے (سائنس، فلسفہ)
علوم نقلیہ	:	وہ علم جو عقل کے بجائے نقل یا بیان کی ہوئی باتوں سے بحث کرتا ہے (حدیث، تاریخ)
اطبا	:	طبیب کی جمع، بہت سے حکیم
بار یاب	:	رسائی پانے والا، کامیاب، موثر
فصیح البیان	:	خوش بیان، شیریں کلام، جس کے بیان میں سلاست اور روانی ہو
بزرگانِ سلف	:	گزرے ہوئے نیک آباواجداد، برگزیدہ لوگ
یدطولیٰ	:	خدا تعالیٰ کی قدرت، طاقت
فارغ التحصیل	:	حصول تعلیم یا تربیت سے فارغ، تعلیم حاصل کیا ہوا

8.7 نمونہ امتحانی سوالات

8.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ فورٹ سینٹ جارج کوٹھی کی تعمیر کس سنہ میں شروع ہوئی؟

2۔ مدراس میں پہلے پبلک اسکول کی بنیاد کب ڈالی گئی؟

3۔ رائٹرس کالج کی بنیاد کس نے ڈالی؟

4۔ مدراس میں پہلے پبلک اسکول کی بنیاد کس نے ڈالی؟

5۔ رائٹرس کالج کی بنیاد کب ڈالی گئی؟

6۔ لارڈ ویلزلی کس سنہ میں انگلستان واپس گئے تھے؟

7۔ ''دکنی انوار سہیلی قدیم اُردو کا آخری بڑا نثری کارنامہ ہے۔'' یہ کس کا خیال ہے؟

8۔ سید حسین شاہ حقیقتؔ کی جملہ تصانیف کی تعداد کتنی ہے؟

9۔ فورٹ سینٹ جارج کالج کو قائم کرنے کا مقصد کیا تھا؟

10۔ ڈراما ''علی بابا چالیس چور'' کس انگریز مصنف کی کتاب ہے؟

8.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ فورٹ سینٹ جارج کالج کے قیام اور اس کے مقاصد کو بیان کیجیے۔

2۔ فورٹ سینٹ جارج کالج کے مختلف تعلیمی شعبہ جات پر نوٹ لکھیے۔

3۔ فورٹ سینٹ جارج کالج کے پریس اور کتب خانے پر مضمون لکھیے۔

4۔ فورٹ سینٹ جارج کالج کی اردو خدمات پر نوٹ لکھیے۔

5۔ فورٹ سینٹ جارج کالج کے انگریزی مصنفین کا تعارف پیش کیجیے۔

8.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ فورٹ سینٹ جارج کالج کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ تفصیل سے بیان کیجیے۔

2۔ فورٹ سینٹ جارج کالج کے اہم مصنفین اور ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

3۔ فورٹ سینٹ جارج کالج کے مصنفین کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

8.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	فورٹ سینٹ جارج کالج	ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبالؔ
2۔	مدراس میں اردو ادب کی نشو و نما	ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبالؔ
3۔	تذکرہ شعرائے دکن (جلد اول، دوم)	عبدالجبار ملکاپوری
4۔	دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی
5۔	مدراس میں اردو	نصیر الدین ہاشمی
6۔	فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات	ڈاکٹر عبیدہ بیگم

اکائی 9: فورٹ ولیم کالج

اکائی کے اجزا

9.0 تمہید

9.1 مقاصد

9.2 فورٹ ولیم کالج کے قیام کے اغراض و مقصد

9.3 ڈاکٹر جان گل کرسٹ

9.4 اردو کے دوسرے انگریز پروفیسران

9.5 فورٹ ولیم کالج کے اہم مصنفین

9.5.1 میر امن دہلوی

9.5.2 سید حیدر بخش حیدری

9.5.3 میر شیر علی افسوس

9.5.4 میر بہادر علی حسینی

9.5.5 مرزا علی لطف

9.5.6 مولوی امانت اللہ

9.5.7 مظہر علی خاں ولا

9.5.8 مرزا جان طپش

9.5.9 میر کاظم علی جوان

9.5.10 شیخ حفیظ الدین

9.5.11 خلیل خاں اشک

9.5.12 مولوی اکرام علی

9.5.13 نہال چند لاہوری

9.5.14 منشی بنی نارائن جہاں

9.5.15 میر عبداللہ مسکین

9.5.16 للولال کوی

9.5.17 مرزا محمد فطرت
9.5.18 میر محی الدین فیض
9.5.19 سید حمید الدین بہاری
9.6 اکتسابی نتائج
9.7 کلیدی الفاظ
9.8 نمونہ امتحانی سوالات
9.8.2 معروضی جوابات کے حامل سوالات
9.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
9.8.2 طویل جوابات کے حامل سوالات
9.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

9.0 تمہید

انگریز ہندوستان میں اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے آئے۔ اس زمانے میں تجارتی کمپنیاں اپنی حفاظت کے لیے فوج بھی رکھتی تھیں۔ انگریزوں کی ایک کمپنی جس کا نام ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' تھا تجارتی اغراض کے لیے ہندوستان آئی اور موقع پا کر ہندوستان پر حکومت کرنے لگی۔ انگریز عہدے داروں کو اُردو سکھانے کے لیے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج 1800ء میں قائم کیا گیا۔ اُردو میں نثری کتابیں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے بہت کم تھیں۔ جتنی کچھ بھی تھیں ان کی زبان بے حد مشکل تھی اور اس میں قافیے اور وزن کا بھی اہتمام کیا گیا تھا یعنی اس کی عبارت مقفّیٰ و مسجع ہوا کرتی تھی۔ اسی وجہ سے فورٹ ولیم کالج میں نثری کتابیں لکھوائی گئیں۔ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا کہ زبان عام فہم اور بیان میں سادگی اور سلاست ہو۔ اس غرض سے فورٹ ولیم کالج میں انشا پرداز یعنی منشی مقرر کیے گئے۔ چوں کہ طبع زاد کتابیں لکھنے میں بہت وقت صرف ہوتا ہے اس لیے فارسی یا ہندوستانی زبانوں میں لکھی گئی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کروایا گیا۔ ابتدائی چار پانچ سالوں میں کوئی چھپّن کتابیں اُردو میں منتقل کی گئیں اور یہ کام انہیں منشیوں نے انجام دیا۔ جس کی وجہ سے مختلف موضوعات پر اُردو میں نثری کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ فراہم ہو گیا، جس کی زبان سادہ سلیس اور آسان تھی۔ فورٹ ولیم کالج کا یہ کارنامہ اُردو ادب اور خاص طور پر اُردو نثر کی تاریخ میں عہد آفریں قرار دیا جا سکتا ہے اور سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

9.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے مقصد کی وضاحت کر سکیں۔
☆ فورٹ ولیم کالج کے اہم مصنفین اور ان کی خدمات کی وضاحت کر سکیں۔
☆ اردو نثر کی ابتدا میں فورٹ ولیم کالج کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈال سکیں۔

☆ کالج کے زوال کی وجوہات بیان کرسکیں۔

9.2 فورٹ ولیم کالج کے قیام کے اغراض ومقاصد

فورٹ ولیم کالج کا قیام انگریز عہدے داروں کو اُردو سکھانے کے لیے عمل میں آیا۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے اسی بات کو بڑی وضاحت کے ساتھ یوں بیان کیا ہے:

> ''ایسٹ انڈیا کمپنی نے فورٹ ولیم کالج کو بالکل افادی بنیاد پر قائم کیا تھا۔ نظمائے کمپنی کا اصل منشا کلکتہ میں چند ارباب قلم کو یکجا جمع کر کے ان سے اپنے انگریز اہل کاروں اور عہدہ داروں کے لیے ایسی سلیس درسی کتابیں لکھوانا تھا جن کا طرز بیان شاعرانہ نزاکتوں اور لفظی موشگافیوں کے بجائے سیدھا سادہ اور عام فہم ہو۔ اس کالج کے تقریباً تمام مصنفوں کو اس بات کا بہت کم موقع دیا گیا کہ وہ قلم کی سحر کاریوں سے اپنے ذاتی جذبات وخیالات کی ترجمانی کرتے۔ کالج کے ارباب اقتدار کو ضروری نصابی کتب کی تیاری میں عجلت تھی۔ اس لیے ان مصنفوں سے بجائے مستقل کتابیں تصنیف کرانے کے مشہور، متبادل اور بالخصوص فارسی کی عام پسند کتابوں کے ترجمے کرائے گئے''۔ (پیش لفظ ''ارباب نثر اُردو'')

فورٹ ولیم کالج میں جو کتابیں تیار ہوئیں وہ ایسے لوگوں کے لیے تھیں جو اُردو زبان سیکھنا چاہتے ہوں۔ اُردو میں مبتدیوں کے پڑھنے کے لیے کتابیں نہیں تھیں۔ اس کی ضرورت یوں پیش نہیں آتی تھی کہ ابتدائی تعلیم فارسی اور عربی میں ہوا کرتی تھی۔ فارسی رسم خط سے جو واقف ہو جاتا تھا وہ اُردو آسانی سے لکھ پڑھ سکتا تھا۔ اُردو عام بول چال کی زبان تھی اور یہی مادری زبان بھی ہوا کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج میں صرف سادہ اور سلیس زبان میں کتابیں تیار کی گئیں بلکہ اُردو قواعد کی کتابیں اور لغات بھی تیار کی گئیں۔ خود اُردو کے پروفیسر اور صدر جان گلکرسٹ نے یہ کام انجام دیا، جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اُردو میں جو نثری کتابیں تھیں وہ بہت ادق زبان میں تھیں اور مقفی و مسجع بھی ہوا کرتی تھیں۔ مبتدیوں کے لیے یہ کتابیں قطعی غیر موزوں تھیں۔ چند کتابیں ضرور ایسی تھیں جن کی زبان آسان تھی لیکن ایسی کتابیں تمام تر مذہبی تھیں۔ ان کتابوں کا موضوع اسلامی تعلیمات اور عقائد تھا۔ اس کے علاوہ تاریخ اور دوسرے علمی موضوعات پر اُردو میں کتابیں نہیں تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ علمی اور ادبی کاموں کے لیے ایک مدت تک فارسی ہی استعمال کی جاتی تھی۔ اس بات کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اُردو کے بڑے بڑے شاعروں نے اُردو شعرا کے جو تذکرے لکھے وہ فارسی میں لکھے گئے۔ میر تقی میر نے اپنا تذکرہ ''نکات الشعرا'' فارسی ہی میں لکھا۔ مصحفی نے کئی تذکرے جیسے ریاض الفصحا'' تذکرۂ ہندی گویاں عقد ثریا تمام کے تمام تذکرے فارسی ہی میں لکھے۔ اسی طرح میر حسن اور قائم چاند پوری نے بھی اُردو شعرا کے تذکرے فارسی ہی میں لکھے۔ میر نے اپنی آپ بیتی ''ذکر میر'' فارسی ہی میں لکھی۔ غالبؔ نے مغلیہ سلطنت کی تاریخ ''مہر نیم روز'' اور ''ماہِ نیم ماہ'' کے نام سے لکھی تو فارسی ہی میں لکھی۔ غرض یہ کہ تمام علمی اور ادبی کام فارسی ہی میں ہوا کرتے تھے۔ اسی لیے اُردو نثر میں کتابیں بہت کم تعداد میں ملتی ہیں۔ اسی وجہ سے فورٹ ولیم کالج میں سادہ اور سلیس اُردو زبان میں کتابیں لکھوائی گئیں۔

9.3 ڈاکٹر جان گل کرسٹ

گل کرسٹ کا پورا نام جان بارتھ وک گل کرسٹ (John Barth Wick Gilchrist) تھا وہ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے۔ ایسٹ

انڈیا کمپنی میں وہ ڈاکٹر کی حیثیت سے ملازم ہوئے اور ہندوستان آئے۔ ہندوستان آئے تو انہوں نے فارسی اور اُردو سیکھنی شروع کی اور یہ زبانیں سیکھنے کے لیے انہوں نے ہندوستانی لباس اختیار کیا اور اُردو زبانوں کے مرکز دہلی اور لکھنؤ میں رہ کر فارسی اور اُردو سیکھی۔ کمپنی کی طرف سے بھی ہندوستانی زبانیں سیکھنے کے لیے ترغیب دی جاتی تھی یعنی تیس روپے الاؤنس دیا جاتا تھا۔ ڈاکر گل کرسٹ نے اُردو زبان سیکھنے میں خصوصی دلچسپی لی۔ انہوں نے کمپنی کو مطلع کیا کہ اب فارسی دفتری زبان بنائے رکھنے کی ضرورت نہیں رہی بلکہ اُردو کو دفتری زبان بنانا زیادہ مفید ہوگا۔ بعد میں 1832ء میں اُردو سرکاری زبان قرار دی گئی۔ گو اس وقت تک گل کرسٹ اپنے وطن لندن روانہ ہو چکے تھے لیکن ان کی تجویز پر عمل کیا گیا۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے گل کرسٹ نو وارد انگریز عہدے داروں کو فارسی کی تعلیم دیا کرتے تھے اور بغیر کسی معاوضے کے انہیں نوشت وخواند کے قابل بنا دیا کرتے تھے۔ جب لارڈ ولزلی گورنر جنرل بن کر ہندوستان آئے تو انہوں نے کمپنی کے ملازمین کے لیے اعلیٰ پیمانہ پر ایک کالج کے قیام کی سفارش کی لیکن کمپنی کے دوسرے عہدے داروں نے بڑی کانٹ چھانٹ کے بعد ایک کالج کے قیام کی منظوری دی۔ 1800ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتے میں قائم ہوا۔ گل کرسٹ کی خدمات کو دیکھتے ہوئے انہیں کالج کا صدر اور پروفیسر بنایا گیا۔ گل کرسٹ صرف چار سال تک ہی کالج کی خدمات انجام دیتے رہے اور خرابیِ صحت کی وجہ سے اپنے وطن لندن لوٹ گئے۔ لیکن ان چار سالوں میں انہوں نے فورٹ ولیم کالج میں تمام ہندوستان سے قابل اور لائق ماہرین زبان کو جمع کر دیا اور تصنیف وتالیف کا کام ان سے اس طرح لیا کہ ان کے جانے کے بعد بھی فورٹ ولیم کالج کے ماہرین زبان تصنیف وتالیف میں لگے رہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے خود انگلستان میں جب ادارۂ شرقیہ Oriental Institute قائم کیا تو گل کرسٹ کو اُردو کی پروفیسری پر معمور کیا۔ اس ادارہ میں صرف ان کو تعلیم دی جاتی تھی جو طبی عہدے پر فائز ہو کر ہندوستان جاتے تھے۔ وہ اس ادارے میں 1825ء تک یعنی اس ادارے کے برخاست ہونے تک کام کرتے رہے۔ بعد میں وہ اپنے طور پر کمپنی کے امیدواروں کو اُردو پڑھاتے رہے۔ 88 سال کی عمر میں 1841ء میں گل کرسٹ کا انتقال ہوا۔

گل کرسٹ کی تصنیف وتالیف کا سلسلہ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے بہت پہلے 1787ء سے شروع ہوتا ہے۔ اسی سال انہوں نے انگریزی ہندوستانی لغت تیار کرنی شروع کی۔ وہ تقریباً تیس سال تک تصنیف وتالیف میں مشغول رہے۔ انہوں نے حسب ذیل کتابیں لکھی تھیں:

1. انگریزی ہندوستانی لغت: وہ کوئی نو سال تک مسلسل اس لغت کو تیار کرنے میں لگے رہے۔ ہر لفظ کی اصل اس لغت میں بتائی گئی ہے کہ لفظ کس زبان کا ہے۔ یہ لغت 1792ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔
2. ہندوستانی علم اللسان: یہ اُردو لسانیات پر کتاب ہے۔ آخر میں انگریزی سے اُردو اور اُردو سے انگریزی کی ایک فرہنگ دی گئی ہے۔ مقدمہ میں اُردو قواعد زبان کو پیش کیا گیا ہے۔
3. اُردو کی صرف ونحو: اُردو قواعد کی یہ کتاب فورٹ ولیم کالج کے نصاب میں شامل تھی۔ میر بہادر علی حسینی نے ''اُردو رسالہ گل کرسٹ'' کے نام سے اس کا خلاصہ لکھا۔
4. مشرقی زبان داں: اُردو زبان سیکھنے کا آسان طریقہ پیش کیا گیا ہے۔ اُردو سے انگریزی اور انگریزی سے اُردو کی فرہنگ بھی شامل ہے۔ آلات جنگ کے اُردو نام بھی دیے گئے ہیں اور زبان کے ابتدائی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔
5. اُردو زبان پر مختصر مقدمہ: ''یہ مشرقی زبان داں'' کا خلاصہ ہے۔

6. ہندی کی آسان مشقیں: فورٹ ولیم کالج کے ابتدائی اور آخری امتحانات کے لیے یہ کتاب لکھی گئی۔

7. فارسی افعال کا جدید نظریہ فارسی افعال کی تشریح کی گئی ہے۔ افعال کے اُردو اور انگریزی مترادفات بھی دیے گئے ہیں۔

8. اجنبیوں کے لیے رہنمائے اُردو: انگریزوں کو اُردو سکھانے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی۔

9. بیاض ہندی: فورٹ ولیم کالج کے مولفین کے کارناموں کا انتخاب۔

10. عملی خاکے: اس میں اُردو الفاظ کی قرأت اور ان کے صحیح تلفظ کے اصول پیش کیے گئے ہیں۔

11. ہندی الفاظ کی قرأت۔ اس میں ہندی الفاظ کی قرأت کے طریقے بیان کیے گئے ہیں۔

12. اتالیق ہندی: اُردو نوشت وخواند آسانی سے سیکھنے کے طریقے۔ اس میں فارسی سیکھنے والوں کی بھی رہنمائی کی گئی ہے۔

13. ہندی عربی آئینہ: اس میں عربی کے ایسے الفاظ کی تشریح کی گئی ہے جن کا اُردو سے گہرا تعلق ہے۔

14. مکالمات انگریزی و ہندوستانی: اہل یورپ کو بول چال سکھانے اور ہندوستانیوں کے ساتھ روزمرہ کی گفتگو کرنے کے طریقے سکھائے گئے ہیں۔

15. مشرقی قصے: اس میں حکایات لقمان اور دوسرے مشرقی قصے اور افسانے فارسی، برج بھاشا اور سنسکرت سے ترجمہ کر کے یکجا کیے گئے ہیں۔ ان کے ترجموں میں گل کرسٹ کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کے دوسرے اہل قلم نے بھی حصہ لیا ہے۔

16. ہندی داستان گو: اس میں فارسی اور دیوناگری رسم الخط کے اُردو میں استعمال کے متعلق بحث کی گئی ہے۔

مذکورہ بالا گل کرسٹ کی کتابوں سے ظاہر ہے کہ اُردو سیکھنے کے لیے جن بنیادی کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے اس کو پورا کرنے کی انہوں نے کوشش کی۔ قواعد زبان اور تدوین لغت کا کام گل کرسٹ نے سب سے پہلے کیا۔ اُردو سیکھنے کے لیے بنیادی کتابوں کا جتنا اور جیسا ذخیرہ انہوں نے فراہم کیا وہ ان کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔

9.4 اُردو کے دوسرے انگریز پروفیسران

ڈاکٹر گل کرسٹ کے انگلستان لوٹنے کے بعد کپتان ٹامس روبک (Captain Thomas Roobuck) اُردو کے پروفیسر اور صدر مقرر ہوئے۔ ان کا تعلق فوج سے تھا۔ گل کرسٹ کی وجہ سے انہیں اُردو کا شغف پیدا ہوا۔ انہوں نے کالج کے اہل قلم کو تصنیف وتالیف کی طرف راغب کیا اور کئی کتابیں شائع کیں۔ ان کو شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ بنی نارائن جہاں کو خاص طور پر تصنیف وتالیف پر آمادہ کیا۔ اور ان سے اُردو شعرا کا تذکرہ لکھوایا۔ گل کرسٹ نے ''ہندوستانی لغت'' کی تدوین کی تو اس میں وہ شریک رہے۔ انہوں نے بھی کئی کتابیں لکھیں۔ ''لغت جہاز رانی'' کے عنوان سے لغت لکھی۔ اس کے ساتھ ایک مختصر اُردو قواعد بھی شامل کی۔ ان کی دوسری کتاب ''ترجمانِ ہندوستان'' (Hindustan Interpreter) ہے۔ اس میں بھی قواعد زبان کی تشریح کی گئی ہے۔ ان اُردو کتابوں کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کی تاریخ بھی انہوں نے لکھی ہے۔

کپتان جوزف ٹیلر Captain Jozeph Taylor

کپتان جوزف ٹیلر اُردو کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے بھی ایک مبسوط اُردو انگریزی لغت لکھی ہے۔ ڈاکٹر ولیم ہنٹر (Dr. William Hunter) ان کے شریک کار تھے۔ بعد میں ولیم اسمتھ نے اس پر نظر ثانی کر کے اس کا مختصر ایڈیشن شائع کیا۔

9.5 فورٹ ولیم کالج کے اہم مصنفین

9.5.1 میر امن دہلوی:

میر امن دہلوی کو جتنی شہرت اور جیسی مقبولیت حاصل ہوئی ویسی فورٹ ولیم کالج کے کسی بھی مصنف کے حصے میں نہیں آئی۔ میر امن تخلص تھا' نام میر امان تھا۔ ہمایوں کے عہد میں ان کے آبا و اجداد ہندوستان آئے۔ مغلیہ دربار سے وابستہ رہے۔ یہ سلسلہ عالم گیر ثانی تک قائم رہا۔ میر امن کا آبائی وطن دہلی ہی تھا۔ نادر شاہ درانی کے حملے سے دہلی تباہ ہوگئی۔ اور وہاں کے لوگ دلی چھوڑ کر دوسری جگہ جانے لگے۔ میر امن اس کے باوجود دلی میں رہے۔ لیکن جب روزگار کے لالے پڑ گئے تو پھر پٹنہ اور اس کے بعد کلکتہ پہنچے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فورٹ ولیم کالج کو لائق آدمیوں اور منشیوں کی ضرورت تھی۔ منشی بہادر علی حسینی ان کے دوست تھے۔ وہ پہلے سے فورٹ ولیم کالج میں خدمت انجام دے رہے تھے۔ انہیں کے توسط سے وہ کالج میں ملازم ہو گئے۔ وہ کالج میں کب تک کام کرتے رہے اس بات کا علم نہیں ہے۔ البتہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ 1801ء میں کالج میں ملازم ہو گئے تھے۔ انہوں نے 1802ء اپنی دونوں کتابیں مکمل کر لی تھیں۔ اس کے بعد وہ کالج میں کیا خدمت انجام دیتے رہے اور انہوں نے کون سے کام انجام دیے اس کے تعلق سے کوئی تحقیقی مواد نہیں ملتا۔ ان کی پیدائش کی تاریخ اور وفات کی تاریخ کے بارے میں معلومات نہیں ہیں۔ اُردو کے اتنے اہم ادیب کے بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں۔

میر امن نے قصہ چہار درویش کو ''باغ و بہار'' کے نام سے لکھ کر شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ ''باغ و بہار'' اس کا تاریخی نام ہے یعنی اگر اس کے حروف کے اعداد کو جوڑ لیا جائے تو اس کا سنہ تصنیف نکل آتا ہے۔ قصہ چہار درویش فارسی کا ایک مشہور قصہ ہے۔ اس قصہ کا اصلی مصنف کون تھا اس کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ بات مشہور تھی کہ یہ قصہ امیر خسرو نے حضرت نظام الدین اولیا کو اس وقت سنایا جب وہ بیمار تھے۔ میر امن نے بھی یہی بات لکھی ہے۔ لیکن بعد کی تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ قصہ امیر خسرو کا لکھا ہوا نہیں تھا۔ بیرونی اور اندرونی شہادتوں سے یہ بات پائے ثبوت کو پہنچتی ہے کہ امیر خسرو کے بعد کے زمانے میں یہ قصہ لکھا گیا ہے۔ مثال کے طور پر قصہ چہار درویش میں تمباکو اور بارود کا ذکر ہے جب کہ یہ دونوں چیزیں ہندوستان میں امیر خسرو کے ایک سو سال بعد استعمال ہوئیں۔ بہر حال یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ یہ قصہ امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے۔

اُردو میں میر امن سے پہلے میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے قصہ چہار درویش کو ''نو طرز مرصع'' کے نام سے لکھا تھا۔ تحسین کا یہ قصہ بہت ادق زبان میں ہے اور اس کی عبارت مقفّٰی اور مسجع ہے۔ قصہ چہار درویش کو میر محمد علی خاں شوق اورنگ آبادی نے اُردو میں نظم کیا ہے۔ اس کی زبان دکنی ہے۔ عوض زرین نے بھی قصہ چہار درویش کو مختصر کر کے ''نو طرز مرصع'' کے نام سے لکھا ہے۔ اس طرح قصہ چہار درویش کو بہت سے لوگوں نے لکھا لیکن ان سے کوئی واقف بھی نہیں ہے لیکن ''باغ و بہار'' اب بھی شوق و ذوق سے پڑھی جاتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا اور اہم سبب یہ ہے کہ اس کا اسلوب اس قدر پر کشش اور خوب صورت ہے کہ قصہ چہار درویش کو جتنی اور جیسی مقبولیت اور شہرت اس کتاب سے حاصل ہوئی وہ کسی اور کتاب سے حاصل نہیں ہوسکی۔ میر امن کی ''باغ و بہار'' نے نہ صرف اُردو میں شہرت پائی بلکہ دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ ایل۔ ایف۔ اسمتھ نے انگریزی میں اس کا ترجمہ کیا وہ بھی اتنا مقبول ہوا کہ اس کے کئی ایڈیشن مدراس' کلکتہ' لندن اور لکھنؤ سے شائع ہوئے۔ پھر ڈنکن فاربس نے 1857ء میں انگریزی میں اس کا خلاصہ شائع کیا۔ گارساں دتاسی نے فرانسیسی میں اس کا ترجمہ کیا۔ غلام محمد خاں خیبر نے ''خریطۂ

سرورؔ'' کے نام سے اسے منظوم کیا۔ سید محمد نے اپنی کتاب ''ارباب نثر'' اُردو میں اس کے ترجموں کی تفصیل دینے کے بعد بجا طور پر لکھا ہے:

''میرامن کے ترجمے کے سوا آج کسی کے ترجمے کو لوگ جانتے بھی نہیں۔ میرامن نے اپنے ترجمے میں ایسی سحر کاری کی ہے کہ وہی اب تک مقبول ہے اور جب تک اُردو زبان زندہ ہے مقبول رہے گا۔ اس کی قدر و قیمت میں مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا جائے گا''۔ (ارباب نثر اُردو۔ 43)

''باغ و بہار'' لکھنے کے بعد ''گنج خوبی'' کے نام سے میرامن نے ملا حسین کاشفی کی مشہور کتاب ''اخلاق محسنی'' کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ جیسا کہ فارسی کتاب کے نام سے ظاہر ہے اس میں اخلاقی حکایتوں کو پیش کر کے نصیحت آموز نتائج اخذ کیے گئے ہیں، لیکن یہ کتاب غیر معروف رہی۔

9.5.2 سید حیدر بخش حیدری:

میرامن دہلوی کے بعد فورٹ ولیم کالج کے جن مصنفین کو اہمیت اور مقبولیت حاصل ہوئی ان میں سید حیدر بخش حیدری اور شیر علی افسوس کے نام آتے ہیں۔ یہ کئی کتابوں کے مترجم تھے۔ حیدری بھی دہلی ہی کے باشندے تھے۔ حیدری کے والد نے ان کی تعلیم و تربیت کا بہت اچھا انتظام کیا تھا۔ ان کو کئی بہت اچھے اساتذہ ملے۔ جب حیدری کو معلوم ہوا کہ فورٹ ولیم کالج میں ملازمت کے مواقع نکل رہے ہیں تو انہوں نے فورٹ ولیم کالج کا رخ کیا اور اپنی کتاب ''قصۂ مہر و ماہ'' ڈاکٹر گل کرسٹ کو پیش کی۔ گل کرسٹ کو اس کتاب کی زبان پسند آئی اور انہوں نے حیدری کو فورٹ ولیم کالج میں ملازمت دے دی جہاں وہ زندگی بھر تصنیف و تعلیم میں مشغول رہے۔ حیدری کے حالات زندگی کی تفصیل بھی نہیں ملتی۔ حیدری کی پہلی تصنیف ''قصۂ مہر و ماہ'' ہے۔ دوسری کتاب فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہونے کے بعد لکھی۔ یہ حضرت امیر خسرو کی فارسی مثنوی کا نثری ترجمہ ہے جو قصۂ لیلیٰ مجنوں'' کے نام سے کیا گیا ہے۔ ان کی تیسری کتاب ''طوطا کہانی'' ہے۔ طوطا کہانی سنسکرت زبان کی ''شکا سب تتی'' پر مبنی ہے۔ شکا سب تتی کے معنی ہیں ''طوطے کی کہی ہوئی ستر کہانیاں''۔ اس کتاب کے فارسی میں کئی ترجمے ہوئے۔ سب سے پہلے فارسی کے عالم مولانا ضیاء الدین بخشی نے اس کا ترجمہ کیا۔ گو یہ ترجمہ مشکل اور ادق زبان میں تھا اس کے باوجود بہت مقبول ہوا اور اس کے بعد میں کئی خلاصے لکھے گئے۔ شیخ ابوالفضل کے علاوہ ملا سید محمد قادری نے بھی اس کا خلاصہ لکھا ہے۔ حیدری نے ملا سید محمد قادری کے خلاصے کو اُردو میں منتقل کیا ہے۔ حیدری کے اس ترجمے کو انگریزی میں بھی منتقل کیا گیا تھا۔ حیدری کی تیسری کتاب ''آرائشِ محفل'' یعنی قصۂ حاتم طائی کو بے حد شہرت حاصل ہوئی۔ گو کہ یہ قصہ بھی فارسی ہی سے ترجمہ کیا گیا ہے لیکن اس میں اتنا ردو بدل اور اتنے اضافے کیے گئے ہیں کہ بقول سید محمد اس کو ''ترجمہ کہنے کی بجائے حیدری کی تالیف کہا جائے تو زیادہ اچھا ہے''۔

حیدری نے حضرت نظامی گنجوی کی مشہور فارسی مثنوی 'ہفت پیکر'' سے متاثر ہو کر اسی طرز پر اُردو مثنوی 'ہفت پیکر'' ہی کے نام سے لکھی۔ یہ مثنوی شاید شائع نہیں ہوئی۔ اس کے ایک آدھ قلمی نسخے ملتے ہیں۔ ''تاریخ نادری'' میں حیدری نے نادر شاہ کے حالات و واقعات اس کے انتقال کے زمانے تک قلم بند کیے ہیں۔ یہ تاریخ بھی فارسی ہی میں لکھی گئی تھی جس کا ترجمہ حیدری نے اُردو میں کیا۔ ''گل مغفرت'' کے نام سے حیدری کی جو کتاب ملتی ہے وہ فارسی کی ''روضۃ الشہدا'' کا ترجمہ ہے۔ حیدری نے ''روضۃ الشہدا'' کا ترجمہ ''گلشن شہیداں'' کے نام سے کیا تھا۔ پھر اس کا ایک انتخاب کیا اور اس کا نام ''گل مغفرت'' رکھا۔ یہ انتخاب بھی تصنیف کی شان رکھتا ہے کیوں کہ حیدری نے جگہ جگہ نظم و نثر میں اتنے اضافے کیے ہیں کہ اسے ترجمہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے کئی ایڈیشن نکلے۔ اس کتاب کا ترجمہ فرانسیسی میں بھی ہوا۔ شیخ عنایت

اللہ کی مشہور فارسی کتاب ''بہار دانش'' کا ترجمہ حیدری نے ''گلزار دانش'' کے نام سے کیا۔ لیکن اس کا کوئی نسخہ نہیں ملتا۔ شاید یہ شائع نہیں ہوا۔ ''گلدستۂ حیدری'' میں حیدری کے مضامین، دیباچے اور نظمیں ملتی ہیں۔ اس کے صرف قلمی نسخے ملتے ہیں۔ یہ بھی زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوا۔ گلدستۂ حیدری کے 6 حصے ملتے ہیں۔ (1) مجموعۂ مراثی (2) مجموعۂ حکایات (3) قصۂ مہر و ماہ (4) قصۂ لیلیٰ مجنوں کا دیباچہ (5) دیوان غزلیات (6) تذکرہ شعرائے اُردو۔ اس تذکرے کا نام انہوں نے ''گلشن ہند'' رکھا تھا۔ لیکن چوں کہ یہ شائع نہیں ہوا اس لیے مرزا علی لطف نے اپنے تذکرے کا نام بھی ''گلشن ہند'' رکھا۔ میر امن کی طرح حیدری کا بھی سنہ وفات نہیں ملتا۔

9.5.3 میر شیر علی افسوس:

حیدر بخش حیدری کی طرح میر شیر علی افسوس بھی فورٹ ولیم کالج کے بہت ہی مشہور و معروف مصنفین میں سے ہیں۔ افسوس کے دادا محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان آئے اور نواب عمدۃ الملک کے ملازم ہوئے۔ افسوس دہلی میں 1735ء میں پیدا ہوئے۔ نواب کے انتقال کے بعد افسوس کے والد پٹنہ گئے اور بعد میں اودھ پہنچ کر وہاں کی سرکار میں ملازمت کی۔ اس کے بعد حیدرآباد آئے اور یہیں انتقال کیا۔ افسوس اودھ کے قیام کے زمانے میں لکھنؤ کے ایک نواب کے لڑکے کے اتالیق مقرر ہوئے۔ لکھنؤ میں اس زمانے میں اُردو کے چوٹی کے شعرا میر تقی میرؔ، مرزا رفیع سوداؔ، مصحفیؔ، انشاؔ اور جراتؔ کے علاوہ بہت سے شاعر جمع تھے۔ افسوس کو لکھنؤ کے کئی بڑے بڑے امرا کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ لکھنؤ جب اجڑنے لگا تو افسوس نے شاعری کا شغل ترک کیا اور درس و تدریس سے وابستہ ہوئے۔ جب فورٹ ولیم کالج میں لائق اور قابل منشیوں کی ضرورت پیش آئی تو ایک نواب نے ایک انگریز کرنل سے افسوس کی سفارش کی اور وہ فورٹ ولیم کالج میں دو سو روپے ماہوار پر ملازم ہوئے۔ فورٹ ولیم کالج میں تصنیف و تالیف میں مصروف رہنے کے بعد 1805ء میں وفات پائی۔

افسوسؔ نے اپنا ''دیوان'' لکھنؤ میں ترتیب دیا تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اشاعت کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہونے کے بعد عمل میں آئی۔ کیوں کہ آنحضرت ﷺ کے قصائد کے بعد نواب آصف الدولہ اور مارکوئس ویلزلی گورنر جنرل ہند کی مدح میں قصیدہ ہے۔ لیکن افسوس کا شاہکار ان کی کتاب ''باغ اُردو'' ہے۔ یہ شہرۂ آفاق کتاب ''گلستان'' سعدی کا ترجمہ ہے۔ گلستان کا یہ ترجمہ ڈاکٹر گل کرسٹ کی فرمائش پر کیا گیا تھا۔ افسوسؔ کے ترجمے کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ سعدی کی ''گلستان'' کا ترجمہ کرنے کے بعد افسوسؔ سے دوسروں کی ترجمہ کردہ کتابوں پر نظر ثانی اور تصحیح کا کام لیا گیا۔ اس کے علاوہ فورٹ ولیم کالج نے بعض بڑے اُردو شاعروں کے کلام کا انتخاب بھی شائع کیا تھا۔ اس کام میں بھی افسوس شریک رہے۔ کلیات سودا کا انتخاب افسوس اور دوسروں نے کیا اور سودا نے ہر صنف سخن میں جو کچھ کہا ہے اس کا بہترین نمونہ اس انتخاب میں پیش کیا گیا ہے۔ ''باغ اُردو'' کے بعد افسوس کا دوسرا اہم کارنامہ ''آرائش محفل'' ہے۔ منشی سبحان نے ہندوستان کی بہت ہی معتبر اور مستند تاریخ ''خلاصۃ التواریخ'' کے نام سے فارسی میں لکھی تھی۔ اسی تاریخ کو افسوس نے ''آرائش محفل'' کے نام سے اُردو میں منتقل کیا۔ اس کی زبان بہت سلیس وصاف ہے۔

9.5.4 میر بہادر علی حسینی:

میر بہادر علی حسینی کے حالات بھی پردۂ اخفاء میں ہیں۔ ان کے والد سید عبداللہ کاظم تھے۔ حضرت شاہ عبدالقادر نے جو قرآن شریف کا پہلا اُردو ترجمہ کیا اس کا اہتمام کرنے میں اور اس کی اشاعت کے سلسلے میں سید عبداللہ کاظم نے بہت کام کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہادر علی حسینی دہلی

ہی کے باشندے تھے۔ میر بہادر علی، میر امن سے پہلے فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہو گئے تھے۔ میر امن ہی کے ذریعہ فورٹ ولیم کالج پہنچے۔ میر بہادر علی نے فورٹ ولیم کالج کے لیے چار کتابیں لکھیں اور دوسری کتابوں کے لکھنے میں ڈاکٹر گل کرسٹ کی مدد کی۔

بہادر علی حسینی نے ''نثر بے نظیر'' کے عنوان سے سحر البیان کے قصے کو نثر میں لکھا۔ گل کرسٹ نے یہ کام اس لیے کروایا کہ اُردو سیکھنے والے انگریز پہلے اس قصے سے واقف ہو جائیں اور پھر ''سحر البیان'' پڑھیں تو اس مثنوی کو سمجھنے میں انہیں سہولت ہوگی۔ اسی وجہ سے مثنوی سحر البیان کے ساتھ اس کو شائع کیا گیا۔ بعد میں اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ میر بہادر علی حسینی کی دوسری کتاب ''اخلاق ہندی'' ہے۔ یہ کتاب سنسکرت کی کتاب ''ہنو پادیشا'' کے فارسی ترجمے کا اُردو ترجمہ ہے۔ فارسی میں اس کے دو تین ترجمے ہوئے تھے۔ یہ اُردو ترجمہ فارسی ترجمے ''مفرح القلوب'' سے کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر گل کرسٹ نے ''بیاض ہندی'' میں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کے اقتباسات شائع کیے تھے۔ اس میں ''اخلاق ہندی'' کا ایک طویل اقتباس شائع کیا تھا۔ بعد میں پوری کتاب شائع کی گئی۔ اس کتاب کی زبان و بیان میں کوئی خاص دلکشی نہیں ہے۔ حسینی کا تیسرا کارنامہ ''تاریخِ آسام'' ہے۔ شہاب الدین کھاش ابن ولی محمد نے فارسی میں جو ''تاریخ آسام'' لکھی تھی یہ اسی کا اُردو ترجمہ ہے۔ بہادر علی کی تاریخ کا کوئی نسخہ نہیں ملتا۔ گل کرسٹ نے لکھا ہے کہ فرانسیسی میں اس کا ترجمہ ہوا تھا۔ حسینی کی چوتھی کتاب ''رسالہ گرسٹ'' ہے۔ یہ کتاب گل کرسٹ کی کتاب ''ہندوستانی صرف ونحو'' کی تلخیص ہے گل کرسٹ نے اُردو زبان کی قواعد اور صرف ونحو کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک مبسوط کتاب ''ہندوستانی صرف ونحو'' کے نام سے مرتب کی تھی۔ یہ نصاب میں تو داخل تھی لیکن اس کی ضخامت کی وجہ سے اُردو سیکھنے والوں کو مشکل پیش آئی تھی۔ اس لیے گل کرسٹ نے اس کا خلاصہ مرتب کروایا۔ انگریزوں نے اُردو قواعد کو مرتب کرنے کا کام اس لیے کیا کہ اُردو قواعد کی کتابیں اس زمانے میں لکھی ہی نہیں گئی تھیں۔ گل کرسٹ کی کتاب ضخیم ہونے کی وجہ سے اور اس کی مانگ بھی نہ ہونے کی وجہ سے اس کو دوبارہ شائع کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس وجہ سے وہ کتاب کم یاب ہوتے ہوئے نایاب ہو گئی اور اس کی جگہ حسینی کے ''رسالہ گل کرسٹ'' نے لے لی۔ اُردو ادب میں چوں کہ تلمیحات کے سلسلے میں اور یوں بھی قرآن شریف کے حوالے آتے ہیں۔ گل کرسٹ نے قرآن شریف کے ترجمے کا کام بھی شروع کروایا تھا اس کام کے لیے بہادر علی حسینی اور مولوی عنایت اللہ کو مقرر کیا گیا بعد میں کاظم علی جوان اور دوسرے علما اس کام میں شریک ہو گئے۔ گل کرسٹ کے قیام تک یعنی 1804ء تک یہ کام برابر ہوتا رہا لیکن جب گل کرسٹ کو خرابی صحت کی بنا پر اپنے وطن انگلستان لوٹنا پڑا تو یہ کام ہمیشہ کے لیے ادھورا رہ گیا۔

9.5.5 مرزا علی لطف:

مرزا علی لطف اپنے تذکرہ ''گلشن ہند'' کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔ نثر میں ان کا یہی ایک کارنامہ ہے۔ مرزا علی نام تھا اور لطف تخلص۔ لطف کے ''تذکرہ گلشن ہند'' کو مولوی عبداللہ خاں سابق منتظم کتب خانۂ آصفیہ نے حیدرآباد میں شائع کیا۔ ان کے والد کاظم بیگ خاں فارسی کے شاعر تھے۔ لطف کے آباواجداد استرآباد سے نادرشاہ کے ساتھ دہلی آئے اور مستقل طور پر یہیں کے ہو رہے۔ لطف دہلی ہی میں پیدا ہوئے۔ وہ دہلی کی تباہی تک وہاں رہے اور پھر وہاں سے نکلے۔ اس زمانے میں لکھنؤ اور حیدرآباد ایسے مقامات تھے جہاں کا رخ اہل علم وفن کیا کرتے تھے۔ لطف کو اس بات کی توقع نہیں تھی کہ لکھنؤ میں فکر روزگار سے آزاد رہ سکیں گے۔ اس لیے انہوں نے حیدرآباد جانے کا ارادہ کر لیا۔ وہ چند روز عظیم آباد اور پٹنہ میں رکتے ہوئے دکن آنا چاہتے تھے۔ لیکن جب کلکتہ پہنچے تو ڈاکٹر گل کرسٹ سے ملاقات ہوئی اور یوں فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہو کر اپنا مشہور اور معروف تذکرہ ''گلشن ہند'' لکھا۔ یہ تذکرہ مکمل کرنے کے بعد وہ حیدرآباد آئے۔ یہاں ان کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ اس زمانے کے ممتاز دکنی شاعر

شیر محمد خان ایمان کی وجہ سے سرکار عالی سے چار سو روپیہ ماہوار وظیفہ اور ایک پالکی عنایت ہوئی۔اعظم الامرا نے ان کی لطیفہ گوئی سے محظوظ ہو کر انہیں اپنے مصاحبین میں شامل کیا اور ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر کر دی۔انہوں نے ایک قصیدہ لکھ کر ارسطو جاہ کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ارسطو جاہ مدارالمہام کے جلیل القدر عہدے پر فائز ہوئے اور جب ان کا انتقال ہوا تو سر سالار جنگ اول کے جدامجد میر عالم اس عہدے سے سرفراز ہوئے۔ لطف نے ان کی مدح میں قصیدے لکھ کر ان کے دربار میں بھی باریابی حاصل کر لی۔لطف کا انتقال 1822ء میں حیدر آباد میں ہوا۔

لطف نے اپنا ایک کلیات بھی مرتب کیا تھا،لیکن وہ اب ناپید ہے البتہ اس کلیات کا انتخاب ''دیوان منتخب'' کے نام سے تاج پریس حیدر آباد نے شائع کیا تھا۔لطف کا شمار اُردو کے بڑے شاعروں میں نہیں ہوتا۔اصل میں ان کی تمام تر شہرت ''گلشن ہند'' کی وجہ سے ہے۔ڈاکٹر گل کرسٹ کی فرمائش پر انہوں نے اپنا تذکرہ مرتب کیا۔دراصل یہ علی ابراہیم خان کے فارسی تذکرہ ''گلزار ابراہیم'' سے ماخوذ ہے۔ڈاکٹر گل کرسٹ کے کہنے پر انہوں نے اس فارسی تذکرہ کو سامنے رکھ کر اپنا تذکرہ مرتب کیا ہے۔تذکرہ کی زبان سلیس اور سادہ نہیں ہے۔اس کی عبارت مقفیٰ اور مسجع ہے لیکن اس تذکرہ کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے بہت سی باتیں ایسی لکھی تھیں جو اس زمانے کے تذکروں میں عام طور پر نہیں ملتیں جیسا کہ انہوں نے شعرا کے حالات ہی بیان نہیں کیے ہیں بلکہ اس دور کے ماحول اور پس منظر کو بھی پیش کیا ہے۔عام تذکروں کے مقابلے میں شعرا کے حالات بھی زیادہ مفصل طور پر پیش کیے ہیں۔میر حسن کی مثنوی ''گلزار ارم'' کے اقتباسات انہوں نے دیے ہیں ورنہ یہ مثنوی اس زمانے میں کہیں نہیں ملتی تھی۔اسی طرح میر اثر کی مثنوی ''خواب و خیال'' کا تذکرہ تو کیا جاتا تھا لیکن لطف نے اس مثنوی کا بھی ایک حصہ پیش کیا ہے۔ان ہی باتوں کی وجہ سے لطف کے اس تذکرے کو بڑی اہمیت اور شہرت حاصل ہوئی۔

9.5.6 مولوی امانت اللہ:

مولوی امانت اللہ چوں کہ فارسی اور عربی کے جید عالم تھے اس لیے فورٹ ولیم کالج میں انہیں عربی اور فارسی کی کتابوں کے ترجمے پر مامور کیا گیا۔ان کے حالات کی تفصیل بھی نہیں ملتی۔مولوی امانت اللہ کی پانچ کتابیں ملتی ہیں۔(1) ہدایت الاسلام (عربی) (2) ہدایت الاسلام (اُردو) (3) جامع الاخلاق (4) صرف اُردو منظوم (5) ترجمۂ قرآن مجید۔

مولوی امانت اللہ نے ''ہدایت الاسلام'' کے عنوان سے عربی میں کتاب لکھی تھی۔یہ بہت ضخیم کتاب تھی اور عربی جاننے والے بھی کافی کم ہو چکے تھے۔ادھر فورٹ ولیم کالج قائم ہو گیا تھا اُردو انشا پردازوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا۔ان تمام باتوں کے پیش نظر مولوی امانت نے اپنی کتاب ہدایت الاسلام کو اُردو میں منتقل کیا اور گل کرسٹ کو پیش کیا۔گل کرسٹ ان کے علم و فضل سے متاثر ہوئے اور انہیں عربی اور فارسی کی ادق کتابوں کے ترجمہ کے لیے کالج میں مامور کیا۔ہدایت الاسلام (عربی) کو مولوی امانت نے دو حصوں میں تقسیم کیا۔ہدایت اور اسلام (اُردو) کی پہلی جلد ڈاکٹر گل کرسٹ کی وجہ سے کالج کی جانب سے شائع ہوئی۔ڈاکٹر گل کرسٹ نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ہدایت الاسلام کی دوسری جلد کا بھی جب مولوی امانت نے ترجمہ کر لیا تو انہیں اور میر بہادر علی حسینی کو قرآن شریف کے ترجمے کا کام سونپا گیا لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد گل کرسٹ کو خرابی صحت کی بنا پر وظیفۂ حسن خدمت پر کالج کی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہونا پڑا۔اور ہدایت الاسلام کی دوسری جلد اور قرآن شریف کا ترجمہ کالج کی طرف سے شائع نہیں ہو سکے لیکن مولوی امانت نے اپنے طور پر اس کا ترجمہ کیا اور یہ ترجمہ اور ہدایت الاسلام کی دوسری جلد کسی اور نے شائع کی۔گل کرسٹ کے جانے کے بعد کپتان جیمس مونٹ ان کی جگہ اُردو کے پروفیسر ہوئے۔انہوں نے فارسی کی مشہور و معروف کتاب ''اخلاق جلالی'' کے ترجمے کا کام

مولوی امانت اللہ کوسونپا۔مولوی امانت نے اخلاق جلالی کا ترجمہ جامع الاخلاق کے عنوان سے کیا۔ یہ مولوی امانت اللہ کا بڑا ہی گراں قدر کارنامہ ہے کیوں کہ ''اخلاق جلالی'' حد سے زیادہ ادق کتاب ہے اوراس کا ترجمہ کرنا لوہے کے چنے چبانے سے کم نہ تھا۔لیکن مولوی امانت نے اپنے علم وفضل اور محنت شاقہ سے اس کام کو پائے تکمیل تک پہنچایا۔ یہ کتاب اُردو میں بھی دقیق اور مشکل ہے۔مولوی امانت اللہ کی آخری تصنیف ''صرفِ اُردو منظوم'' ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ اُردو کی منظوم قواعد ہے۔

9.5.7 مظہر علی خاں ولا:

مظہر علی خان ولا کے حالات بھی نہیں ملتے۔مظہر علی خان کا تخلص ولا تھا۔انہوں نے ممنون، مرزا جان طپش اور غلام ہمدانی مصحفی سے مشورۂ سخن کیا۔ وہ ہندی اور سنسکرت سے بھی واقف تھے۔ ولا نے کوئی سات کتابوں کا ترجمہ کیا لیکن صرف دو ایک کتابیں ہی ان کی شائع ہوئیں۔(1) ''مادھونل اور کام کندلا'' یہ کتاب ہندی سے اُردو میں نقل کی گئی ہے۔ یہ ایک برہمن مادھونل اور ایک رقاصہ کام کندلا کی داستان عشق ہے۔(2) ترجمۂ کریما: سعدی شیرازی کے مشہور پند نامہ ''کریما'' کو ولا نے اُردو میں منظوم منتقل کیا۔ یہ بہت اچھا ترجمہ ہے (3) ہفت گلشن: ناصر علی خان واسطی بلگرامی نے یہ کتاب فارسی میں لکھی تھی۔ ولا نے اسی نام سے اسے اُردو میں منتقل کیا۔اس کتاب کے ذریعہ تہذیب اور اخلاق کے قاعدے بیان کیے گئے ہیں اور نصیحت آموز کہانیاں اور حکایتیں بھی بیان کی گئی ہیں۔(4) ڈاکٹر گل کرسٹ کی نگرانی میں ولا نے ''اخلاق ہندی'' لکھی۔اس میں اخلاقی اسباق اور حکایات ملتی ہیں۔(5) بیتال پچیسی: ولا کا مشہور کارنامہ بیتال پچیسی ہے۔ یہ کتاب سنسکرت میں لکھی گئی تھی۔ برج بھاشا میں اس کا ترجمہ ہوا۔ برج بھاشا سے ولا نے اس کو اُردو میں منتقل کیا۔ بیتال نامی ایک شخص پچیس کہانیاں بیان کرتا ہے۔ بیتال ایک مردہ ہے جس کو ایک جوگی نے بھوت بنا دیا ہے۔ یہ بھوت ہی کہانیاں بیان کرتا ہے۔للولال کوی نے اس ترجمے میں ولا کی مدد کی تھی۔ بیتال پچیسی میں اس کثرت سے ہندی الفاظ استعمال ہوئے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے ہندی کتاب کو اُردو رسم الخط میں پیش کیا گیا ہے۔(6) تاریخ شیر شاہی: یہ شیر شاہ سوری کے عہد کی تاریخ ہے۔ یہ فارسی سے کپتان جیمس مونٹ کی فرمائش پر اُردو میں منتقل کی گئی ہے۔ یہ ولا کا ایک اہم کارنامہ ہے۔گارساں وتاسی نے اس کا ترجمہ فرانسیسی میں کیا تھا۔لیکن یہ شائع نہیں ہوئی۔(7) جہانگیر نامہ: گارساں وتاسی نے لکھا ہے کہ ولا نے ''تزک جہانگیری'' کے ایک حصے کا ترجمہ ''جہانگیر نامہ'' کے عنوان سے کیا تھا۔ولا کی یہ کتاب کہیں نہیں ملتی۔

9.5.8 مرزا جان طپش:

مرزا جان طپش گوخود فورٹ ولیم کالج کے باقاعدہ منشیوں اور اہل قلم میں شامل نہیں تھےلیکن وہ فورٹ ولیم کالج کے لیے کام کرتے تھے۔ دوسرے مترجمین کی کتابوں پر نظر ثانی اور اساتذہ قدیم کے کلام کا انتخاب وہ کیا کرتے تھے۔شاعر کی حیثیت سے بھی وہ ایک مقام رکھتے تھے۔طپش کے آباواجداد بخارا سے ہندوستان آئے طپش دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہ سنسکرت بھی جانتے تھے۔ان کا کلیات کالج کی جانب سے شائع ہوا۔مختلف تذکرہ نگاروں نے انہیں کہنہ مشق اور اچھا شاعر قرار دیا ہےاوران کے کلام میں زبان کی صفائی، فصاحت اور مضامین کی تازگی کی تعریف کی ہے۔کالج نے ان کی ''شاعرانہ'' قابلیت کے اعتراف میں گراں قدر صلہ دیا۔طپش کی یادگاران کی گراں قدر کتاب ''شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان'' ہے۔ اس کتاب میں اُردو محاورات اور روزمرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب ڈھاکہ کے ایک رئیس کے ایما پر لکھی گئی۔اس میں قواعد زبان سے بھی بحث کی گئی ہے۔اس میں 275 محاورات کی تشریح کی گئی ہے۔اور ہر محاورہ کی سند میں اساتذہ کا کوئی شعر پیش کیا گیا ہے۔طپش نے سند میں دکنی اساتذہ جیسے

ولی، سراج، غربت اور دوسرے شعرا کے اشعار بھی دیے ہیں۔ ''بہادر دانش'' کے عنوان سے طپش نے میر حسن کی سحرالبیان کے طرز پر ایک طویل مثنوی لکھی ہے۔ یہ طپش کا شاہکار ہے۔ انہوں نے ہر لحاظ سے میر حسن کی تقلید کی ہے۔ طپش نے ممکنہ حد تک اپنی مثنوی میں وہ تمام خوبیاں پیدا کی ہیں جو سحرالبیان میں ملتی ہیں۔ یہ مثنوی سب سے پہلے کالج کی جانب سے شائع ہوئی طپش سے ''یوسف زلیخا'' بھی منسوب کی جاتی ہے۔ فارسی کے مشہور قصے یوسف زلیخا کو طپش نے اُردو میں منظوم کیا ہے۔ لیکن یہ نا پید ہے۔

9.5.9 میر کاظم علی جوان:

میر کاظم علی نام اور جوان تخلص تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے مشہور منشیوں میں تھے۔ دہلی کے رہنے والے تھے لیکن جب دلی پر تباہی آئی تو یہ بھی اوروں کی طرح دلی کو خیر باد کہنے پر مجبور ہوگئے۔ مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے اور وہاں ایک عرصہ گزارنے کے بعد مشہور شعرا میں شمار ہونے لگے۔ کاظم علی، جوان عربی، فارسی کے علاوہ برج بھاشا سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ لکھنؤ کا ریزیڈنٹ کرنل اسکاٹ ان کی علمی قابلیت سے متاثر ہوا اور فورٹ ولیم کالج کے لیے ان کی سفارش کی۔ کالج سے وابستہ ہونے کے بعد کلکتہ ہی کے ہو رہے اور تمام عمر تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ جوان کی تین کتابیں ملتی ہیں۔ شکنتلا ناٹک: گل کرسٹ کے کہنے پر شہرۂ آفاق ڈرامہ ''شکنتلا'' کو ہندی سے اُردو میں منتقل کیا۔ لیکن وہ زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوا۔ گل کرسٹ نے اپنی ''بیاض ہندی'' میں اس کا ایک طویل اقتباس شائع کیا۔ ''شکنتلا'' کالی داس نے سنسکرت میں لکھا تھا۔ لیکن ہندی میں بھی اس کے کئی ترجمے ہوئے۔ جوان نے ہندی سے اُردو میں منتقل کیا۔ اس ڈرامے کے ترجمے میں للولال کوی نے کاظم علی جوان کی مدد کی۔ کاظم علی کا دوسرا کارنامہ ''بارہ ماسہ'' یا ''دستور ہند'' ہے۔ سال کے بارہ مہینوں میں ہندو اور مسلمان جو جو تیوہار یا عید کرتے ہیں ان کی ساری تفصیل جزئیات سمیت اس مثنوی میں پیش کی گئی ہے۔ ''بارہ ماسہ'' لکھنے کے بعد جوان قرآن مجید کے ترجمے کے کام میں لگ گئے لیکن جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے ڈاکٹر گل کرسٹ کے انگلستان چلے جانے کے بعد یہ کام ان کے جانشینوں کی بے التفاتی کا شکار ہو گیا۔ جوان کی تیسری کتاب ''تاریخ فرشتہ'' ہے۔ اس تاریخ کے ایک بڑے حصے کا ترجمہ جو سلاطین بہمنی کے تعلق سے ہے، جوان نے کیا تھا۔ ان کتابوں کے علاوہ جوان نے شعرائے اُردو کے کلام کے انتخاب کا کام دوسرے مولفین کے ساتھ انجام دیا جیسے کلیات میر کا انتخاب، کاظم علی کے ساتھ مولوی محمد اسلم، منشی غلام قادر اور مرزا جان طپش نے کیا۔ کلیات سودا کا انتخاب کاظم علی نے شیر علی افسوس کے ساتھ کیا۔ یہ انتخاب بہت اچھے ہیں اور سلیقے سے چھپے ہوئے ہیں۔ جوان نے ''سنگھاسن بتیسی'' کے ترجمے میں للولال کوی کی مدد کی۔ اسی طرح حفیظ الدین کی کتاب ''خرد افروز'' پر نظر ثانی کی۔ دوسری کئی کتابوں کی ترتیب و اشاعت میں بھی جوان نے حصہ لیا۔

9.5.10 شیخ حفیظ الدین:

شیخ حفیظ الدین احمد کے جد اعلیٰ نے عرب سے دکن میں بود و باش اختیار کی۔ حفیظ الدین کے دادا دکن سے بنگال میں مستقل سکونت اختیار کی۔ وارن ہسٹنگز گورنر جنرل ہند نے کلکتہ میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا جو نیٹو کالج کہلاتا تھا۔ حفیظ الدین کے والد وہاں مدرس ہوگئے۔ والد نے ان کی تربیت پر شخصی طور پر توجہ کی۔ حفیظ الدین نے عربی فارسی میں بہت اعلیٰ قابلیت پیدا کی۔ جب فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو ان کی قابلیت کے مدنظر ان کو کالج میں عربی و فارسی کا استاد مقرر کیا گیا۔ ڈاکٹر جان گل کرسٹ نے درس و تدریس کے ساتھ ترجمے کا کام بھی سپرد کیا۔ فارسی کی مشہور کتاب ''عیار دانش'' کو انہوں نے ''فرد افروز'' کے نام سے اُردو میں منتقل کیا۔ ''عیار دانش'' اصل میں کلیلہ دمنہ کا قصہ ہے جس کو فارسی میں کئی لوگوں نے

لکھا۔ ملاحسینی الواعظ کاشفی نے اسے ''انوار سہیلی'' کے نام سے فارسی میں منتقل کیا تھا۔ اسی قصے کو علامہ ابوالفصل نے ''عیار دانش'' کے نام سے لکھا۔ ''خرد افروز'' کو ڈاکٹر گل کرسٹ نے اپنی ''بیاض ہندی'' میں شامل کر کے شائع کیا۔ پوری کتاب بعد میں شائع ہوئی۔ اس کے کئی ایڈیشن نکلے۔ انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ ہوا۔

9.5.11 خلیل خاں اشک:

خلیل علی خان اشک کی کتاب ''قصہ امیر حمزہ'' بے حد مشہور و معروف کتاب ہے لیکن خود اس کا مصنف بڑی حد تک گم نامی میں رہا ہے۔ ''داستان امیر حمزہ'' صد ہا بلکہ ہزاروں صفحات پر مشتمل ہے۔ اشک کی زندگی کے بارے میں کہیں سے بھی مواد نہیں ملتا۔ خود اشک نے بھی اپنے بارے میں کہیں بھی کچھ نہیں لکھا ہے۔ ''داستان امیر حمزہ'' فارسی میں لکھی گئی تھی لیکن اس کا حقیقی مصنف کون تھا۔ یہ بات صحیح طور پر معلوم نہیں ہے۔ سید محمد لکھتے ہیں:

> ''ہمارے پیش نظر جو نسخہ ہے اس میں اشک نے لکھا ہے کہ یہ قصہ سلطان محمود غزنوی (998ء تا 1030ء) کے خوش کرنے اور اس فاتح اعظم کو ملک گیری و کشور کشائی کے لیے آمادہ و تیار رکھنے کے لیے کئی ایک راویوں اور داستان گو یوں نے چودہ جلدوں میں تصنیف کیا'' (ارباب نثر اُردو 502)

اسی طرح ایک اور جگہ خود اشک نے اسے ملا جلال ملخی سے منسوب کیا ہے۔ برٹش میوزیم میں جو نسخہ ہے اس میں شاہ ناصر الدین احمد کو اس کا مصنف بتایا گیا ہے۔ بعضوں کے نزدیک یہ فیضی کے تخلیقی دماغ کی اختراع ہے۔ یہ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سب سے پہلے فارسی میں لکھا گیا یا عربی میں۔ اشک اور دوسرے مولفین کے جو نسخے ملتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے اصل فارسی کتاب اتنی طویل نہیں تھی۔ بعد کے اہل قلم نے اس میں مسلسل اضافے کیے ہیں۔ ''داستان امیر حمزہ'' کو سب سے پہلے صاف اور سلیس زبان میں خلیل خان اشک نے لکھا ہے۔ زبان میں یہ اہتمام اس لیے بھی ضروری تھا کہ یہ کتاب نو آموزان اُردو کے لیے لکھی گئی تھی۔ اشک کے سوا جن لوگوں نے بھی اس داستان کو لکھا اس کی زبان اتنی زیادہ صاف و سلیس نہیں تھی۔ حافظ سید عبداللہ بلگرامی نے بھی اس کو لکھا تھا۔ یہ بہت مقبول ہوا اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ بعد میں سید تصدق حسین نے بھی اس کو لکھا چوں کہ وہ عربی اور فارسی کے بڑے عالم تھے اس لیے ان کی زبان پر عربی اور فارسی کا گہرا اثر ہے۔ پھر یہ کہ انہوں نے ''فسانہ عجائب'' کی جیسی مقفیٰ و مسجع زبان بڑے افتخار کے ساتھ استعمال کی ہے۔ اس لیے اشک کی داستان امیر حمزہ اپنی زبان کی صفائی اور سلاست کے اعتبار سے دوسری داستانوں سے ممتاز اور منفرد ہے۔ اس داستان کے علاوہ اشک کا دوسرا کارنامہ ''واقعات اکبر'' ہے کپتان ولیم ٹیلر کے کہنے پر اشک نے ابوالفضل کی مشہور کتاب ''اکبر نامہ'' کا اُردو میں واقعات اکبر کے نام سے ترجمہ کیا لیکن یہ کتاب شائع نہیں ہوئی اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اب کہیں محفوظ بھی ہے یا نہیں۔ خلیل علی خان کا تخلص اشک تھا اور وہ شاعر بھی تھے لیکن ان کا کلام محفوظ نہیں ہے اور داستان میں ان کے جو چند ایک اشعار مل جاتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ معمولی درجے کے شاعر تھے۔

9.5.12 مولوی اکرام علی:

مولوی اکرام علی گل کرسٹ کے انگلستان لوٹنے کے بعد فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے۔ کپتان جان ولیم ٹیلر کی ایما پر انہوں نے رسائل اخوان الصفا' میں سے کئی ایک رسالوں کا ترجمہ عربی سے اُردو میں کیا۔ اخوان الصفا بصرہ کی ایک مشہور علمی انجمن تھی۔ کوئی دس اہل علم اور اہل قلم افراد

اس انجمن کے ممبر تھے۔ان ہی کی تحقیق اور علمی موشگافیوں کا نتیجہ اخوان الصفا کے اکیاون رسالے ہیں۔ان رسالوں میں بہت ہی انوکھے لیکن دلچسپ موضوعات پر بحثیں کی گئی ہیں۔اکرام علی نے جس رسالے کا ترجمہ کیا ہے اس کا موضوع انسان کے اشرف المخلوقات ہونے سے متعلق ہے۔ مولوی اکرام علی کم نام آدمی تھے ان کے تعلق سے کہیں سے بھی کوئی معلومات حاصل نہیں ہوئیں۔اس کے سوا مولوی اکرام علی کی کوئی کتاب نہیں ملتی۔

9.5.13 نہال چند لاہوری:

نہال چند لاہوری فورٹ ولیم کالج کے ایک مشہور منشی تھے۔ان کے حالات زندگی بھی پردۂ اخفا میں ہیں۔آبا و اجداد دہلی کے تھے۔دلی کی تباہی کے بعد لاہور میں بود و باش اختیار کی۔ایک انگریز کپتان کی وساطت سے ڈاکٹر گل کرسٹ کے ہاں پہنچے۔اور فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ تالیف و ترجمہ میں انہیں ملازم رکھ لیا گیا۔نہال چند لاہوری کا صرف ایک ہی کارنامہ ''مذہب عشق'' ملتا ہے۔تاج الملوک اور بکاولی کا قصہ فارسی میں لکھا گیا ہے۔اسی قصے کو نہال چند لاہوری نے ''مذہب عشق'' کے نام سے اُردو میں منتقل کیا ہے۔اس قصہ کو شیخ عزت اللہ بنگالی نے فارسی میں لکھا تھا۔اس قصہ کو اس زمانے بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔اس لیے اسے اُردو میں منتقل کرنے کے لیے گل کرسٹ نے کہا ''مذہب عشق'' اس کا تاریخی نام ہے جس سے 1270ء نکلتا ہے۔اس قصے کے اب تک بیسیوں ایڈیشن نکل چکے ہیں۔اس کی مقبولیت کو دیکھ کر دیا شنکر نسیم نے ''گلزار نسیم'' کے نام سے اس کو نظم کا جامہ پہنایا۔''مذہب عشق'' کی زبان و بیان پر فارسی کا اثر ہے اور سادگی و سلاست کم ہے۔

9.5.14 منشی بینی نارائن جہاں:

منشی بینی نارائن جہاں فورٹ ولیم کالج کے غیر معروف مولفین میں سے ہیں۔بینی نارائن شاعر تھے اور جہاں ان کا تخلص تھا۔بینی نارائن لاہور کے رہنے والے تھے۔گو وہ امیر گھرانے سے تعلق رکھتے تھے لیکن گردش زمانہ نے ان کو بدحال اور تنگ دست کر دیا تھا۔تلاش روزگار میں ہندوستان کے مختلف شہروں میں گھومتے رہے۔فورٹ ولیم کالج کے قیام کی خبر سنی اور قسمت آزمانے وہاں گئے لیکن کوئی بارہ سال تک انہیں کالج میں ملازمت نہیں ملی۔ کپتان ٹامس روبک کے زمانے میں حیدر بخش حیدری کی سفارش سے کالج میں ملازمت ملی۔کالج میں آنے کے بعد انہوں نے دو کتابیں (1) چار گلشن اور (2) تذکرہ دیوان جہاں لکھیں، گارساں وتاسی کی اطلاع کے مطابق انہوں نے ''تنبیہ الغافلین'' کا ترجمہ کیا تھا۔گارساں وتاسی نے جہاں کے تعلق سے یہ بھی کہا ہے کہ وہ مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔''تنبیہ الغافلین'' کے ترجمے سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ان کی کتابیں زیر طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکیں۔''تذکرہ دیوان جہاں'' بہت اہم تذکرہ ہے اس اعتبار سے کہ یہ شعرا کا تذکرہ ہے لیکن اس میں ایسے شاعروں کا تذکرہ شامل ہے جن کا شاعری میں تو بلند درجہ نہیں ہے نثر نویسی میں البتہ ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔''چار گلشن'' بینی نارائن کی وہ تالیف ہے جس میں ایک عشقیہ قصے کو پیش کیا گیا ہے۔یہ قصہ بینی نارائن نے فورٹ ولیم سے وابستہ ہونے سے پہلے لکھ لیا تھا۔جب یہ قصہ کپتان ٹامس روبک اور کپتان ولیم ٹیلر کو دکھایا گیا تو انہوں نے اسے پسند کیا اور اس کا کافی صلہ بینی نارائن کو دیا گیا۔اس دور کے ایک نثری نمونے کے طور پر اس کتاب کی اہمیت ہے اور ہمیشہ رہے گی۔تذکرہ دیوان جہاں جس کا ذکر پچھلے صفحات پر آ چکا ہے۔اس میں 125 شعرا کا ذکر ہے۔اس کی ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے ہوئی ہے۔اس میں شعرا کا تذکرہ بھی ہے اور جہاں کا دیوان بھی ہے۔بینی نارائن کی تیسری کتاب ''تنبیہ الغافلین'' ہے۔یہ کتاب مولانا رفیع الدین کی کتاب کا اُردو ترجمہ ہے۔

9.5.15 میر عبداللہ مسکین:

میر عبداللہ مسکین فورٹ ولیم کالج کے بہت غیر معروف منشی ہیں۔ سید محمد مصنف ''ارباب نثر اُردو'' کی تحقیق کے مطابق مسکین سودا کے ہم عصر تھے اور مرثیہ گو تھے۔ مسکین گل کرسٹ کے زمانے میں فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہوئے۔ گل کرسٹ کی کتاب ''بیاض ہندی'' میں یہ شریک کار تھے۔ مسکین اپنے زمانے کے مشہور و مقبول مرثیہ گو تھے۔ ان کا مرثیہ جو حضرت مسلم بن عقیل اور آپ کے صاحبزادوں کی شہادت کے بارے میں لکھا گیا ہے بے حد مقبول ہوا۔ اس کی اس مقبولیت کی بنا پر اسے نثر میں بھی لکھا گیا تھا۔ مسکین کے اس مرثیہ کا ترجمہ گارساں وتاسی نے فرانسیسی میں کیا اور شائع کیا تھا۔

9.5.16 للولال کوی:

للولال کوی کو ہندی زبان کے مشہور عالم اور شاعر تھے اور راست طور پر انہوں نے اُردو میں ترجمہ نہیں کیا لیکن جو کتابیں ہندی اور برج بھاشا سے اُردو میں ترجمہ ہوئی تھیں ان میں وہ بہت مدد کرتے تھے۔ ان کی ہندی بھی مشکل اور سنسکرت آمیز نہیں تھی۔ انہوں نے کوئی چھ کتابیں ہندی میں لکھیں (1) پریم ساگر (2) راج نیتی (3) سبھا بلاس (4) مہادیو بلاس (5) لطائف ہندی (6) سنگھاسن بتیسی۔ ان تمام کتابوں میں للولال نے صاف اور سلیس ہندی استعمال کیا ہے۔

9.5.17 مرزا محمد فطرت:

مرزا محمد فطرت، فورٹ ولیم کالج کے بہت ہی گم نام مصنفین میں سے ہیں وہ بہت ہی معمولی درجے کے شاعر تھے۔ ان کا اہم کارنامہ جارج ہاڈلے کی انگریزی میں لکھی کتاب قواعد میں ترمیم واضافہ کرنا ہے۔ جارج ہاڈلے نے 1772ء میں قواعد اُردو، انگریزی لکھ کر شائع کی تھی۔ ہندوستان کی زبان سے واقف ہونے کے لیے ہندوستان آنے والے انگریز اس سے استفادہ کرتے تھے۔ اس وجہ سے اس کتاب کے کئی ایڈیشن خود انگلستان میں شائع ہوئے۔ اور ہر ایڈیشن میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا رہا۔ فطرت کا بھی ترجمہ ایڈیشن 1801ء میں لندن سے شائع ہوا۔ فطرت نے بائبل کا ترجمہ دل ہنٹر کی مدد سے اُردو میں کیا۔

9.5.18 میر محی الدین فیض:

میر محی الدین نام فیض تخلص۔ دہلی کے متوطن تھے۔ اس زمانے میں جب گل کرسٹ اُردو زبان کی تحصیل کے لیے شہر شہر گھوم رہے تھے ان کی ملاقات فیض سے ہوئی اور وہ انہیں کلکتہ لے آئے۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کی فرمائش پر انہوں نے شیخ فریدالدین غفار کے ''پندنامہ'' کا منظوم ترجمہ ''چشمہ فیض'' کے عنوان سے اُردو میں کیا۔ اس کے سوا فیض کی کوئی اور کتاب نہیں ملتی۔

9.5.19 سید حمیدالدین بہاری:

سید حمیدالدین بہاری کے نام کے جزو ''بہاری'' سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہار کے رہنے والے تھے۔ گل کرسٹ کو اُردو ہی سے دلچسپی نہیں تھی بلکہ اس کے کلچر اور اس کی تہذیب سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ اسی وجہ سے جہاں تک ممکن تھا اس نے یہاں کی تہذیبی زندگی کے عناصر کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ اسی لیے اس نے قرآن شریف کے ترجمہ کا کام بھی شروع کروایا تھا۔ اس نے چوں کہ ہندوستان میں آنے کے بعد ہی اسلامی اور ہندوستانی تہذیب کے مختلف عناصر سے انگریزوں کو واقف کروانے کے لیے کام کیا۔ اسی لیے یہاں کی اخلاقیات، قصص و حکایات، تاریخ اور تذکرے کی

کتابوں کے ترجمے کروائے۔اسی سلسلے میں اس نے ہندوستانی کھانوں کے تعلق سے ایک کتاب سید حمید الدین بہاری سے مرتب کروائی۔اس کتاب کا عنوان ''خوان الوان'' ہے۔ یہ کتاب حمید الدین کی تالیف تھی یا ترجمہ یقین کے ساتھ کچھ کہا نہیں جا سکتا کیونکہ اس نام کی کتاب فارسی میں دستیاب نہیں ہوئی ہے۔اس کتاب میں میٹھوں اور کھانوں کے نام ان کے اجزا اور ان کے پکانے کے طریقوں کی ساری تفصیل ملتی ہے۔کتاب کے آخر میں ''مصطلحات طعام خانہ'' کی فرہنگ دی گئی جس سے ان تمام متعلقہ اصطلاحات کی تشریح ہو جاتی ہے جو اس کتاب میں استعمال ہوئی ہیں۔اس کے سوا ان کی کوئی کتاب نہیں ملتی۔

9.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ فورٹ ولیم کالج کا قیام 1800ء میں عمل میں آیا۔اس کو قائم کرنے کا مقصد نو وارد انگریز عہدے داروں کو ہندوستانی زبان اور یہاں کے طور طریقوں سے آشنا کرنا تھا۔

☆ کالج تو قائم ہوا کمپنی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے لیکن اس سے اُردو ادب اور خاص طور پر اُردو نثر کو بے حد فائدہ پہنچا۔فورٹ ولیم کالج میں جو کتابیں لکھی گئیں ان کی نثر سادہ اور سلیس رکھی گئی کیوں کہ یہ انگریزوں کو اُردو سکھانے کے لیے لکھی گئی تھیں۔

☆ اُردو میں جو نثری کتابیں تھیں ان کی نثر نو آموزوں کے لیے بے حد مشکل تھی۔ پہلے تو اس لیے کہ ان میں فارسی اور عربی کے ثقیل الفاظ استعمال کیے گئے تھے۔دوسرے یہ کہ مقفّٰی اور مسجع نثر میں لکھی گئی تھیں۔

☆ چند کتابیں سلیس و سادہ نثر میں تھیں لیکن وہ کتابیں یا رسالے مذہب اسلام کے مسائل اور عقائد کی توضیح اور تشریح کے لیے لکھے گئے تھے۔ اس لیے ان کو بھی نہیں پڑھایا جا سکتا تھا۔

☆ نئی کتابیں لکھوانے کے لیے ایسے ادیبوں کو جمع کرنا جو نئے افسانے' کہانیاں اور حکایتیں جلد از جلد لکھ سکیں ممکن نہ تھا۔اس لیے جو کتابیں فارسی یا اُردو کے علاوہ دوسری ہندوستانی زبانوں میں تھیں ان کا ترجمہ کروایا گیا۔ یہ آسان طریقہ تھا اس لیے فورٹ ولیم کالج میں درس و تدریس کے ساتھ ترجمہ و تالیف کا شعبہ بھی قائم کیا گیا۔

☆ فورٹ ولیم کالج کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُردو نثر کو سادہ' سلیس اور ہر قسم کے مضامین ادا کرنے کے قابل بنایا۔لیکن اس کے باوجود رنگین اور مقفّٰی نثر لکھنے کا رواج ایک مدت تک ختم نہیں ہوا۔

☆ رجب علی بیگ سرور نے فورٹ ولیم کالج کے ختم ہونے کے بعد اپنی کتاب ''فسانۂ عجائب'' لکھی تو میر امن کی کتاب ''باغ و بہار'' پر اعتراض کیا۔

☆ میر امن نے ''باغ و بہار'' کے دیباچہ میں لکھا تھا جب تک کوئی شخص ''دلی روڑا'' بن کر نہ رہے وہ ایسی زبان نہیں لکھ سکتا۔ رجب علی بیگ سرور نے ''فسانۂ عجائب'' میں میر امن پر چوٹ کی۔دلی کے روڑے ہیں محاوروں کے ہاتھ پاؤں توڑے ہیں۔

☆ فورٹ ولیم کالج نے بہر حال سادہ اور سلیس نثر کے نمونے اُردو کو دیے اور اس نثر کی ایسی بنیادیں فراہم کر دیں جس پر آنے والی نسلوں نے موجودہ نثر کی شاندار عمارت کھڑی کر دی۔اُردو نثر سکھانے کے ساتھ ساتھ گل کرسٹ کا یہ بھی منشا تھا کہ ہندوستان آنے والے انگریز یہاں

کے رسم و رواج، طور طریقے، ماحول غرض کہ تہذیب و معاشرت سے بھی واقف ہو جائیں۔

☆ اس وجہ سے فورٹ ولیم کالج میں دلچسپ انداز میں زبان کے ساتھ یہاں کی زندگی سے مجموعی طور پر واقفیت کے لیے قصّے، کہانیوں اور حکایتوں کی کتابوں کے زیادہ سے زیادہ ترجمے کروائے کیونکہ قصے کہانیاں یعنی فکشن کے ذریعہ کسی ملک کے بارے میں جتنی گہری واقفیت ہوسکتی ہے وہ کسی اور ذریعہ سے نہیں ہوسکتی۔

☆ تاریخ اور تذکرے کی کتابیں بھی ترجمہ کی گئیں۔ذیل میں ان کتابوں اور فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی کتابوں کی فہرست دی جارہی ہے۔گل کرسٹ کے زمانۂ قیام یعنی 1800ء سے 1804ء تک فورٹ ولیم کالج میں جتنا اور جیسا کام ہوا اس کے بعد نہیں ہوا۔خود گل کرسٹ نے بہت سی کتابیں لکھیں اور مرتب کیں۔

☆ **گل کرسٹ :** (1)انگریزی ہندوستانی لغت (2)ہندوستانی علم اللسان (3)اُردو کی صرف ونحو (4)مشرقی زبان دان (5)اُردو زبان پر مختصر مقدمہ (6)ہندی کی آسان مشقیں (7)فارسی افعال کا جدید نظریہ (8)اجنبیوں کے لیے رہنمائے اُردو (9)بیاضِ ہندی (10) عملی خاکے (11)ہندی الفاظ کی قرأت (12)اتالیق ہندی (13)ہندی عربی آئینہ (14)مکالمات انگریزی و ہندوستانی (15)مشرقی قصے (16)ہندی داستان گو (یہ تمام کتابیں صرف گل کرسٹ کے زورِ قلم کا نتیجہ نہیں ہیں۔ان کتابوں کی تالیف میں اس نے فورٹ ولیم کالج کے دوسرے اہلِ قلم کی مدد لی ہے۔)

☆ **میر امن :** (1)باغ و بہار (2) گنج خوبی۔

☆ **سید حیدر بخش حیدری :** (1)قصہ مہر و ماہ (2)قصہ لیلیٰ مجنوں (3)طوطا کہانی (4) آرائشِ محفل (داستان)، (5)ہفت پیکر (6) تاریخ نادری (7) گل مغفرت (8) گلزارِ دانش (9) گلدستۂ حیدر (10) تذکرۂ گلشن ہند۔

☆ **میر شیر علی افسوس :** (1)دیوانِ افسوس (2)باغِ اُردو (3) آرائشِ محفل (تاریخ)۔

☆ **میر بہادر علی حسینی :** (1)نثرِ بے نظیر (2)اخلاق ہندی (3) تاریخ آسام (4)رسالہ گل کرسٹ۔

☆ **مرزا علی لطف :** (1) کلیاتِ لطف (2) تذکرۂ گلشن ہند۔

☆ **مولوی امانت اللہ :** (1)ہدایت الاسلام عربی (2)ہدایت الاسلام (اُردو) (3)ترجمہ قرآن مجید (4)جامع الاخلاق (5)صرف اُردو

☆ **مظہر علی خاں ولا :** (1)مادھونل اور کام کندلا (2)ترجمہ کریما (3)ہفت گلشن (4)اتالیق ہندی (5)بیتال پچیسی (6)تاریخِ شیر شاہی (7)جہانگیر نامہ

☆ **مرزا جان طپش :** (1) کلیاتِ گلشن (2) شمس البیان فی مصطلحاتِ ہندوستان (3)بہادر دانش (4)یوسف زلیخا

☆ **کاظم علی جوان :** (1)شکنتلا ناٹک (2)بارہ ماسہ (3) تاریخ فرشتہ۔

☆ **شیخ حفیظ الدین :** (1)خرد افروز

☆ **خلیل علی خان اشک :** (1)قصہ امیر حمزہ (2)اکبر نامہ۔

☆ **مولوی اکرام علی :** (1)اخوان الصفا۔

☆ **نہال چند لاهوری :** (1)مذہب عشق۔

☆ **بینی نارائن جهاں :** (1)چار گلشن (2)دیوان جہاں (3)تنبیہہ الغافلین۔

☆ **سر عبدالله مسکین :** (1)مرثیہ ہائے مسکین۔

☆ **للو لال کوی :** (1)پریم ساگر (2)راج نیتی (3)سبھا بلاس (4)مہادیو بلاس (5)لطائف ہندی (6)سنگھاسن بتیسی۔

☆ **مرزا محمد فطرت :**(1)عہد نامہ جدید۔

☆ **محی الدین فیض :** (1)چشمہ فیض۔

☆ **سید حمید الدین بھاری :** (1)خوان الوان۔

9.7 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
ریاض	:	باغات،سرسبز وشاداب مقامات
فُصحاً	:	خوش گفتار لوگ
نوشت وخواند	:	لکھنا پڑھنا
مبسوط	:	پھیلی ہوئی وسیع
مرصع	:	نگینوں اور جواہر سے جڑا ہوا،مناسب یا موزوں الفاظ کی نظم یا نثر جس میں الفاظ نگینوں کی طرح جڑے ہوں
ماہ نیم ماہ	:	آدھے مہینے کا چاند، چودھویں کا چاند
لسان	:	زبان، بولی
مہر نیم روز	:	آدھے روز کا چاند، دوپہر کا سورج، پوری بلندی پر رہنے والا سورج
خریطہ	:	لفافہ، تھیلا
علم نباتات	:	وہ علم جس میں نباتات (پودے یا درخت) کے حالات معلوم ہوں
علم کیمیا	:	وہ علم جس سے کیمیا (دھات، گیس، اکسیر) کے بارت میں معلومات حاصل ہو
علم نجوم	:	ستاروں اور سیاروں کا علم
مطلع کرنا	:	اطلاع دینا، خبر پہنچانا
صادر	:	جاری کرنا، نافذ کرنا
ہیچ	:	معدوم، قابل تذلیل، ناکارہ
ضعیفی	:	بڑھاپا

علالت	:	بیماری
تاریخی نام	:	ایسا نام جس کے حروف سے ابجد کے قاعدے سے تاریخ نکلتی ہو،عربی میں الف سے یا تک ہر حرف کی قیمت مقرر ہے، جوحسب ذیل ہے:
ابجد	:	الف کا1، ب کے 2، ج کے 3، د کے 4
ہوز	:	5, 6. 7
حُطی	:	8, 9, 10
کلمن	:	20, 30, 40, 50
سعفص	:	60, 70, 80, 90
قرشت	:	100, 200, 300, 400
ثخذ	:	500, 600, 700
ضظغ	:	800, 900, 1000

9.8 نمونۂ امتحانی سوالات

9.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ فورٹ ولیم کالج میں میرامن نے کون سی دو کتابیں لکھیں؟

2۔ سید حیدر بخش حیدری نے فورٹ ولیم کالج میں کیا خدمات انجام دیں؟

3۔ میر شیر علی افسوس کی تصانیف کے نام لکھیے۔

4۔ نثر بے نظیر کے مصنف کون ہیں؟

5۔ فورٹ ولیم کالج کب قائم کیا گیا؟

6۔ فورٹ ولیم کالج کو مکمل طور پر کس سن میں بند کر دیا گیا؟

7۔ کالج میں 'روضۃ الشہدا' کا ترجمہ کس عنوان سے کیا گیا؟

8۔ مرزا علی لطف کے علاوہ 'گلشن ہند' کے نام سے کس کا تذکرہ ملتا ہے؟

9۔ داستان امیر حمزہ کی تالیف وترجمہ کی ذمے دار کس کو دی گئی؟

10۔ کالج میں سنسکرت کی تصنیفات کے ترجمے کے لیے کس کا نام سب سے اہم ہے؟

9.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ فورٹ ولیم کالج کے انگریز پروفیسروں کی ادبی خدمات بیان کیجیے۔

2۔ میرامن اور باغ و بہار کی اردو نثر میں کیا اہمیت ہے؟

3۔ سید حیدر بخش حیدری اور میر شیر علی افسوس نے اردو ادب کی کیا خدمات انجام دیں؟

4۔ میر بہادر علی حسینی اور مرزا علی لطف کی ادبی خدمات بیان کیجیے۔

5۔ میر کاظم علی جوان اور مولوی اکرام علی کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

9.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر گل کرسٹ کی ادبی خدمات بیان کیجیے۔

2۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات بیان کیجیے۔

3۔ فورٹ ولیم کالج کے اہم مصنفین کا تعارف پیش کیجیے۔

9.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات	ڈاکٹر عبیدہ بیگم
2۔	گل کرسٹ اور اس کا عہد	ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی
3۔	میر امن سے عبدالحق تک	ڈاکٹر سید عبداللہ
4۔	فورٹ ولیم کالج (تحریک اور تاریخ)	پروفیسر سید وقار عظیم
5۔	فورٹ ولیم کالج کی نثری داستانیں	ڈاکٹر عفت زریں
6۔	اردو نثر کا ارتقا	ڈاکٹر عابدہ بیگم

اکائی 10: قدیم دلی کالج

اکائی کے اجزا

10.0 تمہید

10.1 مقاصد

10.2 کالج کا قیام

10.2.1 اردو ذریعہ تعلیم

10.2.2 شعبہ جات

10.2.3 کالج کے پرنسپل

10.2.3.1 مسٹر جوزف ہنری ٹیلر

10.2.3.2 مسٹر فلیکس بترو

10.2.3.3 ڈاکٹر الواس اشپرنگر

10.2.4 کالج کے اساتذہ

10.2.4.1 مولوی مملوک علی نانوتوی

10.2.4.2 امام بخش صہبائی

10.2.4.3 ماسٹر رام چندر

10.2.4.4 منشی ذکاء اللہ

10.2.4.5 مولوی سبحان بخش

10.2.4.6 مولوی ضیاء الدین

10.2.5 کالج کے نمایاں طلبا

10.2.5.1 ڈپٹی نذیر احمد

10.2.5.2 مولوی محمد حسین آزاد

10.2.5.3 پنڈت موتی لال بسمل

10.2.5.4 مولوی قاسم نانوتوی

10.2.5.5 مولوی کریم الدین پانی پتی

10.2.6 ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی

10.2.6.1 ترجمہ شدہ کتابیں

10.3 اکتسابی نتائج

10.4 کلیدی الفاظ

10.5 نمونہ امتحانی سوالات

10.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

10.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

10.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

10.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

10.0 تمہید

ہندوستان میں مغربی قوموں بالخصوص انگریزوں کی آمد کے بعد تین اہم تعلیمی اداروں فورٹ سینٹ جارج کالج، فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج کا قیام عمل میں آیا۔ ان میں تاریخی اعتبار سے فورٹ سینٹ جارج کالج پہلا جب کہ دہلی کالج آخری ہے۔ ان کے مقاصد، خدمات اور اثرات جداگانہ ہیں۔ ہم اردو والے سب سے زیادہ فورٹ ولیم کالج سے واقف ہیں۔ اس کے دو اسباب ہیں اول یہ کہ اس کالج پر نسبتاً زیادہ لکھا گیا دوم یہ کہ اس کالج کی خدمات کا بیشتر حصہ داستانوی ادب پر مشتمل ہے۔ حالانکہ سائنسی علوم افادیت پسندی، معاشی فلاح، سماجی اصلاح، اور فکری تنوع کے اعتبار سے دہلی کالج کا مقام بڑھا ہوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج کا مقصد نو وارد انگریز افسران کو ہندوستانی زبان سے روشناس کرانا جب کہ سینٹ جارج کالج کا مقصد ججوں، منشیوں اور وکیلوں کو تربیت دینا تھا مگر دہلی کالج صرف اور صرف ہندوستانیوں کی تعلیم کے لیے قائم کیا گیا اردو ذریعہ تعلیم کا ادارہ تھا۔ چناں چہ اس اکائی میں آپ کو دہلی کالج کی اس شاندار خدمات سے واقف کرایا جائے گا جو زبان وادب کے علاوہ اردو میں دیگر علوم کے فروغ کے لیے ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

10.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ دہلی کالج کے قیام پر روشنی ڈال سکیں۔

☆ دہلی کالج کے ذریعہ تعلیم اور اس کے مختلف شعبہ جات کے متعلق اظہار خیال کر سکیں۔

☆ دہلی کالج کے پرنسپلس اور اساتذہ کی خدمات واضح کر سکیں۔

☆ دہلی کالج کے نمایاں طلبا کا تعارف کرا سکیں۔

☆ ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی خدمات بیان کر سکیں۔

10.2 کالج کا قیام

نو آبادیاتی نظریات کی حامل یوروپی استعماری طاقتوں نے صدیوں قبل مشرق اورمشرق بعید کے مما لک پر قبضہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ تجارت کی آڑ میں ان کی کمپنیوں نے کیا۔ بالآخر جس کمپنی کے ہاتھ جو ملک آیا وہ کمپنی کی نو آبادی یا دوسرے لفظوں میں غلام بن گیا۔ چناں چہ بڑے تصادم کے بعد ہندوستان، برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے حصے میں آ گیا جس نے تجارت کے ساتھ ساتھ اقتدار کے لیے بھی راستہ ہموار کرنا شروع کر دیا۔ 1757ء سے 1857ء کے درمیانی سو سالوں میں وہ یہ کام منظّم انداز اور شاطرانہ چالوں سے کرتی رہی۔ یہاں تک کہ کمپنی ہر محاذ پر کامیاب ہوتی چلی گئی۔ اس کے کیا اسباب تھے وہ آپ تاریخ میں پڑھیں گے البتہ یہ بات قابل غور ہے کہ ہر ملک اور ہر عہد کا سیاسی نظام کے ساتھ ایک تعلیمی نظام بھی ہوتا ہے چناں چہ ہندوستان میں بھی صدیوں سے ایک تعلیمی نظام رائج تھا۔ یہ تعلیم مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں میں دی جاتی تھی۔

جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کی سیاست میں دخل اندازی شروع کر دی تو تعلیمی نظام سے وہ کیسے غافل رہ سکتی تھی۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ صدیوں سے مروج طرز تعلیم اور تعلیم گاہوں کو کچھ عرصہ تک اس نے برداشت کیا۔ کیوں کہ کمپنی میں اس تعلیم کی ہمنوائی کرنے والوں کی ایک معتدبہ تعداد موجود تھی۔ بالآخر لارڈ میکالے کے انتہائی سخت موقف نے یوروپی طرز کی جدید تعلیم کے لیے راہ ہموار کر دیا۔

1813ء کے چارٹر ایکٹ میں کمپنی نے تعلیم کے لیے ایک لاکھ روپیہ مختص کیے تھے مگر دس برسوں تک اسے خرچ کرنے کی نوبت نہیں آئی آگے چل کر 1823ء میں دس افراد پر مشتمل ایک ''جنرل کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن'' تشکیل دے کر اسے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ ایک کی رقم کو تعلیم کے مد پر خرچ کرے۔ کمیٹی نے سب سے پہلے ہندوستان کے مدارس کا جائزہ لینے کی غرض سے ایک سرکلر جاری کیا۔ مسٹر جے ایچ ٹیلر کو دہلی کے لیے منتخب کیا جنھوں نے بڑی سرگرمی سے دہلی کے مشرقی اداروں یعنی مدارس کا جائزہ لے کر رپورٹ پیش کی۔ منجملہ دیگر امور کے مسٹر ٹیلر نے مدرسوں کی زبوں حالی کا ذکر کرتے ہوئے کالج کے قیام کی تجویز کمیٹی کے سامنے رکھیں جس پر سنجیدگی سے غور کیا گیا۔ ظاہر ہے کالج کے لیے عمارت کا ہونا ضروری ہے جس کی تعمیر کے لیے لیے خطیر رقم کی ضرورت تھی۔ اس مسئلہ کا حل بھی تلاش کر لیا گیا یعنی مدرسہ غازی الدین حیدر کی پرشکوہ عمارت کو کمیٹی نے حاصل کر لیا اور 1825ء میں اس مدرسہ کو کالج میں تبدیل کر دیا گیا۔

البتہ جدید علوم کے ساتھ مشرقی علوم کو بھی برقرار رکھا گیا۔ دہلی شہر کی مناسبت سے یہ دہلی کالج کے نام سے مشہور ہوا۔ مجوزہ ایک لاکھ کی رقم میں سے پانچ سو روپیہ ماہانہ اس کالج کے لیے مقرر کیے گئے نیز عمارت کی کی تزئین کاری کے لیے ''ٹاؤن اینڈ ڈیوٹی فنڈ'' سے =/7115 روپیہ منظور ہوا۔

10.2.1 اردو ذریعہ تعلیم:

1835ء میں لارڈ ولیم بینٹنگ کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کے بعد پورے ہندوستان میں ذریعہ تعلیم کے لیے انگریزی زبان کو لازمی قرار دے دیا گیا مگر دہلی کالج کی یہ خصوصیت تھی کہ ذریعہ تعلیم اردو تھا یعنی تمام علوم جو داخلِ نصاب تھے وہ اردو میں پڑھائے جاتے تھے۔ یہ ایک مشکل مگر کامیاب تجربہ تھا جسے ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام ترجمہ کے ذریعے حل کر لیا گیا۔

دہلی کالج میں اردو کو ذریعۂ تعلیم رکھنے کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ طلبا محنت اور شوق سے سائنسی اور سماجی علوم پڑھتے تھے۔ نیز طلبا کی ذہنی بیداری، ملکی اور غیر ملکی حالات سے آ گاہی میں اضافہ ہوا۔ یہ حیرت انگیز بات ہے کہ پورے ملک میں جب تعلیم کے لیے انگریزی زبان کو نافذ کر دیا گیا تو دہلی کالج ہی وہ ادارہ تھا جہاں مغربی علوم کی تعلیم اردو زبان میں دی جاتی تھی جس کی تعریف 1853 کی جنرل کمیٹی تعلیم عامہ کی رپورٹ میں یوں درج ہے۔

''اردو کے ذریعہ سے دہلی کالج میں جو سائنس کی تعلیم دی جاتی ہے اس کی مسٹر مواٹ نے بہت تعریف کی ہے۔ ہز آنر ایسی تعلیم کی جو اس ذریعے سے دی جاتی ہے اور خاص کر سائنس کی تعلیم کی بہت قدر کرتے ہیں۔''

اسی سال (1853) ناظم تعلیمات بنگال نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ:

''ایک مدت سے دہلی کالج کی ایک خصوصیت ایسی چلی آ رہی ہے جو اسے بالائی اور زیریں صوبہ جات کے دوسرے کالجوں سے ممتاز کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہاں دیسی زبان (اردو) کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہے اور یہ خاص طور پر ریاضیات کی تمام شاخوں اور کم وبیش تاریخ اور اخلاق و فلسفہ کی تعلیم سے تعلق رکھتی ہے۔ اس طریقۂ تعلیم پر مسٹر بترو نے اپنے زمانۂ پرنسپلی میں استقلال کے ساتھ عمل درآمد کیا اور ان کے جانشین ڈاکٹر اشپرنگر نے اسی جوش کے ساتھ جاری رکھا۔ یہ اب دہلی کالج کے نظام تعلیم کا ایک جز تسلیم کر لیا گیا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ اسے آزادی کے ساتھ بڑھنے اور پھولنے پھلنے دے دیا جائے۔''

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دہلی کالج تجربہ اور نتائج کے اعتبار سے مقبول ادارہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہاں کے تعلیم یافتہ طلبا کے تقررات بھی بڑی تعداد میں ہوتے تھے جو اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ کالج کا معیار بلند تھا یقیناً اسے لائق اور فائق اساتذہ کی خدمات بھی حاصل رہی ہیں۔ دہلی کالج کے خطوط ہی پر چل کر سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی اور جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ نے گرانقدر خدمات انجام دیں۔

10.2.2 شعبۂ جات:

1825 میں دہلی کالج مدرسہ غازی الدین حیدر کی عمارت میں قائم کیا گیا جو مشرقی علوم کی درس گاہ تھی اس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں البتہ مسٹر ٹیلر کی رپورٹ کے مطابق 1824ء میں نو طالب علم اور ایک استاد مولوی عبداللہ تھے۔ جب دہلی کالج وجود میں آ گیا تو مشرقی شعبہ کو برقرار رکھتے ہوئے 1828ء انگریزی شعبہ کو عمل میں لایا گیا۔

مشرقی شعبہ میں فارسی اور عربی کے درجات تھے جس میں دونوں زبانوں کی قواعد، صرف ونحو، نثر ونظم، حدیث وفقہ، ریاضی وتاریخ، منطق و فلسفہ، جغرافیہ وسائنس اور قانون وسیاست وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جب کہ شعبۂ انگریزی میں حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ، عربی وفارسی زبان و ادب کو چھوڑ کر وہ تمام مضامین پڑھائے جاتے تھے جو مشرقی صوبہ میں زیر نصاب تھے البتہ اضافی طور پر انگریزی زبان وادب شامل نصاب تھا۔

آغاز میں تمام طلبا کو وظائف دیئے جاتے تھے 1831 میں ایک رپورٹ پیش کی گئی جس میں یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ دہلی کا کوئی باشندہ تعلیم کی اجرت دینے پر آمادہ نہیں ہوگا خواہ وہ انگریزی شعبہ میں پڑھتا ہوں یا مشرقی شعبہ میں۔ چناں چہ کئی سال تک طلبا سے فیس نہیں لی گئی آگے چل کر انگریزی شعبہ کے طلبا سے فیس لینے کی ابتدا ہوئی جس کا اطلاق رفتہ رفتہ مشرقی شعبوں پر بھی کیا گیا۔ تعلیمی رپورٹ اور طلبا کی لیاقت کا سال بہ سال جائزہ لینے کے بعد کالج کی انتظامیہ نے ایک بڑا قدم یہ اٹھایا کی دونوں شعبوں کے نصاب تعلیم کو یکساں کر دیا جائے اس کے بعد 1844ء میں مشرقی اور انگریزی شعبوں کو ضم بھی کر دیا گیا۔

10.2.3 کالج کے پرنسپل:

کالج قائم کیا گیا تو انتظامی امور کی نگرانی کے لیے ایک مجلس مقامی (Local Comittee) کی تشکیل عمل میں آئی۔ مزید برآں کالج کی سالانہ رپورٹ صوابدید اور منظوری کے لیے صدر مجلس تعلیمات عامہ (General Committe of Public Instruction) کو بھیجی

جاتی تھی جو کہ احاطۂ بنگال کی درسگاہوں کی نگراں تھی۔اس وقت دہلی بھی احاطہ بنگال کا حصہ تھا مگر 1843ء میں دہلی کے تعلیمی اداروں کی نگرانی مغربی وشمالی صوبوں کے لیفٹیننٹ گورنر کے ہاتھ میں چلی گئی جس کے اختیارات اتنے وسیع تھے کہ نصاب کی جزوی تبدیلی بھی لیفٹیننٹ گورنر کی منظوری کے بغیر نہیں کی جاسکتی تھی۔بہر حال کالج کی اصل کمیٹی یعنی مجلس مقامی نے تجویز پیش کی کہ کالج کا ایک پرنسپل مقرر کیا جائے جو اپنا بیشتر وقت کالج کے فرائض انجام دینے میں صرف کرے ساتھ ہی مجلس مقامی کے سکریٹری کی خدمات بھی انجام دے۔مجلس مقامی کے پہلے سکریٹری مسٹر جوزف ہنری ٹیلر تھے لہٰذا کالج کا پہلا پرنسپل انھیں کو بنایا گیا۔

10.2.3.1 مسٹر جوزف ہنری ٹیلر:

1836ء مسٹر جوزف ہنری ٹیلر کو کالج کا پہلا پرنسپل بنایا گیا۔1841ء تک وہ اس عہدہ پر برقرار رہے۔دوسری معیاد کے لیے 1843ء سے 1850ء کے درمیانی عرصہ میں تین سال تک پرنسپل رہے۔پھر تیسری مرتبہ 1854ء سے 1857ء میں اپنی وفات تک وہ پرنسپل رہے۔ 1857ء کے قیامت خیز ہنگامہ کی زد میں مسٹر ٹیلر بھی آگئے اور انھیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔

1824ء سے 1857ء تک مسٹر ٹیلر کا دہلی کالج سے کسی نہ کسی طرح تعلق رہا۔اس طرح 33 برس لگا تار انہوں نے دہلی کالج کی خدمت کی۔مرزا اسداللہ خان غالبؔ کو انہوں نے دہلی کالج میں بحیثیت استاد تقرر کرنا چاہا مگر مرزا نوشہ نے نوکر(سرکاری ملازم) بننے میں سبکی محسوس کی۔ مسٹر ٹیلر نے بغیر کسی مخالفت کے بہت سی اصلاحات کیں اور کالج کو خوب ترقی دی۔منشی ذکاء اللہ کے سوانح نگار سی۔ایف۔اینڈریوز (C.F. Andrews) کا کہنا ہے کی کالج کے اساتذہ اور طلبا مسٹر ٹیلر سے بہت متاثر تھے دراصل وہ طلبا پر بڑی شفقت کرتے اور انھیں اپنی اولاد سمجھتے تھے۔ ان کا یہ مشفقانہ رویہ ہی تھا کہ کالج سے تاریخ ساز شخصیتوں نے جنم لیا۔

10.2.3.2 مسٹر فلیکس بترو:

مسٹر فلیکس بترو نے 1841ء میں پرنسپل کا عہدہ سنبھالا۔وہ کم عمری میں اپنے وطن فرانس سے ہندوستان آگئے تھے اس لیے اردو زبان پر دسترس حاصل کرلی۔ان کی بڑی خواہش تھی کہ مشرقی شعبے میں مغربی علوم کی ترویج ہونی چاہیے۔ظاہر ہے یہ اسی وقت ممکن تھا جب مغربی علوم کو مشرقی زبانوں میں ترجمے کے ذریعے منتقل کیا جائے۔چناں چہ ورنا کیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔اس سوسائٹی کی ترقی اور کتابوں کے ترجمے کے لیے مسٹر بترو نے جس مستعدی اور خلوص کا مظاہرہ کیا وہ تاریخِ ادب کا ایک حصہ ہے۔مشرقی شعبے کو انہوں نے انگریزی شعبے کے برابر کر کھڑا کیا۔

مشہور فرانسیسی اسکالر گارساں دتاسی کا کہنا ہے کہ مسٹر بترو نے فارسی کے بجائے ہندوستانی (اردو) کو رواج دینے کے لیے راستہ ہموار کیا۔ نیز ہندوستانیوں کو نثر لکھنے کا شوق دلایا ورنہ عام طور پر یہ دستور تھا کہ صرف شعروشاعری سے شغف اور اسی کا چرچا تھا۔

مسٹر فلیکس بترو دہلی کالج کے پرنسپل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کمیشن کے سکریٹری بھی تھے جس کے پیش نظر یہ کام تھا کہ طلبا کی ضرورتوں اور معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسا نصاب تیار کیا جائے جس کے تحت تعلیم مادری زبان میں دی جائے ورنہ اس وقت تک اعلیٰ تعلیم عربی، فارسی اور سنسکرت کی وساطت سے دی جاتی تھی۔اس کمیشن نے تیس اعلی پائے کی کتابیں مختلف موضوعات پر تیار کرائیں۔مسٹر فلیکس بترو نے خود تین کتابیں تحریر کیں جو قانون، مالیات اور حقوق سے متعلق ہیں۔1845ء میں صحت خراب ہونے کے بنا پر وہ اپنے وطن فرانس لوٹ گئے۔

10.2.3.3 ڈاکٹر الواس اشپرنگر:

1845ء میں ڈاکٹر اشپرنگر دہلی کالج کے پرنسپل بن کر آئے۔ اس سے قبل وہ بنگال ملٹری سروس میں اسسٹنٹ سرجن تھے 1847 میں نوابان اودھ کے کتب خانے کی فہرست تیار کرنے کے لیے انہیں بھیجا گیا۔ 1850ء میں واپسی پر انھیں کالج کا دوبارہ پرنسپل مقرر کیا گیا۔

ڈاکٹر الواس اشپرنگر جس وقت دہلی کالج کے پرنسپل بنائے گئے اس وقت دہلی کالج کی نوعیت پرانے مدرسوں اور نئے کالجوں دونوں سے جدا تھی۔ پرنسپل یوروپین ہوتا تھا جو مشرقی علوم اور اس کے اصولوں سے ناواقف ہوتا تھا اس کے برعکس اکثر اساتذہ ہندوستانی تھے جو مغربی خیالات اور طرز فکر سے اتفاق نہیں رکھتے تھے ان حالات میں ڈاکٹر اشپرنگر کا کالج پہنچنا کالج کے حق میں بے انتہا مفید ثابت ہوا کیوں کہ اشپرنگر مشرقی اور اسلامی علوم نیز عربی وار دوزبانوں کے زبردست اسکالر تھے۔ دہلی کالج کو ایسے ہی شخص کی ضرورت تھی پرنسپل کا عہدہ سنبھالتے ہی اشپرنگر نے کالج کے نصاب میں اصلاح واضافہ کا کام انجام دیا۔ جو کتابیں بہت ضروری اور نایاب تھیں ان کو مہیا کرایا اور بعض کا ترجمہ اردو میں کرایا۔ طرز تعلیم میں ایسی تدبیریں اختیار کیں جن سے پرانا ڈھانچہ بدل گیا۔ فارسی جماعتوں کے ناقص ہونے کی بہت شکایت تھی اشپرنگر نے اس کا سبب دریافت کرلیا کہ انشا پردازی اور اسلوب نگارش میں متقدمین کی پیروی کی جارہی ہے۔ چناں چہ مطالب کی ادائیگی میں سادگی پر انہوں نے زور دیا۔

ڈاکٹر اسپرنگر نے ایک باتصویر رسالہ کی بنیاد رکھی جس کا نام ''قران السعدین'' تھا۔ اس رسالہ کا مقصد مشرق ومغرب کے فاصلوں اور غلط فہمیوں کو دور کرنا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کی پہلی کوشش تھی۔ یہ تجربہ اتنا کامیاب رہا کہ ایک دہے کے اندر اس طرح کے بارہ سے زائد رسالے شائع ہونے لگے۔ ڈاکٹر اشپرنگر کی ایک اہم تصنیف لائف آف محمد ﷺ ہے۔ یہ کتاب کسی بھی یوروپین مصنف کے ذریعہ اب تک لکھی گئی سیرت کی کتابوں میں ممتاز درجہ رکھتی ہے کیوں کہ ڈاکٹر اشپرنگر نے بنیادی ماخذ کا براہ راست مطالعہ کیا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں تنگ نظری اور لغزشیں نہیں پائی جاتیں۔ ڈاکٹر اشپرنگر کا ایک اہم کام یہ بھی ہے کہ شاہانِ اودھ کے کتب خانہ کی وضاحتی فہرست (Catalog) انھوں نے تیار کی۔ تقریباً دس ہزار مخطوطات کا مطالعہ کرکے ہر کتاب اور اس کے مصنف کا مختصر حال لکھا۔ یہ کام انھوں نے لارڈ ہارڈنگ کی ایما پر 1847ء میں شروع کیا جس میں ڈیڑھ سال کا عرصہ لگا۔

ڈاکٹر اشپرنگر 1857ء میں سبکدوش ہوکر اپنے وطن جرمنی لوٹ گئے اور اپنے ساتھ مشرقی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کرکے لے گئے جو آج بھی ''اشپرنگری ذخیرۂ مشرقیات'' کے نام سے برلن کے شاہی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

10.2.4 کالج کے اساتذہ:

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے دہلی کالج ایک ایسا ادارہ تھا جہاں باضابطہ تعلیمی نصاب تھا مشرقی اور جدید علوم کے شعبے تھے۔ ذریعۂ تعلیم اردو تھا اس لیے جدید علوم کی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے ترجمہ کی سوسائٹی بھی تھی۔ ان تمام امور کے پیش نظر یہاں انتہائی قابل اساتذہ کا تقرر عمل میں آتا تھا۔ جو مختلف علوم وفنون پر کامل دسترس رکھتے تھے ساتھ ہی یہ اساتذہ ذولسان اور کثیر اللسان بھی ہوتے تھے۔ دہلی کالج کے ایسے چند قابل اساتذہ کا ہم یہاں تعارف کرائیں گے۔

10.2.4.1 مولوی مملوک علی نانوتوی:

مولوی مملوک علی نانوتوی مشرقی شعبہ کے صدر تھے۔ عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی حدیث، فقہ، علم ہندسہ اور

اقلیدس کے عالم تھے۔مولانا رشید الدین خان اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی وغیرہ سے دہلی میں تعلیم حاصل کی، مملوک علی نانوتوی کے شاگردوں کی کثیر تعداد تھی، مولانا کی بے پناہ علمی استعداد اور تدریسی صلاحیت پر سب کا اتفاق ہے۔سرسید مرحوم نے ''آثار الصنادید'' میں ان کا ذکر بڑی عظمت سے کیا ہے۔مولوی کریم الدین پانی پتی طبقات شعرائے ہند میں رقم طراز ہیں:

> ''فارسی، اردو اور عربی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے ہیں ہر ایک علم اور فن سے جوان زبانوں میں ہیں مہارت تامہ ان کو حاصل ہے اور جس فن کی کتاب اردو زبان میں انگریزی سے ترجمہ ہوتی ہے اس کے اصل اصول سے بہت جلد ان کا ذہن چسپاں ہو جاتا ہے گویا اس فن کو اول ہی سے جانتے ہیں اور جس کام پر مامور ہیں اس میں کبھی کسی طرح کا حتی الوسع ان سے قصور نہیں ہوا۔''

(تذکرۂ طبقات شعرائے ہند، مطبع العلوم مدرسہ دہلی، 1848، ص463)

دہلی کالج میں رہتے ہوئے مولوی مملوک علی نانوتوی انگریز دشمنی کی ترجمانی کر رہے تھے۔جس کا سرا شاہ ولی اللہ سے جا کر ملتا ہے۔مرزا فرحت اللہ بیگ نے ''ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی'' میں انگریز دشمنی کا ایک بڑا دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے۔اسی مقصد کے تحت انھوں نے مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی جیسے طلبا کی تربیت کی اور تحریک ولی اللہی کی فکری قیادت سنبھالنے کے قابل بنا دیا، جنھوں نے 1866ء میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی۔یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تحریک دیوبند کا منبع بھی دہلی کالج ہی ہے۔

10.2.4.2 امام بخش صہبائی:

امام بخش صہبائی فارسی کے صدر مدرس تھے ان کے علم وفضل کی تعریف متعدد حضرات نے کی ہے۔گارساں دتاسی کا کہنا ہے کہ یہ قابل مصنف دہلی میں سب سے زیادہ فاضل ادیب تصور کیے جاتے ہیں۔امام بخش صہبائی کے مفتی صدرالدین آزردہ، شیفتہ اور غالب سے گہرے مراسم تھے۔صہبائی تدریس کے ساتھ تصنیف کا کام بھی انجام دیتے رہے، ''ترجمہ حدائق البلاغت'' ''اردو صرف ونحو'' اور ''شعرائے اردو کا تذکرہ'' ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

بے چارے امام بخش صہبائی کا انجام بڑا دردناک ہوا۔1857ء کی قیامت خیز بلا میں انگریزوں نے بلاقصور انھیں گولیوں کا نشانہ بنایا اور شہید کر دیا۔منشی صدرالدین آزردہ ان کی شہادت کی خبر سن کر تڑپ گئے اور کہا:

کیوں کہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

10.2.4.3 ماسٹر رام چندر:

دہلی کالج کی ایک مشہور ومعروف شخصیت ماسٹر رام چندر کی تھی جو اسی کالج کے طالب علم رہے بعد میں بحیثیت استاد اور مترجم ان کا تقرر ہوا۔دوران تعلیم ہی ماسٹر رام چندر مضامین لکھتے رہے۔ریاضی میں آپ کو خاص دلچسپی تھی اس لیے ان کی سترہ (17) کتابوں میں بیشتر ریاضی سے متعلق ہیں۔ان کی کتاب ''رسالہ مسائل کلیات و جزئیات'' (A Treatise on the Problems of Maxima and

minima) اتنی مقبول ہوئی کہ لندن یونیورسٹی کے پروفیسر آگسٹن ڈی مارگٹن نے اپنے مقدمے کے ساتھ اسے شائع کیا اور انعام سے بھی نوازا گیا۔

ماسٹر رام چندر ریاضی کے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب اور صحافی بھی تھے۔ اپنے رسالہ ''خیر خواہ ہند'' (بعد میں اس کا نام محبّ ہند ہو گیا) کے ذریعہ اردو تنقید کی وہ بنیاد رکھ چکے تھے۔ اردو شاعری پر انھوں نے جو صحت مند تنقید کی ہے ممکن ہے ''مقدمہ شعر و شاعری'' لکھنے سے قبل الطاف حسین حالی کی اس سے واقفیت رہی ہو۔ ستمبر 1847ء کے خیر خواہ ہند میں ماسٹر رام چندر کا ایک مضمون ''مشاعرہ'' پر شائع ہوا جس میں اردو شاعری پر تنقید کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''شاعری کا موضوع عام طور پر عشق ہے جس کا معیار بہت پست اور افسوسناک ہے............ عاشق سودائی و مجنوں، رند خراباتی، کافر، مغموم اور دلگیر نظر آتا ہے............ عاشق اور واعظ میں کبھی نہیں بنتی۔ ان شاعروں نے شیخ کی بری طرح خبر لی ہے............ ہمارے شاعر جب کبھی معشوق کی ایذا رسانی اور بے وفائی کا ذکر کرتے ہیں تو اس کا سارا الزام آسمان کی کج رفتاری پر رکھتے ہیں............ اردو شاعروں کی بے مذہبی مشہور ہے۔''

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماسٹر رام چندر شعر و شاعری کو ایک محدود تصور سے نکالنا چاہتے تھے۔ ان کا منشا یہ تھا کہ شاعر نیا تہذیبی شعور اپنے اندر بیدار کرے۔ یوروپی زبانوں کی طرح موضوعات میں تنوع پیدا کریں۔

اسی طرح یکم جنوری 1850ء کے رسالہ محبّ ہند میں انھوں نے مروجہ خطوط نگاری پر سخت اعتراضات کیے جس پر فارسی انشا پردازی کا اثر تھا۔ انھوں نے مراسلہ میں سادگی، مقصدیت اور قطعیت پر نہ صرف زور دیا بلکہ عام روش سے ہٹ کر انھیں باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے خطوط تحریر کیے، جسے آگے چل کر مرزا غالبؔ نے پوری طرح اپنا لیا۔ ماسٹر رام چندر کی قیادت میں ''فوائد الناظرین'' کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار بھی شائع ہوتا تھا جس کا مقصد جدید علوم و فنون سے لوگوں کو روشناس کرنا تھا مگر ساتھ ہی تاریخ، اسلاف کے واقعات، سائنسی انکشافات، اساتذہ کے کلام، ملکی و غیر ملکی خبریں بھی اس اخبار کی زینت بنتے تھے۔ سرسید نے جب اپنا اخبار ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' کا اجرا کیا تو ان کے ذہن میں یقیناً ''فوائد الناظرین'' کا نمونہ رہا ہوگا۔ بہر حال ماسٹر رام چندر کی شخصیت بڑی عبقری تھی جو اپنی ذات کے اندر انجمن تھے۔

10.2.4.4 منشی ذکاء اللہ:

ماسٹر رام چندر کی طرح منشی ذکاء اللہ بھی دہلی کالج کے طالب علم تھے۔ ریاضی، طبیعات، تاریخ اور جغرافیہ سے خصوصی دلچسپی تھی۔ ان کی خدمات کے پیش نظر برطانوی حکومت نے انھیں پندرہ (1500) سو روپیہ کا انعام اور خان بہادر و شمس العلماء کے خطابات سے سرفراز کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد دہلی کالج میں ریاضی کے استاد مقرر ہوئے۔ وہ بلا کے ذہین تھے۔ مختلف علوم فنون پر انھوں نے ڈیڑھ سو سے زائد کتابیں لکھیں جن میں صرف ریاضی (Mathemetics) پر ان کی ستاسی (87) کتابیں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اخباروں اور رسالوں میں بھی ان کے سیکڑوں مضامین شائع ہوئے۔ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ باون ہزار صفحات انھوں نے سیاہ کیے ہیں۔ حیرت میں ڈالنے والی ان کی تصانیف پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولوی بشیر الدین احمد ''واقعات دار الحکومت'' میں کہتے ہیں:

> ''فن تاریخ اور ریاضی میں علی الخصوص مسلمانوں میں آپ (منشی ذکاء اللہ) کا جواب نہ تھا۔ آپ کی تصانیف ایک نہیں دو نہیں سینکڑوں ہیں۔ جتنی ضخیم کتابیں آپ نے تصنیف کیں اور ترجمہ کی کسی اور نے نہیں کی۔۔۔۔ بالکل عالمانہ اور فلسفیانہ رنگ تھا۔۔۔ گو شمس العلماء تھے مگر کہلاتے منشی اور یہ لفظ تھا بھی بہت موزوں۔ اتنا بڑا منشی یعنی لکھاڑ کوئی دیکھنے میں نہیں آیا۔ خدا جانے قلم تھا یا مشین دماغ تھا یا معلومات کا ایک نا معلوم و دو غیر متناہی ذخیرہ۔''

(مولوی بشیر الدین احمد، واقعات دار الحکومت، جلد دوم، ص 171)

منشی ذکا اللہ کی تصانیف معلومات کا خزانہ ہے۔ لیکن جہاں تک طرز تحریر کا سوال ہے وہ کسی قدر پھیکا ہے۔ شگفتگی اور دلکشی نہیں پائی جاتی۔ مگر اس کی امید بھی نہیں کرنی چاہیے۔ کیوں کہ ریاضی، سائنس اور تاریخی موضوعات میں اس کی گنجائش کم ہی رہتی ہے۔ پھر بھی طرز نگارش سلیس، رواں اور بے تکلف ہے۔ مشکل سے مشکل بات کو چند الفاظ میں سلجھا دیتے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ مختلف علوم وفنون اور موضوعات کی کتابیں اردو میں لکھ کر یا ترجمہ کر کے جدید علوم کی تحصیل کے لیے اردو زبان کو ذریعہ تعلیم کے قابل بنایا۔ ان کی مشہور کتابوں میں سوانح عمری ملکہ وکٹوریہ، سوانح عمری مولوی سمیع اللہ، آئین قیصری، اقبال نامۂ اکبری، تاریخ ہندوستان اور رسالہ مجالس مناظرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ منشی ذکاء اللہ کے جگری دوست سی۔ ایف۔ اینڈریوز نے انگریزی میں ان کی سوانح عمری ''Zakaullah of Delhi'' کے نام سے تحریر کی جس میں موصوف کی زندگی کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

10.2.4.5 مولوی سبحان بخش:

مولوی سبحان بخش دہلی کالج میں عربی اور فارسی کے ایک کامیاب مدرس تھے۔ انھوں نے ترجمہ کا کام بھی کیا ہے۔ ''تزک تیموری''، ''تاریخ ابن خلکان'' اور ''تذکرہ مفسرین'' کا ترجمہ کیا ہے۔ ان کی سب سے اہم کتاب ''محاورات ہند'' ہے۔

محاورات ہند کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ محاورات کی طرف ابھی تک کسی کا خیال نہیں ہوا۔ اس لیے جمع نہیں کیا گیا اور نہ یہ لکھا گیا کہ لفظ کیا معنی دیتے ہیں اور قائل کی مراد کیا ہے۔ اس کتاب کے دیباچہ میں وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''مجھ کو یہاں کے رواج کے مطابق اور استعمال کے مطابق جتنے (محاورات) میسر ہوئے وہ بہ ترتیب حروف تہجی جمع کر دیے ہیں ورجن میں فحش تھا وہ ترک کر دیے اور واضح ہو کہ ان محاورات میں زبان کے لہجہ کو بہت دخل ہے اور ایک لفظ لہجہ بدلنے سے اور معنی دیتا ہے اور سامع اس کو خوب سمجھتا ہے لیکن مجبوری ہے کہ لہجہ لکھنے میں بالکل نہیں آتا۔''

محاورات ہند کو 1913ء میں مطبع مجتبائی دہلی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا۔

10.2.4.6 مولوی ضیا الدین:

مولوی ضیا الدین کا بھی ماسٹر رام چندر اور منشی ذکاء اللہ کی طرح دہلی کالج کے ان طلبا میں شمار ہوتا ہے جن کا تقرر اسی کالج میں ہوا۔ شعبہ عربی کے ممتاز طالب علموں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ چناچہ 1864ء میں وہ عربی کے استاد مقرر ہوئے۔ انھیں شمس العماء کا خطاب ملا۔ البتہ انھوں نے کوئی

قابل قدر تصنیف نہیں چھوڑی۔ تدریس سے ہی شغف تھا۔ مولوی بشیرالدین ''واقعات دارالحکومت'' میں رقم طرز ہیں۔

''مولوی صاحب (مولوی ضیاالدین) مولوی مملوک علی نانوتوی مشہور عالم کے شاگرد تھے اور مفتی صدرالدین خاں صدرالصدور سے بھی فارسی تحصیل کی تھی۔ ایام غدر میں دہلی کالج میں مدرس ہوئے۔ چندے نارمل اسکول میں پڑھاتے رہے۔ پھر اسی کالج میں عربی کے مدرس ہو گئے...... بڑے بھاری ادیب وقت تھے۔ چوں کہ ساری عمر سررشتۂ تعلیم میں صرف ہوئی۔ پڑھانے ہی کی دھن رہی تصنیف و تالیف کوئی نہ چھوڑی۔

(واقعات دارالحکومت دہلی، دہلی اردو اکادمی، 1990، ص179)

مولوی ضیاالدین کا انجام بھی امام بخش صہبائی کی مانند دردناک ہوا۔ انقلاب 1857ء کو کچلنے کے بعد جب انگریز دہلی میں داخل ہوئے تو وہ اپنے مکان میں موجود تھے۔ قضا آگئی اور مولوی ضیاالدین نے بھی گولی کا نشانہ بن کر داعئ اجل کو لبیک کہا۔

10.2.5 کالج کے نمایاں طلبا:

قدیم دہلی کالج کے فارغ التحصیل طلبا میدان عمل میں اول درجہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کالج کے طلبا کا تقرر ملک کے مختلف حصوں میں ہوتا تھا۔ جہاں بھی یہ طلبا جاتے عوام و خواص ان کا پرجوش خیر مقدم کرتے ان کا حوصلہ بڑھاتے۔ انگریز عملداری کے کالجوں میں بحیثیت استاد نیز نوابوں اور راجاؤں کے اتالیق حیثیت سے تقرر حاصل کرتے۔ دفتروں میں ملازم اور مترجم بھی بن کر جاتے۔ ہم عصر اخباروں میں ان حضرات کی مصروفیتوں اور کارناموں کی خبریں اکثر شائع ہوتی رہتی تھیں۔ بہرحال کچھ طلبا کا یہاں ذکر کرنا مناسب ہے جن کی خدمات نمایاں ہیں۔

10.2.5.1 ڈپٹی نذیر احمد:

ڈپٹی نذیر احمد کے دہلی کالج میں داخلہ کی کہانی مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کی ہے، جس کا ان کی تصنیف ''ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی'' میں تفصیلی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد نذیر احمد اول پنجاب میں مدرس رہے پھر ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو کر کانپور پہنچے۔ آخر میں حیدرآباد کے نظام سالار جنگ اول نے افسر بندوبست مقرر کیا نیز محکمۂ مال کے ممبر بھی بنائے گئے مگر وقت سے پہلے سبکدوش ہو کر دہلی چلے گئے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے دہلی کے علمی ماحول سے خوب خوب استفادہ کیا۔ وہ مشرقی علوم کے ماہر اور مفسر قران کے علاوہ اردو ادب کے پہلے ناول نگار بھی ہیں جنھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے عورتوں کے مسائل، ان کی تعلیم، مسلم گھرانے کی اصلاح اور سماجی برائیوں کو اجاگر کیا ہے۔ مراۃ العروس، بنات النعش، توبتہ النصوح، فسانہ مبتلا، ایامیٰ اور رویائے صادقہ وغیرہ اسی موضوع پر لکھے گئے ناول ہیں۔ نذیر احمد کا ایک اہم ناول ابن الوقت ہے۔ جس میں انھوں نے اس وقت کے سیاسی اور معاشی حالات کا جائزہ لیا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد مذہبی آدمی تھے۔ اس لیے ناولوں میں انھوں نے معاشرتی برائیوں کی اصلاح اور عورتوں کی تعلیم و تربیت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان کا انداز خطیبانہ ہے مگر اردو میں مقصدی ادب کا نمونہ انھوں نے پیش کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کا پلاٹ سادہ ہوتا ہے۔ ان میں نہ کوئی جدت ہے نہ دلکشی لیکن مکالمے کے وہ بادشاہ ضرور ہیں۔ عورتوں کے لب و لہجے۔ انداز گفتگو اور روزمرہ پر انھیں دسترس حاصل ہے۔ ان کی زبان دہلی

کی ٹکسالی زبان ہے۔ عام طور پر بیان میں روانی، جوش، شگفتگی، بے ساختگی غرض سبھی کچھ موجود ہے۔ لیکن اسلوب ناہموار ہے۔ اگر ایک جگہ عربی کے ثقیل الفاظ ومحاورات اور اشعار، آیات وحدیث لکھتے ہیں تو دوسری جگہ ٹھیٹ ہندی کے سادہ اور سلیس الفاظ سے کام لیتے ہیں بہرحال نذیر احمد دہلی کالج کی ایک قدآور شخصیت تھے جنھوں نے اردو ادب کو نہ صرف مالا مال کیا بلکہ ایک صنف ادب کا آغاز بھی انھیں کے ہاتھوں ہوا۔

10.2.5.2 مولوی محمد حسین آزاد:

مولوی محمد حسین آزاد مولوی محمد باقر کے فرزند اور دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد وہ اپنے والد کے اخبار ''دہلی اردو اخبار'' سے منسلک ہو گئے۔ انقلاب 1857ء کے دوران انھوں اس اخبار کو حریت پسندوں کا ترجمان بنا دیا۔ انقلاب کو دبانے کے بعد مولوی محمد باقر کو بلا قصور انگریزوں نے شہید کر دیا تو یہ بمشکل جان بچا کر لاہور پہنچے۔ پنڈت من پھول کی کوششوں سے سررشتۂ تعلیم میں پندرہ روپیہ ماہانہ پر ملازم ہو گئے۔ حکومت نے ان سے ''قصص ہند'' اور بچوں کے لیے ''ریڈرس'' لکھوائیں۔ ''آب حیات'' سے مولوی محمد حسین آزاد کو زیادہ شہرت ملی جس میں ان کا تبحر علمی اور اسلوب کی شوخی صاف دکھائی دیتی ہے گرچہ یہ موجودہ تنقید کے معیار پر پوری نہیں اترتی پھر بھی اس کی بنیادی حیثیت سے کسی کو انکار نہیں۔ آزاد کی دیگر تصانیف میں ''نیرنگ خیال''، ''سخن دان فارس''، ''دربار اکبری''، ''قند پارسی''، ''نگارستان فارس'' اور ''جانورستان'' وغیرہ مشہور ہیں۔ نیرنگ خیال مضمون اور طرز تحریر دونوں لحاظ سے بہت دلچسپ ہے سخن دان فارس کے ذریعہ آزاد نے اردو والوں کو علم السنہ سے متعارف کرایا اور دربار اکبری کے بارے میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ لارڈ میکالے کی کتاب تاریخ انگلستان کے تتبع میں لکھی گئی۔

مولوی محمد حسین آزاد کی ادبی وعلمی زندگی کا سب سے روشن اور نمایاں پہلو اس وقت سامنے آتا ہے جب انھوں نے ڈاکٹر ڈبلیو لائٹنر (Dr. G. W. Leitner) کے ساتھ مل کر مئی 1874ء میں انجمن پنجاب لاہور کی بنیاد رکھی اور جدید شاعری کا آغاز کیا انھوں نے اردو ادب کو ایک نئی فکر اور جدید ذہن عطا کیا۔ غزل کے بجائے نظم کی اہمیت پر زور دیا۔ چنانچہ 8 مئی 1847ء کو آزاد نے ایک مدلل اور تاریخی تقریر کی جسے تحریک انجمن پنجاب لاہور کا منشور قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس مواقعے پر انھوں نے وہ تمام بنیادی مقاصد واضح طور پر بیان کر دیے جو آزاد کا مطمح نظر تھے۔ آزاد کا کہنا ہے کہ سادہ جذبات کو اصلی رنگ میں پیش کرنے کے لیے بھاشا کا استعمال ضروری ہے۔ چنانچہ بدیسی زبانوں کے بے محابہ استعمال نے اردو کو نقصان پہنچایا ہے یہی وجہ ہے کہ آزاد نے برج بھاشا کو اردو کی ماں قرار دیا۔ ہر چند کہ یہ نظریہ اب قابل قبول نہیں رہا تاہم آزاد کے اس بنیادی موقف کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا کہ اردو اسی سرزمین کی بولی ہے۔ مولوی محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب لاہور کے اس جلسے کے اختتام پر اپنی مشہور نظم ''مثنوی شب قدر'' پڑھ کر سنائی۔ بہرحال اردو کے عناصر خمسہ میں سے ایک مولوی محمد حسین آزاد کا اردو زبان وادب میں بڑا مقام ہے۔

10.2.5.3 پنڈت موتی لال بسمل:

پنڈت موتی لال بسمل کا دہلی کالج کے ممتاز طلبا میں شمار ہوتا تھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ''قران السعدین'' کے اڈیٹر رہے۔ بعد میں ''بورڈ آف ایڈمینسٹریشن'' لاہور کے فارسی مترجم اس کے بعد اکسٹرا جوڈیشیل اور آخر میں ڈسٹرکٹ جج کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے۔ پنڈت موتی لال بسمل کو غیر علمی وادبی مصروفیتوں میں بھی علمی ذوق باقی رہا۔ ''تعلیم نسواں'' اور ''صغرسنی کی شادی'' پر انگریزی میں دو رسالے لکھے۔ ''مسمریزم'' کے موضوع پر دو کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیں، اردو اور فارسی شعروادب سے بھی شغف تھا۔ شاعر تھے۔ بسمل تخلص رکھا۔ زبان سلیس اور شیریں ہے۔ انداز بیان بھی والہانہ ہے۔

10.2.5.4 مولانا محمد قاسم نانوتوی:

دہلی کالج کے تعلیم یافتہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کا تعلق مشرقی شعبہ کے صدر مولوی مملوک علی نانوتوی کے وطن سے تھا۔1844ء میں ان کا داخلہ ہوا اسی سال مشرقی و مغربی شعبوں کو ضم کر دیا گیا۔ چنا چہ عربی پڑھنے والے طلبا بھی جدید علوم سے واقف ہو گئے۔اس کا بھر پور فائدہ مولانا قاسم نانوتوی نے اٹھایا۔شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے سرسید مرحوم کی تعلیمی تحریک کی پرزور حمایت کی۔تعلیم سے فراغت کے بعد میرٹھ کے ایک مطبع میں تصحیح کا کام انجام دے رہے تھے کہ انقلاب 1857ء کا واقعہ پیش آ گیا۔اس محاذ آرائی میں اپنے رفقا کے ہمراہ مولانا قاسم محمد نانوتوی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔اس انقلاب کو چند مہینوں کے اندر ہی انگریزوں نے قابو میں کرنے کے بعد جو ظلم و ستم ڈھایا وہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک تاریک باب ہے۔ بہرحال اس طوفان کے تھمنے کے بعد قوم و ملت کے مختلف قائدین اور مصلحین نے اپنے اپنے طور پر فلاح و بہبود کے لیے قدم اٹھائے۔مولانا قاسم نانوتوی نے اسلامی تشخص اور علومِ دینیہ میں ان مسائل کو تلاش کرنے کی سعی کی۔اس سلسلہ میں انھوں نے اتر پردیش کے قصبہ ''دیوبند'' میں 30 مئی 1866ء کو ایک ''ادارہ'' قائم کیا جس میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ اس کا تعلق اور تعاون حکومت کے بجائے صرف عوام سے ہو۔ جلد ہی اس ادارہ نے دارالعلوم دیوبند'' نام سے ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ تعلیم گاہ کی شکل اختیار کر لی۔یہ بھی تاریخ کا عجیب اتفاق ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے ڈانڈے دہلی کالج سے جا کر ملتے ہیں۔مولانا قاسم نانوتوی کے علاوہ دارالعلوم کے تقریباً تمام محرکین مثلاً مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مولانا فضل الرحمٰن عثمانی اور مولانا منیر نانوتوی وغیرہ دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔

10.2.5.5 مولانا کریم الدین پانی پتی:

دہلی کالج کے ایک نمایاں طالب علم مولوی کریم الدین پانی پتی تھے۔تعلیم سے فراغت کے بعد آگرہ کالج میں اردو ادب کے استاد مقرر ہوئے اس کے بعد سر رشتہ عدالت لاہور میں ملازم رہے۔شعر و ادب سے خاص دلچسپی رہی۔کچھ عرصہ تک اپنے مکان پر ہر ماہ مشاعرہ منعقد کرتے تھے۔اس میں بڑھا جانے والا کلام ''گل رعنا'' کے نام سے شائع کرتے تھے۔تصنیف و تالیف کا ایک بڑا ذخیرہ بھی انھوں نے چھوڑا۔ چنا چہ قاضی عبدالودود نے مختلف علوم و فنون پر ان کی چونتیس (34) کتابوں کی فہرست پیش کی ہے۔مولوی کریم الدین پانی پتی کو سب سے زیادہ شہرت ''تذکرہ نگاری'' سے ملی۔اپنی علمی و ادبی زندگی کا آغاز انھوں نے تذکرہ نگاری سے کیا اور تا عمر اس میں دلچسپی لیتے رہے۔ان کے تذکروں میں ''طبقات شعرائے ہند'' اور گلدستہ نازنیناں'' زیادہ مشہور ہیں۔مولوی کریم الدین پانی پتی کے تذکروں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے پہلی دفعہ تذکرے کو تاریخ کی ایک شاخ سمجھنے کی کوشش کی۔تاریخ اور تذکروں کی جو تعریف انھوں نے بیان کی اس سے پہلے کسی اور تذکرہ نگار نے اس طرف اشارہ نہیں کیا تھا۔تذکروں کے بعد ان کے قلم کا جوہر ''تاریخ ابوالفداء'' کے ترجمے میں کھلتا ہے جو ڈاکٹر اشپرنگر کی فرمائش پر کیا گیا۔

مذکورہ بالا شخصیتوں کے علاوہ دہلی کالج کے طلبا کی ایک طویل فہرست ہے جو تحصیل علم کے بعد پورے ملک میں پھیل گئے۔یہ طلبا جہاں بھی جاتے عوام و خواص ان کا پر جوش خیر مقدم کرتے۔تدریس کے علاوہ دیگر پیشوں سے یہ بھی وابستہ رہے مثلاً لالہ مکند لال گورنر جنرل کے سرجن مقرر ہوئے، پنڈت بشیشر ناتھ ایک کامیاب مترجم تھے۔مولوی محمد یعقوب اور مولوی ذوالفقار علی ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔منشی امید سنگھ مہاراجہ اندور کے اتالیق مقرر ہوئے۔

10.2.6 ورناکلرٹرانسلیشن سوسائٹی:

1835ء میں لارڈ میکالے کی سفارشات کے بعد دہلی کالج ہی وہ ادارہ تھا جس نے آخر تک اردو زبان کو ہی ذریعۂ تعلیم کے طور پر اپنائے رکھا۔ لیکن یہ کوئی آسان کام نہ تھا مغربی علوم اور افکار کی افادیت کے پیش نظر لوگوں کا رجحان اس طرف بڑھنے لگا۔ مگر دیسی زبانوں میں ان علوم کی کتب کی عدم موجودگی کی وجہ سے دہلی کالج کی ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے اس کا بیڑا اٹھایا کہ تراجم کے ذریعہ مغربی علوم کا تعارف کرا کے مشرق کے فکری جمود کو توڑا جائے۔

ورناکلرٹرانسلیشن سوسائٹی کی داغ بیل کالج کے پرنسپل مسٹر بترو نے ڈالی۔ ماسٹر رام چندر اور امام بخش صہبائی ان کے اہم معاونین میں تھے۔ شروع میں اسے ''انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنہ ملکی'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور بعض اسے کتب خانہ برائے کارآمد معلومات (Library of usefull knowledge) بھی کہتے تھے۔ بعد میں ورناکلرٹرانسلیشن سوسائٹی کے نام سے موسوم کیا گیا۔ سوسائٹی کا مقصد اردو، ہندی اور بنگالی تینوں زبانوں میں ترجمہ کا کام کرنا تھا لیکن محدود وسائل اور بعض دوسری مجبوریوں کی بنا پر صرف اردو میں ہی یہ کام ہو سکا۔

ترجمہ کا کام گرچہ مسٹر بترو کی تقرری کے سال یعنی 1841ء میں ہی شروع ہو چکا تھا لیکن 1843ء میں انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنہ ملکی کے قائم ہونے پر یہ کام دہلی کالج میں باقاعدہ شروع ہو گیا اور ورناکلرٹرانسلیشن سوسائٹی کی نگرانی میں کتابیں طبع ہونے لگیں۔ 1845ء میں مسٹر بترو یورپ چلے گئے تو ان کی جگہ ڈاکٹر اشپرنگر کا تقرر ہوا۔ انھوں نے بھی ترجمہ و تالیف کے کام کو اسی شوق اور سرگرمی سے جاری رکھا۔

یہ سوسائٹی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی کیوں کہ 1877ء میں دہلی کالج کو ختم کر کے اسے لاہور اورینٹل کالج میں ضم کر دیا گیا۔ پھر بھی قلیل عرصہ میں اس نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ سوسائٹی کی زیر نگرانی ریاضی، طبعیات، کیمیا، طب، جغرافیہ، تاریخ، قانون، سیاسیات، معاشیات اور مذہب وغیرہ کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ مولوی عبدالحق نے ان کی تعداد œ ⌋ ,⌋ ‡ ⌋128 مالک رام نے 131 شمار کرائی ہے۔ جو بھی ہو اس فہرست کو مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ نمونہ کے طور پر چند ترجمہ شدہ کتابوں کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔

10.2.6.1 ترجمہ شدہ اہم کتابیں:

تذکرہ طبقات شعرائے ہند کو مولوی کریم الدین پانی پتی نے مسٹر ایف فیلن کے ساتھ مل کر ''گارساں دتاسی'' کی تاریخ سے ترجمہ کیا ہے۔ اس کی ضخامت 504 صفحات پر مشتمل ہے جو 1848ء میں مطبع العلوم دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کے مقدمہ میں تاریخ اور تذکرہ کے فرق کو بیان کیا گیا ہے۔

تذکرہ شعرائے عرب کو مولوی کریم الدین پانی پتی نے خود اپنی عربی تصنیف ''فرائد الدہر'' کو اشپرنگر کی فرمائش پر اردو میں منتقل کیا جو 1847ء میں مطبع العلوم دہلی کالج سے شائع ہوئی۔ اس میں 347 شعرا کے فکر و فن کے محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے نمونہ کلام بھی پیش کیے گئے ہیں۔

دہلی کالج کے استاد مولوی سبحان بخش نے عربی تصانیف تذکرۃ المفسرین اور تذکرۃ الفقہا کا اردو ترجمہ تاریخ الحکماء نام سے کیا جو 1848ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب میں مختلف اہل فن کا ذکر کیا گیا ہے جو علم ہندسہ، علم نحو اور اقلیدس وغیرہ کے ماہر تھے۔ ترجمہ خوب البتہ املا قدیم طرز پر ہے۔

مشہور مورخ گولڈ اسمتھ کی انگریزی کتاب ''History of England'' کا ترجمہ ''تاریخ انگلستان'' کے نام سے دہلی کالج کے کئی

اساتذہ نے مل کر کیا۔اسی طرح گولڈ اسمتھ ہی کی کتاب’’History of Rome‘‘ کا ترجمہ منشی شیو پرشاد نے’’تاریخ روم‘‘ کے نام سے کیا۔ کتاب کے آغاز میں نہ تو دیباچہ ہے اور نہ ہی وجہ ترجمہ بیان کی گئی ہے۔دراصل 1845ء تک کی طبع شدہ کتابوں میں وجہ ترجمہ بتانے یا پیش لفظ لکھنے کا اہتمام نہیں تھا۔

دہلی کالج کے تعلیم یافتہ پنڈت رام کشن کو ترجمے میں بڑی مہارت تھی ان کے ترجمے میں روانی اور تصنیف کا احساس ہوتا ہے۔انھوں نے قوانین کی کئی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے۔کالج کے پرنسپل مسٹر بترو کی کتاب’’Principles of the Law of Nations‘‘ کا ترجمہ’’اصول قوانین ممالک مختلف‘‘ اور انھیں کی کتاب’’Principles of Public Revenue‘‘ کا ترجمہ’’اصول سرکاری محاصل کے‘‘ نام سے شائع کیا۔ اسی طرح W.H. Macnaghten کی کتاب Principle of Hindu Laws‘‘ کا ترجمہ’’اصول دھرم شاستر‘‘ اور ’’Dumont & Benthan‘‘ کی کتاب ’’Principle of Legislature‘ کا ترجمہ’’اصول قواعد اخلاق اور قوانین‘‘ نام سے کیا۔ قانون ہی کی ایک کتاب’’نسخہ رہنما‘‘ کا ترجمہ’’قانون مال کا‘‘ عنوان سے دہلی کالج کے متعدد اساتذہ نے کیا۔

ماسٹر رام چندر اور مولوی ذکاء اللہ کا دہلی کالج کے نمایاں طلبا میں شمار ہوتا تھا۔دونوں ریاضی داں تھے۔انھوں نے ریاضی کی طبع زاد کتابیں تحریر کیں نیز انگریزی سے ترجمہ بھی کیں۔ ماسٹر رام چندر کی کتاب’’ رسالہ مسائل کلیات و جزئیات‘‘ (A Treatise on the Problems of Maxima and Minima‘‘ اس قدر مشہور ہوئی کہ لندن یونیورسٹی کے پروفیسر مسٹر آگسٹس ڈی مارگن نے (Augustus De Margon) نے اپنے مقدمہ کے ساتھ لندن سے شائع کیا۔منشی ذکاء اللہ نے ابتدائی درجوں کے طلبا کے لیے’’علم مثلث‘‘ نام سے دو چھوٹے چھوٹے رسالوں پر مشتمل ریاضی کی کتابوں کا ترجمہ کیا۔منشی ذکا اللہ نے ریاضی کی اصطلاحات کو بڑی خوبصورتی سے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے جب کہ ایسے خشک موضوع پر ترجمہ کرتے وقت زبان و بیان میں سلاست و روانی برقرار رکھنا بڑا مشکل مسئلہ ہوتا ہے۔مشرقی شعبہ کے صدر مولوی مملوک علی نانوتوی نے’’تحریر اقلیدس‘‘ نام سے بارہ مقالوں کا اردو ترجمہ کیا ہے جو مطبع العلوم مدرسہ دہلی سے شائع ہوا۔مولوی کریم الدین پانی پتی کا کہنا ہے کہ مولوی مملوک علی نے علم ہندسہ کو پانی کر دیا۔

علم طبیعیات(Physics) کی متعدد کتابوں کے ترجمے سوسائٹی کے تحت ہوئے۔مثلاً’’Theodolite‘‘ کی کتاب’’ Practical land Surveying‘‘ کا ترجمہ’’رسالہ پیمائش زمین‘‘ کے عنوان سے منشی ہردیو سنگھ نے کیا۔یہ رسالہ زمین کی پیمائش کے آلات سے متعلق تھا۔ اسی طرح Young کی کتاب’’Machanism‘‘ کا ترجمہ’’رسالہ علم ادات‘‘ کے نام سے پنڈت رادھا کشن نے کیا۔اس رسالہ میں جیومیٹری کی شکلیں بنانے اور ان کے اصولوں پر مختلف کل پرزے بنانے کا طریقہ سکھایا گیا ہے۔دہلی کالج علم کا ایسا مرکز تھا جہاں انگریز بھی مترجم تھے۔اردو کے مترجم،جنھوں نے اپنی مادری زبان (انگریزی) سے بدیسی زبان (اردو) میں ترجمہ کیا وہ بھی میڈیکل سائنس کی کتاب کا ترجمہ۔مترجم ہیں دہلی کالج کے پرنسپل جوزف ہنری ٹیلر جنھوں نے Cooper کی کتاب’’Treatise on Surgery‘‘ کا اردو ترجمہ’’رسالہ بیچ بیان اعمالِ جراحی کے‘‘ نام سے کیا۔ جو مطبع العلوم دہلی سے 1848ء میں شائع ہوئی۔سرورق پر انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں کتاب اور مترجم کا نام صاف لفظوں میں لکھا گیا ہے۔نمونے کے طور پر یہاں چند ترجمہ شدہ کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے تا کہ اس سے حوصلہ پا کر دیگر اردو ذریعۂ تعلیم کے ادارے بھی اپنے کام کو آگے بڑھا سکیں۔

10.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد تین اہم تعلیمی اداروں فورٹ سینٹ جارج کالج، فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج کا قیام عمل میں آیا۔ جنھوں نے اردو زبان وادب کی خدمات انجام دی۔

☆ 1825ء میں قائم کردہ دہلی کالج وہ ادارہ تھا جو ہندوستانیوں کے لیے قائم کیا گیا اور جہاں ذریعۂ تعلیم اردو تھا۔

☆ دہلی کالج کے پرنسپل یوروپین اور اساتذہ ہندوستانی تھے۔ اس کالج میں مشرقی اور مغربی علوم کے شعبے مساوی تھے جنھیں بعد میں ضم کر دیا گیا۔

☆ چوں کہ ذریعۂ تعلیم اردو تھا اس لیے جدید علوم کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے کالج کے پرنسپل مسٹر بتروکی کوششوں سے ''ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی'' قائم ہوئی۔ اس سوسائٹی کے زیر نگرانی پرنسپل، اساتذہ اور طلبا نے مل کر مختلف علوم وفنون کی سینکڑوں کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔

☆ دہلی کالج کے فارغ التحصیل طلبا حرف اول کا درجہ رکھتے تھے چناں چہ ان طلبا کا ملک کے مختلف حصوں میں تقرر ہوتا تھا۔ جہاں انہوں نے کالج کا نام روشن کیا۔

☆ کالج کے رسائل ''قران السعدین'' اور ''خیر خواہِ ہند'' نے جدید اردو تنقید، سادہ اور عام فہم نثر، بامقصد شاعری اور اردو صحافت کی بنیاد رکھنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

☆ کالج نے ایسے طلبا کی تربیت کی جنھوں نے اردو فکشن کا آغاز کیا۔ اردو میں تذکرہ نگاری کی روایت کو فروغ بخشا، مشاعروں کی سرپرستی کی، جدید نظم نگاری کی تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا۔ غالب کی مکتوب نگاری اور منفرد نثر کے لیے راہ ہموار کی۔ سیاسی، سماجی، مذہبی اور ادبی کتابوں کو ترجمے کے ذریعے اردو میں منتقل کیا۔

☆ دہلی کالج نے اردو میں علمی مضامین کی بنیاد رکھی جو ذہنی بیداری کے آغاز کا سبب بنے نیز اردو والوں کو یوروپی ادب وفلسفے سے روشناس کرایا۔

☆ فکری اعتبار سے عالمگیر تہذیبی وحدت، سیاسی اعتبار سے لبرل ازم، سماجی اعتبار سے افادیت پسندی کا نقطۂ نظر دہلی کالج کے سامنے رہا جب کہ اساتذہ اور طلبا کے نزدیک تعلیم کا مقصد انفرادی معاشی فلاح اور ساتھ ہی ساتھ سماجی اصلاح تھا۔

☆ دہلی کالج نے سہ رخی مذہبی زاویہ پیش کیا چناں چہ دارالعلوم دیوبند، علی گڑھ تحریک اور تحریک انجمن پنجاب کے ڈانڈے دہلی کالج میں آکر ملتے ہیں۔

10.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
افادیت پسندی	:	فائدہ
فکری تنوع	:	مختلف افکار

مساوی	:	برابر
زبوں حالی	:	بربادی
آگاہی	:	واقفیت
اطلاق	:	عمل
ضم کرنا	:	ملانا
دسترس	:	پہنچ
شغف	:	شوق
عبقری	:	عظیم، بڑا
شگفتگی	:	خوشگوار
ثقیل الفاظ	:	بھاری بھرکم الفاظ
مطمح نظر	:	پیش نظر
مطبع	:	اشاعت گھر
فارغ التحصیل	:	تعلیمی اداروں سے تعلیمی سند حاصل کرنے والے طلبا
مکتوب نگاری	:	خطوط نگاری

10.5 نمونہ امتحانی سوالات

10.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ دہلی کالج کب قائم ہوا؟

2۔ دہلی کالج کے پہلے پرنسپل کا نام بتائیں؟

3۔ مولوی مملوک علی نانوتوی کس شعبہ کے صدر تھے؟

4۔ ماسٹر رام چندر کی کسی ایک تصنیف کا نام بتائیں؟

5۔ ''قران السعدین'' رسالہ کس نے جاری کیا؟

6۔ انگریزی میں منشی ذکاء اللہ کی سوانح عمری کس نے لکھی؟

7۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ایک ناول کا نام بتائیں؟

8۔ آب حیات کس کی تصنیف ہے؟

9۔ ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کو کس نے قائم کیا؟

10۔ طبقات شعرائے ہند کس نے لکھی؟

10.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ دہلی کالج کے قیام اور اس کے پس منظر پر روشنی ڈالیے۔

2۔ دہلی کالج کے کسی ایک پرنسپل کا تعارف کرائیں۔

3۔ ڈپٹی نذیر احمد کی خدمات پر مختصر نوٹ لکھیے۔

4۔ مولوی محمد حسین آزاد کی ادبی زندگی کو اجاگر کیجیے۔

5۔ ماسٹر رام چندر کی ترجمہ نگاری کا جائزہ لیجیے۔

10.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ دہلی کالج سے وابستہ نمایاں اساتذہ کرام کی خدمات کا مجموعی جائزہ لیجیے۔

2۔ دہلی کالج سے فارغ التحصیل نمایاں طلبا کا تعارف پیش کیجیے۔

3۔ ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی سے ترجمہ شدہ کتابوں کا جائزہ لیجیے۔

10.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	مرحوم دہلی کالج	مولوی عبدالحق
2۔	قدیم دہلی کالج	مالک رام
3۔	ماسٹر رام چندر	صدیق الرحمٰن قدوائی
4۔	مقالات آزاد	محمد حسین آزاد
5۔	واقعات دارالحکومت	مولوی بشیر الدین احمد
6۔	لکچروں کا مجموعہ	ڈپٹی نذیر احمد
7۔	کلیات گارساں دتاسی	گارساں دتاسی
8۔	ہندوستانی نشاۃ الثانیہ میں قدیم دہلی کالج کا کردار	ڈاکٹر شمس الہدیٰ

اکائی 11: جامعہ عثمانیہ

اکائی کے اجزا

11.0 تمہید
11.1 مقاصد
11.2 جامعہ عثمانیہ سے قبل
11.2.1 جامعہ عثمانیہ کی تحریک
11.2.2 جامعہ عثمانیہ کے قیام کا پس منظر
11.2.3 جامعہ عثمانیہ کی ابتدائی جماعتیں
11.3 جامعہ عثمانیہ کی ابتدائی تدریس اور عمارتیں
11.3.1 آرٹس کالج کی عمارت
11.3.2 جامعہ عثمانیہ کے شعبہ جات
11.3.3 آرٹس، سائنس اور قانون کے شعبہ جات
11.3.4 میڈیکل سائنس، انجینئرنگ اور تعلیمات کے شعبہ جات
11.3.5 یونیورسٹی سے کالجوں کا الحاق
11.4 نصابات کی تدوین
11.4.1 دارالترجمہ کی کارکردگی
11.4.2 دارالترجمہ کی اصطلاحات کمیٹی
11.4.3 دارالترجمہ کے ناظم اور مترجمین
11.5 ضمیمہ جات
11.5.1 جامعہ عثمانیہ کے چانسلرس (پولیس ایکشن سے قبل)
11.5.2 جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلرس
11.5.3 دارالترجمہ کے نظماء (خاتمہ تک)
11.5.4 دارالترجمہ کے چند اہم مترجمین
11.6 اکتسابی نتائج

11.7 کلیدی الفاظ
11.8 نمونہ امتحانی سوالات
11.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
11.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
11.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
11.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

11.0 تمہید

کس بھی ملک اور قوم کی ترقی کے سلسلہ میں ایجادات اور اختراعات کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ دنیا کی ہر بڑی قوم کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ ترقی کے اعلیٰ درجوں پر فائز ہو کر نئے نئے کارنامے انجام دیتی رہی ہے۔ ایک دور تھا جب کہ ساری دنیا میں ایجادات اور اختراعات کی وجہ سے ساری دنیا کے باشندے عربوں کی اقوام سے فیض اٹھاتے تھے۔ انقلاب فرانس کے بعد یہ تبدیلی رونما ہوئی کہ تیز رفتاری کے ساتھ یوروپی ممالک کی ترقی ہونے لگے اور نئی ایجادات کا سلسلہ یوروپ کی قسمت بن گیا۔ یوروپی اقوام نے فولاد کی ایجاد کے ذریعہ دنیا کی تاریخ میں بہت بڑا کارنامہ انجام دیا۔ جس کی وجہ سے جدید سائنسی ترقیات اور ایجادات کے استعمال کی شدید ضرورت کا احساس ہونے لگا۔ مشینوں نے یہ ضرورت پوری کی۔ دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف زبانوں کا رواج تھا۔ ایشیائی ممالک میں ہندوستان جیسے سب سے بڑی آبادی والے ملک کے لیے یہ مجبوری تھی کہ یوروپ کی جدید ترقیات اور ایجادات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے زبان بلاشبہ رکاوٹ بن رہی تھی۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے اور یوروپ کی جدید ترقیات اور ایجادات کو ہندوستان کی سرزمین میں نمائندگی دینے کے لیے جس قسم کی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ اس میں دہلی کالج کے کارنامے، انجمن پنجاب لاہور کی ترجمہ نگاری، سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی اور جامعہ عثمانیہ کی نصابی کتابوں کی ترتیب و تدوین کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہندوستان کی بے شمار علاقائی زبانوں میں اردو زبان ہی ایک ایسی زبان ہے، جس میں سب سے پہلے یوروپی زبانوں سے آنے والی ترقیات اور ایجادات کو منتقل کر کے کتابیں شائع کی گئیں۔ اس خصوص میں بیسویں صدی کے آغاز میں ریاست حیدرآباد کے ساتویں فرمانروا نواب میر عثمان علی خان کا اہم کارنامہ رہا کہ انھوں نے اپنی ریاست کی اردو زبان کو ترقی دیتے ہوئے اردو کی پہلی یونیورسٹی ''جامعہ عثمانیہ'' کا قیام عمل میں لایا۔ اس جامعہ میں تمام علوم وفنون کے علاوہ سائنس، انجینئرنگ، میڈیسن اور قانون کی تعلیم کے لیے اردو نصابات کا آغاز کیا گیا اور مقامی سطح پر مشہور طباعت کے معیار کو برقرار رکھتے ہوئے انگریزی کی سائنس و ٹکنالوجی کی کتابوں کے اردو میں ترجمہ کا آغاز کیا گیا۔ چناں چہ جامعہ عثمانیہ کے تمام نصابات کی تکمیل کے لیے ''دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ'' کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے ذریعہ نہ صرف عمدہ اور نایاب کتابیں ترجمہ کی گئیں جو جامعہ عثمانیہ کے معیاری نصاب کا ذریعہ بنتی رہیں۔ جس کی وجہ سے ہندوستان کی پہلی ہندوستانی زبان کی یونیورسٹی اور اردو ذریعہ تعلیم سے اعلیٰ تعلیم کو فروغ دینے کی وجہ سے ساری دنیا میں جامعہ عثمانیہ کا اپنا امتیاز قائم ہو گیا۔

11.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ جامعہ عثمانیہ سے قبل اوراس کے بعد کی تاریخ پر روشنی ڈال سکیں۔

☆ جامعہ عثمانیہ کے قیام اوراس کی ابتدائی جماعتوں کے بارے میں تفصیلات بیان کرسکیں۔

☆ جامعہ عثمانیہ کی تدریس اوراس کی مختلف عمارتوں کا حال بیان کرسکیں۔

☆ جامعہ عثمانیہ کے مختلف شعبے جات اوران کی کارکردگی پر روشنی ڈال سکیں۔

☆ نصابات کی تدوین اوردارالترجمہ کے کارناموں کے علاوہ ناظم اورمترجمین کے کارناموں پراظہارخیال کرسکیں۔

11.2 جامعہ عثمانیہ سے قبل

ریاست حیدرآباداگرچہ ملکی ریاست تھی، جس میں ٹپہ خانہ، کرنسی، ریلوے، ٹرانسپورٹ اور ہوائی اڈے کے ساتھ ساتھ ڈاک وتار کے محکمہ قائم کر کے انتظامی صلاحیتوں اور باضابطہ عدالت اورمختلف محکمہ جات کے قیام پرتوجہ دی گئی۔ حیدرآباد میں کسی یونیورسٹی کے قیام سے قبل انگریزحکومت ہندوستان میں ممبئی، کولکتہ، اور مدراس میں یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں لائی تھی۔ ریاست حیدرآباد کے طالب علموں کواعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے اندرون ریاست مواقع فراہم نہیں تھے، اگر ریاست حیدرآباد کا کوئی باشندہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا تو وہ مدراس یونیورسٹی یا پھرعلی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے اورایم اے کے علاوہ دوسری ڈگریاں حاصل کرنے پرتوجہ دیتا تھا۔ حیدرآباد میں صرف دوکالجوں کا رواج تھا۔ امیروامراء اور جاگیرداروں کے خاندان کے ''جاگیردارکالج (موجودہ بیگم پیٹ ہائی اسکول)'' میں شریک ہوتے تھے، جب کہ ''نظام کالج'' جیسے ادارے میں عام شہریوں کوداخلے کی اجازت تھی۔ میرعثمان علی خان آصف جاہ سابع کی تخت نشینی 1911ء سے قبل ریاست حیدرآباد کے بادشاہ کی حیثیت سے نواب میرمحبوب علی خان نے ''محبوب یونیورسٹی'' کے قیام کے لیے کوشش کی تھی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے، لیکن اپنی زندگی میں انہوں نے عوام کی بھلائی کے لیے مذہبی یونیورسٹی ''جامعہ نظامیہ'' 1872ء میں قائم کی اورعوام کومذہبی تعلیم کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے باضابطہ وقیع لائبریری ''آصفیہ کتب خانہ'' کی بنیادرکھی۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے قبل حیدرآباد میں تعلیمی سرگرمیاں جاری تھیں۔ مختلف تعلقوں اوراضلاع میں پرائمری اور ہائی اسکول قائم تھے۔ لیکن کسی بھی ضلع میں کالج کا تصورنہیں تھا۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے قبل باضابطہ تعلیمی سرگرمیاں ریاست حیدرآباد کا حصہ تھیں۔ لڑکوں کے لیے علیحدہ مدارس اورلڑکیوں کے لیے علیحدہ مدارس کا انتظام تھا۔ اوران مدارس کومدرسہ ذکوراور مدرسہ اُناث کی حیثیت سے اہمیت حاصل تھی۔ غرض جامعہ عثمانیہ کے قیام سے قبل ہی حیدرآباد کا تعلیمی نظام مستحکم تھا۔ لیکن کسی بھی قسم کی جدید یونیورسٹی قائم نہ تھی۔ صرف دوکالجوں کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ ریاست حیدرآباد کے اطراف واکناف میں مدراس یونیورسٹی اورمیسور یونیورسٹی کے ذریعہ اعلیٰ تعلیمی نظام کا سلسلہ جاری تھا۔

11.2.1 جامعہ عثمانیہ کی تحریک:

عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے لیے شاہی حکمران کی علم دوستی کواہمیت حاصل ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی بھی ادارہ اچانک وجود میں نہیں آتا۔ ریاست حیدرآباد میں ایک نئی یونیورسٹی کے قیام کے لیے عوامی تحریک بھی جاری تھی۔ اس مقصد کو بادشاہِ وقت نے پورا کیا۔ انجمن طلبائے قدیم دارالعلوم حیدرآباد نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ریاست کے طلبا اورطالبات کے لیے ایک یونیورسٹی کا قیام لازمی ہے جس کے ذریعہ اس علاقہ کے باشندگان کواعلیٰ تعلیم کے مواقع فراہم ہوجائیں۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے پہلے 1884ء میں جب نواب میرمحبوب علی خان اقتدار سے وابستہ تھے۔ نواب رفعت یارجنگ اوران کے ہم عصرساتھیوں میں سرسالارجنگ اول اورنواب مختارالملک نے 1292ھ مطابق 1875ء کوایک محضرپیش کیا،

جس میں ایسی یونیورسٹی کے قیام پر زور دیا گیا جو اردو ذریعہ تعلیم سے جدید علوم کی تدریس پر توجہ دے۔اس محضر کے 9 سال بعد علامہ جمال الدین افغانی جب حیدرآباد آئے تو انہوں نے بھی اس تحریک کی حمایت کی۔تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ لارڈ رِپن کی توجہ اس جانب مبذول کروانے کے لیے حکومت سے گذارش کی گئی۔آصف سادس کی نگرانی میں باغ عامہ کے احاطہ میں جلسہ منعقد کیا گیا جس میں ''محبوب یونیورسٹی'' کے قیام کا خاکہ پیش کیا گیا۔دارلعلوم حیدرآباد کے فارغ طلبا نے 1332ھ مطابق 1913ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی تو ریاست میں ایک نئی یونیورسٹی کے قیام کی ضرورت پر زور دیا۔اِن تمام تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ عوامی نمائندگی اور شاہی دلچسپی کے نتیجہ میں ایک نئی یونیورسٹی کے قیام کے حالات پیدا ہوئے۔جس میں نواب رفعت یار جنگ اور عوامی نمائندے ہی نہیں، بلکہ ایجوکیشن کانفرنس کی جستجو کو بھی بڑا دخل ہے۔ایجوکیشنل کانفرنس کے سربراہوں میں مولوی محمد مرتضٰی، مولوی ملا عبدالباسط، مولوی رضی الدین کیفی، سید بہاءالدین شطاری، جمال الدین اور محمد مظہر شامل تھے۔جنہوں نے ریاست کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے یونیورسٹی کے قیام پر زور دیا۔غرض ان تمام نمائندگیوں اور عوامی جستجو کی وجہ سے نواب میر محبوب علی خان کے دور میں جو جامعہ قائم نہ ہوسکی تھی۔میر عثمان علی خان کے عہد میں جامعہ عثمانیہ کی شکل جدید علوم کی وہ جامعہ قائم ہوگئی۔۔

11.2.2 جامعہ عثمانیہ کے قیام کا پس منظر:

ریاست حیدرآباد میں اردو ذریعہ تعلیم سے جدید علوم کی یونیورسٹی کے لیے پہلی عرض داشت 22/اپریل 1917ء کو پیش کی گئی۔جس میں سر اکبر حیدری معتمد تعلیمات نے میر عثمان علی خان بادشاہِ وقت کی خدمت میں معروضہ پیش کیا تھا کہ ریاست کی ضرورت کی تکمیل کے لیے نئی یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا جائے۔اس معروضہ کو فخر الملک معین المہام عدالت و کوتوالی اور امور عامہ کی طرف سے منظوری دی گئی۔ناظم تعلیمات اور اکابرین قوم و ملت ہی نہیں، بلکہ ماہرین تعلیم سے تفصیلات دریافت کی گئیں۔اس عرض داشت پر فخر الملک کے علاوہ اکبر حیدری اور ناظم تعلیمات سر راس مسعود سرسید کے پوتے کے دستخط بھی موجود تھے۔اس نمائندگی کے باوجود وائسرائے لارڈ ہارڈنگ نے رائے دی تھی کہ غیر زبان کے ذریعہ تعلیم کے نقصانات بہت زیادہ ہیں اور مجوزہ جامعہ کے بارے میں شبہات ظاہر کیے گئے تھے؛ جس کی وجہ سے اردو ذریعہ تعلیم کی یونیورسٹی قائم کرنے میں رکاوٹ درپیش ہوئی۔جس کے جواب میں نواب عماد الملک، پروفیسر مارگولیتھ، پروفیسر عربی آکسفورڈ یونیورسٹی مسٹر فشر لیڈس یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر بائیکل ووڈ واٹر، لیفٹننٹ گورنر پنجاب مسٹر گلانسی، معین المہام فینانس نے دوبارہ مجوزہ یونیورسٹی کے قیام کی ضرورت پر زور دیا۔غرض اس یادداشت اور عرضداشت کے جواب میں بادشاہِ وقت نے فرمان جاری کیا جس پر امین جنگ صدر المہام پیشی کے دستخط تھے۔جو 1335ھ مطابق 1917ء کی یادگار رہے۔جس میں بادشاہِ وقت نے یونیورسٹی کے قیام کے احکامات جاری کیے تھے۔اس فرمان میں حضور نظام نے فرمایا تھا:

> ''مجھے بھی عرضداشت اور یادداشت کی مصرحہ رائے سے اتفاق ہے کہ ممالک محروسہ کے لیے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں جدید و قدیم مشرقی و مغربی علوم و فنون کا امتزاج اس طور سے کیا جائے کہ موجودہ نظام تعلیم کے نقائص دور ہوکر جس میں دماغی و روحانی تعلیم کے قدیم و جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل ہوسکے اور جس میں علم پھیلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ایک طرف طلبا کے اخلاق کی درستی کی نگرانی ہو اور دوسری طرف تمام علمی شعبوں میں اعلیٰ درجہ کی تحقیق کا کام بھی جاری رہے''۔اس فرمان میں یہ بھی حکم صادر ہوا کہ ''حیدرآباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کی کاروائی شروع کی جائے''۔

اس حوالہ سے پتہ چلتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے لیے باضابطہ ماحول تیار ہو گیا۔ بادشاہِ وقت کے فرمان کے توسط سے 1918ء میں جامعہ عثمانیہ کے قیام سے ایک سال قبل جامعہ کے نصابات کی کتابوں کی اشاعت کے لیے ایک نئے محکمہ کے قیام کی اجازت دی گئی۔ جس کے تحت 14/اگست 1917ء کو دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے ذمہ جامعہ عثمانیہ کی تمام نصابی کتابوں کی ترتیب و اشاعت اور اُنہیں نصاب میں شامل کرنا تھا۔ اس طرح اردو ذریعہ تعلیم سے شروع کی جانے والی ہندوستان کی پہلی یونیورسٹی میں اردو نصاب مرتب و جاری کرنے کے لیے بادشاہِ وقت کے فرمان کے ذریعہ یونیورسٹی کا قیام اور اس کے نصابات کی تیاری کے لیے دارالترجمہ کا قیام اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے۔

11.2.3 جامعہ عثمانیہ کی ابتدائی جماعتیں:

عثمانیہ یونیورسٹی میں سب سے پہلے انٹرمیڈیٹ کی کلاسوں کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے دو شعبے یعنی فنون Arts اور دینیات کی تعلیم شروع کی گئی۔ مختلف عرضداشتوں اور احکامات کے ذریعہ یہ پتہ چلتا ہے کہ 15/اگست 1918ء کو ''عثمانیہ یونیورسٹی کا دستور العمل'' منظور کیا گیا۔ اس وقت مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی صدر یار جنگ صدر الصدور کے عہدہ پر فائز تھے۔ جب کہ محمد اکبر نذر علی حیدری معتمد عدالت و کوتوال سرکار عالی نے بھی دستخط کیے۔ تاریخی پس منظر میں یہ بتایا ہے کہ یکم ذی الحجہ 1337ھ مطابق 28/اگست 1919ء کو باضابطہ تعلیم کا آغاز ہوا۔ اردو کے علاوہ انگریزی زبان بھی باضابطہ پڑھائی جانے لگی۔ یونیورسٹی کا نصاب بھی تیار کیا گیا اور اساتذہ کا انتخاب بھی عمل میں آیا۔ احکامات کے مطابق شوال 1337ھ مطابق 1918ء اساتذہ کا تقرر بھی ہو گیا۔ یونیورسٹی کے نصاب میں اردو، تلگو، مراٹھی، کنڑی اور تامل زبانوں کو شامل کیا گیا۔ اس کے علاوہ انگریزی کے دو پرچے، تاریخ و جغرافیہ کے دو پرچے، ریاضی کے دو پرچے، نیچرل سائنس کا ایک پرچہ، علوم السنہ میں کوئی ایک زبان جیسے عربی، سنسکرت، فارسی، تلگو، مراٹھی، کنڑی، تامل، فرانسیسی اور لاطینی کے علاوہ یونانی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی سہولت فراہم کی گئی۔ جامعہ عثمانیہ کی پہلی جماعت ایف اے (فیلو آف آرٹس) میں داخلہ لینے والے طلبا کے نام عبدالمجید صدیقی، احمد بن عبداللہ، عزیز الرحمٰن، ابوالفتح نصر اللہ اور وینکٹیشو رراؤ تھے۔ جب کہ اورنگ آباد سے شریک ہونے والے طلبا میں یوسف الدین، کلیم الدین انصاری اور انیس احمد شامل تھے۔ جامعہ عثمانیہ کے دفتر، مسجل (رجسٹرار) پروفیسر اور مددگاروں کے نام اخبارات میں شائع کیے گئے۔

11.3 جامعہ عثمانیہ کی ابتدائی تدریس اور عمارتیں

ہندوستان گیر سطح پر ہی نہیں، بلکہ عالمی سطح پر ریاست حیدرآباد میں اردو یونیورسٹی کے قیام کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ جب کہ بنگالی زبان کے عالمگیر شہرت یافتہ شاعر رابندر ناتھ ٹیگور نے حیدرآباد کے بادشاہ کی جانب سے ہندوستانی ذریعہ تعلیم کی پہلی یونیورسٹی کے قیام پر مبارکباد دی تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام اور اس کے توسط سے انجام دی جانے والی سرگرمیوں کا احاطہ بہت کم کتابوں میں دکھائی دیتا ہے۔ اس خصوص میں چند تفصیلات بطور نمونہ پیش ہیں:

> ''بادشاہِ وقت کی جانب سے 26/اپریل 1917ء کو عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کی منظوری دے دی گئی۔ 22/ستمبر 1918ء تک یونیورسٹی قائم کرنے کے سلسلہ میں تمام بنیادی کام انجام دیئے گئے اور اسی 22/ستمبر 1918ء کو سرکاری طور پر عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا۔ اس اعلان کے ساتھ عثمانیہ یونیورسٹی کی باضابطہ جماعتوں کے آغاز کے لیے مقام اور عمارتوں کے لیے غور کیا جانے لگا۔ سب سے پہلے عابد روڈ کے علاقہ میں موجود توپ کا سانچہ جسے

آج ''گن فاؤنڈری'' کہا جاتا ہے' اس علاقہ میں کئی عمارتوں کو منتخب کیا گیا۔ ان تمام عمارتوں میں سب سے خوبصورت عمارت '' آغا منزل'' تھی۔ اس خوبصورت عمارت کے احاطہ میں 28 /اگست 1919ء کو نواب صدر یار جنگ نے بحیثیت وائس چانسلر صبح 10 بجے عثمانیہ یونیورسٹی کا افتتاح کیا۔ اس یادگار تقریب میں ملک کے امراء، علم وادب کے چاہنے والے، اردو ادب کے جانثار اور مسٹر ولنکر موجود رہے۔ وائس چانسلر نے خطبہ افتتاحیہ پڑھا اور توپ کا سانچہ کے علاقہ میں جامعہ عثمانیہ کا آغاز ہوا۔ اس کے ساتھ ہی کئی کرائے کی عمارتوں کو حاصل کرلیا گیا اور ان عمارتوں میں الگ الگ مضامین کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا۔ ہر عمارت کو اس کے مضمون کی بنیاد پر شناخت دی گئی جیسے '' آغا منزل'' کو انتظامیہ کی بلڈنگ اور دوسری عمارتوں کو قانون منزل، سائنس منزل، آرٹس منزل اور طبابت منزل کا نام دیا گیا۔ پہلی مرتبہ کلیہ جامعہ عثمانیہ کے آغاز کی تفصیلات درج کرتے ہوئے نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب '' دکن میں اردو'' میں اس کی تفصیلات درج کی ہیں''۔

اِن حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد پہلی مرتبہ تدریس کا آغاز 28 /اگست 1919ء کو بمقام توپ کا سانچہ (گن فاؤنڈری) کے احاطہ میں ہوا۔ ابتداء میں آرٹس فیکلٹی کی بنیاد رکھی گئی اور اساتذہ کے تقررات کو قطعیت دینے کے بعد مختلف علوم وفنون کی تعلیم کی طرف توجہ دی گئی اور ان کی تدریس کا بھی انتظام کیا گیا۔ جامعہ عثمانیہ کے تمام شعبہ جات کا تعلیمی سلسلہ عابد روڈ کے احاطہ میں جاری رہا۔ 1935ء میں اڈکمیٹ کے علاقہ میں جامعہ عثمانیہ کی نئی عمارتوں کی تعمیر کی منظوری دی گئی۔ چناں چہ مشہور زمانہ آرٹس کالج کی عمارت اور دیگر سائنس، انجینئرنگ، قانون، تعلیمات' شعبۂ امتحانات اور انتظامی امور کے شعبے 1938ء میں اڈکمیٹ منتقل ہوگئے۔ 1935ء سے 1938ء تک اس علاقہ میں عمارتوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا۔ ستمبر 1948ء تک جامعہ عثمانیہ کا ذریعہ تعلیم اردو رہا۔ 1948ء میں ''سقوط حیدرآباد'' اور ریاست حیدرآباد کے انڈین یونین میں انضمام کی وجہ سے ریاست کے مشہور تعلیمی ادارے ''جامعہ عثمانیہ'' کے ذریعہ تعلیم کو اردو سے انگریزی میں منتقل کردیا گیا۔ اس خصوص میں کوئی سینٹ کی میٹنگ ہوئی اور نہ ہی عوامی رائے کا لحاظ کیا گیا' بلکہ نئی حکومت کے اعلامیہ کے ساتھ جامعہ عثمانیہ کے اردو ذریعہ تعلیم کو وقفہ وقفہ سے ختم کردیا گیا۔ اس وقت جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی تھے۔

11.3.1 آرٹس کالج کی عمارت:

بادشاہِ وقت میر عثمان علی خان نے آرٹس کالج کی عمارت کے لیے عالمی سطح کے مقابلے منعقد کیے۔ اس مقابلے میں ولیم جاسپر کے نقشے کو پسند کیا گیا۔ اس نقشے پر آرٹس کالج کی عمارت کی تعمیر کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس عمارت کی خوبی یہ ہے کہ اس کی پہلی منزل کی تعمیر میں مندروں کے ستون کے طریقہ کو اختیار کیا گیا ہے۔ جب کہ دوسری منزل کی عمارت کے ستون مسجد کے طرز کی نمائندگی کرتے ہیں اور آرٹس کالج کا باب الداخلہ عیسائی چرچ کی تعمیر کا نمائندہ ہے۔ اس طرح آرٹس کالج کی عمارت میں بیک وقت تین بڑے مذاہب ہندو، مسلمان اور عیسائی ثقافتوں کے اشتراک کا انداز واضح ہے۔ ہر فیکلٹی کی عمارت اس طرز پر تعمیر کی گئی ہے۔ آرٹس کالج کی عمارت کی تعمیر پر بادشاہِ وقت نے 30 لاکھ روپئے منظور کیے۔ اس عمارت کی تعمیر میں مقامی پہاڑوں کا پتھر استعمال کیا گیا ہے۔ عمارتوں کی تعمیر کے لیے نواب زین یار جنگ اور سید علی رضا جیسے پی ڈبلیوڈی کے انجینئروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جنہوں نے اڈکمیٹ کے کیمپس کا انتخاب کرکے اس علاقہ میں یونیورسٹی کی عمارتوں کی تعمیر کی اجازت دی۔ عمارتوں کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے کے لیے بادشاہِ وقت نے اُس دور کی عالمی سیاحت کے لیے 6,146 پاؤنڈ کی رقم منظور کی تاکہ عالمی سطح پر مشہور اہم

عمارتوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد جامعہ عثمانیہ کی عمارتوں کا ڈیزائن تیار کیا جائے۔غرض آرٹس کالج کی عمارت عالمی سطح پر منفرد انداز اور جمالیاتی حسن کی نمائندگی کرنے والی عمارتوں میں شمار کی جاتی ہے۔

11.3.2 جامعہ عثمانیہ کے مختلف شعبہ جات:

عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے توسط سے نہ صرف جدید علوم فنون کی تعلیم کی طرف توجہ دی گئی بلکہ مختلف شعبہ جات کے علاوہ فیکلٹیز کے قیام اوراس کی کتابوں کی فراہمی پر خصوصی توجہ دی گئی۔سب سے پہلا اور بڑا شعبہ ''فیکلٹی آف آرٹس'' قرار دیا گیا،جس کے پہلے حصہ میں زبانوں کی تعلیم پر توجہ دی گئی۔فیکلٹی آف آرٹس کے دوسرے حصہ میں تاریخ اور جغرافیہ کی جانب توجہ دی گئی۔جس میں اسلامی، یونانی، رومی اور ہندوستانی تاریخ اور جغرافیہ شامل تھے۔ یہ شعبہ بھی سب سے بڑا شعبہ تھا۔اس کے بعد فلسفہ،منطق،نفسیات، اخلاقیات، مابعد الطبیعیات، سماجیات، سیاسیات اور معاشیات کو بھی شعبہ آرٹس سے وابستہ کیا گیا۔ جامعہ عثمانیہ کا ''فیکلٹی آف لا'' کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا،جس میں بین الاقوامی، آئین، یونانی، ہندوستانی اور کریمنل قانون کی تعلیم دی جاتی تھی۔فیکلٹی آف سائنس میں ریاضی اور سائنس شامل تھے،جب کہ فیکلٹی آف سائنس کے دوسرے شعبے میں فزکس اور کیمیاء کی تعلیم دی جاتی تھی۔فیکلٹی آف انجینئرنگ میں میکانیکل اور انجینئرنگ کے شعبے جات شامل تھے۔فیکلٹی آف میڈیسن میں معالجات اور آپریشن کی تعلیم دی جاتی تھی۔اس کے علاوہ جامعہ عثمانیہ میں فیکلٹی آف ایجوکیشن بھی موجود تھا۔یہی نہیں بلکہ زبانوں کے شعبے جات کے علاوہ دو علیحدہ شعبے دینیات اور اخلاقیات کے شامل تھے۔انہیں بھی فیکلٹی آف آرٹس کا درجہ حاصل تھا۔اس کے علاوہ آرٹس فیکلٹی میں سوشیالوجی، سیاسیات اور معاشیات بھی شامل تھے۔غرض عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے بعد آرٹس فیکلٹی کے تین شعبے قانون کا شعبہ اورفیکلٹی آف سائنس کے تین شعبے انجینئرنگ اور میڈیسن کے کئی شعبوں پر مشتمل عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔جس کے ذریعہ طلبا اور طالبات کو باضابطہ تدریس کا اہتمام کیا گیا۔

11.3.3 آرٹس،سائنس اور قانون کے شعبہ جات:

جامعہ عثمانیہ میں آرٹس کے شعبے کو کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ علوم السنہ کا تعلق بھی شعبہ آرٹس سے تھا۔ چناں چہ آرٹس کے ذریعہ سب سے پہلے زبانوں کی تعلیم پر توجہ دی گئی۔جس کے تحت مشرق وسطیٰ کی زبانوں میں عربی اور فارسی کو نصاب کا درجہ دیا گیا۔ہندوستانی زبانوں میں شمالی ہند کی سب سے مقبول زبان یعنی سنسکرت کو نصاب کا موقف دیا گیا۔علوم السنہ میں جنوبی ہند کی تمام زبانوں کی تعلیم و تدریس کا اہتمام کیا گیا' کیوں کہ جامعہ عثمانیہ کا تعلق جنوبی ہند سے تھا۔یہی وجہ رہی کہ تلگو، مراٹھی، کنڑی اور تامل زبان کے شعبے قائم کیے گئے جن کا تعلق آرٹس فیکلٹی سے تھا۔اس کے علاوہ بیرونی زبانوں میں فرانسیسی، لاطینی اور یونانی زبانوں کے شعبے قائم کیے گئے۔ان کا تعلق بھی آرٹس فیکلٹی میں ہوتا ہے۔اس کے علاوہ آرٹس فیکلٹی کے توسط سے باضابطہ السنہ کے بعد فلسفہ، مابعد الطبعیات،نفسیات، منطق اور اخلاق کو شمار کیا گیا۔فیکلٹی آف آرٹس کا تیسرا حصہ سماجیات، سیاسیات اور معاشیات سے وابستہ رہا۔ جب کہ فیکلٹی آف آرٹس کا چوتھا حصہ تاریخ وجغرافیہ سے متعلق ہے جس کے تحت ان شعبہ جات میں اسلامی تاریخ، ہندوستانی تاریخ (قدیم وجدید)،عہد وسطیٰ کی تاریخ،عہد حاضر کی تاریخ، یونان کی تاریخ،روم اور یوروپ کی تاریخ کی تدریس کے علاوہ کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری تھا۔اس طرح فیکلٹی آف آرٹس کا تعلق علوم السنہ اور دوسرے شعبہ جات سے رہا۔

جامعہ عثمانیہ کے سائنس کا تعلق بھی تین مختلف شعبوں سے رہا۔ پہلا شعبہ ریاضی اور سائنس سے متعلق تھا جس کے تحت الجبرا، جامیٹری،

ٹرگنومیٹری کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جس کے بعد سائنس کے دوسرے شعبے میں فزکس کو اہمیت حاصل تھی جس کے ذریعہ آواز اور نور، الکٹری سٹی، مقناطیسیت، جنرل فزکس اور پریکٹیکل فزکس کے موضوعات کو درس وتدریس میں شامل کیا گیا تھا۔فیکلٹی آف سائنس کے تیسرے شعبے میں کیمسٹری یا کیمیا کو داخل کیا گیا تھا۔ جس کے ذریعہ فزیکل کمیسٹری، نامیاتی کیمسٹری، کیالکولس، اپلائیڈ میتھامیٹکس اور آسٹرانومی کے علاوہ پریکٹیکل کیمسٹری، جیالوجی، باٹنی اور زوالوجی کے شعبے بھی شامل تھے۔ اِن تمام شعبہ جات کو سائنس کی تعلیم سے وابستہ کیا گیا تھا۔

جامعہ عثمانیہ میں باضابطہ قانون کا شعبہ قائم تھا۔اس قانون کے شعبے کو علیحدہ فیکلٹی کا درجہ حاصل تھا جس کی علیحدہ عمارت اور علاحدہ اساتذہ تھے۔ یہاں اینشینٹ لاء، جورلیس پروڈنس، بین الاقوامی قانون، آئینی قانون، کریمنل قانون، پرسنل قانون، لاءآف ٹراٹس، لاءآف ایویڈنس، یونانی قانون، سنسکرت قانون، یوروپی قانون اور ایشیائی قانون کی درس وتدریس کا اہتمام کیا گیا تھا۔اس طرح شعبہ آرٹس، سائنس اور قانون میں نہ صرف اساتذہ کا تقرر عمل میں لایا گیا تھا' بلکہ ہر شعبے کی اہم عمارت کے علاوہ اس کے ساتھ ہی تدریس کے لیے جماعتوں کا قیام بھی عمل میں لایا گیا تھا۔

11.3.4 میڈیکل سائنس، انجینئرنگ اور تعلیمات کے شعبہ جات:

جامعہ عثمانیہ کے مختلف شعبوں کو جدید انداز سے وابستہ کرنے کے لیے باضابطہ جماعتوں کا اہتمام اور اساتذہ کے تقرر کے علاوہ تجربہ گاہیں بھی قائم کی گئیں' جس کے ساتھ جماعتی تدریس کا طریقہ اختیار کیا گیا۔میڈیکل سائنس کی تعلیم کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے عثمانیہ یونیورسٹی میں باضابطہ فیکلٹی آف میڈیسن کے تحت اناٹومی، ہسٹالوجی، فزیالوجی، سرجری، آپتھمالوجی اور ڈیسیز آف ویمنس کے شعبے قائم رہے۔ جہاں اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ کا تقرر عمل میں آیا اردو ذریعہ تعلیم سے میڈیسن کی تعلیم کو عام کیا گیا۔غرض دارالترجمہ کی نصابی کتابوں کی وجہ سے میڈیسن کی تعلیم کو اردو میں فروغ حاصل ہوا۔اسی طرح انجینئرنگ کی فیکلٹی کے ذریعہ سیول اور میکانیکل انجینئرنگ کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا۔جس کے لیے علاحدہ عمارت اور اس کے مختلف شعبے قائم کیے گئے۔ اِسی طرح اساتذہ کی فراہمی اور ان کی تربیت کے لیے کالج آف ایجوکیشن قائم کیا گیا' جس کے تحت علوم السنہ کی تدریس کے علاوہ سائنس کی تدریس کے مواقع فراہم کیے گئے۔ تدریسیات پر کتابوں کی فراہمی کے علاوہ مشرقی اور یوروپی طریقہ تدریس کے طریقوں پر مواد فراہم کیا گیا۔ چناں چہ فیکلٹی آف ایجوکیشن کے توسط سے اساتذہ کی تربیت اور ان کو عملی تدریسیات اور بچوں کی نفسیات سے وابستہ کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی۔اس طرح جامعہ عثمانیہ کے اِن شعبہ جات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

11.3.5 یونیورسٹی سے کالجوں کا الحاق:

جامعہ عثمانیہ کے قیام 1918ء کے بعد ہندوستان کی آزادی اور 1966ء تک اس یونیورسٹی سے 20 کالجوں کا الحاق تھا۔جس کے مطابق آرٹس کالج کیمپس میں 6 کالجس، شہر میں 7 کالجس اور اضلاع میں 7 کالجوں کا الحاق تھا' جو رفتہ رفتہ ترقی کرتا ہوا شہر میں 16 کالجس اور اضلاع میں 44 کالجس کے الحاق کا آغاز ہوا۔ 1966ء میں ریاست آندھراپردیش میں جملہ 91 کالجس موجود تھے۔ جن میں 68 کالجس شہر میں واقع تھے۔ جب کہ 31 کالجس اضلاع میں تھے۔ 2000ء تک جامعہ عثمانیہ کو دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی کا درجہ اس لیے حاصل تھا کہ اس یونیورسٹی سے ساری ریاست کے 1750 کالجس کا الحاق تھا۔ 2000ء کے بعد ریاست آندھراپردیش نے اطراف واکناف میں کئی یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں لایا۔ جس کی وجہ سے عثمانیہ یونیورسٹی سے ملحقہ بعض کالج دوسری یونیورسٹیوں کو دیے گئے۔ جامعہ عثمانیہ کی صد سالہ تقاریب 1918ء میں اس یونیورسٹی سے ملحقہ کالجس کی تعداد 950 تھی دنیا کی کسی بھی یونیورسٹی سے ملحق اتنی بڑی کالجوں کا تعداد موجود نہیں ہے' اس لیے جامعہ عثمانیہ کو بیشمار

کالجوں اور ریسرچ سنٹرس کے الحاق کا اعزاز ہے۔

11.4 نصابات کی تدوین

عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام اور اس کی ذریعہ تعلیم کو اردو میں تقویت پہنچانے کے لیے سب سے بڑی ضرورت یہی تھی کہ جدید علوم وفنون کی تعلیم و تدریس کے لیے معیاری اور اعلیٰ سطحی کتابوں کی فراہمی پر توجہ دی جائے۔عثمانیہ یونیورسٹی سے پہلے حیدرآباد کا نصاب تعلیم روایتی قسم کا تھا۔ اگر چہ ہائی اسکول درجہ تک کی تعلیم کے لیے 1911ء میں میر عثمان علی خان نے کمیٹی قائم کر کے ریاست کی تعلیمی ترقی پر توجہ دی تھی۔جس کی وجہ سے دسویں جماعت تک علوم السنہ کے علاوہ سائنس اور صنعت وحرفت کی تعلیم کو فروغ دیا گیا تھا۔ہندوستان کی سرزمین میں جامعاتی سطح پر نصابات کی تدوین اور یوروپی یونیورسٹیوں کے معیارات کو برقرار رکھتے ہوئے جامعہ عثمانیہ میں تدریس پر خصوصی توجہ دی گئی' اور ملک گیر سطح سے قابل اساتذہ کو اس جامعہ میں تدریس کے لیے مدعو کیا گیا۔اس خصوص میں ہر شعبہ جات اور فیکلٹی سے متعلقہ سینئر اور تجربہ کار اساتذہ پر مبنی باضابطہ کمیٹی کا اہتمام کیا گیا۔ ہر قسم کی کمیٹی کی تشکیل کے معاملے میں شعبہ جات کو اختیارات دیئے گئے کہ وہ اپنی یونیورسٹی کے شعبے سے متعلق ہی نہیں بلکہ دوسری یونیورسٹی کے شعبے جات کے اساتذہ کو بھی نصابات کمیٹی میں شامل کریں۔اس طرح جامعہ عثمانیہ میں پہلی مرتبہ جمہوری انداز سے نصابات کی تدوین کا آغاز ہوا۔اگر چہ یونیورسٹی کو بادشاہِ وقت نے قائم کیا تھا لیکن یونیورسٹی کے تمام معاملات میں جمہوری انداز اختیار کیا جاتا تھا' چناں چہ ہر زبان، ہر علم اور ہر فیکلٹی کے علاوہ ہر شعبے سے متعلق نصابی کمیٹیوں کا آغاز ہوا۔اِن نصابی کمیٹیوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ عالمی معیار کی جامعات کے نصابات کو پیش نظر رکھ کر یا پھر دنیا کی مشہور جامعات میں بطور نصاب رائج شدہ کتابوں کو نصاب میں شامل کریں اور اُن کتابوں کو عالمی زبانوں سے اردو میں منتقل کرنے کے لیے اقدامات کریں۔اس مقصد کے لیے نصابات کمیٹی کی طرف سے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کو نمائندگی دی جاتی تھی۔چناں چہ نصاب سے متعلق پیش کردہ کتاب کے ترجمے اور اس کی اشاعت پر خصوصی توجہ مرکوز کی جاتی تھی۔غرض دارالترجمہ کا شعبہ اور اس کے مختلف ذیلی شعبے کتابوں کے ترجمے اور اس کی کتابت کے علاوہ اشاعت کی ذمہ داری پوری طرح انجام دیتے تھے۔

11.4.1 دارالترجمہ کی کارکردگی:

جامعہ عثمانیہ کے نصابی کتابوں کی تصنیف وتالیف سے وابستہ ادارہ کی حیثیت سے دارالترجمہ نے اپنی کارکردگی کا شاندار مظاہرہ کیا۔اس ادارہ کے نام کے بارے میں بھی اختلافات ہیں۔بیشتر ناقدین اور محققین نے ''دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ'' کی حیثیت سے اس کے وجود کو تسلیم کیا۔بعض محققین نے اس ادارہ کا نام ''دارالتصنیف وتالیف وترجمہ'' کی حیثیت سے پیش کیا۔عثمانیہ یونیورسٹی میں موجود قدیم الماریوں اور میزوں پر ''دارالترجمہ'' کا نام لکھا ہوا ہے' جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دارالترجمہ ہی اس کا اہم نام ہے اور پہلی شائع ہونے والی کتاب میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ''اراکین دارالترجمہ'' کے ذریعہ اسی اصطلاح کو استعمال کیا ہے۔

اس اکائی کے ابتدائی حصے میں واضح کیا گیا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے ایک سال قبل 14راگست 1917ء کو جامعہ عثمانیہ کی نصابی کتابوں کی فراہمی کے لیے دارالترجمہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔تحقیق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ موجودہ نامپلی ریلوے اسٹیشن کے روبرو سابق رائل ہوٹل کی عمارت کی جگہ ''دارالترجمہ'' کا قیام عمل میں لایا گیا۔بادشاہِ وقت نے فرمان کے ذریعہ اس شعبے کے لیے ابتدائی طور پر 16 ہزار روپئے کی رقم منظور کی تھی۔جو مختلف ادوار میں 80 لاکھ تک پہنچ ہوگئی۔محتاط اندازے کے مطابق دارالترجمہ کی کتاب کے ایک صفحہ کے ترجمہ کے لیے اس دور میں

27 روپئے خرچ ہوتے تھے۔ دارالترجمہ ایک ایسا ادارہ تھا' جس میں بیک وقت ترجمے کے کام کے علاوہ اصطلاح سازی کا کام بھی انجام دیا جاتا تھا۔ 3/ستمبر 1917ء کو دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی خدمات انجام دینے کے لیے جن اشخاص کا انتخاب عمل میں لایا گیا' اس کے تحت برکت علی ایم اے، الیاس احمد برنی بی اے، عبدالماجد دریابادی بی اے، سرور حسین اور نذیر ہاشمی کا تقرر عمل میں آیا۔ اسی طرح دارالترجمہ کے دفتر کے لیے 150 روپئے ماہانہ کرایہ منظوری دی گئی۔ اس ادارہ کے ذریعہ سائنس، کیمسٹری، انجینئرنگ، طبیعیات، اقتصادیات، فزکس اور قانون کے علاوہ میڈیکل سائنس اور جدید علوم وفنون کی کتابوں کے ترجمہ نگاری اور اس کے ساتھ نئی اصطلاحات کی ترتیب پر خصوصی توجہ دی گئی۔ موجودہ تحقیق کے اعتبار سے دارالترجمہ سے وابستہ 129 مترجمین نے جملہ 386 کتابوں کے ترجمے کا کام انجام دیا۔ اِن ترجموں میں زبان و بیان کا حسن ہی نہیں' بلکہ ترجمے کی عصری روایت بھی شامل رہیں۔ دارالترجمہ سے شائع شدہ ترجموں کو باضابطہ روایتی ترجمہ کی اہم کوشش کا درجہ دیا جاتا ہے۔ یہ ترجمے خوبصورت کتابت اور طباعت کے علاوہ انتہائی عمدہ جلد سازی کی وجہ سے اشاعت کی دنیا میں یادگار کا درجہ رکھتی ہیں۔

11.4.2 دارالترجمہ کی اصطلاحات کمیٹی:

عثمانیہ یونیورسٹی کے ذریعہ نصابی کتابوں کی اشاعت کا وقار قائم کیا۔ خوبصورت طباعت اور بہترین جلد اور اس کی خوبصورتی حد درجہ دیدہ زیب ہوتی تھی۔ دنیا کے مختلف کتب خانوں میں دارالترجمہ کی ترجمہ شدہ کتابیں موجود ہیں' جو آج بھی اپنے وقار کا پتہ دیتی ہیں۔ ترجمہ شدہ کتابوں کے علاوہ دارالترجمہ کے ذریعہ نئی اصطلاحات بھی وضع کی گئیں۔ جس کے مطابق دارالترجمہ نے 80 ہزار نئی اصطلاحیں تیار کیں۔ ان اصطلاحوں کو پاکستان کی سرزمین سے ''اصطلاحات جامعہ عثمانیہ'' کے زیر عنوان دو جلدوں میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے شائع کیا ہے۔ دارالترجمہ کی اشاعت کے دور میں ہی ہر فیکلٹی کی اصطلاحات پر مبنی کتابیں اُسی ادارہ سے شائع کی جا چکی تھیں۔ اس طرح جامعہ عثمانیہ کی کارکردگی میں جہاں کتابوں کے ترجمہ کو اہمیت حاصل رہی ہے' وہیں نئی اصطلاحات پیش کرنے پر بھی خصوصی توجہ دی گئی۔ جامعہ عثمانیہ میں ریڈیو کے لیے لاسلکی کی اصطلاح تیار کی گئی۔ آپٹیکل کے لیے عینک کی اصطلاح وضع کی۔ سائنس اور قانون کے علاوہ میڈیکل سائنس کی بے شمار اصطلاحات جو آج بھی رائج ہیں' جیسے استوانہ، نخز مایہ، جوہر وغیرہ۔ جامعہ عثمانیہ کی نصابی کتابوں میں نئی اصطلاحات شامل کی گئی ہیں۔ ہر شعبے کی جانب سے نصابی کمیٹی جس کتاب کو منتخب کر کے ترجمے کے لیے بھیجی جاتی تھی اُسے مترجم کی جانب سے ترجمہ کرانے کے بعد اس کی اصطلاحات کی صحت کے لیے ''وضع اصطلاحات کمیٹی'' قائم تھی جو نئی اصطلاحات کی تیاری اور ان کی جانچ پرکھ کرتی تھی۔ دارالترجمہ کے توسط سے شائع ہونے والی تمام کتابوں میں کسی بھی قسم کے قابل اعتراض مواد کو دور کرنے کے لیے دو شعبے جنہیں ''ناظر ادبی'' اور ''ناظر مذہبی'' موجود تھے، جن کے ذمہ ترجمہ شدہ کتابوں میں کوئی ادبی اور مذہبی اختلاف راہ پا جائے تو اسے دور کرنا ہوتا تھا۔ ابتداء میں علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی کو ناظر ادبی اور حضرت علامہ عبداللہ عمادی کو ناظر مذہبی مقرر کیا گیا۔ اس طرح دارالترجمہ کی کارکردگی حد درجہ منصوبہ بند تھی۔ علوم وفنون کی دوسری زبانوں کی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کیا گیا اور نئی لفظیات کو اصطلاح کے طور پر استعمال کر کے اردو میں نئی اصطلاحات کو شامل کیا جائے گا۔ اس طرح دارالترجمہ کی کارکردگی میں ترجمہ ہی نہیں' بلکہ اصطلاحات سازی کی خصوصیات کو حد درجہ اہمیت حاصل ہے۔ دارالترجمہ سے شائع شدہ ہر کتاب کے آخر میں اصطلاحات کی فہرست حروف تہجی کے اعتبار سے درج کی جاتی تھی۔

11.4.3 دارالترجمہ کے ناظم اور مترجمین:

جامعہ عثمانیہ میں مختلف شعبہ جات کی تعلیم اور علوم وفنون کی نمائندگی کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے طرز تعلیم کی عالمی شہرت اپنی جگہ مسلمہ ہے۔

اوراس یونیورسٹی کی نصابی کتابیں بھی نمایاں اہمیت کی حامل ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ کی ترجمہ شدہ کتابوں میں شامل مواد کو عالمی حیثیت سے آج بھی وقار حاصل ہے۔ دارالترجمہ کے قیام کے ساتھ ہی مغربی علوم وفنون کی اہم کتابوں کی اشاعت اور ترجمہ کی روایت کو فروغ دیا گیا۔ اس ادارہ سے جملہ 386 کتابیں شائع ہوئیں۔ اس ادارہ کو مستحکم اور کارکرد بنانے کے لیے ہر فیکلٹی کے مترجمین کی طویل فہرست موجود ہے۔ سب سے پہلے بابائے اردو مولوی عبدالحق کا دارالترجمہ کے اولین ناظم کی حیثیت سے تقرر کیا گیا۔ پھر یکے بعد دیگرے سید محی الدین، حمید احمد انصاری، محمد عنایت اللہ دہلوی، محمد الیاس برنی، ڈاکٹر نظام الدین اور ایشور ناتھ ٹوپا کو دارالترجمہ کے ناظم کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کا موقع فراہم کیا گیا۔ ایشور ناتھ ٹوپا کے دور میں ہی دارالترجمہ کی مستقل حیثیت ختم ہوگئی۔ 1950ء سے اردو کتابوں کی اشاعت منسوخ ہوگئی، جس کی وجہ سے ترجمے اور اشاعت کے سلسلہ کا خاتمہ ہوگیا۔ 1955ء تک دارالترجمہ کی کسی بھی کتاب کی اشاعت عمل میں نہیں آئی۔ البتہ 18/ اگست 1955ء کو رات کے وقت دارالترجمہ کی عمارت میں آگ لگ گئی اور نایاب کتابیں آہنی الماریوں میں بند تھیں، انہیں نقصان نہیں ہوا جب کہ 80 ہزار سے ایک لاکھ تک کی کتابیں جل کر خاکستر ہوگئیں۔ 5 آتش فرو انجنوں کی مدد سے دو گھنٹے کے دوران آگ پر قابو پایا گیا۔ اس طرح 18/ اگست 1955ء کو دارالترجمہ کا خاتمہ ہوگیا۔ جس کی اطلاع اُس دور کے مشہور روزنامہ 'رہنمائے دکن' میں شائع ہوئی تھی۔ دارالترجمہ سے وابستہ مترجمین تین قسم کے ہوتے تھے۔ بیشتر ہمہ وقتی مترجمین کی حیثیت سے کام انجام دیتے تھے۔ اس کے علاوہ جزوقتی مترجمین اور پھر موقتی مترجمین بھی کام کرتے تھے۔ سائنس، طب، قانون اور دیگر علوم وفنون کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ، معاشیات، نفسیات، ریاضیات، طبعیات، انجینئرنگ، حیاتیات اور عمرانیات کی کتابوں کے ترجمہ کرنے والوں میں اہم مترجمین شامل تھے۔ غرض عصر حاضر میں جامعہ عثمانیہ کی اہمیت میں اس وجہ سے اضافہ ہوجاتا ہے کہ عالمی سطح پر اردو کا معیار قائم ہونے اور 1948ء کے بعد جامعہ عثمانیہ کا اردو ذریعہ تعلیم ختم کردیئے جانے کے باوجود 1998ء میں ہندوستانی حکومت نے پارلیمانی قانون کے ذریعہ دوبارہ حیدرآباد کی سرزمین میں اردو ذریعہ تعلیم کی نئی یونیورسٹی ''مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی'' کا قیام عمل میں لایا اور ہندوستانی زبان اردو کے علاوہ جامعہ عثمانیہ کی تعلیم کی قدر افزائی کی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دارالترجمہ کے توسط سے جامعہ عثمانیہ کے نصاب کا موقف حاصل کرنے والی ترجمہ شدہ اردو کتابیں عصر حاضر میں معلومات اور علوم کی ترقی کی وجہ سے قابل قبول نہیں رہیں۔ اس کے علاوہ جامعہ عثمانیہ کی نصابی کتابوں میں عام فہم اردو اور آسان زبان کے بجائے اس دور کے تقاضوں کے مطابق باضابطہ عربی اور فارسی تراکیب کے استعمال کی وجہ سے اس دور کی نصابی کتابوں کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق قرار نہیں دیا جاسکتا۔ تاہم جامعہ عثمانیہ اور اس کے قیام سے لے کر اس کے توسط سے ترجمہ شدہ کتابیں اردو زبان وادب میں علوم وفنون کی ترویج کے ورثے کی حیثیت سے آج بھی اہمیت کی حامل ہیں اور اسے جامعاتی سطح کی اردو علوم وفنون کی کتابوں کے اہم ورثے کی حیثیت سے مقبولیت حاصل ہے۔

11.5 ضمیمہ جات

11.5.1 جامعہ عثمانیہ کے چانسلرس (ابتدا تا 1948):

1۔ سرسید علی امام — 1920ء تا 1921ء

2۔ نواب فرید الملک بہادر — 1922ء تا 1923ء

3۔ نواب ولی الدولہ بہادر — 1924ء تا 1925ء

4۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد 1926ء تا 1937ء

5۔ نواب حیدر نواز جنگ بہادر 1937ء تا 1941ء

6۔ کرنل نواب سر محمد احمد سعید خان 1941ء تا 1945ء

7۔ امین الملک سر مرزا محمد اسماعیل 1946ء تا 1947ء

8۔ میر لائق علی 1947ء تا 1948ء

11.5.2 جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلرس (ابتدا تا 1948):

1۔ نواب صدر یار جنگ 1918ء تا 1919ء

2۔ نواب ولی الدولہ بہادر 1920ء تا 1935ء

3۔ نواب مہدی یار جنگ بہادر 1936ء تا 1943ء

4۔ نواب اعظم جنگ بہادر 1943ء تا 1945ء

5۔ نواب علی یاور جنگ بہادر 1945ء تا 1946ء

6۔ ڈاکٹر ولی محمد 1946ء تا 1947ء

7۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی 1947ء تا 1948ء

11.5.3 دارالترجمہ کے نظماء:

1۔	مولوی عبدالحق بی اے	اولین ناظم	ستمبر 1917ء تا اگست 1919ء
2۔	مولوی احمد محی الدین ایم اے بار ایٹ لا	منصرم ناظم	اگست 1919ء تا فروری 1920ء
3۔	مولوی حمید احمد انصاری بی اے	نگران ناظم	فروری 1920ء تا جنوری 1921ء
4۔	مولوی محمد عنایت اللہ دہلوی بی اے	ناظم	جنوری 1921ء تا جنوری 1935ء
5۔	مولوی محمد الیاس برنی ایم اے، ایل ایل بی	ناظم	جنوری 1935ء تا جنوری 1945ء
6۔	پروفیسر ڈاکٹر نظام الدین	ناظم	جنوری 1945ء تا اکتوبر 1948ء
7۔	پروفیسر محمود احمد خان	نگران ناظم (رجسٹرار)	اکتوبر 1948ء تا 23 دسمبر 1948ء
8۔	ایشور ناتھ ٹوپا	ناظم شعبہ ترجمہ وطباعت	1948ء تا 1956ء

نوٹ: 1956ء کے بعد بھی ایشور ناتھ ٹوپا کی خدمات جاری رہیں۔

11.5.4 دارالترجمہ کے چند اہم مترجمین:

1۔ ہارون خاں شیروانی

2۔ مولانا عبدالحلیم شرر

3۔ مولانا عبدالماجد دریابادی

4۔ مولانا ظفر علی خان

5۔ مولانا عبداللہ عمادی
6۔ علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی
7۔ شبیر حسین خان جوش ملیح آبادی
8۔ قاضی تلمذ حسین
9۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان
10۔ مولانا عنایت اللہ دہلوی
11۔ پروفیسر ہارون خان شروانی
12۔ رشید احمد صدیقی
13۔ مولانا الیاس برنی
14۔ محمد فداء علی طالب
15۔ سید ہاشمی فرید آبادی
16۔ سید ہاشم ندوی
17۔ مولانا سید محمد ابراہیم ندوی
18۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
19۔ عبدالباری ندوی
20۔ پروفیسر عبدالقدیر حسرت
21۔ حکیم عبدالباقی شطاری
22۔ مولانا محمد سبزواری
23۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ
24۔ محمد نذیر احمد
25۔ محمد عبدالرحمٰن خان
26۔ چودھری برکت علی
27۔ پروفیسر فیروز الدین
28۔ پروفیسر محمد سعید الدین
29۔ ڈاکٹر خواجہ حبیب حسن
30۔ ڈاکٹر مظفر الدین قریشی
31۔ ڈاکٹر غلام دستگیر
32۔ ڈاکٹر مفتی شاہ نواز
33۔ ڈاکٹر حیدر علی خان
34۔ ڈاکٹر خورشید حسین
35۔ ڈاکٹر فضل کریم خان
36۔ حکیم کبیر الدین
37۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن
38۔ ڈاکٹر محمد حسین
39۔ قاضی محمد حسین
40۔ کشن چند
41۔ جئے تیرتھ سستورکر
42۔ مرتجے راؤ
43۔ رائے بیج ناتھ
44۔ پروفیسر محمد مجیب
45۔ محمد عاقل
46۔ محمد نصیر الدین خان
47۔ محمد احمد محی الدین انصاری
48۔ سید علی رضا
49۔ عبدالمجید صدیقی
50۔ پروفیسر حسین علی مرزا

11.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ جنوبی ہند کے علاقے حیدرآباد میں اعلیٰ تعلیم کی تدریس کا انتظام نہیں تھا۔ ریاست حیدرآباد پر آصفجاہی سلطنت کے بادشاہ حکمران تھے۔

انگریز دورِ حکومت کی وجہ سے ہندوستان کے تین اہم مقامات جیسے ممبئی، کولکتہ اور مدراس میں یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں لایا جاچکا تھا۔

☆ حیدرآباد کے طالب علم اگر اعلیٰ تعلیم کی ڈگری حاصل کرنا چاہتے تو انہیں مدراس یونیورسٹی سے امتحان دے کر کامیاب ہونا پڑتا یا پھر علی گڑھ سے امتحان دے کر اپنی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنا ضروری تھا۔ چھٹے نظام نواب میر محبوب علی خان کے دور میں حیدرآباد کے نامور اشخاص نے ''محبوب یونیورسٹی'' کی تحریک چلائی۔

☆ نواب میر محبوب علی خان کے انتقال کے بعد دارالعلوم حیدرآباد کے سابقہ طالب علموں کی تحریک سے حیدرآباد میں نئی یونیورسٹی کے قیام کا مطالبہ تیز ہوگیا۔

☆ نواب رفعت یار جنگ اور سر اکبر حیدری کی نمائندگی سے حیدرآباد کے ساتویں بادشاہ نواب میر عثمان علی خان نے شاہی فرمان کے ذریعہ ''جامعہ عثمانیہ'' کے قیام کی منظوری دے دی۔

☆ اس یونیورسٹی کے تعلیمی نظام کو اردو زبان سے وابستہ کیا گیا۔ اس لیے آرٹس، سائنس اور میڈیکل سائنس کے علاوہ انجینئرنگ اور قانون کی نصابی کتابوں کی فراہمی کے لیے جامعہ عثمانیہ کے قیام سے ایک سال قبل 14 / اگست 1917ء کو اردو میں علوم فنون کی کتابوں کی فراہمی کے لیے ترجمہ اور اشاعت کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی۔ چناں چہ ''دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ'' کا آغاز شاہی فرمان کے ذریعہ ہوا۔

☆ جامعہ عثمانیہ کے آغاز کے لیے توپ کا سانچہ (گن فاؤنڈری) میں کرایہ کی عمارتیں حاصل کی گئیں۔ اور ہر عمارت کو مختلف نام جیسے سائنس منزل، آرٹس منزل، قانون منزل اور میڈیسن منزل کے نام سے یاد کیا گیا۔ جماعتوں کے آغاز کے لیے مرکزی عمارت ''آغا منزل'' قرار دی گئی، جہاں پر افتتاحی جلسے کے ساتھ 28 / اگست 1919ء سے باضابطہ ایف اے کی جماعتوں کا آغاز ہوا۔

☆ جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ کے لیے تقررات کا عمل 1918ء میں مکمل ہوا۔ سرکاری خزانہ سے بھاری رقم یونیورسٹی کے انتظامیہ اور مختلف محکمہ جات کے قیام کے لیے منظور کی گئی۔ ابتداء میں جامعہ عثمانیہ کے ذریعہ تین شعبہ جات کا آغاز ہوا۔

☆ اس یونیورسٹی کے مجوزہ نصاب کے تحت میٹری کولیشن اور انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کا آغاز کیا گیا۔ اِن امتحانات کے لیے انگریزی لازمی مضمون رکھا گیا، جب کہ اختیاری مضامین میں اردو، تلگو، مراٹھی، کنڑی، سنسکرت اور تامل کے علاوہ بیرونی زبانیں عربی، فارسی، فرانسیسی، لاطینی اور یونانی کو بھی اہمیت دی گئی۔

☆ ہر شعبے میں کارگذار اساتذہ اور ان کے مددگار اپنے شعبے کا نصاب مرتب کر کے کتابوں کی فہرست دارالترجمہ کے حوالے کر دیتے تھے۔ دارالترجمہ سے وابستہ ہمہ وقتی اور جز وقتی مترجمین نصاب کی کتابوں کا ترجمہ کیا کرتے اور اس میں نئی اصطلاحات کے بارے میں وضاحتی نوٹ پر اصطلاحات کی کمیٹی ان پر غور کرتی اور مناسب اصطلاح ہو تو قبول کی جاتی یا پھر نئی اصطلاح وضع کی جاتی تھی۔

☆ دارالترجمہ کے توسط سے سائنس، قانون، طب اور آرٹس کی 386 کتابیں شائع کی گئیں۔ اور 80 ہزار اصطلاحات تیار کی گئیں۔ غرض جامعہ عثمانیہ کے معیاری نصاب کو برقرار رکھنے اور طلبہ میں اردو ذریعہ تعلیم سے دلچسپی پیدا کرنے کے سلسلے میں دارالترجمہ کے مترجمین کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

☆ دارالترجمہ میں نہ صرف ترجمہ کرنے والے ماہرین موجود ہوتے تھے بلکہ اصطلاحات بنانے والی کمیٹی کے علاوہ ناظر ادبی اور ناظر مذہبی کے توسط سے شائع ہونے والی کتاب میں کوئی بھی ادبی اور مذہبی نقص کو شامل ہونے سے روکا جاتا تھا۔ یہی وجہ رہی کہ جامعہ عثمانیہ کی نصابی کتابوں پر کسی قسم کا اختلاف نہیں ہوا۔

☆ دارالترجمہ سے وابستہ 8 ناظم اور 129 مترجمین نصابی کام انجام دیتے رہے۔ جامعہ عثمانیہ کی عمارت کے لیے نواب میر عثمان علی خان نے شہر سے دور اڈکمیٹ کے علاقہ میں 1600 ایکر زمین پر تعمیر کا نقشہ منظور کیا اور وہاں عمارتوں کی تعمیر اور اساتذہ کے قیام کے علاوہ طلبہ کی رہائش گاہوں کو آراستہ کیا گیا۔

☆ 1935ء سے 1938ء تک اڈکمیٹ میں یونیورسٹی کی عمارتوں کی تعمیر ہوتی رہی۔ اور پھر تمام سرگرمیوں کو گن فاؤنڈری سے اڈکمیٹ منتقل کردیا گیا۔ 1921ء تک جامعہ عثمانیہ کے اسٹاف ارکان میں 25 افراد اور باقاعدہ طلبہ کی تعداد 225 تھی۔

☆ سائنس کے طلبہ کو سہولت فراہم کرنے کے لیے نظامیہ رصدگاہ قائم کی گئی۔ پہلے سال کی رپورٹ میں بتایا گیا کہ دوسری ہندوستانی جامعات سے گیارہ طلبہ نے جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا۔ طلبہ کی تین انجمنیں قائم ہوئیں۔ کالج میں گیمس اور کھیل کود کو اہمیت دی گئی۔

☆ بورڈنگ ہاؤس اور طلبہ کی فلاح کے لیے بزم مباحثہ اور کتب خانے کے علاوہ مطالعہ گھر کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جامعہ عثمانیہ کا پہلا بی اے کا امتحان جون 1923ء میں ہوا اور پھر 1924ء میں ایم اے کے امتحانات کا آغاز ہوا۔

☆ طلبہ کو یونیورسٹی کی طرف سے اسکالرشپ دی جاتی تھی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کو یوروپ سے استفادہ کی غرض سے سرکاری امداد فراہم کیا جاتی تھی۔ 1918ء سے لے کر 1948ء تک جامعہ عثمانیہ کے تمام فیکلٹیز میں اردو ذریعہ تعلیم کا رواج تھا۔

☆ اردو میں سائنس، میڈیکل سائنس، انجینئرنگ، قانون اور آرٹس کے علاوہ شعبہ تعلیمات میں تدریسی سہولتوں کی فراہمی کے لیے دارالترجمہ کی کتابیں امدادی کتب کی حامل ہوگئیں۔

☆ غرض جامعہ عثمانیہ کا خوشگوار ماضی اردو ذریعہ تعلیم سے وابستہ ہے۔ جب کہ اس یونیورسٹی نے اپنے آغاز کے 100 سال مکمل کر لیے ہیں۔ جب کہ اس یونیورسٹی سے فارغ لاتعداد طلبا اور طالبات برصغیر ہی نہیں، بلکہ خلیجی ممالک اور یوروپی ممالک میں اپنی خدمات انجام دے کر یونیورسٹی کا نام روشن کر رہے ہیں۔

☆ اس یونیورسٹی کی سلور جوبلی، گولڈن جوبلی، ڈائمنڈ جوبلی، پلاٹینم جوبلی اور صد سالہ تقاریب بڑی شان وشوکت سے منائی گئیں۔

11.7 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
مسجل	:	رجسٹرار
طیلسان	:	گریجویٹ
لاسلکی	:	ریڈیو
امیر جامعہ	:	وائس چانسلر

ناظم	:	ڈائرکٹر
باب الداخلہ	:	داخل ہونے کا دروازہ، مین گیٹ
اختراع	:	نئی بات نکالنا، ایجاد
معروضہ	:	درخواست
عرضداشت	:	درخواست، گذارش
فرمان	:	شاہی حکم نامہ
سینیٹ	:	یونیورسٹی کے اساطین کی مجلس
طباعت	:	پرنٹنگ
عصری	:	زمانے کی ضرورت کے مطابق
وضع کرنا	:	بنانا، تیار کرنا
سقوط	:	گر پڑنا، ہارنا، خاتمہ ہونا
اکابرین	:	بڑے لوگ
صدرالصدور	:	عدالت کا اعلیٰ عہدہ
مدارالمہام	:	وزیر اعظم کا عہدہ، منتظم
معین المہام	:	مددگار وزیر۔ نائب منتظم
انضمام	:	ضم ہونا، شرکت، الحاق
علوم السنہ	:	زبانوں کا علم
عمرانیات	:	معاشرہ سے متعلق علوم
رصدگاہ	:	اجرام فلکی کا دوربین سے مشاہدہ کا مقام

11.8 نمونہ امتحانی سوالات

11.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام کس بادشاہ کے دور میں ہوا؟

2۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کی تحریک کس نے پیش کی؟

3۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے حیدرآباد کے طلبہ کو کس یونیورسٹی سے استفادہ کرنا پڑتا تھا؟

4۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے پہلے بادشاہ وقت نے یونیورسٹی کے لیے کونسے شعبے کو اہمیت دی؟

5۔ جامعہ عثمانیہ میں تعلیم کے آغاز کی تاریخ کیا ہے؟

6۔ جامعہ عثمانیہ میں سب سے پہلے کونسی جماعتوں کا آغاز ہوا؟

7۔ جامعہ عثمانیہ کے ابتدائی نصابات میں سب سے زیادہ اہمیت کونسے مضامین کو دی گئی؟

8۔ جامعہ عثمانیہ میں نصاب کی تدوین کے لیے کس قسم کی کمیٹی ترتیب دی گئی؟

9۔ جامعہ عثمانیہ میں تدریس کے لیے جنوبی ہند کی زبانوں میں تلگو، مراٹھی اور کنڑی کے علاوہ کونسی زبان شامل تھی؟

10۔ جامعہ عثمانیہ کے ذریعہ عربی، فارسی، فرانسیسی، لاطینی کے علاوہ کونسی غیر ملکی زبان کی تعلیم دی جاتی رہی؟

11.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کی تحریک کا جائزہ لیجئے۔

2۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کی منظوری کی تفصیلات بیان کیجیے۔

3۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے پہلے حیدرآباد کے طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے کن یونیورسٹیوں سے رجوع ہونا پڑتا تھا؟

4۔ جامعہ عثمانیہ کی ابتدائی جماعتیں کس مقام پر شروع ہوئیں؟

5۔ جامعہ عثمانیہ کی ابتدائی جماعتیں اور موجودہ کیمپس کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

11.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ محبوب یونیورسٹی سے عثمانیہ یونیورسٹی تک کے سفر کی تفصیلات بیان کیجیے۔

2۔ دارالترجمہ کے قیام اور اس کے اختتام کی تفصیلات بیان کیجیے۔

3۔ جامعہ عثمانیہ میں آرٹس کالج کی عمارت اور اس میں شامل شعبہ جات کی تفصیلات درج کیجیے۔

11.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔ جامعہ عثمانیہ — محمد عبدالحئی

2۔ جامعہ عثمانیہ — ڈاکٹر حسن الدین احمد

3۔ مجلّہ عثمانیہ (جشن الماس نمبر) — پروفیسر غلام عمر خان

4۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد — پروفیسر مجید بیدار

5۔ دارالترجمہ عثمانیہ کی علمی اور ادبی خدمات — ڈاکٹر مجیب الاسلام

6۔ دارالتصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ — ڈاکٹر مصطفٰے علی فاطمی

7۔ عثمانیہ یونیورسٹی گریجویٹ اسوسی ایشن کا شائع شدہ سلور جوبلی سووینیر

8۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا مجلّہ، ڈائمنڈ جوبلی نمبر جامعہ عثمانیہ

بلاک IV : ادبی تحریکات ورجحانات

اکائی 12: اردو نظم اور انجمن پنجاب لاہور

اکائی کے اجزا

12.0 تمہید

12.1 مقاصد

12.2 انجمن پنجاب لاہور کا تعارف

12.2.1 انجمن پنجاب لاہور کا قیام

12.2.2 انجمن پنجاب لاہور کے مقاصد اور کمیٹیاں

12.2.3 انجمن پنجاب لاہور کے مختلف شعبے

12.2.4 انجمن پنجاب لاہور کے موضوعاتی مضامین

12.2.5 انجمن پنجاب لاہور میں لکچرس کا احیا

12.3 انجمن پنجاب لاہور کی مختلف خدمات

12.3.1 انجمن پنجاب لاہور کی تعلیمی خدمات

12.3.2 انجمن پنجاب لاہور میں علوم مفیدہ کی تعلیم

12.3.3 انجمن پنجاب لاہور کی جانب سے میڈیکل کی تعلیم

12.3.4 انجمن پنجاب لاہور کا مشرقی شعبہ

12.3.5 انجمن پنجاب لاہور کی ہمہ جہت تصانیف کا جائزہ

12.4 انجمن پنجاب لاہور کی ادبی سرگرمیاں

12.4.1 انجمن پنجاب لاہور کے نظمیہ مشاعرے

12.4.2 انجمن پنجاب لاہور کی جانب سے نثر کی ترقی

12.4.3 انجمن پنجاب لاہور میں علوم وفنون کے عہدیدار اور کتب

12.4.4 انجمن پنجاب لاہور سے نثر کا فروغ

12.4.5 انجمن پنجاب لاہور کے ذریعہ شعری اصناف

12.5 اکتسابی نتائج
12.6 کلیدی الفاظ
12.7 نمونہ امتحانی سوالات
12.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
12.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
12.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
12.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

12.0 تمہید

اردو میں شاعری کا سلسلہ قدیم دور سے قائم ہے۔ بہمنی سلطنت کے بعد قطب شاہی سلطنت (گولکنڈہ) اور عادل شاہی سلطنت (بیجاپور) نے اردو شاعری کی سرپرستی کی۔ مختلف اصناف مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، رباعی، غزل، ریختی وغیرہ کو فروغ دیا۔ اس دور میں اردو شاعری میں نظم نگاری کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔ گولکنڈے کے پانچویں حکمران سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اپنے کلیات میں غزل کی طرز پر نظمیں لکھی تھیں، جو عید و تہوار، موسم، کھیل اور عمارتوں سے متعلق تھیں۔ اس کے بہت عرصہ بعد اردو شاعری میں باضابطہ مختلف ہیئتوں کو استعمال کرتے ہوئے نظیر اکبرآبادی نے نظم نگاری کا سلسلہ شروع کیا۔ انہوں نے مثلث، مربع، مخمس، مسدس اور مثمن کے انداز میں نظمیں لکھیں۔ وہ اردو نظم نگاری کے سماج پسند اور حقیقت پسند شاعر قرار دیئے جاتے ہیں۔ کیوں کہ انہوں نے ہندوستانی، ماحول، معاشرے اور تہذیب کے علاوہ یہاں کے میلوں ٹھیلوں پر نظمیں لکھ کر اردو شاعری میں نظم نگاری کی بنیاد مستحکم کی۔ طویل عرصہ تک اردو شاعری پر غزل کا قبضہ رہا۔ غزل کے بجائے نظم کی روایت کو فروغ دینے میں جس ادارے کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، اُس ادارہ کا نام انجمن پنجاب لاہور ہے، جس کے تحت مصرع پر غزل لکھنے کے بجائے عنوان پر نظم لکھنے کا طریقہ شروع کیا گیا، جس کی وجہ سے اردو کی ادبی تاریخ میں باضابطہ نظم نگاری کا آغاز ہوا۔ انجمن پنجاب لاہور اور اس کے قیام سے لے کر اختتام تک جن لوگوں نے اہم خدمات انجام دیں ان میں ڈاکٹر لائیٹنر اور کرنل ہالرائڈ کے ناموں کو اہم مقام حاصل ہے۔ جن کی کوششوں کی وجہ سے انجمن پنجاب لاہور میں نظموں کے مشاعروں کا آغاز ہوا اور علوم مشرقی کے احیا کے ساتھ اردو زبان و ادب اور ینٹل اسٹڈیز اور تحقیقی و تنقیدی مقالے لکھنے کے علاوہ میڈیکل اور فارمیسی کی تعلیم کا انتظام اس انجمن کے ذریعہ کیا گیا۔ اس لیے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ''انجمن پنجاب لاہور'' کی خدمات کے توسط سے ہمہ جہت خدمات کے ساتھ اردو نظم کو فروغ حاصل ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔ چناں چہ اس اکائی میں انجمن پنجاب لاہور کے خدوخال ہی نہیں، بلکہ اس کی کارکردگی اور اردو نظم کی ترقی میں مددگار اردو کے شاعروں اور ادیبوں کی خصوصیات کو پیش کیا جائے گا۔

12.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ انجمن پنجاب لاہور کے قیام کا پس منظر بیان کر سکیں۔
- ☆ انجمن پنجاب لاہور کے قیام اور اس کے مختلف شعبہ جات کا تعارف کرا سکیں۔

☆ انجمن پنجاب لاہور کے ڈائرکٹرس اور مصنفین کی خدمات واضح کرسکیں۔

☆ انجمن پنجاب لاہور کی تعلیمی، علوم مفیدہ اور ادبی خدمات پر روشنی ڈال سکیں۔

☆ انجمن پنجاب لاہور کی میڈیکل اور فارمیسی کی تعلیم کے فروغ کی کوششوں پر اظہار خیال کرسکیں۔

☆ انجمن پنجاب لاہور کے نظمیہ مشاعروں کا آغاز اور ان کی تفصیلات واضح کرسکیں۔

☆ انجمن پنجاب لاہور کے ذریعہ اردو نظم کی خدمات کا بیان کرسکیں۔

12.2 انجمن پنجاب لاہور کا تعارف

ہندوستان کی سرزمین میں مشرقی تہذیب اور اقدار کی روایت قائم تھی۔ اس ملک میں جب انگریزوں نے اپنی آمد کے ساتھ نئی ایجادات اور نئی ترقیات کو فروغ دیا تو اس کی وجہ سے ہندوستان کی مختلف بادشاہتوں میں تفریق پیدا ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز قوم نے اس ملک میں تجارت کرنے کی غرض سے ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' قائم کی تھی۔ ہندوستان میں انگریز ہی نہیں، بلکہ فرانسیسی اور ڈچ قومیں بھی تجارت کی غرض سے آئیں۔ لیکن برطانیہ کی انگریز قوم کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ اس نے ہندوستان کی سیاست میں دلچسپی لے کر نہ صرف تجارت کی، بلکہ اس ملک کے حکمران بھی بن گئے۔ حکمرانی کی بنیاد پر انگریزوں نے ہندوستانیوں کو جدید علوم وفنون سے واقفیت دلانے کے لیے تعلیمی نظام کو رائج کیا۔ ان کے دور میں قائم کردہ کلکتہ کی فورٹ ولیم کالج، دہلی کی دلّی کالج اور مدراس کی فورٹ سینٹ جارج کالج کے ذریعہ تعلیم کا آغاز ہوا۔ عام طور پر ہندوستان کے ہر بڑے عہدہ پر انگریز فائز ہوتے تھے۔ چناں چہ کلکتہ کا کالج ہو یا دِلّی کالج یا مدراس کے کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے انگریز آفیسر مقرر تھے۔ اِن کالجوں کے قیام کے ساتھ انگریز قوم نے یہ محسوس کیا کہ جدید تقاضوں کے ساتھ نہ صرف ہندوستانی علوم کو فروغ دیا جائے بلکہ اس کے ساتھ جدید علوم کو بھی اہمیت دی جائے۔ اس مقصد سے انگریز قوم نے لاہور کے مقام پر ایک نئے ادارے کی بنیاد رکھی اور اس ادارے کا نام ''انجمن پنجاب لاہور'' رکھا گیا۔ 1835ء میں لارڈ میکالے نے فارسی کے اثرات کو ختم کرکے انگریزی زبان کو رائج کرنے کا حکم دیا۔ 1849ء میں اردو کو سرکاری اور دفتری کا زبان کا درجہ حاصل ہوا تو انگریز قوم نے اس زبان میں مختلف علوم وفنون کی شروعات کے لیے ایک انجمن اور اس کے ساتھ اردو کے ادیبوں کو وابستہ کرکے نہ صرف مشاعرے منعقد کیے، بلکہ تحقیقی وتنقیدی مضامین کی مجلسوں کا آغاز ہوتا ہے۔ علوم وفنون کے فروغ کے لیے اردو کے ادیبوں سے مضامین لکھانے کی روایت کا آغاز کیا۔ اس ہمہ جہت ترقی کے ساتھ انجمن پنجاب لاہور کے توسط سے اردو میں سب سے پہلے نظم نگاری کے مشاعرے منعقد کیے گئے۔ جس کے ذریعہ اردو میں نیچرل شاعری کا آغاز ہوا۔ ان خصوصیات کی وجہ سے انجمن پنجاب کا تعارف ہندوستان کے دوسرے اداروں اور دوسری انجمنوں سے بالکل مختلف ہوجاتا ہے۔

12.2.1 انجمن پنجاب لاہور کا قیام:

انجمن پنجاب لاہور کے قیام کے بارے میں اس انجمن کی سہ سالہ رپورٹ اور اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب کے توسط سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ یہ سہ سالہ رپورٹ 1866ء سے 1868ء کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس رپورٹ کی اشاعت منشی ہرسکھ رائے وگوبند سہائے کے پریس مکتبہ گنیش پرکاش لاہور میں ہوئی۔ اس حوالے سے یہ بتایا گیا ہے کہ شکھشا سبھا کے مکان پر ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جو 21 جنوری 1865ء کی یادگار ہے۔ اس

جلسہ میں لاہور کے تمام علم دوست حضرات اور رئیس لوگ شریک ہوئے تھے۔حکومت وقت کے مشورے پر اس جلسہ میں انجمن پنجاب کا قیام عمل میں لایا گیا۔اس وقت پنجاب کے سر رشتۂ تعلیم کے منتظم اعلیٰ ڈاکٹر لائٹنز تھے۔جو گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ہونے کے علاوہ انجمن کے قیام کے لیے جستجو کی تھی۔اس وقت انجمن کا پورا نام ''انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب'' رکھا گیا جو بعد میں ''انجمن پنجاب لاہور'' کے نام سے مشہور ہوئی۔جس کے لیے انگریزی میں حسب ذیل وضاحت کی گئی ہے۔ Society for the diffarsion of the useful knowledge in the Punjab کی حیثیت سے قائم کی گئی۔اس جلسہ میں پنڈت منموہن نے صدارت کی تھی جو اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے پنجاب میں مامور تھے اورانھوں نے جلسہ کے آغاز پر ڈاکٹر ڈبلیو جی لائٹنز کا تعارف کرایا۔منشی ہرسکھ رائے مہتمم ''کوہِ نور'' اخبار کو شعبہ کے سکریٹری اور باب نوین چندر رائے کو انگریزی کے سکریٹری منتخب کیا گیا۔جب کہ ڈاکٹر لائٹنز کو انجمن کا صدر مقرر کیا گیا۔اس انجمن کے جلسے میں جن خاص افراد کو شرکت کا موقع ملا ان کے نام بھی درج کیے گئے ہیں۔

1۔ ڈاکٹر ڈبلیو جی لائیٹنر، پرنسپل گورنمنٹ کالج، لاہور
2۔ دیوان بیج ناتھ ای اے سی، لاہور
3۔ فقیر سید شمس الدین صاحب، آنریری مجسٹریٹ لاہور
4۔ سردار بھگوان سنگھ جاگیردار، امرتسر
5۔ شیخ فیروز الدین رئیس، لاہور
6۔ مولوی کریم الدین ڈپٹی انسپکٹر مدارس، لاہور
7۔ مولوی محمد حسین نائب سررشتہ دار، ڈائریکٹری پنجاب
8۔ مولوی نیاز حسین مدرس مدرسہ تعلیم معلمین
9۔ مولوی علمدار حسین مدرس گورنمنٹ کالج، لاہور

اس انجمن کے جلسہ میں ایک تجویز رکھی گئی کہ انجمن کی جانب سے ایک عمدہ قسم کا کتب خانہ کھولا جائے جس میں سب زبانوں کی علمی کتابیں، اخبارات اور رسائل بھی جمع کیے جائیں۔تمام ارکان سے کتابیں عطیہ دینے کے لیے منظوری لی گئی۔ایک ہفتہ کے اندر تمام ارکان کی جانب سے 1088 کتابیں جمع ہوگئیں۔اس طرح انجمن پنجاب لاہور کی جانب سے سب سے پہلا کام کتب خانے کا احیاء ہوا۔

12.2.2 انجمن پنجاب لاہور کے مقاصد اور کمیٹیاں:

انجمن نے جن مقاصد کو پیش نظر رکھ کر اس انجمن کا لائحہ عمل تیار کیا اس کے ذریعہ بے شمار معاملات کو نمائندگی دی گئی۔اس کے اغراض و مقاصد میں حسب ذیل موضوعات کو پیش نظر رکھا گیا۔

1۔ قدیم مشرقی علوم کا احیاء اور لسانیات، بشریات، تاریخ اور ہندوستان کے علاوہ ہمسایہ ملکوں کے آثار قدیمہ کے بارے میں تحقیقی کاموں کی حوصلہ افزائی۔

2۔ دیسی زبانوں کے ذریعہ عوام میں تعلیم کا فروغ۔

3۔ صنعت اور تجارت کی ترقی۔

4۔ معاشرتی، ادبی، سائنسی اور عام دلچسپی کے سیاسی مسائل پر تبادلہ خیال، حکومت کے تعمیری اقدامات کو مقبول بنانا، ملک میں وفاداری اور مشترک ریاست کی شہریت کے احساس کو فروغ دینا اور عوام الناس کی خواہشات اور مطالبات کے مطابق حکومت کو تجاویز پیش کرنا۔

5۔ مفاد عامہ کے تمام اقدامات میں صوبے کے تعلیم یافتہ اور بااثر طبقوں کے افسروں کو قریب لانا۔

ان پانچ اغراض ومقاصد کے علاوہ جو لائحہ عمل تیار کیا گیا اس کے تحت اہم معاملات میں انجمن نے فیصلے کیے۔ جس کے تحت ایک نمائندہ کونسل کا قیام، دیسی سیول سروس کی تشکیل اور اس کے امتحانات کے طریقہ کار میں ترمیمات، ایک تعلیمی کانگریس کا قیام، صحت وصفائی سے متعلق امور، مختلف ادبی، سماجی اور سیاسی موضوعات پر مضامین شائع کرنا، زراعت کے متعلقہ مسائل، ہندوستان میں سنسکرت اور عربی مخطوطات کی حرفی نقل اور ان پر باقاعدہ تحقیقی کام کے بارے میں حکومت کو تجاویز پیش کرنا اور لاہور میں صنعتی آرٹ کے اسکول کی بنیاد رکھنے کی تحریک وغیرہ۔

انجمن کے ذریعہ تعلیمی قابلیت رکھنے والوں کی سفارش اور ان کی رکنیت کے علاوہ عہدیدار سے متعلق نمائندگی کا لائحہ عمل بھی دیا گیا ہے۔ اور اس انجمن کا سالانہ چندہ ہر رکن کو 12 روپئے ادا کرنا لازمی تھا۔ اور ملک میں اس کی کئی شاخیں قائم کرنے کے لیے ارکان سے نمائندگی حاصل کی گئی۔ اعزازی اور نائب اعزازی سرپرست کے لیے سالانہ 120 روپئے دائمی رکنیت کا چندہ منظور کیا گیا۔ اس طرح اغراض ومقاصد کے پس منظر میں یہ انجمن کام کرنے لگی۔ جس کے تحت انجمن کی انتظامیہ پر توجہ دی گئی۔ مالیاتی سکریٹری اور جنرل سکریٹری کی دستخط سے رقم بذریعہ چیک ادا کرنا اور ہر سال انجمن کے حساب کی جانچ پڑتال کرنے کا اختیار دیا گیا۔ اس کے علاوہ مختلف کمیٹیوں کا بھی انتخاب عمل میں لایا گیا۔

12.2.3 انجمن پنجاب لاہور کے مختلف شعبے:

انجمن پنجاب لاہور کی جانب سے مفید معلومات کو دیسی زبانوں میں فراہم کرنے کے لیے مختلف کمیٹیوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس کے تحت ادبی اور سائنسی کمیٹی کے سپرد یہ ذمہ داری کی گئی کہ یہ کمیٹی دیسی زبانوں میں مفید مطبوعات کی اشاعت کی نگرانی کرے۔ اور عام طبقوں میں تعلیم عام کرنے کی غرض سے کتابیں شائع کرے گی۔

دوسری کمیٹی صنعتی سوسائٹی کی تھی جس کے تحت تمام صوبے کے دستکاروں اور فنی کام کرنے والوں کو صنعت اور صنعتی آرٹس کے موضوعات پر معلومات بہم پہنچانے کی ذمہ داری سپرد کی گئی۔ مفت پبلک لائبریری قائم کرنے کے منصوبے کے تحت کمیٹی قائم کی گئی جو ہر خاص وعام کے استفادہ کے لیے کتابوں کی فراہمی پر زور دیا گیا۔ مختلف زبانوں کے شعبے اور ان کی علیحدہ علیحدہ کمیٹیاں مقرر کی گئیں جس کا اعلان انجمن پنجاب لاہور کے ذریعہ کیا گیا جو 3/ مارچ 1865ء میں خاص جلسہ میں فیصلے کا نتیجہ ہے۔

کمیٹی برائے عربی زبان:

(1) ڈاکٹر لائیٹنر سپرنٹنڈنٹ	(2) فقیر سید شمس الدین خاں سپرنٹنڈنٹ
(3) فقیر سید جمال الدین خاں رکن	(4) شیخ فیروز الدین خاں رکن
(5) مشر رام داس رکن	(6) مولوی کریم الدین رکن
(7) مولوی محمد حسین رکن	(8) مولوی طالب علی رکن
(9) سید حسن شاہ رکن	(10) مولوی علمدار حسین رکن

کمیٹی برائے فارسی زبان:

(1) نواب نوازش علی خاں سپرنٹنڈنٹ	(2) نواب نیاز علی خان سپرنٹنڈنٹ
(3) نواب عبدالمجید خاں رکن	(4) پنڈت من پھول رکن

(5) سید رضا شاہ رکن
(6) شیخ فیروز الدین رکن
(7) فقیر سید شمس الدین خاں رکن
(8) رائے مول سنگھ رکن
(9) میر برکت علی خاں تحصیلدار رکن
(10) ملک پہرا یا لعل رکن

کمیٹی برائے سنسکرت زبان:

(1) پنڈت رادھا کشن سپرنٹنڈنٹ
(2) پنڈت روپ چندر کن
(3) پنڈت دیا رام رکن
(4) پنڈت رام دت رکن
(5) پنڈت بھگوان داس رکن
(6) بابو نوین چندرائے رکن
(7) بارشیا ماچرن رکن

کمیٹی برائے ہندی زبان:

(1) بابو نوین چندررائے سپرنٹنڈنٹ
(2) بابو چندرناتھ رکن
(3) لالہ بہاری لال رکن
(4) پنڈت بسنت رام رکن
(5) پنڈت جمنا پرشاد سکریٹری

کمیٹی برائے اردو زبان:

(1) دیوان بیج ناتھ سپرنٹنڈنٹ
(2) پنڈت من پھول رکن
(3) منشی جیشی رام رکن
(4) منشی ہرسکھ رائے رکن
(5) رائے مول چند رکن
(6) فقیر سید شمس الدین خاں رکن
(7) ڈاکٹر رحیم خاں رکن
(8) محمد برکت علی خاں تحصیلدار رکن
(9) مولوی علمدار حسین رکن
(10) پنڈت سورج بھان و جمنا داس سکریٹری

12.2.4 انجمن پنجاب لاہور کے موضوعاتی مضامین:

انجمن کے قیام کے بعد باضابطہ 27/جنوری 1865ء کو جلسہ خاص ہوا اور 13/فروری 1865ء کو خاص جلسہ مقرر ہوا۔ اُسی طرح 17 فروری 1865ء اور 24/فروری 1865ء کے بعد جلسہ عام اور 3/مارچ 1865ء کو جلسہ خاص مقرر ہوا۔ ان جلسوں میں مضامین پیش کیے جاتے رہے۔ جس کے تحت ڈاکٹر لائیٹنر نے ''صحت اور تندرستی'' کے متعلق انگریزی میں مضمون پڑھا جس کا ترجمہ بابو نوین چندر نے ہندی میں کیا۔ مولوی محمد حسین آزاد نے انجمن کے رکن شیاماچرن ہیڈ کلرک محکمہ تعلیمات کا مضمون پڑھا جو چیزوں کو رواج دینے اور سکھلانے کے اخلاق پر لکھا گیا تھا۔ اس محفل میں بابو چندرناتھ کیو وائٹر کا مضمون ''اہل ہند اور عرب نے کس کس علم کی ترقی کی'' پڑھا گیا۔ یہ مضمون انجمن پنجاب لاہور کے رسالے میں شائع کیا گیا۔ تیسرا مضمون عزیز الدین نے پیش کیا جس میں لاہور کی طوائفوں کو آباد کرنے اور انہیں علیحدہ جگہ دینے کی مانگ کی گئی تھی۔ اس طرح پہلے اجلاس سے لے کر پانچویں اجلاس تک انجمن پنجاب کے ذریعہ ایسے مضامین پڑھے گئے جو سماج اور معاشرے کے لیے فائدہ مند تھے۔ چناں چہ

محمد حسین نے اپنے مضمون میں ثابت کیا کہ مختلف پیشوں میں کارکن افراد کی کمی ہوتی جارہی ہے اوراس طرف توجہ دی جانی چاہیے۔ 17/فروری 1865ء کے جلسہ میں ڈاکٹر نیل نے ''صحت'' پر مضمون پڑھا۔ بابونوین چندر نے ''فائدہ اجرائے علم ہندی ملک پنجاب میں'' اورمولوی محمد حسین نے ''فراخی شہرواصلاح مکانات'' مضمون پیش کیا۔ ہرنشست میں نئے نئے موضوعات پر مضامین پڑھنے کا آغاز ہوا۔ ان مضامین کا تعلق ادبیات سے نہیں بلکہ دیگر علوم وفنون کے شعبہ جات سے تھا۔ مولوی محمد حسین نے اپنے مضمون میں اس بات کا اعادہ کیا کہ اہل علم کے بھلائی کے کاموں کے لیے ہندوستان میں مزید مشینیں فراہم کی جانی چاہیے۔ ڈاکٹر لائٹنر نے صحت اور تندرستی پر مضمون بھیجا تھا۔ مولوی علمدار حسین نے مضمون ''حقوق رشتہ داری کی پرداخت'' تحریر کیا جو لاہور کالج کے پروفیسر تھے۔ اکثر انجمن پنجاب لاہور کے جلسوں میں سماجی اور معاشرتی موضوعات پر مضامین پڑھے جانے لگے اوران کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ 31/مارچ 1865ء کے جلسے میں یہ طئے کیا گیا کہ انجمن کے اجلاس میں پڑھے جانے والے مضامین کی اشاعت کے لیے رسالہ شائع کیا جائے۔ اس رسالے کا پہلا نام ''رسالہ انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب'' تھا لیکن اس کو مختصر کر کے ''رسالہ انجمن پنجاب'' رکھا گیا۔ جس کے لیے ڈاکٹر لائٹنر، پنڈت من پھول، منشی ہرسکھ رائے، بابونوین چندر رائے، رائے مول سنگھ اور بابو چندر ناتھ کو منتخب کیا گیا۔ یہ رسالہ پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ ڈاکٹر لائٹنر کا مضمون ''ارتباط سلاطین سابق وحال با اہل ہند'' جیسا مضمون پیش کیا اور پنڈت من پھول نے ''دوسری شادی کی قباحتیں'' مضمون پیش کیا۔ جب کہ سردار بھگوان داس نے ''رائی جنائی'' اور منشی گوپال داس نے ''دختر فروشی'' اور ''نقص دروغ گوئی'' پر مضامین پیش کیے۔ انجمن پنجاب لاہور کی ہرنشست میں سماجی موضوعات پر مضامین پیش کیے جانے لگے۔ اور یہ طئے کیا گیا کہ سنسکرت، بھاشا، اردو، فارسی اور عربی کی امتحانی کمیٹیوں کا انتخاب کیا جائے اور امتحانات مقرر کیے جائیں، جس کے لیے گورنر نے خوش ہوکر اس کام کے لیے ایک سو پچاس روپے ممتحنین کے لیے عطیہ مقرر کیا۔ پنڈت من پھول نے 29/اپریل 1865ء کے جلسہ میں ''نقص طریقۂ تعلیم انگریزی اور مدرسہ جات سرکاری'' پیش کیا۔ 26/مئی 1865ء کو امتحانات کے قواعد وضوابط پیش کیے گئے۔ محمد برکت علی خاں تحصیلدار نے خانگی مکتبوں میں تعلیم کی خراب حالت کا ذکر کرتے ہوئے سرکاری مدارس میں اخلاق کے مضمون کو شروع کرنے کی حمایت کی۔ یہ غرض کے بعد دیگرے 1865ء اور 1866ء سے لے کر 14/دسمبر 1868ء تک مختلف مشورے اور مضامین پیش ہوتے رہے۔ اس دوران کرنل ہالرائڈ نے انجمن پنجاب سے وابستگی اختیار کی اور رسالہ انجمن پنجاب کی پانچویں جلد برائے ماہ جنوری 1869ء پیش کیا۔ غرض مختلف مشوروں اور مضامین کے توسط سے انجمن پنجاب لاہور کے ذریعہ جو اہم مضامین پیش کیے گئے ان کی تفصیلات حسب ذیل ہیں۔

(1) صبح و شام ہوا کھانے کو جانا (2) ایجادات عجیب (3) تار برقی (4) حصول علم کے لیے عالی ہمت رہنا (5) علم کہربائی (برقی) (6) عبرت اہل ہندو پنجاب (7) حقوق آداب محبت وصحبت (8) کمی محصول اخبار (9) رفاہِ عام (10) کفایت شعاری۔ اس کے علاوہ مختلف جلسوں میں پیش ہونے والے دیگر مضامین کے عنوانات قابل ذکر ہیں۔

(1) جواہرات خیالات (2) تربیت اولاد (3) ترجمۂ اخلاق ناصری (4) حال کوہستان ہندوستان (ہل اسٹیشن) (5) علم ہیئت و قدرت (6) آزادی تجارت ہندوستان میں (7) آرام طلبی اور مشقت کا بیان (8) مضامین قابل توجہ سرکار بابت پنجاب ٹینینسی ایکٹ (9) پنجاب ریلوے (10) دخانی جہاز (11) جمہوری ملک۔ اس کے علاوہ مختلف مباحثے بھی منعقد ہوتے تھے۔ جن کی تفصیلات اس دور کے اخبار ''لارنس گزٹ'' میں شائع ہوتی تھیں۔ بہرحال انجمن پنجاب نے 1869ء تک بے شمار اہم کارنامے انجام دیئے۔ اور پھر باضابطہ لکچروں کا دور شروع ہوا۔

12.2.5 انجمن پنجاب لاہور میں لکچرس کا احیا:

انجمن پنجاب لاہور کے توسط سے 1865ء سے لے کر 1869ء تک مختلف موضوعات پر مضامین پیش کرنے کی روایت قائم رہی۔جس کے بعد 6اکتوبر 1869ء کے جلسے میں پہلا لکچر مثنوی ''تنبیہ النفس'' پر پیش کیا گیا جس کے بعد دوسرا لکچر انگلش میں ''شاہان انگلستان'' پر تھا۔تیسرا لکچر منشی کرم الٰہی نے ''چھاپے خانے کی صنعت'' پر پیش کیا۔اس طرح اکتوبر 1869ء سے باضابطہ مضامین کے ساتھ ساتھ لکچر کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔اسی نشست میں انجمن پنجاب لاہور نے یہ طئے کیا کہ انگریزی اور فارسی کے الفاظ کو درست انداز سے لکھنے اور پڑھنے کے لیے تلفظ کی لغت کا اہتمام کیا جائے جس کے لیے اصول بھی مدون کیے گئے۔4/اکتوبر کے ''لارنس گزٹ'' میں ملکہ وکٹوریہ کی لاہور یونیورسٹی میں آمد پر 17 مضامین شائع کیے گئے جو صنعت، سائنس، اخلاق، اخبارات اور جغرافیہ پر مشتمل تھے۔اسی دوران انجمن میں حکومت کی جانب سے اجازت کے پس منظر میں 50 روپئے سے لے کر 500 روپے تک مضمون نگاروں کو انعامات دینے کی منظوری قبول کی۔اس جلسے میں سکھ برادری، راجپوت قبیلے اور مسلمانوں کے بارے میں ہی نہیں، بلکہ ہندوستان کے دوسرے قبیلوں کے بارے میں مضامین پیش کیے گئے۔1870ء میں انجمن پنجاب نے ہندی زبان میں ''تعلیم نسواں'' اور ''حمایت قبل از وقت شادی'' کے عنوانات سے ہندی میں مضامین پیش کیے۔اور حکومت کو اس پر پابندی لگانے کے لیے عرضداشت پیش ہوئی۔انجمن کی جانب سے گورنمنٹ پنجاب کے ایڈوکیٹ مسٹر ایچ کھنگم کے لکچروں کا آغاز جنوری 1870ء سے ہوا۔جو مختلف تعلیمی موضوعات سے متعلق تھے۔اس طرح انجمن کے ذریعہ وبائی امراض، عوام میں چیچک کے ٹیکوں کا استعمال اور قحط سالی کو دور کرنے کے تدابیر ہی نہیں، بلکہ اصطلاحی ناموں کی ڈکشنری تیار کرنے کے علاوہ تواریخ متقدمین اور ''تواریخ سکھان'' اور ''مقامات حریری'' کے ترجمہ پر توجہ دی گئی۔اس کے علاوہ مختلف کتابوں کے ترجموں پر غور وغوض کیا گیا۔جنوری 1870ء میں انجمن کے جلسے میں سیاست مدن پر مضمون پڑھا گیا۔اور فضیلت محبت اور اقسام پر مضمون پیش کیا گیا۔کئی احکامات بھی جاری کیے گئے جن کے ذریعہ نئی ترقیات پر اظہار خیال کی دعوت دی گئی۔جس کی وجہ سے نئے مضامین پڑھنے والوں کی فہرست میں اضافہ ہوا۔جو مضامین پڑھے گئے ان میں مضمون کرۂ ارض معہ نقشہ جات، فاسفورس کا بیان، فضول خرچی شادیوں کی، جلوس وسواری ملکہ وکٹوریہ اور نہر سوئس پر سفرنامہ پیش کیا گیا۔نارمل دہلی اسکول کے ہیڈ ماسٹر منشی ذکاءاللہ کا مضمون ''اسٹیم یعنی بخارات'' پڑھا گیا۔غرض انجمن پنجاب کے ذریعہ مختلف علوم وفنون کی نمائندگی کو ممکن بنانے کے لیے باضابطہ اقدامات کیے گئے اور نہ صرف رشوت ستانی کو روکنے کے لیے اقدامات کرنے اور عدالتوں میں ازدواجی جھگڑوں کے تسلی بخش فیصلوں کے علاوہ انجمن نے پنچایت اور دوسرے اداروں کو مائل کیا کہ وہ عوامی بھلائی کے کاموں میں اپنا حصہ ادا کریں۔غرض انجمن کی سرگرمیوں کا سلسلہ جاری رہا۔انجمن کی جانب سے عملی اقدامات بھی کیے گئے، جس کے تحت احیا علوم مشرقی یعنی اورینٹل کالج کا قیام اور اورینٹل یونیورسٹی کے قیام کے لیے لیفٹننٹ گورنر پنجاب سر ڈانلڈ میکلوڑ کا خط بھی شائع کیا گیا جس کے ذریعہ بھی اورینٹل یونیورسٹی کے قیام پر زور دیا گیا۔اسی کے ساتھ یہ کوشش کی گئی کہ اخلاق اور مذہب کی تعلیم ہی نہیں، بلکہ علم طب اور تاریخ کے ساتھ ساتھ فلسفہ اور نفسیات کو بھی مضامین کی حیثیت سے قبول کیا جائے۔جس کے لیے باضابطہ علاحدہ کمیٹیاں مرتب کی گئیں۔پہلی کمیٹی سنسکرت زبان کی ترقی کے لیے، دوسری کمیٹی اردو زبان وادب کی ترقی کے لیے اور تیسری کمیٹی عربی، فارسی اور انگریزی زبان کی ترقی کے لیے اور چوتھی کمیٹی درسی کتب کی فراہمی کے لیے اور ان تمام موضوعات کو نصاب کا درجہ دے کر انجمن پنجاب لاہور کی جانب سے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔جس کے نتیجہ میں یہ ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ انجمن پنجاب لاہور نے صرف نظم نگاری کے مشاعرے ہی منعقد نہیں کیے بلکہ علوم وفنون کی ترقی کے لیے

کتابوں کی اشاعت اور ان کے توسط سے اعلیٰ جامعاتی نصاب کی ترتیب پر خصوصی توجہ دی۔

12.3 انجمن پنجاب لاہور کی مختلف خدمات

انجمن پنجاب لاہور کے تمام تر کارنامے ادب کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ حالاں کہ انجمن پنجاب لاہور نے سماجی، معاشی اور معاشرتی کاموں کے علاوہ شعبۂ تعلیمات، شعبۂ تدریسیات، شعبۂ السنہ اور میڈیکل سائنس، انجینئرنگ، دواسازی (Pharmacy) کے علاوہ زچہ گری Midwifery کی تعلیم کا بھی انتظام کیا۔ یہی نہیں بلکہ پروفیشنی کے علاوہ سیول سروس قانون کے امتحانات بھی باضابطہ اسی انجمن کی طرف سے مقرر کیے جانے لگے۔ ان تمام علوم وفنون کی نمائندگی کو انجمن پنجاب لاہور سے وابستہ ادیبوں نے علوم مفیدہ کا نام دے کر ان کی درس وتدریس کا باضابطہ اہتمام کیا۔ جب کہ اردو ادب کی تاریخ میں انجمن پنجاب لاہور کی خدمات کو صرف اردو نظم کی شروعات اور اس کے لیے دو اہم اردو کے شاعر محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی کا نام پیش کیا جاتا ہے جب کہ انجمن پنجاب لاہور کی مختلف خدمات کے بارے میں تفصیلات کا جائزہ لیتے ہوئے اس انجمن کی جانب سے ادبی خدمات کو بھی منظر عام پر لایا جائے گا۔ اس سے قبل نثر میں علمی مضامین اور موضوعاتی مضامین کے علاوہ لکچرس اور خطابات کے طریقے کو بھی انجمن پنجاب لاہور نے اہمیت دی اور اس کے توسط سے منعقد ہونے والی مجلسوں اور محفلوں میں پیش ہونے والے کارناموں کو ابتداء میں واضح کیا گیا ہے۔ اس اکائی کے دوسرے حصے میں انجمن پنجاب کی مختلف خدمات کو مختصر انداز سے واضح کیا جائے گا۔

12.3.1 انجمن پنجاب لاہور کی تعلیمی خدمات:

ہندوستان کی تعلیمی ترقی میں باضابطہ تعلیمات یا ایجوکیشن کو اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ سب سے پہلے انجمن پنجاب لاہور نے اپنے منصوبے کے تحت تعلیمات کو تربیت کی آماجگاہ بنانے کی طرف توجہ دی۔ اور مدرسۂ معلمین کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس کے ذریعہ تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ کو داخلہ دیا جاتا اور ان کی کامیابی پر سند عطا کی جاتی جس کے ذریعہ وہ نہ صرف مدارس میں استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کے اہل قرار دیئے جاتے تھے بلکہ باضابطہ ان کی خدمات کو حکومت کی طرف سے بھی تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس طرح انجمن پنجاب لاہور نے عوام کی بھلائی کے لیے اور تعلیم یافتہ طبقہ کو کسی ایک محکمہ سے وابستہ ہونے کے بجائے دوسرے محکمہ جات سے وابستہ کرنے کے لیے امتحانات کا سلسلہ شروع کیا۔ جسے انجمن پنجاب لاہور کے اہم کارناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔

12.3.2 انجمن پنجاب لاہور میں علوم مفیدہ کی تعلیم:

انجمن پنجاب لاہور کی جانب سے اس بات کی مکمل وضاحت نہیں ملتی کہ علوم مفیدہ کے لیے اس انجمن نے کن علوم کو اہمیت دی تھی۔ لیکن اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ علوم السنہ کے علاوہ ایسے تمام علوم جن کے حاصل کرنے سے انسان کو ملازمت کے مواقع اور خدمت کے طریقہ کو فروغ دینے کا موقع ملتا ہے انہیں نصاب کا درجہ دے کر نہ صرف تدریس کا اہتمام کیا گیا' بلکہ باضابطہ نصاب مقرر کر کے میڈیکل، انجینئرنگ، سائنس، ٹکنالوجی، فارمیسی اور قانون کی تعلیم کے مواقع فراہم کیے گئے۔ ان علوم کو علوم مفیدہ کا موقف دیا گیا۔ چناں چہ نصاب میں جہاں علم طب کے لیے قرابادین رحیمی، رسالہ علم فزیالوجی، رسالہ علم وعمل جس کے ذریعہ دایاؤں کے لیے ہدایات اور زچگی کے متعلق اصول تحریر کیے گئے تھے۔ اسی طرح علم وفن جراحی اور علم الجواہر جیسی کتابوں کو نصاب میں شامل کر کے انجمن پنجاب لاہور کے توسط سے امراض کا علاج یونانی اور انگریزی طریقوں سے ممکن دینے کی کوشش کی گئی، جسے بلاشبہ انجمن پنجاب لاہور کے ذریعہ روایتی طب اور جدید طب کے امتزاج سے تعبیر کیا جائے گا۔ اُسی طرح عمل جراحی کے علاوہ

امراض وعلاج کے لیے بھی باضابطہ انگریزی کتابوں کو مختص کر کے تعلیمات کا اہتمام کیا گیا۔اس انجمن نے قانون کی تعلیم کے لیے بھی باضابطہ منصوبہ بندی کی۔اورانٹرنس کے بعد قانون کی جماعتوں میں داخلے کا موقع فراہم کیا گیا۔جس کے ذریعہ ہندوستان اور عرب ہی نہیں، بلکہ یوروپی قانون کی کتابوں کو نصاب کی حیثیت سے شامل کیا گیا۔کئی انگریزی کتابوں کو بھی نصاب میں شامل کیا گیا تاکہ قانون کے بارے میں جدید معلومات اوراہم خصوصیات سے آگاہی حاصل ہوسکے۔اسی باب کے ابتداء میں تعلیم کے علاوہ فارمیسی کا بھی ذکر کیا جاچکا ہے،جس کے لیے بھی باضابطہ جماعتوں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔یہی نہیں بلکہ فلسفہ،اخلاق اورنفسیات کے ساتھ ساتھ منطق اور زبانوں کے علم میں عربی، فارسی، ہندی، اردو اور گرمکھی کی تعلیم دی جاتی تھی۔جس کے لیے باضابطہ نصابات مقرر تھے۔اوران نصابات میں جدید معلومات کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔اس طرح میڈیکل،انجینئرنگ،فارمیسی، تعلیمات،سائنسی علوم اورمشرقی شعبہ جات سے وابستہ انجمن پنجاب لاہور نے عوام کی بھلائی کے لیے کچھ علوم کا تعین کر کے اس کی تدریس اور تعلیم کے لیے ماحول تیار کیا،جس کے نتیجہ میں انجمن پنجاب لاہور کی تحریک سے علوم مفیدہ میں داخلوں کا آغاز اوران کے توسط سے ہندوستان کی سرزمین میں جدید علوم کا احیاء ہونے لگا۔اس دور میں ایسے کارناموں کو اہمیت کا درجہ حاصل رہا ہے جو 1865ء سے 1875ء تک کی اس ادارہ کی جانب سے سرگرمیوں کا ثبوت دیتے ہیں۔اس ادارہ نے صرف علوم مفیدہ میں یہی نہیں، بلکہ میلہ مویشیان،فن زراعت اور دستکاری کے میلوں کا بھی افتتاح کیا۔تاکہ ہر شعبۂ زندگی میں انجمن پنجاب لاہور کی نمائندگی ہوسکے۔اس غرض سے صنعت کاری مدرسہ قائم کیا گیا۔جس کے ذریعہ زراعت کے مدرسے اور پنچایت کے علاوہ دست کاری کے میلے مقرر ہوتے تھے تاکہ لوگوں کو مفید علوم سے فائدہ اوران کی ضرورت کا احساس دلایا جاسکے۔

12.3.3 انجمن پنجاب لاہور کی جانب سے میڈیکل کی تعلیم:

انجمن پنجاب لاہور نے سب سے پہلے اس انجمن کی جانب سے تین کورسس کا آغاز کیا۔اس کورس کے ذریعہ جہاں یونانی طب کو نصاب کا درجہ دیا گیا اُسی کے ساتھ ویدک طب کو بھی نصاب میں شامل کیا گیا۔جو طلبہ انٹرنس کے ذریعہ کامیابی حاصل کرتے تھے انہیں میڈیکل کی یونانی یا ویدک جماعتوں میں داخلہ دیا جاتا تھا۔ہر جماعت کے لیے 15 طلبہ کی تعداد مختص تھی۔پہلا کورس حکیم حاذق کی جماعت کا تھا۔دوسرا کورس عمدۃ الحکماء کی جماعت سے متعلق تھا اور تیسرا کورس زبدۃ الحکماء کی جماعت سے متعلق تھا۔ہر کورس میں داخلہ کے لیے انٹرنس امتحان کی کامیابی ضروری تھی۔ میڈیکل کی تعلیم کو عام کرنے کے لیے انجمن پنجاب لاہور کے ذریعہ جن نصابات کو اُس دور کی ڈگری کے لیے مقرر کیا گیا وہ حسب ذیل ہیں۔

(الف) حکیم حاذق کی جماعت کا نصاب:

1۔قانونچہ (مقالات علمی) (2) موجز (مقالات علمی) (3) طب اکبر (مقالات عملی) معہ رسائل نبض، قارورہ و نجران (4) تشریح الابدان (5) قراباذین، دربیان ادویہ مفرد و مرکبہ۔

(ب) عمدۃ الحکماء جماعت کا نصاب:

(1) اقصرائی (2) سدیدی (3) تشریح الافلاک (4) مفرح القلوب (5) حدود الامراض (6) بحرالجواہر

(ج) زُبدۃ الحکماء کی جماعت کا نصاب:

(1) شرح اسباب (2) نفیسی (3) کلیات قانون بوعلی سینا مع شرح (4) صمیات قانون شیخ بوعلی سینا (5) تلخیص جالینوس مصنفہ بقراط محشی جالینوس۔

انجمن پنجاب لاہور نے صرف یونانی طب کے امتحانات مقرر نہیں کیے بلکہ ویدک طب کو بھی نصاب کا درجہ دیا۔جس میں داخلہ کے لیے انٹرنس کی کامیابی لازمی تھی ۔اور انٹرنس کے لیے کتابوں کا ذکر کر کے پھر امتحانی نصاب کا ذکر کیا جائے گا۔

(الف) شارنگھدر سنگتا، مادھن مدان، مدن پال، نرگھنٹ دو پدیشن شتک ،کوٹ

(ب) امتحان بھیکھک کا نصاب:

بہار لبر کاش، بنک سین، چکرورت، جوترابھاسکر، سنیات چندر کا

(ج) امتحان مہا بھیکھک:

چرک، سکتہ، شنشرت، واگ بھت، ہرہما سکتا (منتخبات)، ہر بیتی سکتا (منتخبات)

بحوالہ انجمن پنجاب تاریخ اور خدمات، از ڈاکٹر صفیہ بانو، کفایت اکیڈمی اردو بازار، کراچی 1983ء صفحہ 31-430

12.3.4 انجمن پنجاب لاہور کا مشرقی شعبہ:

لاہور کی سر زمین میں اس انجمن کی قیام کے ذریعہ اہم عہدیداروں نے بڑے کارنامے انجام دیئے۔مشرقی شعبے کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔جس کے علوم السنہ کا جائزہ لیا جا چکا ہے۔چناں چہ عربی، فارسی، ہندی اور سنسکرت ہی نہیں، بلکہ گرمکھی کو بھی نصاب کی حیثیت سے قبول کیا گیا تھا۔اس کے ساتھ ہی انگریزی زبان کی تعلیم کو بھی ضروری قرار دیا گیا۔یہی نہیں، بلکہ تاریخ، ریاضی، جغرافیہ جیسے علوم کو بھی مشرقی علوم کی حیثیت سے فروغ دیا جانے لگا۔سائنس میں علم طبیعات اور تدرسیات اور علم طبعی کو شامل کیا گیا جس میں علم کیمیا اور طبعیات کو بھی اہمیت حاصل تھی۔منطق کے علاوہ ہندوستان اور انگلستان ہی نہیں، بلکہ عالمی تاریخ کا مطالعہ بھی علوم مشرقی کے ذریعہ کیا جانے لگا۔جس کے تحت نصاب میں شامل کتاب گرین صاحب کی ''تواریخ انگلستان'' اور ہندوستانی مورخوں کی ''تواریخ ہند'' کو نصاب کا درجہ دیا گیا تھا ریاضی میں نہ صرف علم حرکت، علم سکون، علم نجوم، علم ہندسہ، علم مثلث اور تاریخ انگلستان کے ساتھ ساتھ متقدمین اور متاخرین کی تاریخ بھی نصاب میں شامل تھی۔جب کہ تواریخ قدیم اور تواریخ جدید بھی نصاب کا حصہ تھی۔طبعی جغرافیہ کے علاوہ سیاست مدن، قانون فوجداری، قانون مال، قانون دیوانی، قانون شہادت، اور قانون اسٹامپ وغیرہ جیسے موضوعات قانون کے توسط سے نصاب کی حیثیت سے شامل تھے۔جس کی وجہ سے انجمن پنجاب لاہور کو اس لیے اہمیت حاصل ہوگئی کہ اس ادارہ نے جہاں اصول فقہ کی تعلیم کو ضروری قرار دیا اسی کے ساتھ اصول اختیارات اور اصول صیغہ جات اور ملک میں کفایت شعاری کے قوانین کو بھی نصاب کا درجہ دیا۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم دور سے مشرقی شعبے میں جو صرف زبانوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔اور تاریخ و جغرافیہ ہی نہیں بلکہ طبعی اور ریاضی کے علوم میں طالب علموں کو صرف مشرقی کارناموں سے آگاہی دی جاتی تھی۔جب کہ انجمن پنجاب لاہور نے باضابطہ جدید ترقیات کی کتابوں کو نصاب میں داخل کر کے مشرقی شعبے کو حد درجہ فعال اور معلومات سے آراستہ کر دیا، جس کی وجہ سے زبانوں کی تعلیم میں بھی نہ صرف لسانیات کو اہمیت دی جانے لگی۔بلکہ قواعد اور اس کی خصوصیات کو بھی نصاب میں شامل کیا گیا۔جس کی وجہ سے انجمن پنجاب لاہور کی جانب سے علوم مفیدیہ کا تصور واضح اور عوام کی بھلائی کے لیے استعمال ہونے لگا۔

12.3.5 انجمن پنجاب لاہور کی ہمہ جہت تصانیف کا جائزہ:

انجمن پنجاب لاہور کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اس انجمن کے توسط سے نصابات کی ترتیب کے ساتھ ہی علوم وفنون کی بے شمار

کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔علم منطق پر مشہور انگریز فاؤلر کی کتاب کا محمد حسین نے ترجمہ کیا۔ ریاضی کی مختلف کتابوں کو ٹاؤ ہنٹر نے انگریزی میں لکھا تھا جس کی پانچ کتابوں کا غلام مصطفیٰ نے ترجمہ کیا۔ٹیلر کی لکھی ہوئی ''تواریخ متقدمین'' اور جغرافیہ طبعی کا ترجمہ دلا ور علی شاہ نے ترجمہ کیا۔طبعیات کی تین کتابیں انگریزوں نے لکھی تھیں۔ان کے ترجمے ڈاکٹر امیر شاہ نے علم کیمیاء،علم طبعی اور علم طبعیات کے نام سے کیا۔ ہندسہ،الجبرا، اقلیدس اور علم نجوم،علم حرکت پر بابوشان شنتی بھوشن نے کتابیں لکھیں۔اسی طرح علم ریاضی کی کتابیں بھائی گرمکھ سنگھ اور بابو پنچائن نے اردو میں پیش کیں۔ جو منطق اور علم طبعی کے ادبیوں کے قافلوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔طلبہ کی امداد کے لیے صرف اردو ہی نہیں بلکہ ہندی میں بھی کتابیں شائع کی گئیں۔اس دور کے بیشتر اردو مصنفین کا تعلق غیر مسلم طبقہ سے تھا۔علم الٰہیات کو بھی نصاب کی حیثیت سے پیش کیا گیا اور فولر نامی انگریزی ادیب کی کتاب کا ترجمہ ''منطق منتج'' کے عنوانات سے مشہور ہوا۔ بابو بھوشن مکرجی بلا شبہ ریاضی کی کتابوں کے لیے ماہر قرار دیے گئے۔ جب کہ شمس العلماء ذکاء اللہ نے ہاؤنٹر کی کتاب کا ترجمہ ''ہندسہ بالجبر'' کے نام سے کیا۔غرض الٰہیات،طبعی علوم، ریاضی، تاریخ، ترجمہ اور قانون کے ساتھ ساتھ علم سائنس،علم تدریس اور فارمیسی کے توسط سے لاتعداد کتابیں انجمن پنجاب لاہور کے توسط سے منظر عام پر آئیں اور اُن کتابوں کو نصاب کی حیثیت سے قبول کیا گیا۔قدیم دور سے ہی اردو میں نصابی کتابوں کو اہمیت نہیں دی جاتی اور انہیں محفوظ نہیں رکھا جاتا پھر بھی ڈاکٹر صفیہ بانو نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے ''انجمن پنجاب لاہور۔ تاریخ وخدمات'' کے توسط سے درسی کتابوں کے علاوہ علمی وادبی کتابوں کا جائزہ لیتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کی جانب سے قائم کردہ کالجوں اور اداروں میں انجمن پنجاب لاہور کو اس وجہ سے اہمیت حاصل ہے کہ اس ادارہ میں صرف علمی اور ادبی کتابیں یا پھر ترجمہ نگاری پر توجہ نہیں دی گئ' بلکہ علوم وفنون کو نصاب کا درجہ دے کر علوم جدیدہ کی تعلیم کا آغاز کیا۔جس کو اُس دور میں ''علوم مفیدہ'' کی حیثیت سے شہرت دینے کا کارنامہ بھی انجمن پنجاب لاہور کی خصوصیات میں شامل ہے۔

12.4 انجمن پنجاب لاہور کی ادبی سرگرمیاں

انجمن پنجاب لاہور کی جانب سے ادبی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لیے باضابطہ بے شمار محفلیں منعقد ہوئیں اور کئی زبانوں کے علوم وفنون کو جاری رکھنے پر خصوصی توجہ دی گئی۔عربی، فارسی، ہندی، گرمکھی، سنسکرت اور انگریزی کے علاوہ اِن زبانوں کی تعلیم دینے کے لیے باضابطہ درسی کتابیں بھی شائع کی گئیں۔اس کے ساتھ ہی علوم کی ترقی پر بھی خصوصی توجہ دی گئی۔جس میں علم ریاضی،علم تاریخ،علم جغرافیہ،علم منطق،علم طبعی،علم حساب،علم اقلیدس، تاریخ انگلستان اور سیول سرویس کے امتحانات کے بھی نصابات کی ترتیب بھی توجہ دی گئی۔انگریزی زبان، اس کا انشاء اور انگریزی زبان کی تاریخ اور تاریخ انگلینڈ کے علاوہ انگریزی عبارت کی ترکیب کی مشقوں کو بھی نصاب میں شامل کیا گیا۔جدید زبانوں کے علاوہ انجمن پنجاب لاہور کے ذریعہ زبان ہائے عتیق (قدیم زبانوں) کی تعلیم کا بھی اہتمام کیا گیا۔جس کے ذریعہ یونانی زبانیں اور تاریخ یونان کے علاوہ لاطینی زبانیں اور تاریخ روم کے علاوہ عربی زبان اور اس کی تاریخ کے ساتھ باضابطہ سنسکرت اور اس کی تاریخ کا تدریسی طریقہ اور اُسی کے ساتھ جدید زبانوں میں فرانسیسی، جرمنی، اٹلی، ہندوستان اور تاریخ ہند کے علاوہ فارسی زبان اور اس کی تاریخ کو بھی نصاب کا درجہ دیا گیا تھا۔اس اعتبار سے کتابیں صرف اردو ہی نہیں، بلکہ ہندی میں بھی فراہم کی گئیں۔اور باضابطہ ان کی تعلیم کے لیے یہ پابندی عائد کی گئی تھی کہ قدیم زبانوں کے لیے صرف انگریزوں کی تعلیم پر بھروسہ کیا جاتا تھا، جب کہ عربی، سنسکرت اور دوسری زبانوں کے لیے ہندوستانیوں کو بھی موقع دیا جاتا تھا۔اس طرح انجمن پنجاب لاہور نے صرف ہندوستانی زبانوں ہی نہیں، بلکہ عرب اور ایران کے علاوہ یوروپ کی زبانوں کی تعلیم اور اس کے ادب سے آگاہی لینے کے

لیے ادبی سرگرمیوں کا آغاز کیا لیکن، انجمن پنجاب لاہور کے بیشتر معاملات اردو میں انجام دیئے جاتے تھے۔ چناں چہ سیمناروں اور مضامین کی نشستوں کے علاوہ ادبی نشستوں کا بھی آغاز ہوا جس کی وجہ سے انجمن پنجاب لاہور کی علمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ادبی سرگرمیوں کو بھی اہمیت حاصل ہوئی۔

12.4.1 انجمن پنجاب لاہور کے نظمیہ مشاعرے:

عام طور پر ہندوستان کی سرزمین میں فارسی ادب کی روایت کے مطابق ایسے مشاعرے شروع ہوئے۔ جس کے ذریعہ بادشاہوں، امیروں اور درباروں کے توسط سے شاعروں کی سرپرستی کی جاتی تھی تا کہ وہ فکر معاش سے آزاد ہوکر ادبی تخلیقات پیش کرنے میں مصروف رہیں۔ اسی لیے شاہی درباروں میں شعرا کی شعر خوانی اور مشاعروں کی ابتدائی شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔ اردو نظم کی تاریخ میں اولین شاعر حضرت امیر خسرو رحمہ اللہ علیہ ہی وہ واحد شاعر ہیں جنہوں نے خود کو درباروں سے وابستہ رہنے کے بجائے جنگوں سے وابستہ رکھا۔ بادشاہوں کے درباروں کے بجائے بادشاہوں کی مہم میں شریک ہوتے تھے۔ دہلی میں خواجہ میر درد کے مکان پر مشاعروں کے انعقاد کی تفصیل موجود ہے۔ دکن میں قلی قطب شاہ کی سرپرستی میں مشاعرے ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ غرض مشاعرے کی روایت ادبی نوعیت کی اور اس کے توسط سے شعر سنانے اور داد حاصل کرنے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ جس کا سلسلہ شمال اور جنوب میں جاری رہا۔ لیکن اردو ادب کی خدمت' غزل کی شاعری سے انجام دی جارہی تھی۔ اثنائے عشری طبقہ سے تعلق رکھنے والے مرثیے پیش کر کے مشاعروں میں داد حاصل کرتے تھے۔ سب سے عظیم کام انجمن پنجاب لاہور نے یہ انجام دیا کہ غزل کے مشاعرے کے بجائے نظم کے مشاعرے منعقد کرنے کا آغاز کیا۔ اگر چہ انجمن پنجاب کے پہلے ناظم تعلیمات ڈاکٹر لائٹنز تھے لیکن جب صوبہ پنجاب کے سربراہ بن کر کرنل ہالرائڈ ناظم تعلیمات مقرر کیے گئے تو انہوں نے انجمن پنجاب لاہور کے نظمیہ مشاعرے کی بنیاد رکھی۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ 15/اگست 1867ء کو انہوں نے ایک مضمون پڑھا، جس میں ادبی معیار میں انقلاب اور شاعروں کے نصب العین میں تبدیلی کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا۔ اس مضمون کا اثر یہ ہوا کہ باضابطہ عنوان دے کر نظم لکھنے کی خواہش کے تحت مشاعرہ شروع ہوا۔ اردو کے مشہور ادیب پنڈت کیفی اور ڈاکٹر محمد صادق نے یہ ثابت کیا ہے کہ 19/اپریل 1874ء کو جدید اردو نظم کا مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس کی روداد روزنامہ کوہِ نور لاہور کے ضمیمہ 16/مئی 1874ء کو شائع ہوئی۔ محمد حسین آزاد نے اس وقت جو تقریر کی تھی، اس کے اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس محفل مشاعرہ میں شرکاء کون کون تھے۔

> ''یہ عظیم الشان جلسہ ادبی دنیا میں کسی جلسہ سے کم نہیں۔ 19/اپریل 1874ء کو شام کے 6 بجے انجمن کے اہتمام سے شکھشا سبھا کے مکان میں منعقد ہوا۔ حاضرین میں ہندوستانی اصحاب کے علاوہ کرنل ہالرائڈ، مسٹر جسٹس بولنو، چیف جج ہائی کورٹ مسٹر تھارنٹن، سکریٹری پنجاب گورنمنٹ کرنل میکلیگن، مسٹر ینگ کمشنر اور مسٹر نسبٹ ڈپٹی کمشنر لاہور اور نواب عبدالمجید خاں، فقیر سید قمرالدین وغیرہ صاحب تشریف رکھتے تھے۔''

مولانا آزاد نے اپنی تقریر کے ذریعہ ان حقائق کا ذکر کیا ہے جب کہ آزاد کے نبیرہ آغا محمد باقر نے اپنی کتاب ''نظم آزاد'' میں پہلے مشاعرہ کی تاریخ 8/مئی 1874ء لکھی ہے۔ انجمن کی روداد کو متعین نہیں کیا جاتا بلکہ ''رسالہ انجمن پنجاب'' کے پرچوں میں پہلے مشاعرے کی تاریخ 8/مئی

1874ء لکھی گئی ہے۔ اسی لیے اس تاریخ کو پہلے انجمن پنجاب لاہور کے موضوعاتی مشاعرہ کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اس پہلے مشاعرہ سے قبل 2/مئی 1874ء کو شام میں جلسہ عام ہوا تو وہاں مولانا محمد حسین آزاد نے تاریخی تقریر کی اور اپنی پہلی نظم ''شام کی آمد'' اور ''رات کی کیفیت'' پڑھی۔ جس کی تفصیلات اخبارات میں درج ہیں۔ 8/مئی کو انہوں نے اپنی نظم مثنوی ''موسوم بہ شب قدر'' پیش کی۔ 30/مئی 1874ء کو منعقد ہونے والے مشاعرے کا عنوان ''برسات'' رکھا گیا۔ گارساں دتاسی اور ڈاکٹر محمد صادق نے اس مشاعرہ کو انجمن پنجاب لاہور کا دوسرا مشاعرہ لکھا ہے جس میں مولانا حالی نے مشہور نظم ''برکھارت'' پڑھی۔ انجمن پنجاب لاہور کا دوسرا مشاعرہ 30/جون 1874ء کو ہوا جس کا عنوان ''زمستان'' رکھا گیا تھا۔ اس طرح اختلافی موضوعات کے ذریعہ انجمن پنجاب کے مشاعرے کے انعقاد کا اندراج موجود ہے۔ انجمن پنجاب لاہور کی رپورٹ 1974ء جولائی سے نتائج اخذ کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ انجمن کا تیسرا مشاعرہ 3/اگست 1874ء کو منعقد ہوا جس کا عنوان ''امید'' تھا۔ دہلی کے کئی شعرا اور فیروز پور کے شاعروں کے علاوہ محمد حسین آزاد، مولوی اشرف بیگ خاں، رئیس دہلی، شاہ انور حسین ہما، عطاء اللہ خاں عطا، اور الٰہی بخش رفیق نے اس موضوعاتی مشاعرے میں حصہ لیا۔ حالی کی مشہور مثنوی ''نشاط امید'' کو پسند کیا گیا۔ اس طرح وقفہ وقفہ سے انجمن پنجاب لاہور کے مشاعروں کا سلسلہ جاری رہا۔ یکم ستمبر 1874ء کو انجمن ہال کے محفل مشاعرہ میں ''حب وطن'' عنوان پر نظمیں پیش کی گئیں۔ اس طرح نظم نگاری کا قافلہ انجمن پنجاب لاہور سے آگے بڑھتا رہا۔ جس میں صرف مسلم طبقہ ہی نہیں، بلکہ ہندو طبقہ بھی شریک ہوتا تھا۔ لالہ کھڈا مل مدرس نے 30 اشعار پر مبنی نظم سنائی۔ محمد حسین آزاد کی مثنوی 'حب وطن' اور سید اصغر علی لکھنوی حقیر کی نظم بھی پیش کی گئی۔ 9/اکتوبر 1874ء کو انجمن کا پانچواں مشاعرہ ''امن'' کے نام سے منعقد ہوا۔ جب کہ چھٹا مشاعرہ بعنوان ''انصاف'' 14/نومبر 1874ء اور ساتواں مشاعرہ بعنوان ''مروت'' 19/دسمبر 1974ء کو منعقد کیا گیا۔ اس طرح نویں اور دسویں مشاعرے کی روداد موجود ہے جو 13/مارچ 1875ء اور اس کے بعد منعقد ہوا۔ جس میں لکھنوی اور دہلوی شعرا شریک ہوا کرتے تھے۔ غرض مشاعروں کی نظمیہ روایت کو فروغ دینے میں انجمن پنجاب لاہور کی خدمات اپنی جگہ مسلمہ ہے اس لیے اردو زبان اور ادب کی ترقی میں انجمن پنجاب لاہور کی نظم نگاری کے مشاعروں کو سب سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جن کی روداد مختصر بیان کی جا چکی ہے۔

12.4.2 انجمن پنجاب لاہور کی جانب سے نثر کی ترقی:

انجمن پنجاب نے جہاں مختلف علوم وفنون اور ادب کی ترقی میں حصہ لیا وہیں اردو نثر کی دو اہم اصناف اور جن کا تعلق افسانوی نثر سے نہیں بلکہ غیر افسانوی نثر Non-Fiction سے قائم ہے' اس کی ترقی پر خصوصی توجہ دی۔ ابتداء میں مضمون نگاری اور مختلف مضامین نگاروں کی نگارشات کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ نثر کی ترقی میں مضمون کا فنی اظہار دہلی کالج سے مستحکم ہوتا ہے۔ لیکن اردو ادب میں تنقیدی مقالات لکھنا اور لسانی خدمات انجام دینا دو ایسے اہم کارنامے ہیں، جو اردو نثر کی ترقی میں انجمن پنجاب لاہور کے توسط سے مقالہ نگاری اور لسانیاتی جائزہ کو اہمیت کا موقف حاصل ہوا۔ اُس دور تک ان دونوں طریقوں کو کسی نے بھی اپنے اظہار کا ذریعہ نہیں بنایا تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی ہی نہیں، بلکہ انجمن پنجاب لاہور کی مجلسوں میں باضابطہ سرسید کے نثری انشائیے اور مقالے بھی پیش ہوتے رہے ہیں۔ محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب لاہور کی مجلسوں میں ''آبِ حیات'' جیسی کتاب کو قسط وار پیش کیا۔ جس کے ذریعہ انہوں نے اردو زبان پر فارسی انشاء پردازی کے ہونے والے فائدے اور پہلی مرتبہ اردو نثر میں لسانی تحقیق کا راستہ دکھایا۔ ان کے مقالے غالب کے ہمعصر ذوق پر بھی موجود ہیں جو تنقیدی مقالات کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح مولانا حالی نے جہاں محمد حسین آزاد کی طرح انجمن کے مشاعروں میں اپنی نئی نظمیں پیش کیں وہیں باضابطہ مقالے پیش کرنے کی روایت کو بھی فروغ دیا۔

انہوں نے ''حیات جاوید'' کے کئی حصے انجمن پنجاب لاہور کی محفلوں میں پیش کیے۔ وہ پہلے نقاد ہیں جنہوں نے اردو میں طبع زاد اصناف اور شاعری کی اصناف کا تجزیہ کیا۔ وہ اردو میں مقالہ نگاری کے ذریعہ صنفی مطالعہ کے اہم نثر نگار سمجھے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مقالوں کو نئی تنقید کا وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔ سرسید کے کئی انشائیہ انجمن پنجاب لاہور کے محفلوں میں پیش ہوتے رہے۔ اس طرح انجمن پنجاب لاہور نے شاعری کے علاوہ نثر میں مقالہ نگاری اور مضمون نگاری کے ساتھ ساتھ اردو میں پہلی مرتبہ لسانی خدمات کا آغاز کیا۔ نثر اور نظم دونوں میں انجمن کے کارنامے اہمیت کے حامل ہیں۔ اس انجمن نے اورینٹل یونیورسٹی کے قیام کے لیے حکومت سے خط و کتابت کی اور نصاب پیش کیا اور ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کو بھی ممکن بنایا۔ گوکہ انجمن پنجاب لاہور کے دور تک مولانا آزاد کی کتابیں ''آب حیات''، ''سخندان فارس'' اور ''نیرنگ خیال'' وجود میں آ چکی تھیں۔ جب کہ ڈاکٹر لائٹنر نے ''دردستان اور سنین اسلام'' کتاب لکھ کر نئی لسانیات کی بنیاد ڈالی۔ گویا لسانی اعتبار سے زبان کو صرف اس کی اصناف سے نہیں، بلکہ اس کے دور سے وابستہ کرنے کا طریقہ لسانی پس منظر میں ڈاکٹر لائٹنز کی کتاب سے وجود میں آیا۔ فارسی، عربی اور ترکی زبانوں کے ماخذات کا حوالہ دینے کے بجائے انسانی پس منظر میں اردو کے ساتھ ہندوستانی حوالے دینے کی بنیاد بھی انجمن پنجاب لاہور کے ذریعہ شروع کی گئی۔ جب کہ 1835ء میں اردو کو سرکاری اور عدالتی زبان کا درجہ دیا گیا۔ تو اس کے ساتھ ہی اردو اور ہندی کا جھگڑا پیدا ہوتا۔ اس جھگڑے کو مٹانے کے لیے انجمن پنجاب لاہور کے ادیبوں نے ایسے مضامین لکھے جس کی وجہ سے نہ صرف مسائل کو حل کرنے پر توجہ دی جانے لگی، بلکہ زبان میں نئی انگریزی اصطلاحات کا چلن اور اس کے ساتھ ہی زبان کی صرف ونحو پر توجہ دینے کا کام بھی انجمن پنجاب لاہور نے لسانی پس منظر میں انجام دیا۔ اس طرح اردو میں پہلی مرتبہ کالج کے نصاب کے لیے ''عام اصول صرف ونحو'' اور فارسی کے لیے ''فرہی صرف ونحو'' جیسی کتابیں محمد حسین آزاد نے ڈاکٹر لائٹنز کی کوشش سے جاری کی۔ جس کی وجہ سے نہ صرف ہند۔ ایرانی تقابلی لسانیات کی بحث کا آغاز ہوا بلکہ اردو زبان میں فلسفیانہ تحقیقات کے اصول بھی مدون ہوئے۔ غرض اردو نثر کی ترقی میں انجمن پنجاب لاہور کی اِن خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

12.4.3 انجمن پنجاب لاہور میں علوم وفنون کے عہدہ داران و کتب:

انجمن پنجاب لاہور کا یہ کارنامہ ہے کہ اس ادارہ کی جانب سے علم طب اور عمل جراحی کے علاوہ مختلف علوم وفنون کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا۔ میڈیکل کالج میں موجود اساتذہ کی نمائندگی اس طرح کی گئی ہے۔

(1) جے بی اسکرون پرنسپل و مدرس جراحی و علم طب (بہ سبب بیماری رخصت پر ہیں)

(2) ٹی ای بی براؤن ایم ڈی لندن قائم مقام پرنسپل

(3) جی ہنڈرسن ایم ڈی قائم مقام مدرس علم طب و جراحی

(4) سی ایم اسمتھ، آرسی ایس مدرس فن قابلہ و علم سمیات وغیرہ متعلقہ عدالت

(5) ڈی ٹی بی براؤن، ایم ڈی مدرس علم کیمیا و علم ادویہ اور علم نباتات

(6) ای بینیل، مدرس علم تشریح و افعال اعضاء اور قائم مقام مدرس علم ادویہ

(7) جی انڈروس، مدرسہ کے اسپتال کے سرجن جو ہمیشہ مدرسہ میں رہتا ہے

(8) رحیم خاں، سپرنٹنڈنٹ ہندوستانی جماعت

(9) محمد حسین خاں، اسسٹنٹ ڈیماسٹریٹر اناٹومی

(10) آر ڈبلیو سری سن، اپوتھیکرے

ان اساتذہ کی سرکردگی میں ایسی تعلیم فراہم کی جاتی تھی کہ جس کے بعد کامیاب ہونے والے طلبہ کو سب اسسٹنٹ سرجن مقرر ہونے اور ڈاکٹر مقرر ہونے کے لائق بنایا جاتا تھا۔ اسی طرح سائنسی علوم کو بھی فروغ دینے کے لیے باضابطہ تعلیم کا آغاز کیا گیا اور اساتذہ کا تقرر عمل میں آیا۔ جس کے لیے درسی کتابیں بھی موجود تھیں۔ اخلاق، تہذیب اور شائستگی سکھانے کے لیے منشی عزیز الدین سررشتۂ محکمہ تعلیمات کی کتاب نصاب میں شامل کی گئی۔ جس میں جھوٹ اور سچائی کے علاوہ عام اخلاقی باتوں کا ذکر تھا جو ''جوہر عقل'' کے نام سے مشہور تھی۔ ''منتخبات اردو'' جس کے ذریعہ آسان زبان میں کہانیاں، قصے پیش کیے جاتے تھے۔ ''مفتاح القواعد'' انگریزی زبان کی گرامر جس کا اردو میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ ''قصص الہند'' مولانا آزاد کی کتاب جو ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کے ذریعہ تحریر کی گئی تھی نصاب کا حصہ قرار پائی تھی۔ درسی کتب میں ''مختصر جغرافیہ کرۂ ارض'' بھی شامل تھی جسے حافظ عبدالرحمٰن نے تحریر کیا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر بابو ایس ایم مکرجی سے کتاب ''علم حرکت'' لکھائی گئی۔ جس کے ذریعہ سائنس کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اخلاقی اور مذہبی کتب بھی نصاب کا درجہ رکھتے تھے۔ جس کے ذریعہ کتاب ''لکچر اثبات واجب الوجود وتعالیٰ وتقدس'' ہی نہیں بلکہ ''مسئلہ شرعی در باب دعوی و رسالت'' اور مختلف ادیبوں سے 14 مضامین پر شامل ''سبب دروغ گوئی'' کو نصاب میں شامل کیا گیا تھا۔ فقیر جمال الدین کی کتاب ''در باب علو حوصلگی'' بھی نصاب کا درجہ رکھتی تھی۔ کئی مصنفین کے 26 مضامین پر مشتمل کتاب ''دختر فروشی'' نصاب میں شامل تھی۔ منشی کرم الٰہی کی کتاب ''علم اخلاق'' اور کتاب ''در بیان مضرت بے اتفاقی'' اور کتاب ''در باب انسداد رشوت ستانی'' بھی نصاب میں شامل تھی۔ اسی طرح زبانوں اور تاریخ ہی نہیں بلکہ فلسفہ اور منطق کے علاوہ فارمیسی کے ساتھ ساتھ زچہ گری کی کتابوں کا بھی نصاب موجود تھا جس کی تدریس کے ذریعہ اُس میدان میں قابل طلبا و طالبات پیدا کیے جاتے تھے۔

12.4.4 انجمن پنجاب لاہور سے نثر کا فروغ:

اس اکائی کی ابتداء میں بتایا جا چکا ہے کہ انجمن پنجاب لاہور نے نثر کے ذریعہ غیر افسانوی اصناف کو فروغ دیا۔ مضمون نگاری اور مقالہ نگاری کے علاوہ انجمن پنجاب لاہور میں اپنے مضامین پڑھنے والے افراد نے اس انجمن کی جانب سے اردو نثر میں مباحثہ کی بنیاد کو فروغ دیا۔ اس کے علاوہ خطبہ نگاری بھی فروغ پانے لگی۔ سرسید کے انشائیے بھی انجمن پنجاب لاہور کے نشستوں میں پیش کیے جاتے رہے۔ اُس دور تک اردو کی غیر افسانوی نثر میں یہی اصناف کا درجہ اہمیت کا حامل تھا۔ مختلف علوم وفنون کے علاوہ فلسفہ، منطق، طب اور قانون کے علاوہ فارمیسی اور دواخانہ کی ضروریات پر مضامین لکھنے کا آغاز بھی انجمن پنجاب کے ذریعہ ہوا۔ جنہیں انجمن پنجاب لاہور کے قلم کاروں نے علوم مفیدہ کے نام سے شہرت دی۔ جب کہ انجمن پنجاب لاہور کے ذریعہ افسانوی نثر پر کوئی توجہ نہیں دی گئی، کیوں کہ سارے ہندوستان میں داستانوں اور ناولوں کا اس قدر عروج تھا کہ اس کے بعد مزید افسانوی اصناف کو اختیار کرنے کے لیے انجمن پنجاب لاہور نے کوئی لائحہ عمل تیار نہیں کیا۔ کیوں کہ انجمن پنجاب لاہور کے قیام کا مقصد ہی فائدہ پہنچانے والے علوم کی تدریس اور ان کے لیے کتابوں کی فراہمی جیسا رویہ تھا۔ اس لیے انجمن پنجاب سے وابستہ عہدیداروں نے ایسی نثر کی طرف خصوصی توجہ دی جن کے ذریعہ علوم وفنون کی نمائندگی اور ان کے توسط سے ترسیل کا حق ادا ہو سکے۔

12.4.5 انجمن پنجاب لاہور کے ذریعہ شعری اصناف:

شاعری کی روایتی اصناف کا چلن انجمن پنجاب لاہور سے قبل موجود تھا۔ چناں چہ مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، رباعی، غزل، قطعہ، شہر آشوب، واسوخت اور ریختی جیسی شعری اصناف کو عروج حاصل ہو چکا تھا۔ مختلف شعرا ان شعری اصناف پر کم توجہ دینے لگے تھے؛ بلکہ توجہ کا مرکز حسن وعشق کی شاعری اور اس کے توسط سے غزل کی شاعری کو اعزاز حاصل ہو چکا تھا۔ اس وقت تک ساری اردو دنیا میں دو نظم گو شعرا موجود تھے۔ دکن کے علاقے میں سلطان قلی قطب شاہ نے اپنے دیوان کے ذریعہ غزل کی ہیئت میں نظم لکھی تھی، جب کہ نظیرا کبر آبادی نے مختلف ہیئتوں میں نظموں کا سلسلہ شروع کیا تھا جب کہ نظم کی روایت محدود تھی۔ انجمن پنجاب لاہور کے مشاعروں کے ذریعہ باضابطہ نظم نگاری کی روایت کا آغاز ہوا اور شاعروں نے عنوانات پر نظمیں لکھ کر پیش کرنا شروع کیا۔ اردو شاعری میں انگریزی ادب سے قبول کی جانے والی نظم نگاری کا سلسلہ شروع ہوا۔ ابتداء میں انجمن پنجاب کے جلسوں میں تین بڑے شاعروں نے مثنوی نگاری کی روایت کو برقرار رکھا جن میں محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی اور انور حسین ہما جیسے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ مثنوی کی زبان سادہ تھی جس کے بعد کرنل ہالرائڈ کے مشورہ پر انجمن پنجاب میں موضوعاتی نظموں کو پیش کرنے سلسلہ شروع ہوا۔ محمد حسین آزاد اور مولانا حالی نظم نگاری کے سرخیل قرار دیئے گئے۔ چناں چہ یکے بعد دیگرے انجمن پنجاب لاہور کے مشاعروں میں مختلف عنوانات جیسے اخلاق، تہذیب، قناعت، مروت، انصاف، امن کا انتخاب کیا گیا جس میں مثنویاں بھی پیش کی گئیں لیکن انجمن پنجاب کا انقلابی کارنامہ یہی ہے کہ مولانا آزاد اور مولانا حالی نے مل کر اردو شاعری میں نظم کی روایت کو ''نیچرل شاعری'' سے وابستہ کیا۔ قدرتی موضوعات پر لکھی جانے والی نظمیں نیچرل شاعری کہلاتی ہیں۔ چناں چہ ''شام کی آمد''، ''رات کی کیفیت''، ''برکھارُت'' اور ایسے ہی کئی عنوانات پر نظمیں لکھی گئیں؛ جنہیں اردو کی پہلی نیچرل شاعری کی بنیاد قرار دے کر انجمن پنجاب لاہور کے توسط سے اردو میں سب سے پہلے نیچرل شاعری کے آغاز ہونے کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔ اِن مشاعروں میں شرکت کرنے والوں میں کرنل ہالرائڈ، جسٹس بولنو، جج چیف کورٹ مسٹر تھارنٹائن، سکریٹری پنجاب گورنمنٹ کرنل مکگلیکس، مسٹر نیک کمشنر مسٹر نسبٹ، ڈپٹی کمشنر لاہور عبدالمجید خاں، فقیر سید قمرالدین وغیرہ کے علاوہ جسٹس بولندہ بھی انجمن پنجاب کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ اِن مشاعروں میں شعرا کی حیثیت سے شاہ انور حسین ہما، مولوی مرزا اشرف بیگ اشرف، منشی الٰہی بخش رفیق، مولانا آزاد، مولوی محمد مقرب علی رئیس جگراؤں، مولوی عمر جان ولی، مولوی قادر بخش، مولوی عطاء اللہ اور مولوی علاء الدین محمد کاشمیری کے علاوہ پنڈت کرشن لال طالب، ملا گل محمد عالی، مفتی امام بخش، رئیس دوگالا، انور حسین، مصر رام داس قابل، منشی علاء الدین صافی، لالہ گنڈا مل، سید اصغر علی حقیر لکھنوی۔ اس طرح 8 رمئی 1874ء کے مشاعرے میں 11 شعرا اور اس کے بعد کے مشاعروں میں شاعروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ طویل فہرست موجود ہے، جس میں منشی لکشمن داس برہم ہی نہیں، بلکہ فصیح الدین رنج کے نام بھی شامل ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انجمن پنجاب کے مشاعروں میں شرکت کرنے والے جہاں مسلم طبقہ کی تعداد زائد تھی، وہیں ہندو طبقہ بھی اِن مشاعروں میں شریک ہو کر اپنی نظمیں سنایا کرتا تھا۔ انجمن پنجاب کے مشاعرے' ان کے موضوعات اور شرکاء کے ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس انجمن میں قومی یکجہتی کا کام کرنے کے ساتھ ساتھ موضوعات کے تنوع کو شاعری میں پیش کرنے اور نظم کی شاعری کو نیچرل شاعری سے وابستہ کر کے اردو کی شعر گوئی کی صنف میں پابند نظم نگاری کا آغاز کیا۔ اُس وقت تک آزاد نظم اور معریٰ نظم کا چلن عام نہیں ہوا تھا اس لیے انجمن پنجاب کے موضوعات اور اس سے وابستہ شاعروں کی کوشش کو پابند شاعری ہی نہیں، بلکہ نیچرل شاعری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ غرض متفقہ طور پر نظم نگاری کو عام کرنے میں انجمن پنجاب لاہور کی خدمات قابل ستائش ہیں۔

12.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ انجمن پنجاب لاہور کا قیام سرکاری احکامات کے ذریعہ ڈاکٹر لائیٹنر کے مشورے سے عمل میں آیا۔

☆ ڈاکٹر لائیٹنر کے بعد کرنل ہالرائڈ نے انجمن پنجاب لاہور کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کیا۔

☆ انجمن پنجاب لاہور میں نصابی کتابوں کی ترتیب میں خصوصی توجہ دی گئی۔

☆ انجمن پنجاب لاہور کے زیر اثر سب سے پہلے موضوعاتی مضامین پیش کرنے کی روایت کا آغاز ہوا۔

☆ انجمن پنجاب لاہور کا پورا نام ''انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب'' رکھا گیا تھا۔

☆ ڈاکٹر لائیٹنر کو گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل اور کرنل ہالرائڈ کو پنجاب سر رشتۂ تعلیم کے منتظم اعلیٰ کا درجہ حاصل تھا۔

☆ اس انجمن نے تعلیم یافتہ اور بااثر طبقے سے لوگوں کا انتخاب کر کے کمیٹیاں بنائیں۔

☆ قدیم مشرقی علوم، لسانیات، بشریات، تاریخ اور ہند کے علاوہ ہمسایہ ملکوں کے آثار قدیمہ کی تحقیق کے لیے کمیٹی قائم کی گئی۔

☆ دیسی زبانوں کی تعلیم اور فروغ کے علاوہ صنعت وتجارت کی ترقی کے لیے کمیٹی قائم کی گئی۔

☆ معاشرتی، ادبی، سائنسی اور میڈیکل، انجینئرنگ اور فارمیسی کی تعلیم کے لیے کمیٹی مقرر کی گئی۔

☆ صنعتی سوسائٹی کے ذریعہ مختلف طبقوں میں تعلیم اور دیسی زبانوں میں مفید مطبوعات کی اشاعت کی ذمہ داری دی گئی۔

☆ انجمن کی جانب سے رسالہ انجمن پنجاب جاری کیا گیا جس کے مہتمم سورج بھان تھے۔

☆ تمام زبانوں کی کمیٹیوں میں عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی اور اردو کے سپرنٹنڈنٹ اور سکریٹری کے علاوہ ارکان مقرر ہوئے۔

☆ انجمن پنجاب لاہور کا پہلا اجلاس 21/جنوری 1865ء کے شکھشا سبھا کے مکان پر مقرر ہوا۔

☆ انجمن پنجاب لاہور کا ابتداء کے ساتھ ہی مختلف شعبے اور مختلف کمیٹیوں کا قیام عمل میں آیا۔

☆ انجمن کے ابتدائی جلسوں میں ہی علوم وفنون اور مختلف موضوعات پر مضامین پیش کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔

☆ انجمن پنجاب لاہور کے پہلے جلسے کے بعد دوسرا جلسہ 27/جنوری، تیسرا جلسہ 11 فروری، 17/فروری اور پانچواں جلسہ 24/فروری، چھٹا جلسہ 3/مارچ اور 9 مارچ کے بعد 17/مارچ کو مضامین پڑھے گئے۔

☆ چند اہم مضامین میں لالہ گوپال داس کا مضمون ''نفس دروغ گوئی'' اور ان کا مضمون ''دختر فروشی'' اہمیت کا حامل ہے۔

☆ انجمن پنجاب لاہور نے نصاب کی ترتیب کے ساتھ امتحانات کے انعقاد پر توجہ دی۔

☆ مئی 1866ء میں کالج یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی اور طلبہ سے فیس نہ لینے کا اعلان کیا گیا۔

☆ انجمن پنجاب لاہور کے سالانہ امتحانات میں پہلی مرتبہ 109 طلبہ کو داخلہ دیا گیا۔

☆ انجمن نے اپنی کمیٹیوں کے ذریعہ زراعت، فینانشیل، ایجوکیشن اور میڈیکل کمیٹی قائم کی۔

☆ انجمن کی جانب سے باضابطہ تعلیمی کاروائیوں کے علاوہ نمائش گاہ کا قیام کا اعلان کیا گیا۔

☆ دیسی زبانوں میں عربی، سنسکرت، فارسی، ہندی، گرمکھی اور اردو کے امتحانات لیے جاتے تھے۔

☆ انجمن پنجاب لاہور نے لاہور کے توسط سے جن موضوعات پر مضامین پیش کیے گئے، ان کے اہم عنوانات اس انداز کے تھے۔

(1) صبح وشام ہوا کھانے کو جانا (2) ایجاد عجیب (3) تارِ برقی (4) حصول علم کے لیے اعلیٰ ہمتی، (5) علم کہربائی، (6) عبرت اہل ہندو پنجاب (7) حقوق آداب ومحبت وصحت (8) کمی محصول اخبار (9) رفاہِ عامہ (10) کفایت شعاری۔

☆ مختلف جلسوں میں جو گیارہ مضامین پیش کیے گئے ان کی تفصیلات اس طرح دستیاب ہیں:

(1) جواہر خیالات (2) تربیت اولاد (3) ترجمہ اخلاق ناصر (4) حال قبرستان ہندوستان (5) علم ہیئت وقدرت (6) آزادئ تجارت (7) آرام طلبی اور مشقت کا بیان (8) مضامین قابل توجہ حکومت پنجاب (9) پنجاب ریلوے (10) دخانی جہاز (11) بہبودی ملک

☆ اس کے علاوہ کیمیا، طبعیات، ریاضی، قانون اور دواسازی کے علاوہ ڈاکٹری کے علوم پر بھی مضامین پیش کیے گئے۔

☆ انجمن پنجاب لاہور کی ادبی سرگرمیوں میں جہاں نثر نگاری کے توسط سے مضمون، مقالہ اور خطبات کا آغاز کیا گیا۔

☆ انجمن پنجاب لاہور کی ادبی سرگرمیوں میں نثر کے بعد شاعری میں تبدیلی پر خصوصی توجہ دی گئی۔

☆ انجمن پنجاب لاہور کے مشاعرے اردو ادب کی تاریخ میں سب سے اہم مقام کے حامل ہیں۔

☆ کرنل ہالرائڈ کے مشورے پر محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی نے سب سے پہلے نظمیہ مشاعرے کی بنیاد رکھی۔

☆ انجمن پنجاب لاہور پہلا نظمیہ مشاعرہ 8 رمئی 1874ء کو منعقد ہوا جس میں مثنوی کے علاوہ ''نظم'' پیش کی گئی۔

☆ انجمن پنجاب لاہور کے مشاعرے سے اردو میں پہلی مرتبہ باضابطہ نیچرل شاعری کی بنیاد مستحکم ہوئی۔

☆ انجمن پنجاب لاہور کے مشاعروں سے پہلے اردو میں غزل گوئی کو فروغ حاصل تھا۔ نظم پر توجہ نہیں دی جاتی تھی۔

☆ انجمن پنجاب لاہور نے علم طب، علم تاریخ، علم طبعیات، فلسفہ، اخلاقیات، علم تعلیمات اور میڈیکل، انجینئرنگ اور قانون کی تدریس کو عام کیا۔

☆ انجمن پنجاب لاہور کی تجویز پر حکومت برطانیہ نے برصغیر میں اعلیٰ تعلیم کو فروغ دینے کے لیے پنجاب یونیورسٹی 8 رستمبر 1869ء کو اعلان کیا۔ اس بیت العلوم کا نام ''یونیورسٹی کالج لاہور'' رکھا گیا۔

☆ انجمن پنجاب لاہور کی جدوجہد سے علوم وفنون کے علاوہ اردو نثر نگاری میں اہم تبدیلی واقع ہوئی۔

☆ انجمن پنجاب لاہور کے کارنامے صرف نثر نگاری اور علوم وفنون کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ شاعری کی وجہ سے بھی ہے۔

☆ انجمن پنجاب لاہور کے مشاعروں سے اردو میں نظم لکھنے کی روایت عام ہوئی۔ اور پابند نیچرل شاعری کا آغاز ہوا۔

12.6 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
علوم مفیدہ	:	فائدہ پہنچانے والے علوم (سائنس وٹکنالوجی)
ریختی	:	عورتوں کی زبان میں لکھی جانے والی شاعری
شہر آشوب	:	جس شاعری میں شہر کے خراب حالات کا ذکر ہو

مشرقی تہذیب	:	جس تہذیب میں مذہب، اخلاق اور شائستگی شامل ہو
اقدار	:	(قدر کی جمع) قدریں، کسی قوم مذہب کے اچھے طریقے
لائحۂ عمل	:	نصب العین۔ پروگرام۔ کسی چیز کو پیش کرنے کا منصوبہ
حرفی نقلی	:	پرانی قلمی کتاب کی جوں کا توں نقل کرنا
استفادہ	:	فائدہ، کام انجام دے کر مزید فائدہ حاصل کرنا
اعادہ	:	لوٹانا، دہرانا، بار بار کرنا، گزرے ہوئے معاملات کو دہرانا
دروغ گوئی	:	جھوٹ بولنا
نقص	:	برائیاں، خرابیاں، خامیاں، کوتاہی، کسر، کمی
دخانی	:	دھواں یا بھاپ (بھاپ سے چلنے والے)
مدن	:	شہریت، شہر سے متعلق، شہری زندگی کے اصول
جراحی	:	زخم اور پھوڑوں کا علاج، نشتر لگانا، آپریشن کرنا
احیاء	:	جان ڈالنا، کسی چیز کو دوبارہ شروع کرنا، رائج کرنے کی کوشش
واسوخت	:	ایسی شاعری جس میں جلی کٹی باتیں سنائی جائیں
طبع زاد	:	اپنی ایجاد، خود کی لکھی ہوئی نئی چیز جس میں کوئی اور شامل نہ ہو
سمیات	:	زہریلی اشیاء کا علم
علو حوصلگی	:	بلند حوصلہ، حوصلہ کی اونچائی یا بلندی
مفتاح	:	کنجی، چابی، کلید، قفل کھولنے کا چھوٹا سا آلہ
مضرت	:	نقصان، ضرر، وہ چیزیں جو نقصان پہنچاتی ہیں
بے التفاتی	:	توجہ نہ دینا، عدم رغبت، نظر انداز کرنا، بے توجہی
تنوع	:	قسم قسم کا، مختلف چیزوں کو شامل کرنا

12.7 نمونۂ امتحانی سوالات

12.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ انجمن پنجاب لاہور کا قیام کس عیسوی میں ہوا؟

2۔ انجمن پنجاب لاہور کا پہلا جلسہ کس مقام پر منعقد ہوا؟

3۔ انجمن پنجاب لاہور کا قیام عمل میں لانے میں کس کی کوششوں کو دخل رہا؟

4۔ انجمن پنجاب لاہور کی نشستوں میں ادبی، سائنسی اور صنعتی کمیٹی کے علاوہ کونسی کمیٹی قائم کی گئی؟

5۔ انجمن پنجاب کی زبانوں کی کمیٹی میں عربی، فارسی، اردو اور ہندی کے علاوہ کونسی زبان شامل تھی؟

6۔ ڈاکٹر لائٹنز نے انجمن پنجاب لاہور کی تجاویز میں کونسے اہم شعبے کے لیے تخمینہ پیش کیا؟

7۔ ڈاکٹر لائٹنز نے یونیورسٹی کالج کے قیام کے لیے کس قسم کے نام کی تجویز رکھی؟

8۔ ڈاکٹر لائٹنز نے مشرقی علوم کے علاوہ کس قسم کے مدرسے کے آغاز کی تجویز رکھی؟

9۔ انجمن پنجاب لاہور کے ذریعہ دیسی زبانیں کس کو کہا گیا؟

10۔ انجمن پنجاب لاہور کے جلسوں میں کس قسم کی کاروائی کو اہمیت دی گئی؟

12.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ انجمن پنجاب لاہور کے قیام اور اس کی مختلف کمیٹیوں کا جائزہ لیجئے۔

2۔ انجمن پنجاب لاہور کے اہم شعبوں کا تعارف کروایئے۔

3۔ انجمن پنجاب لاہور کے ذریعہ پیش ہونے والی مجالس میں کن موضوعات پر مضامین پیش کیے جاتے رہے؟

4۔ انجمن پنجاب لاہور لاہور کے ذریعہ اہم لکچرس کے عنوان کا جائزہ لیجیے۔

5۔ علوم مفیدہ کے توسط سے انجمن پنجاب لاہور نے کونسی تعلیم کو عام کیا؟ مختصر بیان کیجیے۔

12.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ انجمن پنجاب لاہور کا قیام اور اس کی مختلف کمیٹیوں اور شعبے جات کا جائزہ لیجیے۔

2۔ انجمن پنجاب لاہور کو منظّم کرنے میں دو انگریزوں اور دو اردو ادیبوں کے ناموں کا جائزہ لیجیے۔

3۔ انجمن پنجاب لاہور کی جانب سے پیش کردہ مشاعروں کی مختلف کاروائیوں کا جائزہ لیجیے۔

12.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	انجمن پنجاب: تاریخ وخدمات	ڈاکٹر صفیہ بانو
2۔	تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند	از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
3۔	غزل اور متغزلین	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
4۔	ماسٹر رام چندر	صدیق الرحمٰن قدوائی
5۔	اردو ادب کی تحریکیں	ڈاکٹر انور سدید
6۔	اردو کی رومانی تحریک	ڈاکٹر محمد حسن

اکائی13 : علی گڑھ تحریک

اکائی کے اجزا

13.0 تمہید
13.1 مقاصد
13.2 علی گڑھ تحریک کا پس منظر
13.3 سرسید احمد خاں کی خدمات
13.4 سرسید کے رفقا کی ادبی خدمات
13.5 علی گڑھ تحریک کے اثرات
13.6 اصنافِ ادب پر اثرات
13.6.1 تاریخ نگاری
13.6.2 سوانح نگاری
13.6.3 ناول نگاری
13.6.4 مضمون نگاری ومقالہ نگاری
13.6.5 اردو شاعری
13.6.6 اردو تنقید نگاری
13.6.7 اردو صحافت
13.7 اکتسابی نتائج
13.8 کلیدی الفاظ
13.9 نمونہ امتحانی سوالات
13.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
13.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
13.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
13.10 مزید مطالعے کے لیے کردہ کتابیں

13.0 تمہید

انسانی زندگی مسلسل حرکت میں ہے پھر بھی زندگی کے متعدد پہلو ایسے ہیں جس میں نقل در نقل اور رواج در رواج عمل کرتے رہنے سے جمود کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس جمود کو توڑنے کے لیے افراد یا جماعتیں منظر عام پر آتی رہتی ہیں' ان کے اس کام کو تحریک کہتے ہیں۔ دنیا میں فنون لطیفہ اور ادب کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ ادب میں بھی جمود اور سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔ انیسویں صدی میں انقلاب 1857ء کا واقعہ اردو ادب کے لیے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ ہمارا ادب گذشتہ سے پیوستہ رہتے ہوئے نئی توانائی اور جدید اصناف کے ساتھ سفر کرتا ہے۔ اس کو وقت کے تقاضے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے اور با مقصد بنانے میں سرسید یا علی گڑھ تحریک کا بڑا اہم کردار ہے، اس کا تفصیلی جائزہ آپ اس اکائی میں پڑھیں گے۔

اردو ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات سے شاید ہی کسی کو انکار ہو۔ یہ اثرات اتنے وسیع اور دوررس ہیں کہ ڈیڑھ سو سال گزر جانے کے بعد بھی تازہ دم لگتے ہیں۔ اردو ادب کا وہ کون سا گوشہ ہے جو اس کے اثر سے چھوٹ گیا ہو۔ علی گڑھ تحریک سے قبل اردو کی شناخت شاعری سے تھی۔ نثری ادب پر توجہ اس تحریک نے دی۔ سوانح نگاری' تاریخ نویسی' مضمون نگاری' مقالہ نگاری اور ناول نگاری میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس کے اصول مرتب ہوئے۔ تنقید کی ابتدا ہوئی' صحافت کو فروغ ملا' ردِ عمل کے طور پر طنز و مزاح کی بنیاد پڑی اور رومانوی تحریک نے اپنے بال و پر نکالے۔ ادب کا سائنٹفک و جمالیاتی پہلو سامنے آیا۔ غرض رنگارنگی کا ایک حسین نمونہ ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس اکائی میں ان تمام اثرات کا جائزہ لیا جائے گا جس کے نتیجہ میں آپ آسانی سے یہ سمجھ جائیں گے کہ علی گڑھ تحریک کے اردو ادب پر کیا احسانات ہیں۔

13.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ علی گڑھ تحریک کے پس منظر کو بیان کر سکیں۔
- ☆ سرسید سے قبل اردو کی ادبی صورت حال پر گفتگو کر سکیں۔
- ☆ سرسید اور ان کے رفقا کی ادبی خدمات پر روشنی ڈال سکیں۔
- ☆ علی گڑھ تحریک کے فکری و عملی اثرات پر گفتگو کر سکیں۔
- ☆ اردو اصناف ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات پر اظہار خیال کر سکیں۔
- ☆ اردو شاعری' ناول' تنقید اور صحافت پر اس کے اثرات کی نشاندہی کر سکیں۔

13.2 علی گڑھ تحریک کا پس منظر

1757ء کی جنگ پلاسی کے بعد ہندوستان جدید دور میں داخل ہوتا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا جب یوروپی تجارتی قوم نے ہندوستان میں مغل حکومت کی کمزوری اور امرا کی ریشہ دوانیوں کا فائدہ حاصل کر کے، اپنا استبدادی پنجہ گاڑ دیا۔ بنگال کی بے شمار دولت ہاتھ لگنے کے بعد انگریزوں کی نیت خراب ہوگئی۔ پھر 1764ء کی بکسر کی لڑائی میں مغل، اودھ اور بنگال کی متحدہ افواج کو انگریزوں نے شکست دے کر اپنی فوجی برتری کو ثابت کر دیا۔ ہندوستان کی دیگر ریاستوں کو بھی رفتہ رفتہ انگریزوں نے شکست دے کر یا کمزور کر کے لوٹنا کھسوٹنا شروع کر دیا۔ ظلم و بربریت کا یہ سلسلہ کب تک چلتا ؟ ہندوستانیوں کے ذہنوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکنے لگی ۔ چناں چہ جنگ پلاسی کے ٹھیک سو سال بعد 1857ء میں

انگریزوں کے خلاف پورے ہندوستان میں جنگ لڑکر انھیں بے دخل کرنے کی آخری کوشش کی گئی لیکن یہ کوشش کامیاب ثابت نہ ہوئی جس کی کئی وجوہات ہیں مثلاً اتحاد و اتفاق کی کمی، بہتر اور منظّم فوج کا نہ ہونا، انگریزوں کے مقابلے میں ناقص ہتھیار اور اسلحہ، ترسیل و رابطہ کی عدم موجوگی، انگریزی خفیہ محکمہ کی چابکدستی اور خود ہندوستانیوں کے ذریعہ مخبری اور غداری وغیرہ ایسے حقائق تھے جس کی بنا پر چند مہینوں میں انگریزوں نے پورے انقلاب کو کچل ڈالا اور صدیوں سے قائم مغل شہنشاہیت کے آخری ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو بھی ہمیشہ کے لیے گل کر دیا۔

انقلاب 1857ء ہندوستانی تاریخ کے سب سے اہم واقعات میں سے ایک ہے' جس نے ایک نئے ہندوستان کو جنم دیا۔ انگریزوں اور ان سے پہلے کی دیگر فاتح قوموں میں ایک بنیادی فرق یہ تھا کہ موخرالذکر نے ہندوستان کو غلام نہیں بنایا بلکہ وہ خود اس کے غلام ہو گئے جب کہ اس کے برعکس انگریزوں نے ہندوستان کو غلام بنایا۔ نسلی تفوق، علمی برتری اور عسکری قوت کا زعم ان میں موجود تھا نتیجتاً ہندوستانی عوام ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو کر احساس کمتری کا شکار ہو گئی۔ انھیں اس مصیبت سے نکالنے کے لیے بہت سارے مصلح قوم اٹھ کھڑے ہوئے جنھوں نے سیاسی، سماجی، تعلیمی اور مذہبی اصلاحی تحریکات کے ذریعہ مخلصانہ خدمات انجام دیں۔ ایسے ہی ایک مصلح قوم کا نام سرسید احمد خان ہے جن کی تحریک علی گڑھ تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔

انیسویں صدی کی ان تحریکات کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک کی بنیاد انگریزوں سے مفاہمت پر ہے جو مغربی علوم، سائنسی طرز فکر، منطقی استدلال اور عقلیت پرستی کی روشنی میں تجدیدی کام کرنا چاہتا تھا تا کہ کھویا ہوا وقار بحال ہو سکے ساتھ ہی انگریزوں کے ذہنوں میں ہندوستانیوں کے تئیں جو شکوک وشبہات ہیں اس کا ازالہ بھی ہو جائے۔ دوسری طرح کی تحریکات کی بنیاد انگریزوں سے نفرت پر ہے جو مغربی ثقافتی یلغار کے سامنے اپنی مشرقی روایات، اپنے تشخص، تہذیب وثقافت کو مٹنے دینا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے عقلیت کے بجائے عقائد اور تجدید کے بجائے احیا پر زور دیا۔ اول الذکر میں برہموسماج، پرارتھنا سماج اور علی گڑھ تحریک وغیرہ جب کہ دوسری طرح کی تحریکات میں آریہ سماج، رام کرشن مشن اور دیوبند تحریک وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

1857ء کے انقلاب میں چوں کہ مسلمانوں کا بڑا اہم رول رہا اور انگریز اس بات سے بخوبی واقف تھے اس لیے انھیں ہر پہلو سے نظرانداز کرنا ضروری سمجھا۔ سرسید نے اپنی انتھک کوششوں سے ایک طرف انگریزوں کے ذہنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف مختلف انجمنوں اور علی گڑھ کالج کے قیام، تصنیف، تالیف، مضامین، صحافت اور تقریروں کے ذریعہ مسلمانوں کے تعلیمی، سیاسی اور سماجی انحطاط کو دور کرنے کا بھی بیڑا اٹھایا۔ علی گڑھ تحریک نے ہندوستانی مسلمانوں کے تنزل کے سدباب کے ساتھ ساتھ اردو ادب پر بھی بڑے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں جس کا ذکر آئندہ اکائی میں کیا جائے گا۔ اس اکائی میں سرسید اور ان کے رفقا کی خدمات کا جائزہ لیتے ہیں۔

13.3 سرسید احمد خاں کی خدمات

سماجی خدمات:

یکم اپریل 1869ء کو سرسید انگلینڈ روانہ ہوئے۔ گرچہ اس سے پہلے اپنی تصنیفات اور سائنٹفک سوسائٹی کے اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں لکھے گئے اخلاقی اور معاشرتی مضامین کے ذریعہ انھوں نے اصلاح کا کام شروع کر دیا تھا۔ مگر اکتوبر 1870ء میں انگلینڈ سے واپس ہوئے تو ان کے ذہن میں سماجی اصلاح اور تعلیمی تصور کا ایک واضح خاکہ موجود تھا۔ انھوں نے ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ'' قائم کر کے تعلیمی مشن کو عملی جامہ پہنایا

بلکہ ''تہذیب الاخلاق'' پرچہ جاری کر کے سماجی اصلاح کا کام انجام دیا۔

تہذیب الاخلاق جسے ''محمڈن سوشل رفارمر'' بھی کہتے تھے' کا مقصد یہ تھا کہ قوم میں جدید زندگی کے مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت بیدار ہوجائے نیز ان تمام خرابیوں کو دور کیا جائے جو سماج کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق کی ایک اشاعت میں سماجی اصلاح سے متعلق 29 نکات پر مشتمل ایک پروگرام پیش کیا تھا جن میں چند نکات درج ذیل ہیں:۔

سب سے پہلے ''آزادیٔ رائے'' کو سرسید ضرور سمجھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ انسان کو آزادانہ رائے دینے کا حق ہو تو دنیا کی آدھی برائیاں ختم ہوجائیں گی۔ ''دین اور دنیا'' کی تفریق کو وہ غیر ضروری سمجھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ بدبختی سے دنیا دین کو غارت کر دیتی ہے اسی طرح خوش بختی سے دنیا دین کو سنوار بھی دیتی ہے۔ دین اور دنیا کے بارے میں سرسید کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ایک ہاتھ میں قرآن دوسرے میں جدید علوم اور سر پر لا الہ الا اللہ کا تاج ہو۔ سرسید قوم میں ''خود اعتمادی'' پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس کا مفہوم ان کے نزدیک یہ تھا کہ دوسروں کے دستِ نگر نہ ہوں اور اپنے مسائل آپ حل کرنا سیکھیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ''اپنی مدد آپ'' کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔ اپنی مدد آپ سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص اپنی ترقی کے لیے اپنی استطاعت کے مطابق خود کسی بیرونی امداد کا انتظار کیے بغیر کوشش کیے۔

یہی جذبہ ترقی کی بنیاد ہے۔ ''ناامیدی اور مایوسی'' کو وہ قوم کے لیے انتہائی مضر سمجھتے تھے۔ سرسید نے اپنے مشن میں بار بار ناکام ہونے کے باوجود اپنا کام جاری رکھا اور آخر ایک دن اپنی منزل کو پالیا۔ اپنے مضمون ''امید کی خوشی'' میں بڑی خوب صورتی سے انہوں نے مثالوں کے ذریعہ اس بات کو سمجھایا ہے۔ ''رسم ورواج'' کی پابندی کو سرسید نے بندر کی نقل سے تشبیہ دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نقل کے بجائے عقل سے کام لے کر اچھی رسموں کو اختیار کرے اور بری رسموں کو رد کرے۔ کاہلی اور سستی کسی کے نزدیک بھی اچھی چیز نہیں ہے۔ مگر سرسید نے ''کاہلی وسستی'' کو جسمانی محنت کے بجائے قلبی اور عقلی محنت کی کمی کو سمجھا تھا۔ دوسرے لفظوں میں دل' دماغ اور عقل کو قوم کے مفید کاموں میں استعمال کرے۔ ''خوشامد'' سرسید کے نزدیک دل کی بیماریوں میں سب سے زیادہ مہلک ہے۔ اس کی وجہ سے انسان خودغرضی اور مطلب پرستی کا شکار ہوجاتا ہے۔ ''ریاکاری'' کو انہوں نے تہذیب اور معاشرت کا دشمن بتایا ہے۔ ریاکاری ظاہر و باطن کو الگ کرتی ہے۔ ریاکار آدمی آسانی سے اپنے دوست کو دھوکہ دے سکتا ہے۔ ''بحث و تکرار'' بھی سرسید کے نزدیک ایک اچھی چیز نہیں۔ اس سے دلوں میں کدورت پیدا ہوجاتی ہے اور ''تعصب'' کو سرسید بدترین خصلتوں میں سے ایک خصلت بتاتے ہیں۔ یہ نیکیوں کو برباد اور خوبیوں کو تباہ کر دیتی ہے۔ عدل وانصاف اس کی وجہ سے جاتا رہتا ہے۔

ان چند انتہائی اہم اور قابلِ غور معاشرتی خرابیوں کی طرف سرسید نے توجہ مبذول کرائی ہے جن کو دور کر کے قوم ترقی کر سکتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ برائیاں ہمارے سماج میں پنپ رہی تھیں اور پنپ رہی ہیں جس کو سرسید نے محسوس کر کے بلاخوف لکھا' بتایا اور دور کرنے کی حتی المقدور کوشش کی۔

تعلیمی خدمات:

سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ ہندوستانی مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کرنا ہے۔ وہ قوم کے سارے امراض کا علاج مغربی تعلیم میں تلاش کرتے ہیں۔ 1857ء کے بعد ملک کے حالات تیزی سے بدل گئے۔ اندازِ فکر' رہن سہن' تعلیمی نظام اور نصاب کے علاوہ ہر چیز پر اس کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ اب اگر ملازمتوں کو حاصل کرنا ہے' سماج میں بہتر زندگی گذارنا ہے' حکومت میں اپنی رسائی حاصل کرنا ہے' تجارت' صنعت

وحرفت کے شعبوں میں ترقی کرنا ہے تو جدید تعلیم سے منہ موڑ نہیں سکتے۔لیکن مسلمانوں کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ صدیوں تک حکومت ان کے پاس تھی ان کے علوم اور زبان کو دیگر اقوام سیکھ اور پڑھ رہے تھے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ اپنی زبان اور علوم کو ترک کر کے دوسرے علوم اور زبان کو سیکھنا پڑ رہا تھا۔ اس کے لیے اتنی جلدی سے یہ آمادہ نہیں تھے۔سرسید نے وقت کے تقاضہ کو سمجھا اور لاکھ مخالفتوں کے باوجود اپنے مشن میں لگے رہے۔وہ سمجھتے تھے کہ اب مسلمانوں کو بھی جدید علوم پڑھنے پڑیں گے۔ابتدا میں سرسید ہندو اور مسلمانوں کی تعلیم کے لیے یکساں کوشش کرتے رہے مگر راجہ رام موہن رائے نے بہت پہلے ہی ہندوؤں میں بیداری پیدا کر دی تھی اور ان کے سامنے مسلمانوں کی طرح کوئی مسئلہ بھی نہیں تھا۔وہ پہلے عربی اور فارسی پڑھتے تھے اب انگریزی پڑھنے میں انہیں کیوں کر جھجھک محسوس ہوگی۔البتہ سرسید نے اپنے تعلیمی ادارے کے دروازے غیر مسلموں پر بھی اسی طرح کھلے رکھے جس طرح مسلمانوں پر۔

سرسید اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ مسلمان انگریزی سیکھنے پر راضی نہیں ہوں گے۔اس لیے وہ جدید علوم کی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرانا چاہتے تھے۔گرچہ دہلی کالج کی ''ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی'' نے یہ کام انجام دیا تھا لیکن بے وقت کالج بند ہو جانے سے یہ کام ادھورا رہ گیا تھا۔اس مقصد کے تحت سرسید نے غازی پور میں اپنے قیام کے دوران 9 جنوری 1869ء کو ''سائنٹفک سوسائٹی'' قائم کی بعد میں ان کے تبادلہ کے ساتھ یہ سوسائٹی بھی علی گڑھ منتقل ہوگئی۔اس سوسائٹی نے تقریباً چالیس کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرایا ہے۔

آغاز میں سرسید مادری زبان یعنی اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دینا چاہتے تھے اس کی ایک وجہ تو وہی ہے جو پہلے گذر چکی یعنی مسلمان انگریزی کی طرف مائل نہیں ہو رہے تھے۔دوسری وجہ انہوں نے یہ بیان کی کہ غیر ملکی زبان میں تعلیم حاصل کی جائے تو دوگنی محنت کرنی پڑتی ہے۔ایک تو اصل مضمون پر دوسرے زبان سیکھنے پر مزید یہ کہ یہ علم دیرپا نہیں ہوتا اس لیے ان کے ذہن میں ایک ورناکلر یونیورسٹی کا خاکہ موجود تھا۔مگر برطانیہ کے سفر سے لوٹنے کے بعد ان کی فکر میں بڑی تبدیلی آجاتی ہے اور وہ اردو کے بجائے انگریزی کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر اپنانے کی پرزور دعوت دیتے ہیں۔ اپنے اس موقف کی تائید میں وہ کہتے ہیں کہ ''تمام علوم کو اردو میں منتقل نہیں کیا جا سکتا جب کہ جدید علوم کو حاصل کرنا ناگزیر ہو گیا ہے دوسرے یہ کہ حکمرانوں کی زبان انگریزی ہے۔تیسرے یہ کہ راجہ رام موہن رائے کی قیادت میں برادرانِ وطن انگریزی زبان کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گئے ہیں اور وہ مسلمانوں سے آگے بڑھ چکے ہیں''۔ بہرحال سرسید نے برطانیہ سے لوٹ کر دو بڑے کام انجام دیے۔ایک مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کے لیے تہذیب الاخلاق پرچہ کا اجرا' دوسرے تعلیمی پس ماندگی دور کرنے کے لیے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام۔

24 مئی 1875 کو مدرسۃ العلوم علی گڑھ یعنی محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام عمل میں آیا۔سرسید کا قائم کردہ یہ کالج آج ہمارے سامنے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں موجود ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کو دور کرنے میں اس یونیورسٹی کا بڑا اہم کردار ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔حالاں کہ ان کے اس تعلیمی مشن میں رکاوٹیں بھی پیدا کی گئیں۔مولوی امداد علی اور مولوی علی بخش کٹر مخالفین میں تھے۔شبلی نعمانی نے بھی بعض چیزوں میں سرسید کی مخالفت کی۔اکبرالہ آبادی نے شروع میں اپنی شاعری کے ذریعہ سرسید پر چوٹیں کسیں مگر بعد میں مداح ہو گئے۔سرسید کا ساتھ دینے والوں میں الطاف حسین حالی' ڈپٹی نذیر احمد' منشی ذکاء اللہ' محسن الملک' وقار الملک' مولوی سمیع اللہ وغیرہ کے نام لیے جاتے ہیں۔سرسید کے ان رفقا نے بھی تعلیمی اور ادبی خدمات انجام دی ہیں۔

سرسید تعلیم کو سبھی کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔مگر تعلیم حاصل کرنے والوں کو وہ چھ حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جو

سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے کے لیے تعلیم کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جو تجارت یا صنعت وحرفت کو ذریعۂ معاش بنانا چاہتے ہیں۔ تیسری طرح کے لوگوں میں زمین دار اور جاگیردار آتے ہیں (یہ آزادی سے قبل کا طبقہ ہے)۔ چوتھی قسم میں ایسے لوگ آتے ہیں جو مختلف علوم و فنون میں مہارت حاصل کر کے تصنیف وتالیف کا مشغلہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ پانچواں طبقہ علم دین حاصل کرنے والوں کا ہے۔ چھٹا گروہ عام لوگوں کا ہے جو تھوڑی بہت تعلیم حاصل کر کے اپنے روزمرہ کے کاموں میں معمول کے مطابق لگا رہنا چاہتا ہے۔ اگر ان تمام پر غور کیا جائے تو سرسید کے قائم کردہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں پہلی قسم کے لوگ یعنی سرکاری ملازمتوں کے خواہش مند ہی متوجہ ہوئے۔ یہاں کے طلبا نے ملازمت ہی کو ترجیح دی اور کالج کے ارباب حل وعقد کا مقصد بھی یہی تھا کہ ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کو اطمینان بخش بنایا جائے۔

عورتوں کی تعلیم کی طرف سرسید نے خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ اس کے مخالف تھے بلکہ ان کا کہنا تھا کہ مرد جب تک تعلیم یافتہ نہ ہوں عورتوں کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کی جاسکتی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مسلمان اپنی لڑکیوں کو اسکولوں میں بھیجنے پر آمادہ نہیں تھے۔ جہاں تک ابتدائی تعلیم کی بات ہے اس کا خاکہ بھی سرسید کے ذہن میں تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ پورے ملک میں ابتدائی تعلیم کے ادارے قائم ہوں اس مقصد کے لیے انہوں نے 1886ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ بہرحال سرسید کی پیہم کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمان بالآخر تعلیم کی طرف متوجہ ہو گئے۔

ادبی خدمات:

سرسید بے انتہا مصروف انسان تھے پھر بھی انہوں نے تصنیف وتالیف کے لیے وقت نکالا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ تصنیف وتالیف میں جیسا میرا جی لگتا ہے ویسا کسی اور کام میں نہیں لگتا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سیاسی، سماجی اور تعلیمی خدمات انجام دیتے ہوئے لکھنے پڑھنے کے مشغلہ کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ایک بڑی قابل لحاظ بات یہ ہے کہ سرسید کے تمام کاموں سے کچھ نہ کچھ اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر اردو زبان وادب کی جو خدمات انہوں نے انجام دیں ان کا اعتراف دوست دشمن سبھی کرتے ہیں۔

سرسید نے کم عمری میں ہی لکھنا شروع کر دیا تھا اور یہ سلسلہ وفات کے نو دن پہلے تک چلتا رہا۔ آخری مضمون انہوں نے تہذیب الاخلاق میں اردو کی حمایت میں لکھا تھا جب کہ آغاز اپنے بڑے بھائی کے اخبار ''سید الاخبار'' سے کیا۔ ان کی پہلی کتاب 'رسالہ جلاء القلوب بذکر محبوب'' ہے۔ انہوں نے تقریباً ہر موضوع پر قلم اٹھایا۔ تاریخ کی تین اہم کتابوں ''آئین اکبری''، ''تاریخ فیروز شاہی'' اور ''تزک جہانگیری'' کو مرتب کیا۔ دہلی کی عمارتوں کا تفصیلی جائزہ ''آثار الصنادید'' میں لیا ہے۔ انقلاب 1857ء کے تعلق سے ''تاریخ سرکشی بجنور'' اور ''اسباب بغاوت ہند'' تحریر کی۔ مذہب پر کئی کتابیں لکھیں۔ ان میں ''تفسیر قرآن''، ''تفسیر انجیل'' (تبیین الکلام)، ''خطبات احمدیہ''، ''ابطال غلامی اور ''احکام طعام اہل کتاب'' وغیرہ اہم ہیں۔ کل ملا کر چالیس سے زائد کتابیں سرسید نے تحریر کیں۔ جہاں تک ادب کی بات ہے اس پر باضابطہ کتاب تو نہیں لکھی البتہ اخبار سائنٹفک سوسائٹی (بعد کو علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ) اور تہذیب الاخلاق میں شائع ان کے انشائیوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو زبان، اسلوب اور نثر کو خود سرسید اور ان کی تحریک نے کس قدر متاثر کیا ہے۔ انہوں نے آسان اور سادہ نثر نگاری کو فروغ دیا۔ گرچہ فورٹ ولیم کالج اور خطوط غالب کے ذریعہ اس کی داغ بیل پڑ چکی تھی مگر ابھی یہ رجحان عام نہیں ہوا تھا۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک نے اردو ادب کی یہ بڑی خدمت کی کہ پُرتکلف نثر کو ترک کر کے سلیس و سادہ نثر کو ترقی دی۔ دوسرا کام یہ کیا کہ تحریر کو بامقصد اور افادیت کا حامل بنایا۔ تہذیب الاخلاق میں سرسید کے جو ادبی مضامین یا انشائیے شائع ہوئے ان میں سے چند یہ ہیں: بحث وتکرار، امید کی خوشی، گزرا ہوا زمانہ، جاڑا، تعلیم، رسم ورواج کی پابندی، آزادی رائے، سمجھ، دنیا بہ امید قائم ہے، اخلاق،

ریاکاری، خوشامد، اپنی مدد آپ وغیرہ۔

سرسید نے اپنے ان تمام مضامین میں انشا پردازی کا کمال دکھایا ہے۔ فطرت کی سچی تصویر کشی، درد انگیزی، اثر پذیری، حقیقت نگاری، افادیت پسندی وغیرہ ان کی تحریروں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ایک بڑا وصف ان کی تحریروں کا یہ بھی ہے کہ علمی اصطلاحات، الفاظ اور تعلیمات کو بڑی سادگی، صفائی اور دل آویزی سے ادا کیا ہے۔ ان کی تحریر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

''نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح تکرار ہوتی ہے پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں مل بیٹھتے ہیں پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں یوں ہے۔ وہ کہتا ہے واہ تم کیا جانو؟ وہ بولتا ہے تم کیا جانو؟ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے۔ تیوری چڑھ جاتی ہے۔ رخ بدل جاتا ہے، آنکھیں ڈراونی ہوجاتی ہیں، باچھیں چڑ جاتی ہیں... لپاڈگی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کر کر چھڑا دیا تو غراتے ہوئے ایک ادھر چلا گیا اور ایک اُدھر۔'' (بحث وتکرار)

اسے پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ آسان الفاظ میں انسانی فطرت کی کتنی سچی تصویر کھینچی ہے۔ یہ اثر ان کی تحریروں میں جا بجا ملتا ہے۔ شوخی وظرافت کی جھلکیاں بھی کہیں کہیں نظر آجاتی ہیں۔

شاعری سے سرسید کی طبیعت کو مناسبت نہیں تھی۔ البتہ انہوں نے ان نقائص کی نشاندہی کی ہے جو ہماری شاعری میں راہ پاگئے۔ شاعروں کو مفید مشورے بھی دیے۔ انجمنِ پنجاب لاہور کی زیرنگرانی جب نئی طرز کی شاعری کو رواج دیا گیا تو محمد حسین آزاد کو جو اس انجمن کے روح رواں تھے، سرسید نے مبارک باد دی۔ سرسید کی یہ بڑی تمنا تھی کہ شاعری سے قوم کو بیدار کرنے کا کام لیا جائے چناں چہ الطاف حسین حالؔی سے انہوں نے مسدس مدوجزر اسلام لکھوائی جو آج تک اپنی اثر انگیزی، مضمون آفرینی، سادگی اور خلوص کی وجہ سے اتنی ہی مقبول ہے جتنی کہ پہلے تھی۔ مجموعی طور سے دیکھا جائے تو سرسید کی کوششوں سے ادب کی دنیا میں انقلاب برپا ہوگیا اور کچھ ہی دنوں میں نثر ونظم کا ایسا سرمایہ فراہم ہوگیا جس پر فخر کیا جاسکتا ہے۔

13.4 سرسید کے رفقا کی ادبی خدمات

الطاف حسین حالؔی:

حالؔی کا وطن پانی پت (ہریانہ) ہے۔ 1854ء میں جس وقت ان کی عمر سترہ سال تھی، دہلی آئے اور ادبی شخصیتوں سے ملنے کا موقع ملا۔ خصوصاً غالبؔ سے وہ بڑے متاثر ہوئے اور ان سے گہرا رشتہ استوار ہوگیا۔ 1857ء کی بغاوت میں وہ دہلی سے چلے گئے پھر 1863ء میں دہلی واپس ہوگئے۔ اس سفر میں نواب مصطفٰی خاں شیفتہ سے ملاقات ہوئی۔ بغاوت کے بعد وہ دہلی میں زیادہ دن نہ رہ سکے اور لاہور چلے گئے۔ اسی زمانے میں انجمنِ پنجاب لاہور نے نظموں کے مشاعروں سے اردو شاعری کو ایک نیا رخ عطا کیا۔ یہ اس سے وابستہ ہوگئے۔ سکریٹری بھی بنائے گئے۔ انہوں نے انجمن کے لیے چار نظمیں ''برکھارُت''، ''نشاطِ امید''، ''مناظرہ رحم وانصاف'' اور ''حبِ وطن'' لکھیں جو بہت پسند کی گئیں۔ چند سال لاہور میں گزار کر وہ پھر دہلی چلے آئے۔

دہلی آکر اردو نثر نگاری کی طرف توجہ دی کیوں کہ اب وہ سرسید کی صحبت میں آگئے تھے۔ ان کی نثر میں سرسید کی چھاپ بھی ہے اور انفرادیت بھی۔ مثلاً سادگی، منطقی استدلال اور بے تکلف اظہار وغیرہ سرسید کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ سادگی میں لطافت، منطقیت میں شاعرانہ انداز، تمثیلی پیرایہ، فطری اور بول چال کا لہجہ، عربی اور فارسی الفاظ سے احتراز مگر بعض جگہ انگریزی کا بے جا استعمال حالؔی کی نثر نگاری کی نمایاں خصوصیات

ہیں۔ حالی کی نثر نگاری کو دیکھنا ہے تو ان کی سوانحی تصانیف کو پڑھنا چاہیے۔ اردو میں سوانح نگاری کو سرسید تحریک نے ہی جلا بخشی۔ حالی نے تین اہم سوانح عمریاں لکھی ہیں۔ خود سرسید کی سوانح ''حیاتِ جاوید'' نام سے لکھی۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ سرسید کی زندگی کے کسی پہلو پر لکھی جانے والی کوئی تحریر اس کے استفادے سے مستغنی نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح غالب کی سوانح ''یادگارِ غالب'' کے عنوان سے تحریر کی۔ یہ بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ 'حیاتِ جاوید'۔ تیسری کتاب ''حیاتِ سعدی'' ہے جو کہ فارسی کے مشہور شاعر شیخ سعدی علیہ الرحمہ کی سوانح عمری ہے۔

سرسید نے حالی سے قوم کو بیدار کرنے کے لیے ایک نظم لکھنے کی خواہش کی چناں چہ مدو جزر اسلام (اسلام کا عروج و زوال) کے نام سے ایک طویل نظم لکھی۔ یہ نظم بعد میں 'مسدس حالی' کے نام سے مشہور ہوئی۔ نظم میں حالی نے سب سے پہلے اسلام کے عروج و زوال پر روشنی ڈالی۔ پھر مسلم قوم کی جہالت اور تعلیم کی کمی پر اظہار خیال کیا ہے۔ مسدس میں ایک سچی اور دل سوز آواز کو لوگوں نے سنا۔ سرسید اس نظم کو پڑھ کر سر دھنتے تھے۔ زبان سادہ، سلیس اور دل نشیں ہے۔ روانی اس نظم کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ 1879ء میں یہ نظم شائع ہوئی۔ ہندوستان میں خواتین کی حالتِ زار کو بھی حالی نے سمجھا۔ راشد الخیری کو دنیا مصورِ غم کے نام سے جانتی ہے۔ حالی نے بھی عورتوں کے دکھ درد، بیوگی و بے چارگی کو سمجھنے اور اپنی نظموں میں ان حالات کو پیش کرنے میں جو تصویر کشی کی ہے، وہ مصورِ غم سے کسی طرح کم نہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے 1874ء میں ''مناجاتِ بیوہ'' اور 1906ء میں ''چپ کی داد'' نام سے طویل نظمیں لکھیں۔ حالی اس معاملہ میں سرسید سے بھی آگے بڑھے ہوئے تھے چناں چہ ''تعلیم نسواں'' کے بارے میں ان کا ایک واضح تصور تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد کی طرح انہوں نے بھی خواتین کے لیے ناول ''مجالس النسا'' تحریر کی۔

اردو تنقید کی تاریخ میں الطاف حسین حالی کا بڑا مقام ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو میں بحیثیت فن، تنقید کی ابتدا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری سے ہوتی ہے۔ 1893ء میں انہوں نے یہ فکر انگیز مقدمہ اپنے مجموعہ کلام کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس کے شائع ہوتے ہی پوری ادبی دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ اردو تنقید کو اس سے نئی راہ ملی۔ اس طرح حالی پہلے شخص ہیں جنہوں نے شعر کو کسوٹی پر پرکھا اور تنقیدی مسائل سے بحث کی۔ بحیثیت مجموعی سرسید کے اہم رفیق حالی سے اردو ادب کو بے انتہا فائدہ پہنچا۔ ان پر آپ تفصیل سے مطالعہ کرسکتے ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی:

شبلی نعمانی (1914-1857) اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ عربی فارسی اور فلسفہ وغیرہ کی تعلیم اپنے وقت کے علما سے حاصل کی۔ 1872ء میں وہ علی گڑھ کالج میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے آئے۔ یہاں سرسید کے کتب خانے سے بھرپور استفادہ کیا اور ان ہی کی توجہ سے سوانح نگاری کی طرف راغب ہوئے۔ حالاں کہ اس وقت تک وہ نظمیں لکھتے تھے۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران پروفیسر آرنلڈ سے فرانسیسی زبان سیکھی۔ آرنلڈ سے اتنا گہرا تعلق تھا کہ ان کے ہمراہ مصر، شام و دیگر اسلامی ممالک کا سفر کیا۔ سرسید کے آخری دور میں کچھ اختلافات کی بنا پر شبلی علی گڑھ سے علاحدہ ہوگئے۔ 1897ء میں وہ وہاں سے اپنے وطن اعظم گڑھ آگئے اور ایک نیشنل اسکول کی بنیاد رکھی۔ کچھ عرصہ وہ حیدرآباد میں رہے جہاں انھیں تصنیف و تالیف کا اچھا موقعہ ملا۔ لکھنؤ میں جب دارالعلوم ندوۃ العلما قائم ہوا تو شبلی کی خدمات حاصل کی گئیں۔ وہاں رہ کر مولانا عبدالماجد دریابادی اور علامہ سید سلیمان ندوی جیسے صاحبِ طرز ادیبوں کی تربیت کرتے رہے۔ آخر میں پھر اعظم گڑھ آگئے اور ایک تحقیقی ادارہ ''دارالمصنفین'' نام سے قائم کیا جو آج تک اپنا کام کررہا ہے۔

سرسید کے رفقا میں علامہ شبلی بڑی عبقریت کی حامل شخصیت تھی۔ علم الکلام اور فلسفہ میں کامل دست رس رکھتے تھے۔ سوانح نگاری، تاریخ

نویسی، ادب، انشا اور شاعری کے ساتھ اردو تنقید میں بھی ان کا ایک بلند مقام ہے۔ ''سیرۃ النبی''، ''المامون''، ''الفاروق''، ''الغزالی''، ''سیرۃ النعمان'' اور ''سوانح مولانا روم'' ان کی سوانح عمریاں ہیں جب کہ ''شعرالعجم'' اور ''موازنہ انیس و دبیر'' سے ان کی تنقیدی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ ایک مختصر کلیات بھی شائع ہوا ہے جس میں مثنوی، مسدس، قصیدے اور اخلاقی و سیاسی نظمیں ملتی ہیں۔ برطانوی سامراج کے واقعات پر بڑی ولولہ انگیز نظمیں لکھی ہیں جنہیں پڑھ کر شبلی خود بھی روتے تھے اور دوسروں کو بھی رلاتے تھے۔

شبلی کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں قوت اور جوشِ بیان کے ساتھ ساتھ ایجاز و اختصار بھی ہے۔ چوں کہ شبلی جمالیاتی تنقیدی دبستان سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے نثر میں شاعرانہ فضا پیدا کرنے کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ وہ برمحل اشعار کا استعمال کر کے معانی و مطالب کو دل کش انداز میں ادا کر دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ ان کی نثر کی سادگی میں فن کاری کی ایک خاص شان پائی جاتی ہے۔ ادب کے طالب علم کو شبلی کی موازنہ انیس و دبیر اور شعرالعجم کی چوتھی جلد ضرور پڑھنی چاہیے۔

ڈپٹی نذیر احمد:

ڈپٹی نذیر احمد کا وطن بجنور ہے۔ بچپن میں دہلی آ گئے اور قدیم دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ انگریزی حکومت کی ملازمت کی اس لیے ان کی حمایت کرتے رہے۔ انہوں نے کبھی کچھ وقت حیدرآباد میں گذارا، بقیہ زندگی دہلی میں رہ کر تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے۔ ''شمس العلما'' کے خطاب سے نوازے گئے۔

سر سید سے ان کے روابط تھے۔ عموماً تقاریر کے لیے سر سید انہیں اپنے ساتھ رکھتے تھے کیوں کہ آواز بلند اور بھاری بھرکم تھی۔ بڑے بڑے اجتماعات میں تقریر کرتے تو سناٹا چھا جاتا۔ ان کی تقریروں کے مجموعے خطبات نذیر احمد کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ جسے پڑھ کر ان کے وسیع علم کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ قرآن پاک کی تفسیر بھی انہوں نے لکھی۔ قانون کی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے جن میں ''تعزیراتِ ہند'' اور ''قانونِ شہادت'' مشہور ہیں۔ نذیر احمد کی اصل شہرت ان کے ناولوں سے ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار کہا جاتا ہے۔ حالاں کہ انہیں پتہ نہیں تھا کہ وہ ناول لکھ رہے ہیں۔ ان کے سامنے پہلے سے ناول کا خاکہ یا نمونہ اردو میں موجود نہیں تھا۔ ظاہر ہے ان کے ناول فکری اور فنی اعتبار سے کمزور ہیں البتہ ناول کے عناصر ترکیبی ہونے کی بنا پر ان کی تصانیف کو ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے کل سات ناول لکھے۔ پہلا ناول ''مرأۃ العروس'' 1869ء میں لکھا جو کہ اپنی لڑکی کی تعلیم و تربیت اور ذہن سازی کے لیے لکھا تھا۔ لیکن ایک انگریز کلکٹر کی فرمائش پر اسے شائع کیا جو مقبول ہو گیا۔ دوسرا ناول ''بنات النعش'' بھی اسی مقصد سے لکھا۔ تیسرا ناول ''توبۃ النصوح'' سب سے زیادہ مشہور اور دلچسپ ہے۔ اس کو پڑھ کر دلی کے اجڑتے ہوئے مسلم خاندانوں کی تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ اس ناول کا ایک زندہ جاوید کردار ''مرزا ظاہر دار بیگ'' ہے۔ ان کے دیگر ناولوں کے نام ''ابن الوقت''، ''فسانۂ مبتلا''، ''ایامیٰ'' اور ''رویائے صادقہ'' ہیں۔

نذیر احمد کے متعلق عموماً یہ رائے ظاہر کی جاتی ہے کہ فن کے اعتبار سے ان کے ناول، ناول کے بجائے خطبات نظر آتے ہیں جس میں اصلاح معاشرت کی بات کہی گئی ہے۔ مگر اعتراض کرنے والے اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اس وقت سماجی برائیاں مسلمانوں کے درمیان سب سے اہم مسئلہ بنی ہوئی تھی اور سر سید تحریک کے زیر اثر نذیر احمد بھی ناولوں کے ذریعہ لوگوں کو نئی راہ دکھانا چاہتے تھے۔ اس لحاظ سے ان میں ترقی یافتہ ناولوں کی تمام خوبیاں تلاش کرنا بے کار ہے۔ مگر انیسویں صدی کے ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت کی بہترین تصویریں ان ناولوں میں ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے

کہ ان کے ہر ناول کے نہ جانے کتنے ایڈیشن نکل چکے ہیں بلکہ دیگر کئی زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔ نذیر احمد زبان کے بادشاہ ہیں۔ دلی کی عام بول چال اور محاورے کے ساتھ ساتھ سنجیدہ علمی زبان کا استعمال بڑی مہارت سے کرتے ہیں۔ کبھی کبھی عربی کے نامانوس لفظ اور بے جا محاورے لکھ دیتے ہیں۔ دورخی زبان ہونے کے باوجود یہ لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور بقول ڈاکٹر سید عبداللہ نذیر احمد کا منفرد اسلوبِ بیان دلوں پر اپنا سکہ جماتا چلا جاتا ہے۔ یہ خاص رنگ سرسید کے رفقا میں سے کسی کو حاصل نہ ہوا۔

نواب محسن الملک:

نواب محسن الملک کا سرسید کے خاص رفقا میں شمار ہوتا ہے۔ اٹاوہ (اتر پردیش) کے رہنے والے تھے۔ انگریز حکومت میں معمولی ملازمت کرتے ہوئے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ اٹاوہ میں ملازمت کے دوران سرسید سے ملاقات، تعارف اور پھر زندگی بھر گہری دوستی و رفاقت قائم ہوگئی۔ کچھ عرصہ حیدرآباد میں رہے۔ 1893ء میں علی گڑھ آ گئے اور سرسید کے سچے معاون بن کر رہے۔ سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر اور سرسید کے انتقال کے بعد 1899ء میں کالج کے سکریٹری بنائے گئے۔

نواب محسن الملک فکری اعتبار سے اپنے رفقا میں سرسید کے زیادہ قریب تھے اور ان کی کتابیں بھی دراصل ان ہی خیالات کی ترجمان ہیں۔ اس لیے تمام کتابیں مذہبی اور تہذیبی موضوعات پر ہیں۔ ''تہذیب الاخلاق'' میں سرسید کے بعد سب سے زیادہ مضامین انہوں نے لکھے۔ ان کے ذریعہ محسن الملک کی ادبی رجحان کی شناخت کی جاسکتی ہے۔ ان کا اندازِ بیان سادہ اور شیریں ہے۔ تمثیل سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ ان کا ایک مضمون تعلیم و تربیت ہے۔ نمونہ کے طور پر اس کا ایک اقتباس دیکھیے۔

> ''ایک روز خیال نے مجھے عالمِ مثال تک پہنچایا.......... جب میں عالمِ مثال (وہاں) سے لوٹا اور لوگوں سے یہ قصہ کہا تو وہ سب ایک ایک لفظ کی حقیقت مجھ سے پوچھنے لگے ہیں۔ صرف یہ کہہ کر کہ باغ ہرا بھرا میں نے مغرب میں دیکھا ہے وہ علوم وفنون جدیدہ کا باغ ہے۔ جس کے پھل پھول اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ پر ہمارا اپنا دل بہلانے والا کوئی وہاں نہیں جس کی ویرانی اور خزاں کی کیفیت ہمارے سامنے ہے وہ پتھر جو سرچشمہ پر آ گیا ہے۔ جہالت ہے' وہ ندی نالے' گندے پانی کے رسم رواج کی پابندی'' سیلی'، نما تعصب' علم نما نادانی' جھوٹا زہر' جھوٹی شیخی' جاہلانہ تقلید' عامیانہ علامی' ضرر انگیز حرارت' وحشیانہ تعلیم و تربیت ہے۔ جس کا نتیجہ مسخ انسانیت ہے جو کہ ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور جس کا علاج اب ہم سوائے دعا کے کچھ نہیں جانتے۔''

یہ پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ فکر کے ساتھ ساتھ کہنے کا انداز بھی بالکل سرسید جیسا ہے اور مقصدیت غالب ہے۔ لیکن ایسی عمدہ تصویر کشی کی ہے کہ محسن الملک کے اندر کہانی لکھنے کی پوری صلاحیت نظر آتی ہے ان کے دیگر مضامین ''تدبیر و امید''، اور ''عزت'' وغیرہ اہم ہیں جس میں ادبیت بھرپور نمایاں ہے۔ محسن الملک کا مقام اردو ادب میں گرچہ وہ نہیں ہے جو حالؔی اور شبلؔی کا ہے مگر ادب کو نئی جہت اور جدت ادا کرنے میں وہ ان کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں۔

دیگر رفقا:

سرسید کے دیگر رفقا بھی ہیں جنہوں نے بہت کچھ لکھا مثلاً منشی ذکاء اللہ اور مولوی چراغ علی وغیرہ مگر ان کے موضوعات ادب سے ہٹ کر ہیں۔ منشی ذکاء اللہ مشہور ریاضی داں اور تاریخ نگار تھے۔ یہ بھی ڈپٹی نذیر احمد کی طرح دہلی کالج کے پڑھے ہوئے تھے۔ ڈیڑھ سو سے زائد کتابیں

انہوں نے لکھی ہیں۔ تاریخ اور ریاضی سے ہٹ کر تہذیب الاخلاق میں مضامین لکھتے تھے۔ اس کے علاوہ سرسید کی مجوزہ ورناکلر یونیورسٹی کے معاون و موئید تھے۔ اردو ذریعہ تعلیم کے حامی منشی ذکاءاللہ نے اپنی زندگی میں محتاط اندازے کے مطابق پچاس ہزار صفحات لکھے ہیں۔ ان میں بعض کتابیں کئی جلدوں پر مشتمل ہیں۔ اگر انہوں نے ادب کو بھی اپنا موضوع بنایا ہوتا تو یقیناً اردو کے نامور ادیبوں میں ان کا شمار ہوتا۔ چراغ علی نے علمی اور مذہبی کتابیں لکھی ہیں۔ اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان پر انہیں زبردست عبور حاصل تھا۔ متعدد کتابیں انگریزی میں بھی ہیں۔ یہ بھی محسن الملک کی طرح فکری اعتبار سے سرسید سے پوری طرح ہم آہنگ تھے۔ اپنی کتابوں میں سرسید کے مذہبی افکار کی ترجمانی کی ہے۔

اردو کے ایک اور بڑے ادیب ہیں جن کا تعلق براہ راست سرسید تحریک سے نہ تھا مگر ادبی اور فکری پہلو سے اس تحریک کا ساتھ دیتے نظر آتے ہیں۔ یہ ہیں مولوی محمد حسین آزاد۔ انہوں نے نظم اور نثر دونوں میں خدمات انجام دیں۔ ''انجمن پنجاب لاہور'' کے روح رواں یہی تھے۔ اردو شاعری کو فطری اور موضوعاتی بنانے میں اس انجمن کا بڑا ہاتھ ہے۔ حالی بھی اس سے وابستہ تھے۔ محمد حسین آزاد کی مشہور کتابوں میں قصصِ ہند، آبِ حیات، نیرنگِ خیال، دربارِ اکبری، سخندان فارس، کلام نظم آزاد وغیرہ ہیں۔ آبِ حیات کو زیادہ مقبولیت نصیب ہوئی۔ اردو شعرا کا تذکرہ پہلی مرتبہ اس میں سماجی پس منظر، تاریخی ارتقا اور ادبی شعور کا لحاظ کرتے ہوئے کیا گیا ہے۔

13.5 علی گڑھ تحریک کے اثرات

فکری اثرات:

اردو ادب میں سرسید ہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے تقلید کے بجائے آزادئ رائے کی بنیاد ڈالی جس میں عقل، نیچر، تہذیب اور مادی ترقی کو اہمیت دی گئی۔ سرسید کی فکر کے یہ عناصر ترکیبی حقیقت نگاری، اجتماعیت، عقلیت اور مادیت وغیرہ وہ رجحانات ہیں جن سے اردو کا سارا ادب متاثر ہوا۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ترقی پسند تحریک اپنی بیشتر خصوصیات کی بنا پر سرسید کی مادیت، عقلیت اور حقائق نگاری کی ترقی یافتہ شکل معلوم ہوتی ہے۔

سرسید کا یہ فکری رویہ اردو ادب میں تقریباً ہر جگہ موجود ہے۔ مذہبی تصنیفات ہوں کہ تاریخ نگاری یا سوانح نویسی، مضامین مقالے، تنقید اور شاعری، سبھی اس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ چناں چہ اس تحریک کے زیر اثر لوگ تقلیدی کم اور تحقیقی زیادہ ثابت ہوئے۔ سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھنے اور پرکھنے کا میلان پیدا ہوا۔ یہیں سے سائنٹفک تنقید نگاری کی بھی بنیاد پڑتی ہے۔

عملی اثرات:

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ سرسید سے قبل اردو ادب دنیا کے عمدہ ادب کی صف میں شامل ہونے کے لائق نہیں تھا۔ بلکہ تخلیقی اور صنفی اعتبار سے ادھورا ادب تھا۔ سرسید کی کوششوں سے اردو کے نثری اصناف پر توجہ دی گئی اور شاعری کے رخ کو بدلا گیا۔ ناول، سوانح، خاکہ، مضامین، مقالے، تاریخ نگاری اور تنقید نگاری کا ایک طرح سے آغاز ہوا۔ جدید نظم نگاری کا چرچا ہوا۔ شاعری کے موضوعات بدلے گئے۔ سرسید نے اپنی بیش قیمت تصانیف کے ذریعہ دیگر مصنفوں اور ادیبوں کو وہ خیالات دیے جس سے ادب کی توانا روایت قائم ہوئی۔ ایسا ادب جس میں حقیقت، مقصدیت اور افادیت کا پہلو نمایاں ہو اور جو معاشرے کے لیے سودمند ہو۔ انھوں نے تہذیب الاخلاق پرچہ اسی مقصد سے جاری کیا تھا۔ اس رسالہ میں شائع بیشتر مضامین کے ذریعہ سرسید کی فکر کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اردو ادب کو کیا دینا چاہتے ہیں۔ اور ایسا ہوا بھی۔

13.6 اصنافِ ادب پر اثرات

13.6.1 تاریخ نگاری:

سر سید احمد خان نئی تعلیم کے حامی اور جدیدیت کے علم بردار تھے انہوں نے حضور نبی کریم کے اسوہ حسنہ پر عمل کرنے کے لیے اخلاقیات کی خالص قدروں کو فروغ دینے کی کوشش کی، لیکن اس تحریک نے تاریخ کو سپاٹ بیانیہ نہیں بنایا بلکہ اس فلسفے کو جنم دیا کہ تاریخ کے اوراق میں قوم اور معاشرے کا دھڑکتا ہوا دل محفوظ ہوتا ہے۔ جس کا آہنگ دریافت کر لینے سے مستقبل کو سنوارا اور ارتقاء کے تسلسل کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ اسی نقطہ نظر سے سر سید احمد خان نے ''آئین اکبری''، ''تزک جہانگیری'' اور تاریخ فیروز شاہی دوبارہ مرتب کیں۔ شبلی نعمانی نے ''الفاروق''، ''المامون'' اور اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر لکھیں۔ جب کہ مولوی ذکا اللہ نے ''تاریخ ہندوستان'' مرتب کی۔

علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کے شاندار ماضی کی قصیدہ خوانی نہیں کی اور نہ ہی اسلاف کی عظمت سے قوم کو مسحور کیا بلکہ سر سید احمد خان کا ایمان تھا کہ بزرگوں کے یادگار کارناموں کو یاد رکھنا اچھا اور برا دونوں طرح کا پھل دیتا ہے۔ چناں چہ اس تحریک نے تاریخ کے برے پھل سے عوام کو بچانے کی کوشش کی اور ماضی کے تذکرہ جمیل سے صرف اتنی توانائی حاصل کی کہ قوم مستقبل کی مایوسی ختم کرنے کے لیے ایک معیار مقرر کر سکے۔ علی گڑھ تحریک نے تاریخ نگاری کے ایک الگ اسلوب کی بنیاد رکھی۔

اس لیے علی گڑھ تحریک نے تاریخ نگاری میں غیر شخصی اسلوب کو مروج کیا اور اسے غیر جانبداری سے تاریخ نگاری میں استعمال کیا۔ اس میں شک نہیں کہ تاریخ کا بیانیہ انداز نثر کی بیشتر رعنائیوں کو زائل کر دیتا ہے۔ تاہم سر سید احمد خان تاریخ کو افسانہ یا ناول بنانے کے حق میں ہرگز نہیں تھے اور وہ شخصی تعصّبات سے الگ رہ کر واقعات کی سچی شیرازہ بندی کرنا چاہتے تھے۔ چناں چہ انہوں نے تاریخ کے لیے سادہ اور بیانیہ نثر استعمال کرنے پر زور دیا اور اس نقطہ نظر کے تحت آثار الصنادید کی بوجھل نثر کو سادہ بنایا۔

سر سید کو تاریخ نگاری سے غیر معمولی دلچسپی تھی اور یہ ذوق موروثی تھا، کیوں کہ ان کے اسلاف کا تعلق قلعۂ معلیٰ سے تھا۔ اس بنا پر انہوں نے قدیم تاریخی کتابوں کی تصحیح واشاعت پر توجہ دی۔ آئین اکبری، تزک جہانگیری اور تاریخ فیروز شاہی کو شائع کرایا۔ دہلی کی یادگاروں اور عمارتوں پر بڑی جانفشانی سے آثار الصنادید نام سے کتاب لکھی اور اس وقت معنی خیز جملہ کہا کہ ''بزرگوں کے قابل یادگار کاموں کو یاد رکھنا اچھا اور برا دونوں طرح کا پھل دیتا ہے۔'' انہوں نے اردو تاریخ نگاری کو متاثر کیا چناں چہ ان کے رفقا میں دو بڑے مورخ شبلی اور منشی ذکا اللہ کو تاریخ لکھنے کا فن بتایا۔ علی گڑھ تحریک نے ہی تاریخ کو اجتماعیت کی روشنی میں پیش کرنے اور واقعات کے تاریخی اسباب تلاش کرنے پر زور دیا۔ دوسری اہم بات جس کی طرف توجہ دلائی وہ یہ کہ تاریخ لکھنے کا اپنا اسلوب ہونا چاہیے جو سادگی پر مبنی ہو۔ ہر فن کا اسلوب اور طرز بیان جداگانہ ہوتا ہے۔ چناں چہ ناول میں تاریخ اور تاریخ لکھتے وقت ناول والا اندازِ بیان دونوں پر غلط تاثر چھوڑتا ہے۔ تیسری بات یہ کہ تاریخ کا ایک مادی وجود ہوتا ہے اگر یہ کٹ جائے تو حقیقت افسانے میں بدل جائے گی اور تاریخ، تاریخ نہ رہ کر علم الاساطیر کا درجہ حاصل کر لے گی۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ابن خلدون نے فلسفۂ تاریخ کی بحث میں اس اصول کو واضح کیا ہے، مگر یہ احساس جاتا رہا جس کی بازیافت علی گڑھ تحریک نے کی۔ محسن الملک نے تہذیب الاخلاق میں مقدمہ ابن خلدون پر دو تبصرے لکھ کر اس کو مزید واضح کیا تھا۔ شبلی، جنہیں اس تحریک نے فن تاریخ کا شعور عطا کیا، اپنے وطن اعظم گڑھ میں دار المصنفین کی بنیاد ڈالی۔ اس ادارہ سے وابستہ افراد

نے تاریخ پر بیش قیمت کتابیں تحریر کیں۔ چناں چہ دارالمصنفین کے کارنامے بھی بالواسطہ علی گڑھ تحریک کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔

13.6.2 سوانح نگاری:

سرسید کے رفقائے خاص شبلی اور حالی نے سوانح نگاری کی صنف کو وہ ترقی دی کہ شاید ہی کوئی اسے فراموش کر سکے مگر یہ بات ذہن میں رہے کہ سرسید کو سوانح سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی کیوں کہ وہ شخصیت سے زیادہ قومی مسائل اور تحریکوں پر توجہ دیتے تھے۔ سرسید روایات کی اتباع کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔ اس لحاظ سے ان کے اندر ایک انقلابی ذہن اور سخت گیر طبیعت کارفرما تھی۔ جب کہ سوانح نگاری کے لیے کچھ نہ کچھ عقیدت ضروری ہے۔ اس کے باوجود اردو کی سوانح عمری سرسید کی تحریروں سے متاثر رہی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس دور کی سوانح نگاری قومی ترقی کے مقصد سے فروغ پاتی رہی اور قومی ترقی ہی سرسید کی تحریک کا بنیادی عنصر ہے۔ اب مولانا حالی کو دیکھیے ان کی سوانح عمریاں سادہ اور ادبی ہیں مگر قومی خدمت کا جذبہ پوری طرح موجود ہے۔ قوم کے لیے انھوں نے ظرافت، خوش طبعی اور زندہ دلی کے عمدہ نمونے پیش کیے۔ شبلی کا مرتبہ سوانح نگار کی حیثیت سے حالی سے بڑھا ہوا ہے۔ مسلمانوں کی عہد ساز شخصیتوں کی سوانح لکھ کر شبلی نے قوم کو اسے مشعل راہ بنانے کی اپیل کی ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل زندگی سیرت النبی کے نام سے قلم بند کرنا شروع کیا مگر زندگی نے وفا نہ کی اور اس کو سید سلیمان ندوی نے تکمیل تک پہنچایا۔

سوانح نگاری میں بھی علی گڑھ تحریک کا دیا ہوا اصول یعنی قومی ترقی اور اصلاح پیش نظر تھا۔ اسی کے زیر اثر عبدالحلیم شرر اور عبدالرزاق کانپوری نے بھی سوانح کی صنف میں اضافہ کیا۔ بہر حال سرسید نے اردو سوانح نگاری کو کچھ دیا ہو یا نہ دیا ہو مگر انداز نظر تو ضرور دیا۔ اس کے سبب اردو سوانح نگاری ادب کی دوسری اصناف کی مانند اپنی شناخت قائم کر سکی۔

اردو ادب میں دیگر اصناب کے مقابلے میں سوانح نگاری کی عمر بہت کم ہے۔ اردو میں سوانح نگاری کی ابتدا 1857 سے پہلے ہو چکی تھی، لیکن اس میں خامیاں ہونے کی سبب ان کو ادبی حیثیت حاصل نہیں ہوئی۔ اردو میں مولانا حالی کو پہلے سوانح نگار ہونے شرف حاصل ہے۔ پہلی بار انہوں نے ہی فنی بالیدگی کے ساتھ سوانح نگاری اردو میں متعارف کرایا۔ مولانا حالی کی تین سوانح عمریاں ''حیات جاوید''، ''حیات سعدی'' اور ''یاد گار غالب'' اردو میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

13.6.3 ناول نگاری:

علی گڑھ تحریک میں اصلاحی اور منطقی نقطہ نظر کو تمثیل میں بیان کرنے کا رجحان سرسید احمد خان، مولانا حالی اور محسن الملک کے ہاں نمایاں ہے۔ تاہم مولوی نذیر احمد نے اسے فن کا درجہ دیا اور تحریک کے عقلی زاویے اور فکری نظریے کے گرد جیتے جاگتے اور سوچتے ہوئے کرداروں کا جمگھٹا کھڑا کر دیا۔ چناں چہ وہ تمام باتیں جنہیں سرسید احمد خان نسبتاً بے رنگ ناصحانہ لہجے میں کہتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے انہیں کرداروں کی زبان میں کہلوایا ہے اور ان میں زندگی کی حقیقی رمق پیدا کر دی ہے۔

اگر چہ زندگی کی یہ تصویریں بلاشبہ یک رخی ہیں اور نذیر احمد نے اپنا سارا زور بیان کرداروں کے مثالی نمونے کی تخلیق میں صرف کیا۔ لیکن یہ حقیقت بھی مد نظر رکھنی چاہیے کہ زوال دہلی کے بعد مسلمانوں کی زبوں حالی کے پیش نظر اس وقت مثالی کرداروں کو پیش کرنے کی ضرورت تھی۔ چناں چہ صاف اور واضح نظر آتا ہے کہ مولانا شبلی اور مولانا حالی نے جو قوت اسلاف کے تذکروں سے حاصل کی تھی وہی قوت نذیر احمد مثالی کرداروں کی تخلیق سے حاصل کرنے کے آرزومند ہیں۔ مولوی نذیر احمد کے ناول چوں کہ داستانوں کے تخیلی اسلوب سے ہٹ کر لکھے گئے تھے اور ان میں حقیقی زندگی کی

جھلکیاں بھی موجود تھیں اس لیے انہیں وسیع طبقے میں قبولیت حاصل ہوئی اور ان ناولوں کے ذریعے علی گڑھ تحریک کی معتدل اور متوازن عقلیت کو زیادہ فروغ حاصل ہوا اس طرح نذیر احمد کی کاوشوں سے نہ صرف تحریک کے مقاصد حاصل ہوئے بلکہ ناول کی صنف کو بے پایاں ترقی ملی۔نظیر احمد کے علاوہ علی گڑھ تحریک سے متاثر ہوکر عبدالحلیم شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار پھر آگے مرزا ہادی رسوؔا نے ناول کے فن کو عروج بخشا۔

نذیر احمد کا شمار سرسید کے نامور رفقا میں ہوتا ہے۔ان کی تخلیقات میں علی گڑھ تحریک کا گہرا اثر دکھائی پڑتا ہے۔نذیر احمد اعلیٰ درجے کے زبان داں تھے۔وہ عمدہ مقرر اور بہترین ادیب تھے۔انہوں نے بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے اور ساتھ ہی ناول بھی لکھے ہیں۔یہاں پر ان کے تمام ناول کا مختصر تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔ان کا پہلا ناول ''مراۃ العروس'' ہے، جو پہلی مرتبہ 1869 میں شائع ہوا۔اسی ناول کو اردو کا پہلا ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ نذیر احمد نے چھ ناول ''بناۃ النعش''، ''توبۃ النصوح''، ''ابن الوقت''، ''محسنات''، ''ایامیٰ'' اور ''رویائے صادقہ'' بھی ہیں۔

13.6.4 مضمون نگاری و مقالہ نگاری:

علی گڑھ تحریک کا ایک فیضان یہ بھی ہے کہ اس نے مضمون نگاری کی ہمت افزائی کی۔مضمون نگاری اس کے اولین نمونے اس تحریک نے ہی فراہم کیے۔''تہذیب الاخلاق'' نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔لندن میں قیام کے دوران سرسید وہاں اسٹیل اور ایڈیسن کے رسائل ''سپیکٹیٹر'' اور ''ٹیٹلر'' سے متعارف بلکہ متاثر ہوئے۔سرسید نے ان رسالوں سے بہت اثر قبول کیا اور رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا اور ادبی مضمون شائع کرنے لگے۔ سرسید نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر علمی و ادبی مضامین تحریر کیے۔تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے ساتھ ساتھ سائنس، معیشت و معاشرت، تہذیب و تمدن کو بھی موضوع بنا کر مضمون لکھے۔سرسید کے بعض مضامین میں انگریزی ''ایسے'' Essay کے عناصر بھی ملتے ہیں۔سرسید کی اس روایت کو مولوی چراغ علی، محسن الملک، نذیر احمد، حالی اور شبلی نے آگے بڑھایا۔

ان حضرات نے زندگی کے تمام مسائل کو اپنا موضوع بنایا اور فرحت بخش و سنجیدہ انداز میں پیش کیا۔کچھ عرصہ بعد رومانی نثر کو عروج حاصل ہوا تو مہدی افادی، سجاد حیدر یلدرم، وحید الدین سلیم، عنایت اللہ دہلوی، مقتدیٰ خاں شیروانی محفوظ علی بدایونی اور میر ناصر علی نے مضمون نگاری کو فروغ دیا۔مضمون کے ساتھ ساتھ تحقیقی مقالات لکھنے کا رواج بھی عام ہوا۔شبلی، سرسید اور نذیر احمد نے بڑے سنجیدہ اور تحقیقی مقالے لکھے۔

13.6.5 اردو شاعری:

اردو شاعری پر علی گڑھ تحریک نے جو احسان کیا ہے اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔اس تحریک کی بدولت آزؔاد اور حاؔلی جیسے علماء نے اردو ادب کو نیچرل شاعری کا تحفہ عطا کیا۔اس سے قبل شاعری کے میدان میں کوئی قابل ذکر کارنامہ دکھائی نہیں دیتا۔اگرچہ شاعری میں کلاسیکی شعرا نے اپنے تئیں آسمان کے قلابے ملانے کی کوشش کی، لیکن اس سے عوام کی فلاح کا کوئی ذریعہ نہ نکل سکا۔وؔلی سے میؔر اور مرؔزا کی شاعری نے صرف دربار سے انعام و اکرام لے کر اردو شاعری کو گلدستہ بنا کر طاق پر سجا دیا، لیکن علی گڑھ تحریک نے اسے اصلاحی پیرہن میں ملبوس کر کے فلاح و بہبود کا ذریعہ بنایا۔

علی گڑھ تحریک کا ہی فیضان ہے کہ اردو شاعری کے دامن میں آج وہ وسعت آگئی ہے کہ وہ اپنے اندر ہر طرح کے مضامین ادا کرنے کے قابل ہوگئی۔اس تحریک سے قبل جو شعری سرمایہ ملتا ہے اس میں عاشق، معشوق، ہجر، وصال سے زیادہ کوئی اور مضمون دکھائی نہیں دیتا۔سرسید نے اپنے اجداد کی تاریخ کو پڑھا تھا اور وہ جانتے تھے کہ شاعری سے بڑے بڑے کام لیے گئے ہیں، لیکن اردو شاعری کے مزاج میں جس طرح عشق و عاشقی رچ بس گئی تھی اس میں اصلاح کا پہلو تلاش کرنا مشکل تھا۔چوں کہ مسلمان انگریزوں کے عتاب سے دوچار تھے اور انہیں اس دلدل سے نکالنے کے لیے

اصلاحی مضامین کے ساتھ معاشرے کو سنوارنے اور ترتیب دینے والی شاعری کی بھی ضرورت تھی۔لہٰذا انہوں نے اپنے رفقا میں ایسے لوگوں کو اس بات کی ذمے داری دی، جو ایک زمانے سے شعر و شاعری اور مرصع نگاری کے دلدادہ رہے تھے۔ان میں شبلی، آزاد اور حالی کا نام پیش پیش ہے، لیکن شبلی نے سرسید سے اختلاف کی وجہ سے اس میدان میں کوئی خاص کارنامہ انجام نہیں دیا۔البتہ آزاد نے انجمن پنجاب میں اردو نظم کو فروغ دیا اور حالی نے مسدس لکھ کر قوم کو بیدار کیا، جسے سرسید نے اپنے لیے توشۂ آخرت شمار کیا۔

سرسید، حالی اور آزاد کی نیچرل شاعری کی تحریک یا نظم جدید پوری طرح سے مغرب زدہ تھی۔ایک قوم کے اثرات دوسری قوم پر مرتب ہونا ایک فطری اور ناگزیر عمل ہے۔قوموں کے باہمی ربط و تعلق سے نئی زبانیں اور تہذیبیں وجود میں آتی ہیں۔جب انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے قدم جمائے تو انگریزی ادب نے اردو شعر و ادب پر اپنے نقوش ثبت کیے اور سب سے پہلے براہ راست انگریزی شاعری کی اتباع میں جدید نظم کی تحریک کا آغاز ہوا۔

اردو میں جدید شاعری کا آغاز حالی اور آزاد کی انجمن پنجاب میں پڑھی جانے والی نظموں سے ہوتا ہے۔حالی اور آزاد سرسید تحریک کے زیر اثر اردو شاعری میں انگریزی طرز شاعری کو رواج دے رہے تھے۔جدید نظم کی تحریک کے سرسید کے نظریات کے زیر اثر اور حکومت کی ایما پر منظر عام پر آئی تھی اور بدلتے ہوئے اس ادبی رجحان میں افادی اور فطری شاعری اپنا وجود قائم کر رہی تھی۔

علی گڑھ تحریک کے فکری زاویوں اور ادبی اثرات کا سب سے گہرا اثر حالی کی تحریروں میں دکھائی دیتا ہے۔انہوں نے اپنی نظموں، غزلوں اور نایاب تصانیف کے ذریعے علی گڑھ تحریک کے بنیادی مقصد اور اساسی پہلوؤں کو تقویت بخشی۔

حالی کا شمار ان مؤرخوں، نقادوں اور شاعروں میں ہوتا ہے، جنہوں نے سرسید کی افادی ادب اور نیچری شاعری پر خاص توجہ مرکوز کی۔ اردو ادب اور تنقید میں ادب کے سماجی مقصد اور اس کی افادیت پر زور دے کر ادب کو مغربی تصورات سے روشناس کیا۔''نیچر'' وہ لفظ ہے کہ جس پر سرسید اور حالی دونوں نے بار بار اصرار کیا ہے اور اسی اصرار نے حالی کو مسدس ''مدوجزر اسلام'' لکھنے پر آمادہ کیا۔1879ء میں جب یہ نظم شائع ہوئی تو سرسید نے اپنے ایک خط میں اس کی تعریف اس طرح کی ہے:

> ''اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جاوے تو بالکل بجا ہے۔کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے، بیان سے باہر ہے۔تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ، تشبیہات دور از کار سے جو مایہ ناز شعرا و شاعری ہے بالکل مبرا ہے۔......آپ کے اس خیال کا کہ حق تصنیف مدرسۃ العلوم کو دیا جاوے اور رجسٹری کروا دی جاوے، میں دل سے شکر کرتا ہوں۔مگر میں نہیں چاہتا کہ اس مسدس کو جو قوم کے حال کا آئینہ اور جوان کی تاریخ کا مرثیہ ہے، کسی قید سے مقید کیا جاوے، جس قدر چھپے اور جس قدر مشہور ہو اور لڑکے ڈنڈوں پر گایا کریں اور رنڈیاں مجلسوں میں سارنگی پر گاویں، قوال درگاہوں میں گاویں، حال لانے والے سچے حال پر حال لاویں۔اسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہوگی۔میرا تو دل چاہتا ہے کہ دہلی میں ایک مجلس کروں جس میں تمام اشراف ہوں اور رنڈیاں نچواؤں، مگر وہ رنڈیاں یہی مسدس گاتی ہوں۔میں اس کُل مسدس کو تہذیب الاخلاق میں چھاپوں گا۔''

(حالی کا ذہنی ارتقا، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ص 67-66)

سرسید کی یہ تحریر اس بات کی غماز ہے کہ حالی کا یہ فن پارہ ان کی امید پر کھرا اترا، کیوں کہ سرسید نے سادگی، بے تکلفی اور مطلب نگاری کو ہی نیچر قرار دیا تھا۔ یہ تمام خصوصیات حالی کے اس مسدس میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ سرسید کے اثرات ان کے اکثر معاصرین ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں پر صاف نظر آتے ہیں۔ حالی کے مقدمہ شعر و شاعری سے ہی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے سرسید کا کتنا اثر قبول کیا۔ کیوں کہ حالی کے خیالات میں سرسید کے خیالات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ مثلاً نظم کے لیے بول چال کی زبان اور فطری جذبات کو ترجیح دی۔

حالی بھی سرسید کی طرح مسلم قوم کی زبوں حالی کو بیان کر کے انہیں ذلت و رسوائی کے گڑھے سے نکالنے کے لیے کوشاں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حالی کی وہ نظمیں جو انہوں نے انجمن پنجاب کے موضوعی مشاعروں میں پڑھی تھیں، سرسید کو بہت پسند آئیں۔ حالی کی شاعری کی بنیاد ان بلند پایا مشہور نظموں پر ہے۔ (1) برکھارت (2) نشاط امید (3) حب الوطنی اور (4) مناظرۂ رحم و انصاف وغیرہ۔ ان نظموں کی اہم خوبی یہ ہے کہ ان میں حقیقت نگاری ہے، مبالغہ سے پاک ہیں۔ تشبیہ و استعارہ کے بھنور سے آزاد ہیں اور یہی علی گڑھ تحریک کے تحت اردو شاعری کا بدلتا ہوا منظر نامہ بھی ہے۔

اردو شاعری کی پہچان اب تک غزلوں سے تھی۔ نظم نگاری اس وقت تک پورے طور پر ابھر کر سامنے نہیں آئی جب تک سرسید نے اس کی طرف توجہ نہیں دلائی۔ بعد میں مولوی محمد حسین آزاد کی کاوشوں سے ''انجمن پنجاب لاہور'' نے نظم نگاری کی باضابطہ تحریک چلائی۔ سرسید ہر چیز کو اجتماعی اور افادی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ چناں چہ شاعری کے بارے میں بھی ان کا خیال تھا کہ مروجہ شاعری میں فطری جذبات کی کمی ہے۔ اسی لیے محمد حسین آزؔاد کی مثنوی ''خوابِ امن'' اور حالی کی نظم ''برکھارت'' کی خوب تعریف کی۔ سرسید شاعری میں ردیف و قافیہ کے التزام کو بھی غیر ضروری سمجھتے تھے۔ اس تحریک کا اثر عبدالحلیم شؔرر کے یہاں پوری طرح عیاں ہے۔ انہوں نے رسالہ ''دلگداز'' میں متعدد ایسی نظمیں شائع کیں جن میں مروجہ قواعد و ضوابط سے انحراف ہے۔

علی گڑھ تحریک نے غزل کے برعکس نظم کو رائج کرنے کی کوشش کی۔ اس کا سبب خود سرسید احمد خان یہ بتاتے ہیں کہ:

> ''ہماری زبان کے علم و ادب میں بڑا نقصان یہ تھا کہ نظم پوری نہ تھی۔ شاعروں نے اپنی ہمت عاشقانہ غزلوں اور واسوختوں اور مدحیہ قصوں، قصیدوں اور ہجر کے قطعوں اور قصہ کہانی کی مثنویوں میں صرف کی تھی۔''

اس بنا پر سرسید احمد خان نے غزل کی ریزہ خیالی کے برعکس نظم کو رائج کرنے کی سعی کی۔ نظم کے فروغ میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مولانا الطاف حسین حالی سے ''مسدس حالی'' لکھوائی اور پھر اُسے اپنے اعمال حسنہ میں شمار کیا۔ سرسید احمد خان شاعری کے مخالف نہ تھے لیکن وہ شاعری کو نیچرل شاعری کے قریب لانا چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے محمد حسین آزاد کے نیچرل مشاعرے کی داد دی اور ان کی مثنوی ''خواب امن'' کو دل کھول کر سراہا۔ سرسید احمد خان کی جدیدیت نے اس حقیقت کو بھی پالیا تھا کہ قافیہ اور ردیف کی پابندی خیالات کے فطری بہاؤ میں رکاوٹ ہے۔

سرسید احمد خان کے ان نظریات کا اثر یہ ہوا کہ اردو نظم میں فطرت نگاری کی ایک موثر تحریک پیدا ہوئی۔ نظم جدید کے تشکیلی دور میں علی گڑھ تحریک کے ایک رکن عبدالحلیم شرر نے سرگرم حصہ لیا اور ''رسالہ دلگداز'' میں کئی ایسی نظمیں شائع کیں جن میں جامد قواعد و ضوابط سے انحراف برت کر تخلیقی رو کو اظہار کی آزادی عطا کی گئی تھی۔

سرسید کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مولوی الطاف حسین حاؔلی سے ''مسدس مد و جزر اسلام'' لکھوائی۔ اس نظم نے مسلم معاشرہ کی

اصلاح میں غیر معمولی کام انجام دیا۔اس کے تعلق سے مولوی عبدالحق نے ایک دلچسپ واقعہ تحریر کیا ہے کہ پنجاب کے ایک دور افتادہ گاؤں میں کسی شادی میں شرکت کی غرض سے ان کا جانا ہوا۔اس تقریب میں انہیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ایک شخص مسدس مولانا حالی پڑھتا جاتا ہے اور خود بھی رو رہا ہے دوسروں کو بھی رلا رہا ہے۔مسدس کی سادگی، سلاست، روانی، قوم کو بیدار کرنے والا مضمون اور شاعر کا خلوص آج بھی دلوں کو گرماتا اور لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔شبلی کی قومی اور سیاسی شاعری میں بھی یقیناً سرسید کا ذہن کارفرما ہے۔بعد کے اکثر قومی شاعروں نے انہیں بنیادوں پر شاعری کر کے نام کمایا۔شروع میں اکبرالہ آبادی نے علی گڑھ تحریک کی پرزور مخالفت کی اور اس کے لیے شاعری کو وسیلہ بنایا۔ایک طرح سے ان کے ذہن اور شاعری دونوں کو علی گڑھ تحریک ہی سے جلا اور روشنی حاصل ہوئی۔''مخزن'' میں لکھنے والے اکثر شاعروں کے کلام میں اس تحریک کا اثر نظر آتا ہے اور آگے چل کر اقبال نے سرسید کی سخت کلاسیکیت کے خلاف رومانوی احتجاج کا جھنڈا بلند کیا۔

13.6.6 اردو تنقید نگاری:

علی گڑھ تحریک نے زندگی کے جمال کو اجاگر کرنے کے بجائے مادی قدروں کو اہمیت دی۔چناں چہ ادب کو بے غرضانہ مسرت کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے ایک ایسا مفید وسیلہ قرار دیا گیا جو مادی زندگی کو بدلنے اور اسے مائل بہ ارتقا رکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ادب کا یہ افادی پہلو بیسویں صدی میں ترقی پسند تحریک کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔تاہم یہ اعزاز علی گڑھ تحریک کو حاصل ہے کہ اردو زبان کے بالکل ابتدائی دور میں ہی اس کی عملی حیثیت کو اس تحریک نے قبول کیا اور ادب کو عین زندگی بنا دیا۔اس اعتبار سے بقول سید عبداللہ سرسید سب پہلے ترقی پسند ادیب اور نقاد تھے۔اول الذکر حیثیت سے سرسید احمد خان نے ادب کو تنقید حیات کا فریضہ سرانجام دینے پر آمادہ کیا اور موخر الذکر حیثیت سے ادب کی تنقید کے موقر اصول وضع کر کے اپنے رفقاء کو ان پر عمل کرنے کی تلقین کی۔

اگر چہ سرسید احمد خان نے خود فن تنقید کی کوئی باقاعدہ کتاب نہیں لکھی، لیکن اُن کے خیالات نے تنقیدی رجحانات پر بڑا اثر ڈالا۔ان کا یہ بنیادی تصور کہ اعلیٰ تحریر وہی ہے جس میں سچائی ہو، جو دل سے نکلے اور دل پر اثر کرے، بعد میں آنے والے تمام تنقیدی تصورات کی اساس ہے۔سرسید احمد خان سے قبل عبارت آرائی اور قافیہ پیائی کو اعلیٰ نثر کی ضروری شرط خیال کیا جاتا تھا لیکن سرسید احمد خان نے مضمون نگاری کا ایک صاف اور سیدھا طریقہ اختیار کیا۔انہوں نے انداز بیان کے بجائے مضمون کو مرکزی اہمیت دی اور طریق ادا کو اس کے تابع کر دیا۔سرسید احمد خان کے یہ تنقیدی نظریات ان کے متعدد مضامین میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں اور ان سے سرسید احمد خان کا جامع نقطہ نظر مرتب کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ علی گڑھ تحریک نے ایک ان لکھی کتاب پر عمل کیا۔

اگر علی گڑھ تحریک سے پہلے کی تنقیدی پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ علی گڑھ تحریک سے قبل کی تنقید صرف ذاتی تاثرات کے اظہار تک محدود تھی۔لیکن سرسید احمد خان نے ادب کو بھی زندگی کے مماثل قرار دیا۔اور اس پر نظری اور عملی زاویوں سے تنقید کی۔گو کہ سرسید احمد خان نے خود تنقید کی کوئی باضابطہ کتاب نہیں لکھی۔تاہم ان کے رفقاء میں سے الطاف حسین حالی نے''مقدمہ شعر وشاعری'' جیسی اردو تنقید کی باقاعدہ کتاب لکھی اور اس کا عملی اطلاق''یادگار غالب'' میں کیا۔مولانا حالی کے علاوہ شبلی نعمانی کے تنقیدی نظریات ان کی متعدد کتابوں میں موجود ہیں۔ان نظریات کی عملی تقلید''شعر العجم'' ہے۔

سرسید نے صرف ادب اور اس کی تخلیق کو ہی اہمیت نہیں دی بلکہ انہوں نے قاری کی اساسی حیثیت کو بھی تسلیم کیا۔انہوں نے مضمون کو

طرز ادا پر فوقیت دی، لیکن انشاء کے بنیادی تقاضوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ بلکہ طرز ادا میں مناسب لطف پیدا کر کے قاری کو اسلوب کے سحر میں لینے کی تلقین بھی کی۔ چناں چہ ان کے رفقاء میں سے مولانا شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد کے ہاں مضمون اور اسلوب کی ہم آہنگی فطری طور پر عمل میں آتی ہے اور اثر و تاثیر کی ضامن بن جاتی ہے۔ اگر چہ ان کے مقابلے میں حالی کے ہاں تشبیہ اور استعارے کی شیرینی کم ہے تاہم وہ موضوع کا فکری زاویہ ابھارتے ہیں اور قاری ان کے دلائل میں کھو جاتا ہے۔ اس طرح مولوی ذکاء اللہ کا بیانیہ سادہ ہے لیکن خلوص سے عاری نہیں جب کہ نواب محسن الملک کا اسلوب تمثیلی ہے اور ان کی سادگی میں بھی حلاوت موجود ہے۔

اردو ادب میں اب تک جانچنے اور پرکھنے کا کوئی متعین اصول نہیں تھا۔ اس تحریک نے پہلی مرتبہ ادب کی ماہیت، ساخت، مقصد اور قاری کی اہمیت کے سلسلے میں آواز بلند کی۔ پہلی مرتبہ ادب میں قاری کے وجود کو تسلیم کیا گیا۔ سرسید کے تنقیدی نظریات ان کے متعدد مضامین میں بکھرے ہوئے ہیں۔ انہوں نے باضابطہ تنقید کی کوئی کتاب نہیں لکھی البتہ ان کے رفقا میں سے حالی نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر اردو تنقید کی بنیاد رکھی۔ ''مقدمۂ شعر و شاعری'' حالی کے دیوان کے ساتھ 1893ء میں شائع ہوا جو اردو تنقید نگاری میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ اس نے تنقیدی روایت کا رُخ بدل دیا اور جدید تنقید کی بنیاد رکھی۔ اس کتاب میں شاعری کے حوالہ سے ظاہر کیے گئے خیالات، مغربی تنقیدی اصولوں کی اشاعت کے باوجود اب بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

شبلی نے بھی ''شعر العجم'' کے ذریعہ تنقید کو فروغ بخشا۔ علی گڑھ تحریک نے تنقید کے جس نظریے کو فروغ دیا اس میں طرز ادا کے بجائے مرکزی موضوع اور بنیادی مضمون کو اہمیت حاصل ہے۔ یعنی بات کا مفہوم الفاظ میں گم ہونے کے بجائے قاری تک آسانی سے پہنچ جائے۔ اس طرح اس تحریک نے قاری کی اساسی اہمیت کو اجاگر کیا۔ یہ بھی دھیان میں رہے کہ سرسید نے مضمون کے ساتھ انشا کے بنیادی تقاضوں کو بھی مدِ نظر رکھا ہے۔ جسے شبلی اور نذیر احمد نے خوب صورتی سے برتا ہے۔

موجودہ دور میں تنقیدی ادب کا مطالعہ گہرا اور وسیع ہو چکا ہے۔ اس کے مختلف دبستان قائم ہو چکے ہیں مگر شعر و ادب کے تعلق سے علی گڑھ تحریک نے جو کچھ نظریات اور خیالات دیے آج بھی ان کی اہمیت مسلم ہے۔ اور یہی کیا کم ہے کہ تنقیدی شعور کی داغ بیل اسی نے ڈالی۔ تقابلی مطالعہ کا راستہ بھی شبلی نے ''موازنہ انیس و دبیر'' لکھ کر دکھایا۔

''موازنہ انیس و دبیر'' کو اردو میں تقابلی تنقید کی پہلی کتاب کہا جاتا ہے۔ یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ موازنہ اور تقابل دونوں عربی زبان کے الفاظ ہیں اور ماہرین لسانیات کا متفقہ خیال ہے کہ ایک ہی زبان کے دو لفظ ہم معنی نہیں ہو سکتے، ہاں قریب المعنی ضرور ہو سکتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک مترادف لفظ ہوتے ہی نہیں ہیں۔ اس تناظر میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شبلی کی مذکورہ کتاب کو تقابلی کتاب تسلیم کیا جانا چاہیے یا نہیں؟ راقم الحروف کے نزدیک اس کتاب کو تقابلی نہیں بلکہ موازنہ کی کتاب کہا جانا چاہیے۔ میرے فہم کے مطابق موازنہ اور تقابل میں ایک باریک سا فرق ہے وہ یہ کہ تقابل میں موازنہ شامل ہے جب کہ موازنہ میں تقابل شامل نہیں ہے۔ یعنی محض ہم وزن چیزوں کا تقابل کرنا موازنہ ہوگا اور قدر مشترک چیزوں کا تقابل کرنا تقابلی مطالعہ ہوگا۔ اس کو اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ موازنہ کے مقابلے میں تقابل میں زیادہ وسعت ہے۔ اس لحاظ سے موازنہ انیس و دبیر تقابلی کتاب نہیں ہوگی۔ پھر بھی موازنہ انیس و دبیر کی اہمیت اور شبلی نعمانی کی علمیت میں کوئی کلام نہیں ہے۔ یہ تسلیم شدہ تقابلی کتاب ہے۔ اسی موازنے سے اردو میں عملی تقابلی طریقۂ کار کی ابتدا ہوئی۔

موازنہ انیس و دبیر کے جواب میں تین کتابیں ''ردالموازنہ از میر افضل علی''، ''تردید موازنہ از حسن رضا و محمد جان عروج'' اور ''المیزان از نظیر الحسن فوق''، لکھی گئیں۔ یہ کتابیں تقابلی مطالعے ہی کی ایک کڑی ہیں۔ اس کے بعد سے اردو میں تقابلی مطالعے کا رواج عام ہوا اور اس قبیل کی متعدد کتابیں منظر عام پر آئیں۔

13.6.7 اردو صحافت:

اردو صحافت نگاری کا آغاز سرسید کے بچپن میں ہو چکا تھا مگر سرسید کے زمانے میں اخباروں کا پیشہ کے طور پر استعمال ہونے لگا۔ سرسید کے بھائی سید محمد خان دہلی سے ''سید الاخبار'' نکالتے تھے۔ سرسید نے اپنی صحافتی زندگی کی ابتدا اسی اخبار سے کی۔ غازی پور میں جب انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی تو اس کے نام سے اخبار سائنٹفک سوسائٹی بھی جاری کیا۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اس کی بدلی ہوئی شکل تھی۔ ''تہذیب الاخلاق'' کا اجرا سرسید کی عظیم صحافتی خدمات تھی۔ اگر چہ اس میں سنجیدہ اور علمی مضامین ہوتے تھے۔

سرسید کی صحافت میں چند باتیں توجہ کے قابل ہیں۔ ایک اخبار کی دیدہ زیبی' کاغذ کی عمدگی' حروف کی خوب صورتی وغیرہ جو انہوں نے یورپ کے اخباروں سے لی تھی۔ دوسرے اخبارات میں بے خوف آزادئ رائے جس میں تعمیری پہلو نمایاں ہوتا تھا۔ یہ وہ چیز تھی جو بعد میں ذرائع ابلاغ سے رفتہ رفتہ ختم ہوتی گئی۔ بعد میں ملک کے حالات بدل گئے۔ تحریک آزادی جڑ پکڑ چکی تھی تو ''الہلال''، ''البلاغ''، ''زمیندار''، ''دبدبہ سکندری'' وغیرہ اخباروں نے اردو کی صحافتی دنیا کو مالا مال کیا۔

مختصر یہ کہ علی گڑھ تحریک ایک بہت بڑی فکری اور ادبی تحریک تھی۔ خصوصاً ادبی لحاظ سے اس کے اثرات کا دائرہ بہت وسیع ثابت ہوا۔ اس تحریک کی بدولت نہ صرف اسلوب بیان اور روح مضمون بلکہ ادبی انواع کے معاملے میں بھی نامورانِ علی گڑھ کی توسیعی کوششوں نے بڑا کام کیا۔ اور بعض ایسی اصناف ادب کو رواج دیا جو مغرب سے حاصل کردہ تھیں۔ ان میں سے بعض رجحانات خاص توجہ کے لائق ہیں۔ مثلاً نیچرل شاعری کی تحریک جس میں محمد حسین آزاد کے علاوہ مولانا الطاف حسین حالی بھی برابر کے شریک تھے۔ قدیم طرز شاعری سے انحراف بھی اسی تحریک کا ایک جزو ہے۔ اردو تنقید جدید کا آغاز بھی سرسید احمد خان اور اُن کے رفقا سے ہوتا ہے۔ سوانح نگار، سیرت نگاری، ناول اردو نظم اور مضمون نگاری سب کچھ ہی سرسید تحریک کے زیر اثر پروان چڑھا۔

13.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ ہندوستان کی تاریخ میں 1857ء کی بڑی اہمیت ہے کیوں کہ اس سال ہندوستان کے تمام طبقوں اور قوموں نے مل کر ایک ساتھ انگریزوں کو ملک سے بھگانے کی آخری کوشش کی جو کہ ناکام ہوئی مگر اس کے بعد ہندوستان کی صدیوں پرانی روایات' سیاست' تعلیم' معاشرت' مذہب اور تہذیب و ثقافت سب کچھ متاثر ہوئیں۔

☆ قدیم و جدید کی کشمکش کھل کر سامنے آگئی اور یہ کشاکش ہر میدان میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ عمل اور ردعمل دیکھنے کو ملتا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالنے کی بات ہے۔ اب ہر میدان میں پسپا ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

☆ سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قائم کرنا ہے۔ یہ کالج آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں موجود ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کو دور کرنے میں اس یونیورسٹی نے بڑا کام کیا۔

☆ سرسید نے دوسرا بڑا کام تہذیب الاخلاق پرچہ کے ذریعہ معاشرتی اصلاح کا کیا۔اس میں مسلسل مضامین لکھ کر اور اہلِ قلم حضرات سے لکھوا کر ذہنی اور فکری جمود کو توڑنے کی کوشش کی۔اس کے لیے انہوں نے ایک پرچہ میں 29 نکات کا پروگرام دیا۔

☆ تیسرا کام یہ کیا کہ سرسید نے اردو ادب کو ایک رجحان اور تخلیقی ادب سے مالا مال کر دیا۔اپنے مضامین کے ذریعہ موضوع' اسلوب' فکر اور فن تمام چیزوں میں ایک بڑی تبدیلی پیدا کی۔ادب کے لیے یہ ایک بڑی خدمت ہے۔شاعری سے دلچسپی نہیں تھی البتہ نثر نگاری میں سرسید کی بڑی خدمات ہیں۔

☆ سرسید کے رفقا نے وقت کے تقاضے کو سمجھتے ہوئے اردو ادب کی اکثر اصناف میں جو جو کام کیے ہیں وہ ہمیشہ اہمیت کے حامل رہیں گے۔ الطاف حسین حالؔی کا نام سب سے نمایاں ہے۔اردو نظم کو انہوں نے ایک نئی سمت دی اور مسدس حالؔی لکھ کر قوم کو بیدار کیا۔مقدمہ شعر و شاعری کے ذریعہ اردو تنقید کی بنیاد رکھی۔سرسید، غالب اور شیخ سعدی کی سوانح عمریاں لکھیں۔

☆ شبلی نعمانی علی گڑھ کالج میں استاد تھے۔سرسید کو قریب سے دیکھنے اور ان کے کتاب خانے سے استفادے کا موقعہ ملا۔زبردست عالم تھے۔

☆ علم الکلام اور فلسفہ کے علاوہ تنقید سوانح نگاری' مضامین' مقالات' تنقید اور شاعری میں کامل دست رس تھی۔مختلف شخصیات کی متعدد سوانح عمریاں لکھیں۔سیرۃ النبی بڑی تحقیقی اور مدلل کتاب ہے۔

☆ ڈپٹی نذیر احمد ناولوں سے پہچانے جاتے ہیں۔انھیں اردو کے پہلے ناول نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔کل سات ناول لکھے۔پہلا ناول مراۃ العروس ہے۔توبۃ النصوح اور ابن الوقت اپنے نفس مضمون کی وجہ سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔

☆ نذیر احمد بڑے اچھے خطیب بھی تھے۔دہلی کی ٹکسالی اور بامحاورہ زبان لکھتے اور بولتے تھے۔قرآن پاک کا ترجمہ بھی کیا ہے۔سرسید کے دو رفقا ایسے تھے جو فکری اعتبار سے ان کی ترجمانی کر رہے تھے۔ایک محسن الملک دوسرے چراغ علی۔ان دونوں نے ادبی سے زیادہ مذہبی میدان میں کام انجام دیا ہے۔

☆ علی گڑھ تحریک نے نثر کی اصناف کو بھی فروغ بخشا۔اس نے مشرق و مغرب کے فکری سرچشموں کو ملا کر اردو ادب کو مغرب کے برابر لانے کی کوشش کی۔اس طرح سرسید نے جدید مغربی خیالات کو قبول کرنے کے لیے ذہن کو آمادہ کیا۔

☆ اردو میں کئی اصناف سے متعارف اسی تحریک نے کرایا اور پہلے سے موجود اصناف کی اصلاح کی۔اس کا تصور بالکل واضح تھا۔ابہام نام کی کوئی چیز نہ تھی۔اردو ادب کو اس نے مالا مال کر دیا۔

☆ اردو شاعری پر علی گڑھ تحریک نے جو احسان کیا ہے اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔اس تحریک کی بدولت آزؔاد اور حالؔی جیسے علماء نے اردو ادب کو نیچرل شاعری کا تحفہ عطا کیا۔اس سے قبل شاعری کے میدان میں کوئی قابل ذکر کارنامہ دکھائی نہیں دیتا۔

☆ ادب کا کون سا وہ شعبہ ہے جو اس سے متاثر نہیں ہے۔بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اردو کی بعد کی تمام تحریکیں علی گڑھ تحریک کا عکس لیے ہوئے ہیں۔

☆ سرسید کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مولوی الطاف حسین حالؔی سے ''مسدس مد و جزر اسلام'' لکھوائی۔اس نظم نے مسلم معاشرہ کی

اصلاح میں غیر معمولی کام انجام دیا۔

☆ اردو کیا کسی اور زبان کی شاید ہی کوئی ایسی تحریک ہو، جس نے ادب اور زندگی دونوں کو اتنا متاثر کیا ہو جتنا کہ علی گڑھ تحریک نے کیا۔

☆ علی گڑھ تحریک میں اصلاحی اور منطقی نقطہ نظر کو تمثیل میں بیان کرنے کا رجحان سر سید احمد خان، مولانا حالی اور محسن الملک کے ہاں نمایاں ہے۔ تاہم مولوی نذیر احمد نے اسے فن کا درجہ دیا اور تحریک کے عقلی زاویے اور فکری نظریے کے گرد جیتے جاگتے اور سوچتے ہوئے کرداروں کا جمگھٹا کھڑا کر دیا۔

☆ نظیر احمد کے علاوہ علی گڑھ تحریک سے متاثر ہو کر عبدالحلیم شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار پھر آگے مرزا ہادی رسوا نے ناول کے فن کو عروج بخشا۔

☆ موجودہ دور میں تنقیدی ادب کا مطالعہ گہرا اور وسیع ہو چکا ہے۔ اس کے مختلف دبستان قائم ہو چکے ہیں مگر شعر و ادب کے تعلق سے علی گڑھ تحریک نے جو کچھ نظریات اور خیالات دیے آج بھی اس کی اہمیت مسلم ہے۔ اور یہی کیا کم ہے کہ تنقیدی شعور کی داغ بیل اسی نے ڈالی۔ تقابلی مطالعہ کا راستہ بھی شبلی نے ''موازنہ انیس و دبیر'' لکھ کر دکھایا۔

☆ موازنہ انیس و دبیر کے جواب میں تین کتابیں ''ردالموازنہ از میر افضل علی''، ''تردید موازنہ از حسن رضا و محمد جان عروج'' اور ''المیزان از نظیر الحسن فوق''، لکھی گئیں۔ یہ کتابیں تقابلی مطالعے ہی کی ایک کڑی ہیں۔ اس کے بعد سے اردو میں تقابلی مطالعے کا رواج عام ہوا اور اس پر متعدد کتابیں منظر عام پر آئیں۔

☆ اردو نثر کی بیشتر اصناف مثلاً تاریخ نگاری، سوانح نگاری، سیرت نگاری، ناول نگاری، مضمون نگاری سب کچھ ہی سر سید تحریک کے زیر اثر پروان چڑھی۔

13.8 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
ریشہ دوانیاں	:	سازش، جوڑ توڑ
استبداد	:	ظلم و جور
مؤخر الذکر	:	آخر میں کہی گئی بات
عسکری	:	فوجی
زعم	:	غرور، تکبر
استدلال	:	دلیل، ثبوت
ثقافت	:	تہذیب، رہن سہن
استطاعت	:	طاقت، قدرت
بیرونی	:	باہری
مہلک	:	ہلاک کرنے والی

خصلت	:	عادت
حتی المقدور	:	جہاں تک ہو سکے، ممکن حد تک
فراموش کرنا	:	بھلانا
پیہم	:	مسلسل
فروغ	:	ترقی دینا
افادیت	:	فائدہ پہنچنا
تلمیحات	:	اشعار میں کسی تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کرنا
استفادہ	:	فائدہ اٹھانا
اختصار	:	مختصر کرنا
مجوزہ	:	تجویز کی ہوئی چیز
کشاکش	:	رسّہ کشی، کھینچا تانی
رفقا	:	ساتھ رہنے والے افراد
حامل	:	بوجھ اٹھانے والا، کسی چیز کو لے جانے والا

13.9 نمونہ امتحانی سوالات

13.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کس نے جاری کیا؟

2۔ ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج'' کا قیام کب عمل میں آیا؟

3۔ ''اسباب بغاوت ہند'' کا مصنف کون ہے؟

4۔ ''حیات جاوید'' اور ''حیات سعدی'' کا مصنف کون ہے؟

5۔ رسالہ ''دلگداز'' کس نے جاری کیا؟

6۔ اردو تنقید کی کون سی کتاب حالؔی نے لکھی ہے؟

7۔ شعر العجم کے مصنف کا نام بتایئے؟

8۔ سرسید کے کسی دو رفقا کے نام لکھیے۔

9۔ موازنہ انیس و دبیر کب شائع ہوئی؟

10۔ مولانا حالؔی کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

13.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ اردو ادب پر سرسید کے فکری اور عملی اثرات کا جائزہ لیجیے۔

2۔ مختلف اصناف ادب پر علی گڑھ تحریک کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ بیان کیجیے۔

3 ۔ اردو کے پہلے ناول نگار کون ہیں ان کے ناولوں کی کیا خصوصیات ہیں؟

4۔ شبلی کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

5۔ اردو ادب کو شبلی سے کیا فائدہ پہنچا' نشان دہی کیجیے۔

13.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ علی گڑھ تحریک کا پس منظر بیان کیجیے۔

2۔ سرسید کی تعلیمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

3۔ علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اردو تنقید میں کیا تبدیلی رونما ہوئی؟ تفصیل سے لکھیے۔

13.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	حیاتِ جاوید	الطاف حسین حالؔی
2۔	سید احمد خاں	خلیق احمد نظامی
3۔	سرسید اور ان کے نام ورفقا	سید عبداللہ
4۔	میر امن سے عبدالحق تک	سید عبداللہ
5۔	مطالعہ سرسید احمد خاں	عبدالحق
6۔	سرسید اور ہندوستانی مسلمان	نورالحسن نقوی
7۔	سرسید احمد خاں اوران کا عہد	ثریا حسین

اکائی 14: ترقی پسند تحریک

اکائی کے اجزا

14.0 تمہید
14.1 مقاصد
14.2 ترقی پسند تحریک کا پس منظر
14.3 ترقی پسند تحریک کا آغاز
14.4 ترقی پسند تحریک کا عروج
14.5 ترقی پسند تحریک کا زوال
14.6 ترقی پسند تحریک کے ادبی کارنامے
14.6.1 شاعری
14.6.2 افسانہ
14.6.3 ناول
14.6.4 تنقید
14.7 اکتسابی نتائج
14.8 کلیدی الفاظ
14.9 نمونہ امتحانی سوالات
14.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
14.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
14.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
14.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

14.0 تمہید

''ترقی پسند تحریک'' ادب کی سب سے مقبول تحریک ہے۔ اس تحریک نے ہندوستانی ادب بالخصوص اردو ادب پر گہرا اثر ڈالا۔ اس اکائی میں آپ یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ یہ تحریک ہندوستان میں ایک ادبی تحریک کی حیثیت سے کب رونما ہوئی۔ اس تحریک نے ادب کے مزاج اور اسلوب کا رخ کس طرح بدلا۔ یہ تحریک ادب برائے زندگی کا فلسفہ لے کر آئی تھی۔

14.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ ترقی پسند تحریک کا پس منظر بیان کر سکیں۔

☆ ترقی پسند تحریک کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈال سکیں۔

☆ ترقی پسند تحریک کے عروج وزوال سے بحث کر سکیں۔

☆ ترقی پسند تحریک کی ادبی خدمات مثلاً شاعری، افسانہ، ناول اور تنقید پر روشنی ڈال سکیں۔

14.2 ترقی پسند تحریک کا پس منظر

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جرمنی میں ہٹلر کی سرکردگی میں فاشزم کی جڑیں مضبوط ہونے لگیں۔ پورا یورپ ایک سیاسی بحران سے گزر رہا تھا۔ بین الاقوامی فضا تیزی سے تبدیل ہو رہی تھی۔ جرمنی نے ابی سینا (حبشہ) پر حملہ کر دیا تھا۔ جاپان نے چین پر حملہ کر کے اس کے شمالی علاقوں پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔ چند سامراجی طاقتیں پوری دنیا کو آپس میں بانٹ لینا چاہتی تھیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بادل ساری دنیا میں منڈلا رہے تھے۔ ہٹلر نے ملک کے اعلیٰ درجے کے فنکاروں، سائنس دانوں اور دانش وروں کو قید کر لیا تھا یا جلاوطن کر دیا تھا۔ ٹامس مان اور ارنسٹ ٹولر جیسے عظیم ادیب اور آئن سٹائن جیسے سائنس داں جلاوطن ہو کر بے سروسامانی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان ادیبوں کی پر خلاف یوروپ کے ادیبوں میں فاشزم کے خلاف غم و غصے کی لہر دوڑ رہی تھی۔ یوروپ اور امریکہ کے دانش ور متحد ہو کر انسانیت دشمن طاقتوں کے خلاف نبرد آزما تھے۔

جولائی 1935ء میں پیرس میں کلچر کے تحفظ کے لیے تمام دنیا کے ادیبوں کی ایک کانفرس بلائی گئی۔ پہلی بار دنیا کے سارے ادیب ایک تحریک کی شکل میں متحد ہوئے۔ اس کانفرس میں یہ طے کیا گیا کہ ادیب کو اپنے ذاتی خانوں سے نکل کر انسانوں کے اجتماعی مفاد اور تہذیب وثقافت کی اعلیٰ قدروں کے تحفظ کے لیے رجعت پسند قوتوں کے مقابل آنا چاہیے اور اپنے فن کو انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔

24 نومبر 1934ء میں ہندوستانی نوجوانوں کا ایک گروپ لندن یونیورسٹی کے ایک رسٹورنٹ نان کنگ کے پیچھے ایک کمرے میں جمع ہوا۔ ان ادیبوں نے ہٹلر کے فاشزم کی مخالفت کی۔ اس گروپ نے 1935ء میں ایک ادبی حلقے کی شکل اختیار کر لی۔ اس حلقے میں سجاد ظہیر تھے جنھوں نے 1932 میں اپنے ہم خیال ادیبوں احمد علی رشید جہاں اور محمود الظفر کے ساتھ مل کر کہانیوں کا ایک مجموعہ ''انگارے'' شائع کیا تھا۔ ان کہانیوں کے موضوعات اور لہجے میں ایسی تیز ابیت تھی کہ ہندوستان کے روایتی معاشرے میں اسے قبول نہیں کیا گیا اور اس کتاب کو ضبط کر لیا گیا۔ سجاد ظہیر کے علاوہ انگریزی کے ناول نگار ملک راج آنند، بنگالی کے ادیب جیوتی گھوش اور پرمود سین گپتا اور اُردو کے شاعر ڈاکٹر دین محمد تاثیر شامل تھے۔ ان لوگوں نے ایک انجمن بنائی اور اس کا نام انڈین پروگریسیو رائٹرز ایسوسی ایشن (Indian Progressive Writers Association) رکھا اور ملک راج آنند کو اس کا صدر مقرر کیا گیا۔ انجمن کے مینی فیسٹو کا مسودہ لندن ہی میں تیار ہوا۔ اس کی نقل سجاد ظہیر نے ہندوستان میں اپنے دوستوں ڈاکٹر اشرف، محمود الظفر اور ان کی اہلیہ ڈاکٹر رشید جہاں کے علاوہ احمد علی اور ہیرین مکرجی کو بھیجا۔ اس مینی فیسٹو میں جو تجاویز پیش کی گئیں تھیں وہ یہ ہیں:

(1) ہندوستان کے مختلف لسانی صوبوں میں ادیبوں کی انجمنیں قائم کرنا۔

(2) ان ادبی جماعتوں سے میل ملاپ پیدا کرنا جو اس انجمن کے مقاصد کے خلاف نہ ہوں۔

(3) ترقی پسند ادب کی تخلیق کرنا' صحت مند ادب کا ترجمہ کرنا جس سے ہم تہذیبی پسماندگی کو مٹا سکیں اور ہندوستانی آزادی اور سماجی ترقی کی طرف بڑھ سکیں۔

(4) ہندوستانی کو قومی زبان اور انڈو رومن رسم الخط کو قومی رسم الخط تسلیم کرنے کا پرچار کرنا۔

(5) فکر و نظر اور اظہار خیال کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا۔

(6) ادیبوں کے مفاد کی حفاظت کرنا۔عوامی ادیبوں کی مدد کرنا جو اپنی کتابیں طبع کرانا چاہتے ہیں۔

انجمن کے اغراض و مقاصد کو پریم چند نے اکتوبر 1935ء میں سے اپنے رسالے ''ہنس'' میں شائع کیا اور ایک اداریہ لکھا اور ان مقاصد کی حمایت کی اور لکھا ''یہ ہمارے ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہے''۔دوسری مرتبہ فروری 1936ء میں لفٹ ریویو(Left Review) لندن نے شائع کیا۔

1953ء میں سجاد ظہیر ہندوستان آئے تو انہوں نے مولوی عبدالحق' منشی پریم چند' جوش ملیح آبادی اور منشی دیا نرائن نگم سے ملاقات کی جو دسمبر 1935ء میں ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کی ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ان ادیبوں اور دانشوروں نے مینی فیسٹو کے مقاصد سے اتفاق کیا اور اس پر دستخط کیے۔

الہ آباد میں احمد علی کے علاوہ فراق گورکھپوری اور ڈاکٹر اعجاز حسین تھے۔ ہندی کے ادیب شیودان سنگھ چوہان اور نریندر شرما تھے۔احتشام حسین اور سید وقار عظیم اس وقت ایم۔اے کے طالب علم تھے۔ان سب نے سجاد ظہیر کے منصوبے کی تائید کی۔ پنڈت امرناتھ جھا' وائس چانسلر الہ آباد یونیوسٹی اور ڈاکٹر تاراچند نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔الہ آباد میں ترقی پسند ادیبوں کا ایک حلقہ بن گیا۔جس میں ہندی اور اُردو کے ادیب شامل تھے۔

علی گڑھ میں ترقی پسند مصنفین کا پہلا اجلاس 1936ء کے اوائل میں خواجہ منظور حسین کے مکان پر ہوا۔سردار جعفری' جان نثار اختر' حیات اللہ انصاری' اسرارالحق مجاز' اختر حسین رائے پوری' خواجہ احمد عباس' شاہد لطیف اور سبط حسن وغیرہ اشتراکیت میں دلچسپی رکھتے تھے۔سبط حسن ان دنوں حیدرآباد میں قاضی عبدالغفار کے اخبار ''پیام'' میں کام کر رہے تھے۔انہوں نے حیدرآباد میں اس کو منظم کیا۔ ہیرن مکرجی نے کلکتہ میں انجمن کی تشکیل کی۔ پنجاب میں محمودالظفر' رشید جہاں' فیض احمد فیض نے انجمن بنائی۔ پنجاب میں میاں افتخارالدین وفیروز الدین منصور نے بھی اس تحریک کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔ بہار میں سہیل عظیم آبادی اور اختر اورینوی نے ایک حلقہ قائم کرلیا۔اس طرح یہ تحریک سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔

14.3 ترقی پسند تحریک کا آغاز

ترقی پسند تحریک پہلی ادبی تحریک تھی جس میں مختلف زبانوں کے ادیب نظریاتی اتحاد کی وجہ سے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو رہے تھے۔اس بات کو محسوس کیا جانے لگا کہ ایک کانفرنس بلائی جائے جس میں ملک کے ادیب جمع ہو کر ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کریں اور انجمن کا ایک لائحہ عمل تیار کریں۔انجمن کا دستور مرتب کریں۔ پوری دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کے پیدا کردہ سیاسی بحران سے تہذیب و کلچر کو جو خطرات درپیش ہیں ان کے تدارک کے لیے تمام ادیب متحد ہو کر ایسی سیاسی قوتوں کا ساتھ دیں جو ترقی پسند خیالات رکھتی ہوں۔ترقی پسند ادیبوں نے پہلی کانفرنس اپریل 1936ء میں لکھنؤ میں بلائی۔استقبالیہ کمیٹی کے صدر صاحب طرز ادیب چودھری محمد علی رودلوی منتخب کیے گئے۔اس کانفرنس میں پریم چند' مولانا حسرت موہانی' جئے پرکاش نرائن' کملا دیوی چٹوپادھیائے' میاں افتخار الدین' یوسف علی مہر' اندولال یاجنک وغیرہ نے شرکت کی۔ بنگال' گجرات'

مہاراشٹرا اور مدراس کے ادیب شریک ہوئے اور اپنی زبان وادب کے مسائل پر تقریریں کیں۔اس کانفرنس کو دو چیزوں کی وجہ سے اہمیت حاصل ہے۔ایک اعلان نامہ دوسرا پریم چند کا خطبہ صدارت۔

اعلان نامہ میں کہا گیا کہ ہندوستانی مصنفین کا یہ فرض ہے کہ ملک میں جو ترقی پذیر رجحانات ابھر رہے ہیں ان کی ترجمانی کریں اور ان کی نشو ونما میں حصہ لیں۔بے بنیاد روحانیت اور تصور پرستی چھوڑ کر عقلیت کو اختیار کریں۔ادبیات اور دیگر فنونِ لطیفہ کو قدامت پرستوں سے نجات دلا کر عوام کے دکھ سکھ اور جدو جہد کا ترجمان بنائیں۔نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل بھوک' افلاس' سماجی پستی اور غلامی کو موضوع بنائے۔انجمن کے مقاصد یہ ہوں گے:

1. تمام ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین کی امداد سے مشاورتی جلسے منعقد کرنا اور لٹریچر شائع کر کے اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنا۔
2. ترقی پسند مضامین لکھنے اور ترجمہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور رجعت پسند رجحانات کے خلاف جدو جہد کی کوشش کرنا۔
3. ترقی پذیر مصنفین کی مدد کرنا۔
4. آزادئ رائے اور آزادئ خیال کی حفاظت کی کوشش کرنا۔

پریم چند نے خطبۂ صدارت میں کہا:

''ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے......ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔ ابھی تک کا معیار امیرانہ اور عیش پرورانہ تھا۔ ہمارا آرٹسٹ امرا کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا انہیں کی قدردانی پر اس کی ہستی قائم تھی......

ہمارا آرٹ شبابیات کا شیدائی ہے اور نہیں جانتا کہ شباب سینے پر ہاتھ رکھ کر شعر پڑھنے اور صنف نازک کی کج ادائیوں کے شکوے کرنے یا اس کی خود پسندیوں اور چونچلوں پر سر دھننے میں نہیں ہے۔شباب نام ہے آئیڈیل کا' ہمت کا' مشکل پسندی کا' قربانی کا...

پریم چند نے اس یادگار جملے پر اپنے خطبے کو ختم کیا:

''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو' آزادی کا جذبہ ہو' حسن کا جوہر ہو' تعمیر کی روح ہو' زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے' سلائے نہیں کیوں کہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی''

اس کانفرنس میں مولانا حسرت موہانی نے بھی تقریر کی۔انہوں نے کہا ''محض ترقی پسندی کافی نہیں ہے' جدید ادب کو سوشلزم اور کمیونزم کی بھی تلقین کرنی چاہیے اور انقلابی ہونا چاہیے۔اسلام اور کمیونزم میں کوئی تضاد نہیں ہے۔اسلام کا جمہوری نصب العین اس کا متقاضی ہے کہ ساری دنیا میں مسلمان اشتراکی نظام قائم کرنے کی کوشش کریں......

پرانی باتوں سے کام نہیں چلے گا۔وہ محض دل بہلانے کی چیزیں ہیں۔شاعری کے معاملے میں آپ کو میری تقلید کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ میں خود اس قسم کے نئے ترقی پسند ادب کی تخلیق میں آپ کی پوری مدد کروں گا۔(سجاد ظہیر ''روشنائی'' ص112)

اس کانفرنس میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا دستور اساسی پیش کیا گیا جو بالاتفاق منظور ہوا۔اس دستور کا مسودہ سجاد ظہیر' ڈاکٹر عبدالعلیم اور محمود الظفر نے مل کر تیار کیا۔اس کانفرنس میں سجاد ظہیر کو کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنرل سکریٹری چنا گیا۔لکھنؤ کی کل ہند کانفرنس کے پورے ملک میں چرچے ہونے لگے۔پریم چند نے اپنے خطبۂ صدارت کا ہندی میں ترجمہ کیا اور رسالہ ہنس جولائی 1936ء میں شائع کیا۔پریم چند جہاں بھی

جاتے اس تحریک کا ضرور تذکرہ کرتے۔ دہلی میں اختر حسین رائے پوری نے انجمن کی شاخ قائم کی۔ ڈاکٹر عابد حسین نے تحریک کی سرپرستی کی۔ شاہد احمد دہلوی نے انجمن کے مقاصد کے لیے ایک علحدہ ماہنامہ ''شاہ جہاں'' جاری کیا۔ کانپور میں انجمن قائم ہوئی اور مولانا حسرت موہانی کو صدر منتخب کیا گیا۔ لکھنؤ اور حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن سے متاثر ہو کر نوجوان اس کے قریب آنے لگے۔ سجاد ظہیر اور ڈاکٹر اشرف نے لاہور کا سفر کیا اور وہاں علامہ اقبال سے ملاقات کی۔ اس تحریک کے مقاصد پیش کیے۔ علامہ اقبال نے ہمت افزائی کی اور کہا:

''ظاہر ہے کہ مجھے ترقی پسند ادب یا سوشلزم کی تحریک کے ساتھ ہمدردی ہے' آپ لوگ مجھ سے ملتے رہیں''

(روشنائی' سجاد ظہیر ص170)

ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادیب بھی انجمنیں قائم کرنے لگے۔ اس طرح یہ تحریک ہندوستان گیر حیثیت اختیار کرنے لگی۔

1937ء میں اُردو اور ہندی کے ترقی پسند ادیبوں نے الہ آباد میں ایک کانفرنس کی۔ مجلس صدارت میں آچاریہ نریندر دیو' پنڈت رام نریش ترپاٹھی اور مولوی عبدالحق شامل تھے۔ مولوی عبدالحق اس کانفرنس میں شرکت نہ کرسکے لیکن اپنا خطبۂ صدارت بھیج دیا۔ انہوں نے ترقی پسندوں کی حوصلہ افزائی کی۔

الہ آباد میں 1938ء میں پھر ایک کانفرنس بلائی گئی۔ مجلس صدارت کے لیے جوش ملیح آبادی' آنند نرائن ملا اور ہندی کے مشہور شاعر سمترا نندن پنت کا نام منتخب کیا گیا۔ اس کانفرنس میں پنڈت نہرو نے تقریر کی۔ انہوں نے کہا:

''ادیب کی پہنچ جہاں ہوتی ہے وہاں سیاست داں کی نہیں۔ اس کے پاس عام لوگوں کی زبان ہوتی ہے' اس سے مدد لے کر وہ خیالی دنیا اور موجودہ دنیا کے درمیان ایک پُل بناتا ہے جس پر ہو کر عام لوگوں کے دماغ خیالی دنیا تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر واقعی پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں............

آنے والے انقلاب کے لیے ملک کو تیار کرنا' اس کی ذمہ داری ادیب پر ہوتی ہے۔ آپ لوگوں کے مسئلوں کو حل کیجیے' ان کو راستہ بتائیے لیکن آپ کی بات آرٹ کے ذریعہ ہونی چاہیے نہ کہ منطق کے ذریعے۔ آپ کی بات ان کے دل میں اتر جانی چاہیے۔ ہندوستان میں ادیبوں نے بڑا اثر کیا ہے مثلاً بنگال میں ٹیگور نے لیکن ابھی تک ایسے ادیب کم پیدا ہوئے جو ملک کو زیادہ آگے لے جاسکیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتا ہے اور اس سے ہمیں بڑی امیدیں ہیں۔ (نیا ادب جنوری/فروری 1941)

الہ آباد کی اس کانفرنس میں ٹیگور نے جو پیغام بھیجا اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اپنے پیغام کے آخر میں انہوں نے لکھا۔

''یاد رکھو تخلیق ادب بڑے جوکھوں کا کام ہے۔ حق اور جمال کی تلاش کرنا ہے تو پہلے 'انا' کی کینچلی اتارو' کلی کی طرح سخت ڈنٹھل سے باہر نکلنے کی منزل طے کرو پھر دیکھو کہ ہوا کتنی صاف ہے' روشنی کتنی سہانی ہے اور پانی کتنا لطیف ہے۔''

(نیا ادب جنوری/فروری 1940)

14.4 ترقی پسند تحریک کا عروج

دسمبر 1938ء کے آخری ہفتے ہیں ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل ہند کانفرنس کلکتہ میں ہوئی۔ اس کی صدارت ملک راج آنند نے کی۔ اس

کانفرنس میں بنگالی زبان کے کئی اہم ادیب وشاعر شریک ہوئے۔اُردو، بنگالی، گجراتی، مراٹھی اور تامل ادب کے رجحانات پر تقریریں ہوئیں۔ڈاکٹر عبدالعلیم کو اس کانفرنس میں کل ہند انجمن کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔

دو ڈھائی سال کے اندر ترقی پسند ادیبوں کی تحریک تمام ہندوستانی زبانوں میں مقبول ہوگئی۔اقبال، ٹیگور، پریم چند، عبدالحق، جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو، آچاریہ نریندر دیو اور جے پرکاش نرائن جیسے دانشوروں نے ترقی پسندوں کی حوصلہ افزائی کی۔ہندوستان بھر کے نوجوان اس رجحان سے متاثر ہو رہے تھے۔بنگالی زبان کے مشہور رسالے ''پرچے'' نے ترقی پسند ادیبوں کے مضامین اور نظموں کو اہتمام سے شائع کرنا شروع کیا۔ حیات اللہ انصاری جو کانگریس کے ترجمان ''ہندوستان'' کے ایڈیٹر تھے۔انہوں نے ترقی پسند ادیبوں وشاعروں کی تخلیقات کو شائع کیا۔ترقی پسندوں نے خود اپنا رسالہ ''نیا ادب''، لکھنؤ سے جاری کیا۔مجلس ادارت میں سبط حسن، علی سردار جعفری اور مجاز شامل تھے۔''نیا ادب'' بے حد مقبول ہوا۔اس کی مقبولیت سے حوصلہ پا کر نوجوان ادیبوں نے اپنا ایک اشاعتی ادارہ امدادِ باہمی کے اصولوں پر ''حلقہ ادب'' کے نام سے قائم کیا۔جس کے تحت سجاد ظہیر کی ''لندن کی ایک رات'' (ناول) حیات اللہ انصاری کی کہانیوں کا مجموعہ ''انوکھی مصیبت'' مجاز کا مجموعہ کلام'' آہنگ'' اور سردار جعفری کے افسانوں کا مجموعہ ''منزل'' شائع کیے گئے۔جوش ملیح آبادی اپنا رسالہ ''کلیم'' بند کر کے نیا ادب کے ادارے میں شامل ہوگئے۔''نیا ادب'' عروج پر تھا۔ملک راج آنند، ڈاکٹر عبدالعلیم اور احمد علی کی ادارت میں انگریزی ماہنامہ انڈین لٹریچر شائع کیا گیا۔بنگالی زبان کا ''پرچھوٹیا'' اور ''پرگتی'' مراٹھی کا ''چترا'' ہندی کا ''روپاب'' اور ''وپلو'' بھی مقبولیت حاصل کرنے لگے۔ہندوستان کی ساری زبانوں میں ترقی پسند مصنفین کی تحریریں مقبول ہونے لگیں۔

تیسری کل ہند کانفرنس:

ترقی پسند مصنفین کی تیسری کل ہند کانفرنس مئی 1942ء میں دہلی میں منعقد ہوئی۔دوسری جنگ عظیم کا خطرہ سر پر تھا۔بین الاقوامی سیاسی حالات بہت ہی نازک موڑ پر آ گئے تھے۔ترقی پسند ادیب فاشزم کے خلاف اور جمہوریت کی تائید میں پہلے ہی آواز اٹھا چکے تھے۔اس کانفرنس میں وہ ادیب بھی شریک ہوئے جو ترقی پسند تحریک سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔خاص طور پر حلقہ اربابِ ذوق جو ترقی پسند ادب کی تحریروں کو پروپگنڈہ کہتا تھا اور جو اشاریت وہیئت پرستی سے متاثر تھے وہ بھی شریک ہوئے۔اس میں سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، کرشن چندر، مجاز، سردار جعفری، سبط حسن اور رشید جہاں ایک طرف تھے تو دوسری طرف راشد، میراجی، مولانا صلاح الدین احمد مدیر ''ادبی دنیا'' اور قیوم نظر وغیرہ تھے۔ان کے علاوہ مولانا عبدالمجید سالک اور حفیظ جالندھری اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔اس میں ترقی پسند ادیبوں نے قرارداد پیش کی کہ وہ فاشزم کے مخالف ہیں اور اتحادی اقوام کے ساتھ ہیں، لیکن ساتھ ہی برطانوی سامراج کے اس رویے کی مذمت بھی کی کہ وہ ان نازک حالات میں بھی ہندوستان کو آزادی دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

ایک طرف تو ترقی پسند تحریک کو سراہا گیا لیکن چار پانچ سال میں نوجوان ادیبوں نے جس طرح کا ادب تخلیق کیا انہیں دیکھ کر ترقی پسند ادیبوں کے خلاف غلط فہمیاں پھیلنے لگیں۔اس وقت اُردو ادب میں کئی میلانات تھے کچھ لوگ مقصدیت کے حامی تھے۔کچھ جدید ادبی تحریکوں سے متاثر تھے مثلاً اشاریت اور اظہاریت، فرائڈ، بودلیر، ملارمے وغیرہ کے نظریات انہیں اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔افسانوں میں تحلیل نفسی، لاشعوری کیفیات کا رجحان، شاعری میں ابہام، نئی ہیئت کی تلاش کا رجحان پرورش پانے لگا۔شاعری میں ہیئت کے تجربے کیے جانے لگے جس کے نتیجے میں ترقی پسندی ایک مبہم اصطلاح بن گئی تھی۔

ترقی پسند ادب کے خلاف مضامین اوراس کے جواب میں وضاحت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔نواب جعفرعلی خاں اثرلکھنوی، رشید احمد صدیقی نے ترقی پسند ادب کے خلاف اعتراضات کیے۔رشید احمد صدیقی نے انقلابی شاعری میں تخریبی رجحانات، نعرہ بازی پر اور فحاشی وعریاں نویسی پر سخت اعتراضات کیے۔رشید احمد صدیقی نے ترقی پسند ادب کی تاریخ میں اہم رول ادا کیا جو رجحانات خلط ملط ہو رہے تھے انہیں پہچانا گیا۔ترقی پسند اور غیر ترقی پسند میں تمیز کی جانے لگی۔ترقی پسند ادب اور نیا ادب یا جدید ادب کو الگ الگ دیکھا جانے لگا۔رشید احمد صدیقی اور اثر لکھنوی وغیرہ کے مضامین کے جوابات احتشام حسین، سجاد ظہیر، علی جواد زیدی وغیرہ نے دیے۔ترقی پسند تحریک کے بارے میں دوسری بحث اس وقت شروع ہوئی جب ماہر القادری نے ''اُردو اصلاح ادب کانفرنس'' منعقد کی۔اس کانفرنس میں بلینک ورس کی مخالفت کی گئی۔آزاد نظم کے شاعروں کی پیروڈی کی گئی۔آزاد نظم کے خلاف مضامین لکھوائے گئے۔عندلیب شادانی مسعود حسن رضوی اور نیاز فتح پوری نے آزاد نظم کو اُردو شاعری کے مزاج کے خلاف بتایا۔محمد حسن عسکری نے آزاد نظم کی پیروڈی کی سخت مذمت کی۔ڈاکٹر عبدالعلیم نے بھی ایک تفصیلی مضمون تین قسطوں میں ''ترقی پسند ادب کے بارے میں چند غلط فہمیاں'' لکھا۔انہوں نے بڑے مدلل انداز میں لکھا کہ آزاد نظم اُردو مزاج کے خلاف نہیں ہے۔انہوں نے آزاد نظم نگاروں کے یہاں ابہام اور فراریت کے جو رجحانات تھے ان کا بھی تجزیہ کیا۔انہوں نے یہ بھی وضاحت کی کہ ہیت اور اسلوب کے سلسلے میں ترقی پسندوں کا رویہ کیا ہونا چاہیے۔انہوں نے لکھا کہ انہیں ایسا اسلوب اختیار کرنا چاہیے جو حال اور مستقبل کی ضروریات کو پورا کرسکے۔

جن دنوں یہ مباحث چل رہے تھے حیدرآباد میں کل ہند اُردو کانگریس کا اجلاس ہوا۔جس میں سجاد ظہیر کو ترقی پسند تحریک پر مقالہ پڑھنے کے لیے مدعو کیا گیا۔اس مقالے میں سجاد ظہیر نے غلط فہمیوں کا انسداد کرنے کی کوشش کی اور ترقی پسند تحریک کی پالیسی بھی واضح کی۔

1944-43ء میں قحط بنگال کا اہم واقعہ ہوا۔ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے ادیبوں وشاعروں نے اسے موضوع بنا کر ظلم اور بہیمیت کے خلاف سخت احتجاج کیا۔

اکتوبر 1945ء میں ترقی پسند اُردو مصنفین نے حیدرآباد میں ایک کانفرنس بلائی چوں کہ اُردو زبان اور ادب کے مسائل پر تفصیلی مباحث کا موقع نہیں مل رہا تھا اس لیے یہ کانفرنس منعقد کی گئی۔یہ کانفرنس پانچ دن تک چلتی رہی۔اس میں اُردو کے تقریباً تمام اہم ادیب موجود تھے۔اس کا افتتاح سروجنی نائیڈو نے کیا۔ڈاکٹر تاراچند نے اُردو ہندی کے اجلاس کی صدارت کی۔فراق گورکھپوری نے شاعری کے اجلاس کی، قاضی عبدالغفار نے صحافت کے اجلاس کی، احتشام حسین نے تنقید کے اجلاس کی اور مولانا حسرت موہانی نے عام اجلاس کی صدارت کی۔اس کانفرنس کے متعلق کرشن چندر نے ایک دلچسپ رپورتاژ ''پودے'' لکھا۔

اس کانفرنس کی اہم قرارداد ڈاکٹر عبدالعلیم نے فحاشی کے خلاف پیش کی۔اس قرارداد میں کہا گیا کہ اُردو ادب میں جو فحاشی کے رجحانات پرورش پارہے ہیں اس کا ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند ادب کے نظریے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ترقی پسند ادیب فحاشی کے خلاف ہیں اوراس کے اظہار کو ادب کے لیے غیر صحت مند اور مضر سمجھتے ہیں۔اس تجویز کی قاضی عبدالغفار نے مخالفت کی اور کہا ہمیں اس قسم کی کوئی تجویز پاس کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ کسی قسم کے سخت احتساب کی ضرورت ہے۔جنسی موضوعات پر بھی ادب کی تخلیق ہوسکتی ہے۔بشرط یہ کہ لکھنے والے کا زاویہ نگاہ تعمیری اور ترقی پسندانہ ہو۔جنس بھی ہمارے سماج کے اہم مسائل میں ہے۔اس تجویز سے غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے کہ ترقی پسند نوجوان اس موضوع اور زندگی کے اس پہلو کو خارج سمجھ کر اس سے قطع تعلق کرلیں۔اس قرارداد کی سب سے زیادہ مخالفت مولانا حسرت موہانی نے کی۔انہوں نے کہا کہ

''ادبی تخلیقات میں لطیف ہوس نا کی کا اظہار'' کوئی مضائقہ نہیں'' اس پر قرارداد مسترد ہو گئی۔

تقسیم ہند کے بعد ترقی پسند ادیبوں نے دسمبر 1947ء میں لکھنؤ میں ایک کانفرنس منعقد کی۔ تین دن تک مختلف اجلاس ہوئے اور ایک شاندار مشاعرہ بھی ہوا۔ کانفرنس کے افتتاح کے لیے مولانا آزاد کو مدعو کیا گیا لیکن وہ کسی وجہ سے شرکت نہ کر سکے۔ افتتاح کی رسم ڈاکٹر سید محمود نے ادا کی۔ عام جلسے کی صدارت قاضی عبدالغفار نے کی' مجلس مقالات کی صدارت رشید احمد صدیقی نے کی۔ ایک اجلاس خاص طور پر زبان کے مسئلے پر کیا گیا جس کی صدارت نیاز فتح پوری نے کی۔ مشاعرے کی صدارت حضرت اثر لکھنوی نے کی۔ انجمن کا تنظیمی جلسہ بھی ہوا جس میں یہ طے ہوا کہ ایک مرکزی دفتر بمبئی میں باقاعدہ قائم کیا جائے اور سردار جعفری کو عارضی طور پر جنرل سکریٹری بنایا جائے۔

مئی 1949ء میں ترقی پسند ادیبوں نے پانچویں کل ہند کانفرنس بھیمڑی میں منعقد کی۔ اس کانفرنس کے بعد ترقی پسند مصنفین کی تحریک میں ایک نیا موڑ آیا۔ کیوں کہ 1936ء کے مینی فیسٹو کو ناکافی سمجھ کر ایک نیا مینی فیسٹو منظور کیا گیا۔ اس زمانے میں تلنگانہ اور بنگال کی عوامی تحریکوں اور حکومت کی سیاسی پالیسی کی وجہ سے بہت سے ترقی پسند ادیب قید تھے جو جیل سے باہر تھے' وہ کشمکش میں تھے کہ حکومت کا ساتھ دینا چاہیے یا نہیں۔ سب سے اہم مسئلہ تیسری جنگ عظیم کا خطرہ تھا۔ ترقی پسند علی الاعلان امن پسند طاقتوں کا ساتھ دینے اور سرمایہ دارانہ مفاد کی خاطر دنیا کو جنگ کے جہنم میں جھونکنے والی طاقتوں سے کنارہ کشی کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ نئے منشور میں ان تمام مسائل کا احاطہ کیا گیا۔

نئے منشور میں کہا گیا کہ آج ترقی پسند اور رجعت پسند ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہیں۔ اس میں وہ جدوجہد صاف دکھائی دے رہی ہے جو ہندوستان کے عوام جمہوریت اور اشتراکیت کے لیے کر رہے ہیں۔

حکومت ہند کے اس فیصلے کی مخالفت کی گئی جس میں حکومت نے برطانوی کامن ویلتھ میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مطالبہ کیا گیا کہ ہندوستان کو آزاد خودمختار اور عوامی جمہوریت قائم کرنا چاہیے۔

سرمایہ دار ممالک امریکہ اور برطانیہ' سوویت یونین' پوربی یورپ کی عوامی جمہوریتوں اور ایشیا کے عوام کی جدوجہد کے خلاف جھوٹی خبریں پھیلا رہے ہیں۔

ہندوستان کا سرمایہ دار طبقہ مزدوروں' کسانوں' فن کاروں پر ظلم ڈھا رہا ہے اور حکومت ان کے ساتھ ہے۔ مزدوروں' کسانوں اور متوسط طبقے کی جدوجہد کو دبانے کی بھرپور کوشش کی جا رہی ہے۔ حکومت جمہوری اخباروں اور رسالوں کو بند کر رہی ہے۔

سوویت یونین کی تعریف کی گئی جہاں اشتراکی سماج میں سرمایہ داروں کی آزادی ختم کی جا چکی ہے کہ وہ عوام کو دبا سکیں اس لیے وہاں جمہوریت پسندوں کو پوری آزادی ہے۔ سوویت یونین کا ادب اس وقت دنیا بھر کے ترقی پسندوں کی رہنمائی کرتا ہے۔

ترقی پسند ادیبوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ عوام کے قریب آئیں۔ اعلیٰ سماجی مقصد کے بغیر ادب عظیم نہیں ہو سکتا۔ ادیبوں کو اپنی تحریروں میں سنجیدگی اختیار کرنے کے لیے کہا گیا۔ عوامی ادب اور کلچر کا مستقبل ترقی پسندوں کے ہاتھوں میں ہے اس کا یقین دلایا گیا۔ ترقی پسند ادیبوں سے کہا گیا کہ وہ عوام سے رشتہ جوڑیں۔ مزدوروں اور کسانوں کی زندگی اور جدوجہد کی عکاسی کریں۔ رومانوی اور رجعت پرست ادیبوں کے نظریے اور عمل کے ساتھ سمجھوتہ بازی سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا۔ اس کانفرنس میں ہندی کے مشہور نقاد رام بلاس شرما کو کل ہند انجمن کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔

نئے منشور کی اشاعت کے بعد سردار جعفری نے ایسے شاعروں سے بیزاری کا اظہار کیا جو رمزیت اور تغزل کے قائل تھے۔ انہوں نے فیض

احمد فیض کی نظم ''یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر'' پر اعتراض کیا۔ سردار جعفری نے فیض اور جذبی پر اعتراض کیا اور کیفی اعظمی و جان نثار اختر کو ترقی پسند قرار دیا۔ اس منشور اور سردار جعفری کے رویّے سے لکھنے والے تذبذب کا شکار ہو گئے۔

نقوش، ماہِ نو، آج کل اور نیا دور جیسے ادبی رسائل کا بائیکاٹ کیا گیا۔ بعض ادیبوں نے اس زمانے میں لکھنا چھوڑ دیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد ترقی پسند تحریک کے ترجمان ''شاہراہ'' کا تنزل شروع ہو گیا۔ ترقی پسندوں میں ''ادبی جمود'' پر بحث ہونے لگی۔

14.5 ترقی پسند تحریک کا زوال

مارچ 1952ء میں ترقی پسند ادیبوں نے دہلی میں ایک کانفرنس منعقد کی۔ خوب مباحث ہوئے اور ایک نیا منشور منظور کیا گیا۔ اس میں کہا گیا کہ:

> ''ہندوستان کے لوگ چاہتے ہیں کہ ان کا ادب اور آرٹ ان کی قومی روایات کے مطابق ترقی کرے۔ ہمارے عوام کی خواہش ہے کہ ایک آزاد اور خوش حال زندگی انہیں حاصل ہو۔ وہ چاہتے ہیں کہ دنیا کی تمام قوموں کے ساتھ دوستی اور برادرانہ امن قائم رکھیں۔ ہمارا ادب انسان دوستی کے جذبے کا، زندگی پر یقین اور اعتماد کا روشن مستقبل کی امیدوں کا علم بردار ہو۔ بے مقصد زندگی، شکست پسندی، فنا پسندی اور جبر پرستی ایسے رجحانات ہیں جو ہماری تہذیب کی ترقی میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ ہم اس ادب کے مخالف ہیں جو عریانی، فحاشی، دہشت پسندی اور غارت گری پھیلاتا ہے۔ ہمارا ادب فنی اعتبار سے خوب صورت ہونا چاہیے۔ قومی اور عام پسند ہونا چاہیے اور ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک کی تمام زبانوں میں ادب کے پھلنے پھولنے کے لیے تمام سہولتیں دی جائیں۔

اس کانفرنس میں کرشن چندر کو کل ہند انجمن کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔

بہت سے ادیب اس تحریک سے بدظن ہو گئے کیوں کہ انتہا پسند ادیبوں نے تحفظِ ذہنی کا مظاہرہ کیا تھا۔ کرشن چندر نے تنظیم میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ ان کی حیثیت ایک تجارتی ادیب کی ہوتی جا رہی تھی۔ شعرا بین الاقوامی مسائل پر نظمیں لکھنا چھوڑ کر غزل گوئی کی طرف راغب ہو گئے۔ مختلف شہروں سے تنظیمیں ختم ہونے لگیں۔ اسی دوران سجاد ظہیر راول پنڈی سازش کیس سے رہا ہو کر مستقل طور پر ہندوستان واپس آ گئے۔ انہیں انجمن کو پھر سے سرگرم کرنے پر آمادہ کیا گیا۔ مارچ 1956ء میں مئو (ضلع اعظم گڑھ) میں ترقی پسند ادیب جمع ہوئے۔ یہ طے کیا گیا کہ احتشام حسین سارے ادیبوں سے خط و کتابت کر کے یہ مسئلہ طے کریں کہ کیا اُردو کی ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی الگ ضرورت ہے؟ انجمن کا نام ترقی پسند مصنفین ہی رہے یا تبدیل کر دیا جائے؟

مئی 1956ء میں حیدرآباد میں کل ہند کانفرنس ہوئی۔ بہت سے ترقی پسند مصنفین نے اس میں شرکت کی۔ مباحث ہوئے اور تحریک کے بانیوں سجاد ظہیر او ڈاکٹر عبدالعلیم نے اس خیال کا اظہار کیا کہ موجودہ حالات میں ادیبوں کے تقاضے بدل گئے ہیں اور چوں کہ ترقی پسند نظریہ ادب اب اتنا عام ہو چکا ہے کہ اس کی تشریح یا اس کے پرچار کی ضرورت نہیں رہی بلکہ اس دور میں کم و بیش ہر ادیب اسے تسلیم کرنے لگا ہے۔

ڈاکٹر عبدالعلیم نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

> ''میرا اپنا خیال ہے کہ برا یا بھلا جو بھی کام کرنا تھا انجمن کر چکی۔ اب اس تنظیم پر توجہ دینے کے بجائے ایک کل ہند اُردو

ادیبوں کی انجمن بنائی جائے۔ بلا لحاظ اس کے اراکین کے معاشی، سیاسی یا مذہبی نظریے کچھ بھی ہوں ہمارے پاس صرف ایک معیار ہواور وہ یہ کہ ہر رکن لکھنے والا ہو۔ لکھنے والوں میں بھی ہم کوئی معیار یا سطح مقرر نہیں کر سکتے۔ ہر شخص کو رکن بننے کا حق ہونا چاہیے......

پہلے میری رائے تھی کہ انجمن کو دوبارہ منظّم کرنا چاہیے۔ مرکز اور شاخوں میں ربط پیدا کر کے اسے باعمل بنانا چاہیے لیکن اب میں اس رائے پر قائم نہیں ہوں۔ اس کو بدلنے کے لیے تیار ہوں۔

......آج ہند کی تعمیر جمہوریت اور اشتراکیت کی بنیادوں پر قائم ہو رہی ہے جس پر عظیم اکثریت کو اتفاق ہے۔ اس نظام کو قائم کرنے کے لیے سارا ہندوستان کوشاں ہے۔ ترقی پسند مصنفین کی بنیاد یہ تھی کہ ہم آزادی حاصل کریں اور انگریز سامراج کو ہندوستان سے باہر نکالنے کی جدوجہد میں ادبی جنگ کریں۔ آج ہمارے پاس متحد ہونے کے لیے دوسری بنیاد اتحاد موجود ہے۔ ان بنیادوں پر آج تمام لکھنے والوں کو متحد کیا جا سکتا ہے۔

ہماری تنظیم کوئی سیاسی تنظیم نہیں ہوگی۔ ہمارا مقصد ادب کے ذریعہ اپنے خیالات کی ترویج ہے......''

اس طرح ترقی پسند مصنفین کی تحریک انجام کو پہنچی۔ 1936ء سے 1956ء تک اس تحریک نے ایک اہم رول ادا کیا۔

14.6 ترقی پسند تحریک کے ادبی کارنامے

14.6.1 شاعری:

ترقی پسند شاعروں نے اختر شیرانی کی رومانیت اور جوش ملیح آبادی کی انقلابی شاعری سے متاثر ہو کر شاعری کی۔ ان کے یہاں بغاوت اور دہشت انگیزی کے ساتھ ساتھ ملک کی آزادی کا جذبہ بھی ملتا ہے۔ وہ انقلاب کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار تھے۔ شمیم کرہانی، شہاب ملیح آبادی، وقار انبالوی وغیرہ نے جذباتی شاعری کی جو اس دور کے نوجوانوں میں بے حد مقبول ہوئی۔ شمیم کرہانی کی نظم ''قومی سپاہی کا گیت''، ''جوان جذبے'' میں شدید وطنی جذبہ ہے۔ شہاب ملیح آبادی کی نظم ''ہٹو آتا ہے مرد انقلابی'' بھی اسی جذبے کا اظہار کرتی ہے۔ ترقی پسند شاعروں نے انقلاب اور آزادی کو ہی اپنا محبوب قرار دیا تھا۔ ان کے انقلاب کا تصور رومانی تھا۔ وہ اکثر نظمیں اپنی محبوب کو مخاطب کر کے لکھتے تھے۔ اس سے معذرت کرتے تھے کہ ان کے پاس محبت سے زیادہ اہم کام ہیں۔ اس لیے وہ محبت کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ سردار جعفری کی ''انتظار نہ کر''، علی جواد زیدی کی نظم ''میری راہ میں''، ایسی نظمیں ہیں جن میں شاعر اپنی محبوبہ سے کہتا ہے کہ وہ ان سنگین مسائل کو سمجھ نہیں سکتی اور نہ اس کا نازک حسن ان حالات میں ساتھ دینے کا متحمل ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد شاعروں نے اپنے محبوب کو بغاوت اور انقلاب کی تلقین کرنی شروع کر دی۔ سلام مچھلی شہری نظم ''شرائط'' میں کہتے ہیں:

اٹھا کے ہاتھ کہے انقلاب زندہ باد
لہو سے مثل دلہن مہندیاں رچائے ہوئے

مجاز کی نظم ''نوجوان خاتون سے خطاب'' کا یہ شعر بے حد مشہور ہوا

تیرے ماتھے کا یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

ان تمام نظموں میں انقلاب کا ایک معصوم تصور ملتا ہے۔عنفوان شباب کا جوش بھی ہے۔

ترقی پسند شاعروں نے فرسودہ نظام کو ختم کر کے ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کے بھی خواب دیکھے۔ان کے یہاں ایک جذباتی ہیجان، غصہ اور انتقام کی آگ بھڑکتی نظر آتی ہے۔

مجاز کی نظم ''انقلاب''میں یہ جذبہ عروج پر نظر آتا ہے۔

جھونپڑوں میں خوں، محل میں خوں، شبستانوں میں خوں

دشت میں خوں، وادیوں میں خوں، بیابانوں میں خوں

جاں نثار اختر نظم ''ساقی''میں کہتے ہیں:

جو ممکن ہو تو، تو بھی آج رنگیں جام کے بدلے

لہو کے رنگ میں ڈوبا ہوا پرچم اٹھا ساقی

سردار جعفری کی ایک نظم ''جوانی'' کا شعر ہے:

مرے ہونٹوں پہ نغمے کانپتے ہیں دل کے تاروں کے

میں ہولی کھیلتا ہوں خون سے سرمایہ داروں کے

جذبی کی نظم ''دعوت جنگ''۔مخدوم کی نظم ''موت کا گیت'' اور ''مشرق'' ایسی ہی نظمیں ہیں۔اس طرح کی نظموں کے سلسلے پر سجاد ظہیر نے بروقت روک لگائی۔انہوں نے لکھا ''نوجوانوں سے خطاب، طالب علموں سے خطاب، سپاہی سے خطاب، مزدوروں سے خطاب اور کسانوں سے خطاب اب بند ہونا چاہیے۔اگر آپ کو کچھ لکھنا ہے تو آپ ملاّ پن چھوڑیے، لوگ آپ کا بھی مذاق اڑانے لگیں گے جبر تو یہ ہے کہ آپ کسی کو مخاطب نہ کیجیے۔زمانے پر نظر ڈالیے، حالات کو سمجھیے اور جو کہنا ہو کہہ ڈالیے۔''

سجاد ظہیر کی اس تنقید کے بعد بہت سے شاعر سنبھل گئے۔بعض نے اسی روش کو جاری رکھا۔آگے چل کر جن شاعروں کو استحکام حاصل ہوا ان میں مجاز، مخدوم، فیض، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری وغیرہ شامل ہیں۔سلام مچھلی شہری، علی جواد زیدی، مسعود اختر جمال، شہاب ملیح آبادی، شمیم کرہانی کی شہرت ان کا دور گزرنے کے بعد ختم ہوگئی۔

اسرار الحق مجاز نے ترقی پسند شعرا میں سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔عزیز احمد نے مجاز کی شاعری کو انقلاب اور تغزل کا حسین امتزاج قرار دیا۔مجاز کی رومانی نظموں میں ''طفلی کے خواب''، نذر دل، ان کا جشنِ سالگرہ، نورا، کس سے محبت ہے ''ایک غمگین یاد''۔''آج کی رات'' شامل ہیں۔خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں ''مجاز کی غنائیت میں چشمے کی روانی، شادابی اور عنفوان شباب کی وارفتگی اور والہانہ پن ملتا ہے''۔مجاز کی انقلابی شاعری میں رومانیت نے خاص دل کشی پیدا کی۔''آوارہ، اندھیری رات کا مسافر''۔''رات اور ریل''۔''نذر خالدہ''۔''ایک جلاوطن کی واپسی''۔''نوجوان خاتون سے''۔''خواب سحر'' اور ''آہنگ نو'' انقلابی نظمیں ہیں۔مجاز کی انقلابی شاعری کے بارے میں فیض نے لکھا مجاز انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں انقلاب کا مطرب ہے، اس کے نغمہ میں برسات کے دن کی سی سکون بخش خنکی اور بہار کی رات کی سی گرم جوش تاثیر آفرینی ہے۔''

فیض احمد فیض کا پہلا مجموعۂ کلام ''نقش فریادی'' ہے جس کے بارے میں ن۔م۔راشد نے لکھا تھا ''یہ ایک ایسے شاعر کی نظموں اور غزلوں

کا مجموعہ ہے جو رومان اور حقیقت کے سنگم پر کھڑا ہے''۔فیض کی رومانی نظموں میں' آخری خط' سر دِ شبانہ' تہ نجوم شامل ہیں۔مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ' رقیب سے' تنہائی' موضوعِ سخن' بول کے لب آزاد ہیں تیرے' میں انہوں نے اُردو شاعری کو ایک نئے آہنگ سے آشنا کیا۔فیض بلند بانگ شاعری کے قابل نہیں تھے۔وہ رمزو کنایے میں اپنی بات کہتے تھے۔صبح آزادی' دوعشق' نثار میں تیری گلیوں پہ' شیشوں کا مسیحا' زنداں کی ایک شام' یاد' ملاقات' ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے اور دریچہ وغیرہ ان کی مشہور نظمیں ہیں۔

مخدوم نے ابتدا میں رومانی نظمیں لکھیں۔ان نظموں میں ایک تازگی' شادابی' جمالیاتی کیف اور انداز بیان کی ندرت ہے۔سجدہ' انتظار' محبت کی چھاؤں' نامۂ حبیب' پشیمانی ان کی رومانی نظمیں ہیں۔مخدوم انقلاب کا انتظار بھی محبوب کے انتظار کی طرح کرتے ہیں۔مخدوم کی شاعری میں غنائیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ان کی نظمیں ''اندھیرا' زلف چلیپا' چاند تاروں کا بن' چارہ گر'' فنی اعتبار سے مکمل نظمیں ہیں۔مخدوم کے کلام کے بارے میں عزیز احمد لکھتے ہیں کہ ''خالص شاعرانہ حیثیت سے بھی اس کے کھرے ہونے میں کوئی کلام نہیں''۔

سردار جعفری کا پہلا مجموعہ کلام ''پرواز'' ہے۔سردار جعفری کی نظموں میں وجدان اور تخلیقی عناصر کی کمی ہے۔ان کے انداز بیان میں ایک کرختگی ہے۔سال نو' ٹوٹا ہوا ستارہ' آخری خط ان کی کامیاب نظمیں ہیں۔بعد میں سردار جعفری نے طویل نظمیں لکھیں ان کے یہاں الفاظ کی تکرار ہونے لگی اور تمام مصرعے ایک ہی لفظ سے شروع ہونے لگے۔ان کی نظمیں سیلاب چین' آنسوؤں کے چراغ' موت' نیا دوھان' زنداں' زنداں بہ زنداں' کو ریا ترقی پسند حلقوں میں بے حد مقبول ہوئیں۔ان کی طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' بھی بہت مشہور ہوئی۔سردار جعفری نے تشبیہات میں ندرت کو ملحوظ رکھا۔

کیفی اعظمی کی ابتدائی نظمیں بھی رومانی اور ہلکی پھلکی ہیں۔اندیشہ' پشیمانی' ٹرنک کال' پامسٹ' حوصلہ اور تبسم ان کی خوب صورت نظمیں ہیں۔کیفی اعظمی نے بھی ہنگامی موضوعات پر نظمیں لکھیں لیکن ان کے یہاں سردار جعفری کی طرح کرختگی نہیں ہے بلکہ ایک دھیمے دھیمے بہاؤ کی کیفیت ہے۔ایسی نظموں میں مولانا آزاد اور خضر حیات' خانہ جنگی' قومی اخبار' کوریا کا نعرہ وغیرہ ہیں۔لیکن کیفی کو جلد ہی ہنگامی شاعری کا احساس ہو گیا اور انہوں نے اس انداز کو ترک کر دیا۔

جان نثار اختر نے بھی اپنی شاعری کا آغاز ہلکی پھلکی نظموں سے کیا۔ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر انہوں نے انقلابی نظمیں لکھیں جن میں بگولا' یہ ہو کر رہے گا' میں ان کے گیت گاتا ہوں' سجاد ظہیر کے نام' روس کو سلام وغیرہ شامل ہیں' روس کو سلام میں 34 مصرعے لفظ ہزار ہا سے شروع ہوتے ہیں۔امن نامہ' ستاروں کی صدا ان کی طویل نظمیں ہیں۔خاک دل اور خاموش آواز میں انہوں نے اپنی انفرادیت کو پا لیا۔ان کی رباعیات کا مجموعہ ''گھر آنگن'' بھی کافی مقبول ہوا۔ان کی غزلوں کے مجموعے ''پچھلے پہر'' سے ایک نئی تبدیلی کا احساس ہوا۔

ساحر لدھیانوی کی شاعری میں بے ساختگی اور تغزل ہے۔ساحر نے متوسط طبقے کے عام تعلیم یافتہ نوجوانوں کو بے حد متاثر کیا۔ان کے اسلوب میں ایک وضاحت بے ساختگی اور شیرینی ہے جو نوجوانوں کو متاثر کرتی ہے۔ساحر کا مجموعہ کلام سب سے زیادہ پڑھا گیا۔تاج محل کے علاوہ ''گریز' چکلے' لمحۂ غنیمت' بنگال' فن کار' کل اور آج' ایک تصویر رنگ' جاگیر' لہو نذر دے رہی ہے حیات'' ساحر کی مشہور نظمیں ہیں۔ساحر نے امن کے موضوع پر ایک طویل نظم ''پرچھائیاں'' لکھی جو اس موضوع پر لکھی گئی سب سے عمدہ نظم سمجھی جاتی ہے۔

مجروح سلطان پوری نے نظم کے بجائے غزل کو اپنایا وہ سب کچھ جو ترقی پسند شعرا نظم کے پیرایہ میں کر رہے تھے مجروح نے غزل میں کہا۔

مجروح کا لب ولہجہ اُردو تغزل کا مستند لب ولہجہ ہے جس میں انہوں نے نئی کیفیات کو سمویا ہے۔ مجروح نے بہت کم لکھا لیکن جو بھی لکھا وہ یاد رہ جانے والا ہے۔

ان کے علاوہ فراق گورکھپوری، مطلبی فرید آبادی، اختر انصاری، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، اختر الایمان، شاد عارفی، پرویز شاہدی، منیب الرحمٰن، عزیز حامد مدنی، ظہیر کاشمیری کے علاوہ وامق جون پوری، غلام ربانی تاباں، نیاز حیدر، مخمور جالندھری، سلیمان اریب وغیرہ بھی اہم شاعر ہیں۔

ترقی پسند شاعری کے لیے جو ضروری شرطیں طے کی گئیں وہ اس طرح تھیں۔ شاعر غم دوراں کو موضوع بنائے غم جاناں اور غم ذات کو موضوع بنانا رجعت پسندی ہے۔ شاعر انقلاب کی جدوجہد میں بین الاقوامی سیاست پر نظر رکھے۔ اس کا کینوس وسیع ہو۔ جمالیاتی قدریں، ہیت کا تناسب وغیرہ رجعت پسند نقادوں کی اصطلاحیں ہیں۔ ادب میں اشاریت، رمزیت، استعارہ، تشبیہہ، علامت زوال پسندوں کا رجحان ہے۔ غم افسردگی، اداسی اور تنہائی کا اظہار ناپسندیدہ ہے۔ شاعری کو امید افزا ہونا چاہیے جو شاعر عالم گیر عوامی جدوجہد کو موضوع نہیں بناتا اس کا سیاسی شعور خام ہے۔

اس فارمولے کے زیر اثر جو شاعری کی گئی وہ یکسانیت کا شکار ہوگئی۔ دنیا کے ہر ملک کو موضوع بنایا گیا۔ نظموں میں لفظوں کی تکرار، مصنوعی رجائیت، احساس اور جذبے کے فقدان نے شاعری کو ہنگامی بنا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس طرح کی شاعری سے لوگ اوب گئے۔

14.6.2 افسانہ:

ترقی پسند تحریک سے قبل افسانے میں دو واضح میلانات ملتے ہیں۔ ایک حقیقت نگاری اور دوسری رومانیت اور تخیل پرستی کا۔ 1932ء میں ''انگارے'' کے نام سے جو افسانے لکھے گئے ان میں وہ سارے امکانات تھے جو آگے چل کر اُردو افسانے کے واضح رجحانات بنے۔ قدیم معاشرے اور اخلاقی وقوانین کے خلاف بغاوت کے علاوہ نفسیاتی مسائل کو بھی پہلی بار برتا گیا تھا۔ اس کے لکھنے والے ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے تھے۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے انگارے کی توسیع کی۔

1936ء کے بعد اُردو افسانہ نگاروں کی جو کھیپ سامنے آئی اس میں کرشن چندر کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ کرشن چندر نے ابتدا میں رومانی افسانے لکھے لیکن یہ رومانیت فراریت نہیں بلکہ زندگی کو بدلنے کی آواز ہے۔ ان کے ابتدائی افسانوں میں ''جہلم میں ناؤ پر، آنگی، جنت وجہنم'' وغیرہ ہیں۔ ''دو فرلانگ لمبی سڑک'' سے وہ سماجی حقیقت نگاری کی طرف آئے۔ کرشن چندر کو کشمیر سے خاص دلچسپی تھی۔ کرشن چندر نے ہیئت کے تجربے بھی کیے۔ ''زندگی کے موڑ پر، گرجن کی ایک شام اور بالکونی'' ان کے طویل افسانے ہیں۔ قحط بنگال پر انہوں نے ناقابلِ فراموش افسانہ ''ان داتا'' لکھا۔ کرشن چندر بعد میں بسیار نویسی کا شکار ہو گئے۔ ان کی افسانہ نگاری پر انشائیے کا رنگ حاوی ہونے لگا۔ اس کے باوجود انہوں نے ''آدھے گھنٹے کا خدا، تائی ایسری، کالو بھنگی، شہزادہ، اشوک کی موت، پورے چاند کی رات'' جیسے افسانے لکھے۔ کرشن چندر کے افسانے ادب عالیہ کا حصہ رہیں گے۔

سعادت حسن منٹو نے تلخ حقیقتوں، عورت مرد کے تعلقات اور ان کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ انہوں نے ابتدا میں سیاسی موضوعات پر افسانے لکھے جن میں کامیاب افسانہ ''نیا قانون'' ہے۔ منٹو کو بمبئی میں بسنے والے نچلے طبقے پر لکھے گئے افسانوں سے شہرت ملی۔ جسم فروش عورتوں پر منٹو نے بے مثال کہانیاں لکھیں'' کالی شلوار، ہتک، جانکی، سو کینڈل پاور بلب، سرکنڈوں کے پیچھے اس موضوع پر لکھی ہوئی کامیاب کہانیاں ہیں۔ منٹو نے اُردو افسانے کو بہترین کردار دیے۔ کرداروں پر مبنی افسانوں میں بابو گوپی ناتھ، سہائے، سوگندھی، موذیل، ایشر سنگھ، مد

بھائی ٹوبہ ٹیک سنگھ، تقی کا تب، جانکی، راج کشور اور باسط غیر معمولی کردار ہیں۔ منٹو نے فسادات پر بھی یادگار افسانے لکھے۔ منٹو کا اسلوب کفایت شعارانہ اور طریقہ کار سلیقہ مندانہ تھا۔ وہ فطرت انسانی کے رمز شناس اور اعمال انسانی کے پراسرار نفسیاتی محرکات کے نباض تھے۔ منٹو کے افسانوں کا انجام غیر متوقع اور تعجب خیز ہوتا تھا۔

راجندر سنگھ بیدی نے بہت کم لکھا لیکن فنی اعتبار سے مکمل افسانے لکھے۔ مواد، ہیت اور کردار نگاری کے سلسلے میں ان کے ہاں ایک خاص توازن پایا جاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں فلسفیانہ فکر و ارنفسیاتی باریک بینی ملتی ہے۔ بیدی نے متوسط طبقے کے مسائل اور ان کے دکھ درد سے اچھی طرح واقف ہیں۔ انہوں نے کئی خوب صورت افسانے لکھے۔ دس منٹ بارش میں، گرم کوٹ، ہڈیاں اور پھول، من کی من میں، رحمٰن کے جوتے اور آلو وغیرہ۔ بیدی نے کسی خاص فارمولے پر افسانے نہیں لکھے۔ انسانی جبلی معصومیت ان کا بنیادی موضوع ہے۔ بیدی کے افسانوں میں کردار نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ گرہن، لاجونتی، اپنے دکھ مجھے دے دو، اغوا، دیوالہ، لمبی لڑکی کے کرداروں کا دیو مالائی داستانوں سے گہرا تعلق ہے۔ بھولا جیسا بچہ بھی ان کے کرداروں میں شامل ہے۔ بیدی نے شعور کی پختگی اور گہری بصیرت کے ساتھ جنسی موضوعات کو برتا ہے۔ بیدی رمزیت، تہہ داری اور مشکل پسندی کے قائل تھے۔

عصمت چغتائی نے متوسط طبقے کی عورتوں کی زندگی اور ان کے نفسیاتی مطالعے کو اپنی افسانہ نگاری کا محور بنایا۔ وہ عورت کی نفسیاتی نشو ونما اور اس کے پیچ و خم کو بڑی مہارت کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ اس میں رمزیت اور طنزیہ انداز ہوتا ہے۔ گیندا، اُف یہ بچے، ساس، جوانی، ایک شوہر کی خاطر قابل ذکر ہیں۔ جنسی موضوعات پر بھی انہوں نے سنبھل کر لکھا لیکن 'لحاف' کی وجہ سے کافی بدنام ہوئیں۔ حقائق کی پیش کشی کے لحاظ سے پردے کے پیچھے، کیڈل کورٹ، قابل ذکر ہیں۔ ان کا جو نقطہ نظر تھا وہ دو ہاتھ، بے کار، عشق پر زور نہیں اور گلدان میں واضح انداز میں ملتا ہے۔ ''چوتھی کا جوڑا'' ان کا یادگار افسانہ ہے۔ اس کے علاوہ پنکچر، یار، نفرت، بیمار، خدمت گزار قابل ذکر ہیں۔ عصمت چغتائی کا سب سے بڑا وصف ان کا اسلوب ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں ''ان کے افسانوں سے اُردو افسانوں کی لغت میں بے شمار نئے الفاظ، نئے محاورات، نئی تشبیہات اور علامات کا اضافہ ہوا ہے جو محض عورتوں کی معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں''۔

ان چار افسانہ نگاروں کے علاوہ حیات اللہ انصاری، سہیل عظیم آبادی، اوپیندر ناتھ اشک، اختر حسین رائے پوری، اختر اورینوی، اختر انصاری، احمد ندیم قاسمی، دیوندر ستیارتھی، بلونت سنگھ، خواجہ احمد عباس، مہیندر ناتھ، ابراہیم جلیس، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، شکیلہ اختر، صدیقہ بیگم سیوہاروی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ترقی پسند تحریک میں اُردو افسانے نے عالمی معیار تک رسائی حاصل کی۔ عورتوں کے مسائل، فسادات، بین الاقوامی مسائل اور نفسیاتی کردار نگاری، ترقی پسند افسانے کے خاص اوصاف رہے ہیں۔

14.6.3 ناول:

ترقی پسند تحریک میں ناول اس درجے کے نہیں لکھے گئے جس معیار کی شاعری یا افسانہ نگاری کی گئی۔ ترقی پسند تحریک امراؤ جان ادا یا گئودان جیسے بڑے ناول پیش نہ کرسکی۔

ترقی پسند ناول کا نقشِ اول سجاد ظہیر کا ''لندن کی ایک رات'' ہے۔ یہ ناول 1936ء میں لکھا گیا مگر اس کی اشاعت 1938ء میں عمل میں

آئی۔16 جون 1904ء کی صبح آٹھ بجے سے شروع ہوتا ہے اور دوسری صبح دو بجے ختم ہوتا ہے۔''لندن کی ایک رات'' شام کو چھ بج کر دس منٹ پر شروع ہوتا ہے اور صبح کی پھیکی روشنی پر ختم ہوتا ہے۔اس ناول میں ان ہندوستانی طلبا کی ذہنی وجذباتی کشمکش کی عکاسی کی گئی ہے جو برطانوی حکومت کے دور میں بغرض تعلیم لندن جاتے تھے۔سجاد ظہیر نے مختلف کرداروں کے ذریعہ ہندوستان کے متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی عکاسی کی ہے اور اس دور کے سیاسی وتہذیبی مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔

کرشن چندر کا ناول'' شکست'' 1943ء میں شائع ہوا۔اس ناول میں کرشن چندر نے برہمنی سماج کے خلاف احتجاج کیا ہے۔معاشی اور طبقاتی نظام میں محبت کی ناکامی اس ناول کا موضوع ہے۔کرشن چندر نے معاشی کشمکش فرسودہ رسوم وعقائد اور ذات پات کے بندھنوں کی عمدہ عکاسی کی ہے۔

اس دور کے سب سے کامیاب ناول نگار عزیز احمد ہیں۔انہیں ناول نگاری کے فن پر پوری گرفت حاصل تھی۔''ہوس'' اور'' مرمر اور خون'' ان کے ابتدائی ناول ہیں۔''گریز''،ایسی بلندی ایسی پستی'' آگ'' اور''شبنم'' ان کے دوسرے ناول ہیں۔''گریز'' ایک اہم ناول ہے۔اس کا کردار بھی متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور آئی۔سی۔ایس کا امتحان پاس کرنے کے بعد اسے یوروپ کے مختلف مقامات میں جانے کا موقع ملتا ہے۔عزیز احمد نے یوروپ کی زندگی اور وہاں کا اخلاقی وتہذیبی انحطاط اور ہندوستان کے بےبس متوسط طبقے کی ذہنیت کی بڑی کامیاب عکاسی کی ہے۔''ایسی بلندی ایسی پستی'' میں انہوں نے حیدرآباد کے جاگیردارانہ نظام کی تصویر کشی کی ہے جو زوال پذیر تھا۔یہ ناول اس دور کی تہذیب کے کھوکھلے پن کو عیاں کرتا ہے۔'' آگ'' کشمیر کی معاشی کشمکش کے پس منظر میں لکھا گیا اور''شبنم'' میں یونیورسٹی کے پروفیسروں کی اخلاقی کمزوریوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔

عصمت چغتائی کا پہلا ناول'ضدی' ہے۔یہ ناول جذباتیت اور رومانیت پر مبنی ہے اور فلم کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر لکھا گیا۔ان کا اہم ناول''ٹیڑھی لکیر'' ہے۔اس ناول میں عصمت نے ایک نسوانی کردار کو پیدائش سے جوانی تک جو مختلف منزلیں پیش آتی ہے انہیں کامیابی کے ساتھ اور ایک قطرۂ خون پیش کیا۔اس میں مصنفہ کا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ چھلکتا ہے۔یہ ناول ایک کامیاب نفسیاتی ناول ہے۔عصمت نے معصومہ،عجیب آدمی،جنگلی کبوتر بھی لکھے۔

ابراہیم جلیس نے''چور بازار'' لکھا۔سعادت حسن منٹو نے''بغیر عنوان کے'' لکھا۔قرۃ العین حیدر نے''میرے بھی صنم خانے''(1947ء) اور احسن فاروقی نے''شام اودھ''(1948ء) لکھا۔یہ ناول ترقی پسند ناولوں کے زمرے میں نہیں آتے۔راجیندر سنگھ بیدی کا ناولٹ''ایک چادر میلی سی'' ایک اہم ناولٹ ہے۔حیات اللہ انصاری کا ناول''لہو کے پھول'' 2608 صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔اس میں 1911ء سے 1950ء تک کی سماجی معاشرتی اور سیاسی زندگی کی ترجمانی کی گئی ہے۔کرشن چندر نے''جب کھیت جاگے'' جیسا ناول لکھا جس میں کسانوں کی تلنگانہ تحریک کو موضوع بنایا گیا۔فسادات کے موضوع پر راما نند ساگر کا ناول''اور انسان مرگیا'' اہم ہے۔دراصل اچھے ناول ترقی پسند تحریک کے بعد لکھے گئے جن میں خدیجہ مستور کا'' آنگن''،قرۃ العین حیدر کا'' آگ کا دریا''،عبداللہ حسین کا''اداس نسلیں''،شوکت صدیقی کا''خدا کی بستی'' شامل ہیں۔

14.6.4 تنقید:

ترقی پسندوں نے حسن کے معیار کو بدلا اور ادب کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے نئے نئے اصول وضع کیے۔ان کا خیال تھا کہ ادب سماجی زندگی

کی پیداوار ہے۔اس لیے سماجی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کا بدلنا بھی ضروری ہے۔وہ ادب کے تنقید حیات ہونے کے قائل تھے۔ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اُردو تنقید کے مزاج اور ذہن میں نئی نئی تبدیلیاں آئیں۔بحث مباحثے کے لیے راہیں نکلیں، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوا۔ادب میں مواد، ہیت اور اظہار و اسلوب میں نئے تجربات کی ہمت افزائی کی گئی۔جن نقادوں نے ترقی پسند تنقید کے اصول وضع کیے اور معترضین کا تسلی بخش جواب دیا۔ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جو نظریاتی مسائل سامنے آئے انہیں سوجھ بوجھ کے ساتھ حل کیا اور اُردو تنقید کو واضح، سائنٹفک اور معروضی انداز بخشا ان میں اختر حسین رائے پوری، سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم احتشام حسین اور مجنوں گورکھپوری شامل ہیں۔

اختر حسین رائے پوری کا مضمون ''ادب اور زندگی'' (رسالہ اُردو۔جولائی 1995ء) ترقی پسند ادب میں پہلی تنقیدی کوشش ہے۔اختر حسین رائے پوری نے ادب کا مقصد ذوقِ جمال تفننِ طبع اور ہنسی مذاق اور تفریح کو نہیں بلکہ ادب میں افادیت و مقصدیت اور نئی معنویت کو قرار دیا۔ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''ادب اور انقلاب'' کے نام سے شائع ہوا۔اختر حسین رائے پوری نے نذرالاسلام کی شاعری کو ترقی پسند ادب کا بہترین نمونہ قرار دیا۔اختر حسین رائے پوری کی انتہا پسندی نے انہیں بہت دور تک چلنے نہیں دیا۔وہ ترقی پسند تنقید سے علاحدہ ہو گئے۔

سجاد ظہیر مارکسی نظریات کے حامی تھے۔تنقید پر انہوں نے کوئی باضابطہ کتاب نہیں لکھی لیکن جہاں جہاں ضرورت پڑی انہوں نے اپنے تنقیدی نظریات کا اظہار کیا۔ایک ایسے وقت جب نوجوان جوش اور نذرالاسلام کے زیر اثر انقلاب کا دہشت ناک خونین تصور پیش کر رہے تھے۔سجاد ظہیر نے ''اُردو کی جدید انقلابی شاعری'' لکھ کر نوجوانوں کو انتہا پسندی سے روکا اور اعتدال کا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کی۔سردار جعفری نے فیض پر سخت تنقید کی تھی۔وہ رمز و اشاریت کے خلاف تھے۔انہوں نے فیض کو رجعت پسند شاعر قرار دیا۔سجاد ظہیر نے فیض کی انفرادیت نرم شیریں مترنم اندازِ کلام کو قرار دیا۔

ڈاکٹر عبدالعلیم کا رویہ سخت اور ایک طرفہ تھا۔لیکن بعد میں انہوں نے اس کو تبدیل کیا۔اس تبدیلی کا احساس ان کے مضمون ''ادب اور مارکسزم'' میں ہوتا ہے۔ڈاکٹر عبدالعلیم عوامی شاعری کا مطالبہ کرتے ہیں۔وہ ادب میں رمز و ایما کو جائز قرار نہیں دیتے۔

احتشام حسین کو ترقی پسند تنقید میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ان کا رویہ متوازن اور غیر جذباتی، ان کا علم گہرا اور مطالعہ وسیع تھا۔انہوں نے نظری اور عملی تنقید پر مضامین لکھے۔تنقیدی جائزے، روایت اور بغاوت، ادب اور سماج، تنقید اور عملی تنقید، ذوق ادب و شعور، تنقیدی نظریات ان کی اہم کتابیں ہیں۔احتشام حسین کارل مارکس کے جدلیاتی مادیت کے فلسفے سے متاثر تھے۔وہ ادب کے ذریعہ عوام کو بیدار کرنے کے قائل تھے۔احتشام حسین جمالیاتی اور ادبی قدروں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔وہ یہ دیکھتے ہیں کہ فن پارہ اشتراکیت سے کتنا قریب ہے اور محنت کش مزدوروں کو اس سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔شعر و ادب پر جتنی بے لاگ باتیں احتشام حسین نے کی ہیں۔دوسرے مارکسی نقادوں کے یہاں نہیں ملتیں۔

مجنوں گورکھپوری نے ابتدا میں تاثراتی تنقید کی لیکن انقلاب روس کے بعد ان کا زاویہ فکر بدل گیا۔مجنوں کا خیال تھا کہ ادب صرف زندگی کا ترجمان ہی نہیں بلکہ زندگی کا نقاد بھی ہوتا ہے۔مجنوں کے یہاں ادب میں اجتماعیت و انفرادیت ماضی کے ادبی اکتسابات کے سلسلے میں صحت مند رویہ، ہنگامی ادب کی نوعیت فن اور رمز و ایما کی ضرورت پر ایک متوازن اور سلجھا ہوا انداز فکر ملتا ہے۔مجنوں نے عملی تنقید کا اظہار بہت کم کیا۔

آل احمد سرور نے خود کو کسی خاص دبستان یا گروہ سے وابستہ نہیں کیا۔آل احمد سرور مارکسی نظریہ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ترقی پسندانہ رجحانات کی خوبی بیان کرنے ادب کے افادی، مقصدی، عوامی اور اجتماعی کردار پر زور دینے کے باوجود وہ دوسرے مارکسی نقادوں کی طرح پہلے سے

طے شدہ نظریے کی روشنی میں ادب کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ آل احمد سرور کے یہاں ذہنی توازن فکری بصیرت اور فنی رمز شناسی کا جوہر یکجا ہو گیا ہے۔ تنقیدی اشارے' نئے اور پرانے چراغ' تنقید کیا ہے۔ نظر اور نظریے ان کی اہم تصانیف ہیں۔

عزیز احمد نے ترقی پسند ادب کو ایک متوازن نقطۂ نظر دیا۔ انہوں نے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کو انتہا پسندی کا شکار ہونے سے بچالیا۔ وہ ادب کو زندگی کا ترجمان سمجھتے تھے۔ وہ پرانے ادب کو رد نہیں کرتے بلکہ پرانے ادب میں ترقی پسند عناصر تلاش کرتے ہیں۔ ''ترقی پسند ادب'' ان کی اہم کتاب ہے۔

ممتاز حسین ادب کے مارکسی نقطۂ نظر کے حامی تھے۔ انہوں نے سماجی زندگی کو اس کے تاریخی ارتقا کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی اور مارکسی نظریۂ تنقید کو جامعیت کے ساتھ پیش کیا۔ ابتدا میں ممتاز حسین کا انداز بیان مشکل اور پیچیدہ تھا بعد میں انہوں نے اس پر قابو پالیا۔ ان کا مضمون ''ماضی کے ادب عالیہ سے متعلق'' بہت ہی اہم ہے۔ اس میں انہوں نے مارکسی نقطۂ نظر کی بڑی خوبی سے وضاحت کی ہے۔

علی سردار جعفری خود کو نقادوں کی صف میں شامل نہیں کرتے لیکن انہوں نے اپنی تنقید سے بھی متاثر کیا۔ سردار جعفری نے کبیر' میر' غالب' اقبال اور مخدوم کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے اس دور کے سماجی و سیاسی حالات' تہذیب و تمدن' طبقاتی کشمکش اور عوامی زندگی سے ان کے گہرے رشتے کو اہمیت دی۔ ان کی اہم کتاب ''ترقی پسند ادب'' ہے۔ علی سردار جعفری ایسی شاعری کو ترقی پسندی کے دائرے سے خارج قرار دیتے ہیں جس میں رمزیت' اشاریت' تشبیہ و استعارہ اور تہہ داری ہو۔ اسی نقطۂ نظر کی وجہ سے انہوں نے فیض کی نظم ''صبح آزادی'' پر سخت تنقید کی۔ اسی طرح انہوں نے منٹو پر بھی سخت تنقید کی تھی۔ انہوں نے فیض اور جذبی کے مقابلے میں کیفی اعظمی اور جان نثار اختر وغیرہ کی شاعری کی تعریف کی۔ علی سردار جعفری کی تنقید نے لکھنے والوں کو تذبذب میں مبتلا کر دیا۔

محمد حسن نے بھی مارکسی نقطۂ نظر سے ادب کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی۔ محمد حسن ادب کی عصریت' انفرادیت اور آفاقیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ تنقید کے لیے سائنٹفک طریقوں کو ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ جمالیات اور فکر کے درمیان توازن قائم کو رکھنے کے قائل ہیں۔ انہوں نے اپنی تنقید کو غیر جانب دار بنانے کی کوشش کی۔ شعر نو' عرض ہنر' ادبی سماجیات' شناسا چہرے' معاصر ادب کے پیش رو' جدید اُردو ادب اور دہلی میں اُردو شاعری کا فکری و تہذیبی پس منظر ان کی اہم تصانیف ہیں۔

قمر رئیس نے زیادہ تر فکشن پر لکھا۔ انہوں نے مارکسی نظریے کا اطلاق فن پارے پر بڑی ہنرمندی سے کیا۔ وہ سماجی عوامل کے ساتھ ساتھ داخلی محرکات اور فنی خوبیوں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ وہ ادب اور سماج کے گہرے رشتے کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ناولوں میں ہم عصر حالات' تہذیب' معاشرت' سماجی' سیاسی اور اقتصادی حالات کا جتنا اچھا اور مفصل بیان ہوتا ہے اُردو کی دوسری صنف اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ تلاش و توازن اور تنقیدی تناظر ان کی اہم کتابیں ہیں۔

سید محمد عقیل رضوی بنیادی طور پر سماجی اثرات کو اہمیت دیتے ہیں لیکن اس کے ساتھ جدید حسیت اور زندگی کے اس کرب پر بھی نگاہ رکھتے ہیں جس نے ادب میں پرانے اصولوں کو توڑا۔ وہ جدیدیت کے سخت مخالف ہیں۔ وہ اپنے مضمون 'جدید قدر اور نظر'' میں لکھتے ہیں:

> ''ادب میں فن کار کی ذات اور اس کے انفرادی احساسات کا اظہار ضرور ہوتا ہے لیکن اس کا شعور جماعتی شعور ہے۔ اس طرح اس کو روح عصر سے الگ نہیں پیش کیا جا سکتا ہے اور روح عصر سے جدلیت تک راستہ جاتا ہے''۔

ان نقادوں کے علاوہ اختر انصاری، احمد ندیم قاسمی، عبادت بریلوی، وقار عظیم، اعجاز حسین، اختر اور ینوی، اسلوب احمد انصاری، خورشید الاسلام، ظ انصاری، شکیل الرحمٰن، باقر مہدی، وحید اختر، ہنس راج رہبر، عالم خوندمیری، عتیق اللہ، صادق وغیرہ نے بھی اپنی تحریروں میں ترقی پسند نظری وعملی تنقید کا احاطہ کیا۔

ترقی پسند تحریک میں ڈراما بھی لکھا گیا اور طنز ومزاح بھی۔ سجاد ظہیر نے اپنے لندن میں قیام کے دورن ڈراما ''بیمار'' لکھا تھا۔ رشید جہاں نے ''عورت''، محمود الظفر نے ''ایک شام'' لکھا۔ احمد علی نے ''آزادی'' لکھا۔ ڈاکٹر دین محمد تاثیر نے ''مرزا غالب کے گھر ایک شام'' لکھا۔ کرشن چندر نے ریڈیو کی ملازمت کے دوران ریڈیائی ڈرامے لکھے جو ''دروازہ'' کے نام سے مجموعے کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس میں ''سرائے کے باہر'' زیادہ مقبول ہوا۔ منٹو کے ڈراموں کے مجموعے ''تین عورتیں''، اور ''آؤ''، عصمت چغتائی کی ڈراموں کا مجموعہ ''شیطان'' کے نام سے راجندر سنگھ بیدی کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ''سات کھیل'' شائع ہو چکے ہیں۔ اوپیندر ناتھ اشک نے بے شمار ڈرامے لکھے اور ایک ایکٹ کے ڈراموں کو مرزا ادیب نے مقبول بنایا۔ ڈاکٹر محمد حسن کے ڈراموں کا مجموعہ پیسہ اور پرچھائیں'' ہے۔ ریوتی سرن شرما اور حبیب تنویر نے ڈرامے کی صنف کو اپنایا۔ حبیب تنویر کا ڈراما آگرہ بازار کافی مقبول ہوا۔

طنز ومزاح میں کنھیا لال کپور، کرشن چندر، ابراہیم جلیس اور فکر تونسوی نے گہرے نقش چھوڑے۔ کرشن چندر کا ناول ''ایک گدھے کی سرگذشت'' بہت مقبول ہوا۔

14.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ 1934ء میں لندن میں زیر تعلیم نوجوانوں کے ایک گروہ نے انڈین پروگریسیو رائٹرز ایسوسی ایشن بنائی۔ یہ نوجوان سجاد ظہیر، ملک راج آنند، جیوتی گھوش، پرمود سین گپتا اور دین محمد تاثیر تھے۔ انھوں نے ایک مینی فیسٹو بنایا اور اپنے دوستوں کو ہندوستان بھیجا۔ پریم چند نے اپنے رسالے ''ہنس'' میں مینی فیسٹو شائع کیا۔

☆ 1935ء میں سجاد ظہیر ہندوستان آئے تو انھوں نے ترقی پسندوں کا ایک حلقہ بنالیا۔

☆ ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس اپریل 1936ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ اس کانفرنس میں پریم چند نے یادگار خطبہ دیا۔ ایک اعلان نامہ جاری کیا گیا جسمیں تلقین کی گئی کہ بے بنیاد روحانیت اور تصویر پرستی چھوڑ کر عقلیت اختیار کریں۔

☆ پریم چند نے اپنے خطبے میں حسن کا معیار بدلنے پر زور دیا۔ تفکر، آزادی کے جذبے، تعمیر کی روح اور زندگی کی حقیقتوں، حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرنے والے ادب پر اصرار کیا۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی انجمنیں قائم ہونے لگیں۔

☆ 1938ء میں دوسری کل ہند کانفرنس کلکتے میں بلائی گئی۔ دو ڈھائی سال کے اندر ترقی پسند ادیبوں کی تحریک تمام ہندوستانی زبانوں میں مقبول ہوگئی۔ ترقی پسندوں نے اپنا رسالہ ''نیا ادب'' لکھنؤ سے جاری کیا۔

☆ ملک راج آنند، ڈاکٹر عبدالعلیم اور احمد علی کی ادارت میں ماہنامہ ''انڈین لٹریچر'' شائع ہوا۔ تیسری کل ہند کانفرنس مئی 1942ء میں دہلی میں منعقد ہوئی اس میں ایک قرارداد پاس کی گئی کہ وہ فاشزم کے خلاف ہیں اور اتحادی اقوام کے ساتھ ہیں۔

☆ برطانوی سامراج کے اس رویے کی مذمت کی گئی کہ وہ نازک حالات میں بھی ہندوستان کو آزادی دینے کے لیے تیار نہیں۔ چار پانچ سال میں جس طرح کا ادب لکھا گیا اس کی تعریف تو ہوئی لیکن تنقید بھی ہونے لگی۔

☆ آزاد نظم کی سخت مخالفت کی گئی اور فحاشی کا الزام عاید کیا گیا۔ اکتوبر 1945ء میں حیدر آباد میں ترقی پسند مصنفین نے ایک کانفرنس بلائی۔ فحاشی کے خلاف قرار داد پیش کی گئی لیکن قاضی عبدالغفار اور مولانا حسرت موہانی نے اس کی مخالفت کی، یہ قرار داد مسترد ہوگئی دسمبر 1947ء میں لکھنؤ میں ایک کانفرنس بلائی گئی جس میں طے ہوا کہ بمبئی میں باقاعدہ دفتر قائم کیا جائے۔

☆ مئی 1949ء میں پانچویں کل ہند کانفرنس بھیمڑی میں منعقد کی گئی۔ ایک نیا مینی فیسٹو بنایا گیا۔ ہندی کے مشہور نقاد رام بلاس شرما کو جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔ نئے منشور کی اشاعت کی وجہ سے لکھنے والے تذبذب میں پڑ گئے۔

☆ مارچ 1952ء میں دہلی میں کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس کانفرنس میں کرشن چندر کو کل ہند انجمن کا سکریٹری چنا گیا۔ اس دوران سجاد ظہیر راول پنڈی کیس سے رہا ہو کر مستقل طور پر ہندوستان آ گئے۔

☆ مئی 1956ء میں حیدر آباد میں کل ہند کانفرنس ہوئی۔ اس میں فیصلہ کیا گیا کہ ترقی پسند تحریک اپنا رول ادا کر چکی۔ اب اس کی مزید تنظیم ضروری نہیں۔

☆ ترقی پسند شاعروں میں اسرارالحق مجاز، فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، سردار جعفری، کیفی اعظمی، جان نثار اختر، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

☆ افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔ ان کے علاوہ اپیندر ناتھ اشک، خواجہ احمد عباس، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، دیویندر ستیارتھی۔ مہیندر ناتھ، شکیل وغیرہ بھی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

☆ ناول نگاروں میں سجاد ظہیر، کرشن چندر، عصمت چغتائی، ابراہیم جلیس، راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ انصاری وغیرہ نے اچھے ناول لکھے۔

☆ تنقید میں سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، اختر حسین رائے پوری، احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، آل احمد سرور، عزیز احمد، ممتاز حسین، قمر رئیس، سید محمد عقیل نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ترقی پسند مصنفین نے ڈراما اور طنز و مزاح میں بھی گہرے نقوش چھوڑے۔

14.8 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
اشتراکیت	:	جائیداد و وسائل میں عوام کے مساویانہ حصہ کا فلسفہ
غاصبانہ	:	زبردستی
مینی فیسٹو	:	منشور
لائحۂ عمل	:	طریقۂ عمل
عقلیت	:	دلائل پر مبنی طرز فکر و عمل
مشاورتی	:	صلاح و مشورہ کا عمل

رجعت پسندی	:	قدامت پسند
بہمیت	:	حیوانیت، بے رحمی
بدظن ہونا	:	خفا ہونا
عفوانِ شباب	:	جوانی کی اٹھان

14.9 نمونہ امتحانی سوالات

14.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ پنڈت نہرو نے الہ آباد کی کس کانفرنس میں تقریر کی؟

2۔ نیا منشور کس کانفرنس میں جاری کیا گیا؟

3۔ ترقی پسندوں کے رسالے کا نام کیا تھا؟

4۔ سجاد کس کیس سے رہا ہو کر آئے؟

5۔ مئی 1956 میں حیدر آباد کی کانفرنس میں کیا فیصلہ کیا گیا؟

6۔ ''مجاز انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں انقلاب کا مطرب ہے۔'' کس کا قول ہے؟

7۔ ترقی پسند شاعروں میں کس شاعر نے صرف غزل کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے؟

8۔ عزیز احمد کے کس ناول میں حیدر آباد کے جاگیردارانہ نظام کی تصویر کشی کی گئی ہے؟

9۔ عصمت چغتائی کے کس ناول کو نفسیاتی ناول قرار دیا گیا ہے؟

10۔ راجندر سنگھ بیدی کے ناولٹ کا نام کیا ہے؟

14.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ترقی پسند تحریک کے پس منظر پر ایک نوٹ لکھیے۔

2۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز و ارتقا پر ایک مضمون لکھیے۔

3۔ ترقی پسند افسانے کو عالمی معیار تک پہنچانے والے افسانہ نگاروں پر ایک نوٹ لکھیے۔

4۔ ترقی پسند شاعری کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار خیال کیجیے۔

5۔ ترقی پسند تنقید کے اہم خدوخال کو واضح کیجیے۔

14.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ترقی پسند تحریک کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ تفصیلی نوٹ لکھیے۔

2۔ ترقی پسند تحریک کے زوال کے اسباب کیا ہیں؟ تفصیل سے بیان کیجیے۔

3۔ ترقی پسند ناول پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔

14.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمن اعظمی
2۔	ترقی پسند ادب	عزیز احمد
3۔	ترقی پسند ادب	علی سردار جعفری
4۔	روشنائی	سجاد ظہیر

اکائی 15 : رومانی تحریک اور حلقۂ اربابِ ذوق

اکائی کے اجزا

15.0 تمہید

15.1 مقاصد

15.2 رومانی تحریک: ایک تعارف

15.2.1 مغرب میں رومانی تحریک

15.2.2 اردو میں رومانی تحریک کا آغاز وارتقا

15.2.3 اردو ادب پر رومانی تحریک کے اثرات

15.3 حلقۂ اربابِ ذوق

15.3.1 حلقۂ اربابِ ذوق: پس منظر، قیام، سرگرمیاں

15.3.2 حلقۂ اربابِ ذوق: رجحانات

15.4 اکتسابی نتائج

15.5 کلیدی الفاظ

15.6 نمونۂ امتحانی سوالات

15.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

15.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

15.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

15.7 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

15.0 تمہید

اس اکائی کا تعلق ''رومانی تحریک'' اور ''حلقۂ اربابِ ذوق'' سے ہے۔ رومانی تحریک نے اردو ادب کو ایک نئی سوچ اور فکر دی، جس میں عقل کے بجائے احساسات وجذبات کے ذریعے حقیقت تک پہنچنے کے لیے جدوجہد شروع ہوئی۔ رومانی تحریک بھی دوسری تحریکوں کی طرح صنعتی انقلاب کی دین ہے اور بدلتے ہوئے حالات میں ایک نئی کائنات کی تلاش سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں نئی قدروں کی آمد اور پرانی قدروں اور اصولوں سے انحراف ہی نہیں بلکہ ان کے رد کی تجاویز بھی سامنے آنا شروع ہوئیں۔ اس اکائی میں ہم یہ بھی جاننے کی کوشش کریں گے کہ رومانی تحریک نے

برصغیر میں اردو ادب پر کب اور کس طرح اثر انداز ہونا شروع کیا۔ کلاسیکی اور مقصدی ادب سے اس تحریک نے ادب کے مزاج اور اسلوب کے رجحان کو یکسر بدل دیا اور نئی روایات کو جنم دیا۔ رومانی تحریک نے پرانے ادبی فلسفے کے ساتھ ساتھ ادب میں تخیل، جذبات اور فطرت کے عمل کو بھی داخل کیا۔

حلقۂ اربابِ ذوق کا قیام 29 اپریل 1939ء کو لاہور میں عمل میں آیا بعدازاں دھیرے دھیرے دہلی میں بھی اس کی ایک شاخ قائم ہوئی اور شمالی ہند کے کئی علاقوں میں اس کو وسعت حاصل ہوئی۔ حلقے نے صرف ادبی اجتماعات ہی منعقد نہیں کیے بلکہ عملی طور پر شعر و ادب کے فروغ کے لیے بھی کام کیا۔ حلقہ نے ہیئت اور داخلیت پر زیادہ زور دیا لیکن سیاسی اور سماجی حالات سے بھی حلقہ کے شاعر بیگانہ نہیں رہے انہوں نے سیاسی، تہذیبی اور سماجی موضوعات پر اظہار خیال کیا اور اپنے زاویے کو کام میں لے آئے۔ حلقۂ اربابِ ذوق کی مجموعی طور پر ہماری ادبی تاریخ میں بڑی اہمیت ہے۔

15.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ رومانی تحریک کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈال سکیں۔
- ☆ مغرب میں رومانی تحریک کی اہمیت کو سمجھ سکیں۔
- ☆ اردو میں رومانی تحریک کا آغاز و ارتقا پر روشنی ڈال سکیں۔
- ☆ اردو ادب پر رومانی تحریک کے اثرات کی وضاحت کر سکیں۔
- ☆ حلقۂ اربابِ ذوق کے پس منظر، قیام اور سرگرمیوں پر تبصرہ کر سکیں۔
- ☆ حلقۂ اربابِ ذوق کے رجحانات بیان سکیں۔

15.2 رومانی تحریک: ایک تعارف

رومانیت کو انگریزی میں Romanticism کہتے ہیں یہ اصطلاح Romance یا Romana سے لی گئی ہے۔ رومانا جنوبی علاقے کی لاطینی زبان کا نام ہے اور Romance ان زبانوں کو کہا جاتا ہے جو یوروپ کے جنوبی علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔ یہ قدیم رومن لاطینی زبان کی کوکھ سے نکلی ہوئی زبانیں ہیں۔ انہوں نے بھی دوسری زبانوں کی طرح مقامی زبانوں کے اثرات قبول کرنے کی وجہ سے مختلف شکلیں اختیار کیں، ان میں اطالوی، ہسپانوی اور پرتگالی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بقول بکسن اور آرتھر Romantic لفظ کو جس شخص نے پہلی مرتبہ استعمال کیا وہ جرمن نقاد Friedrich Schlegal تھا اور جرمنی سے ہی یہ اصطلاح فرانس اور انگلینڈ تک پہنچی۔ مورخین کا خیال ہے کہ رومانیت کی تحریک پہلے پہل چوتھی صدی قبل مسیح میں یونان سے شروع ہوئی اور قدیم یونانی دیومالاؤں میں جو تخلیقی لچک ہے اسے رومانی یا رومانیت کا نام دیا جاتا رہا ہے۔ پرانی اساطیری روایات و توہمات اور مافوق الفطرت عناصر کے خلاف بغاوت سے سرکشی اور جنسی افسانے جیسی روایات سے رومانیت میں انحراف کی مثالیں ملتی ہیں۔

رومانوی تحریک سے متعلق مختلف نظریات سامنے آتے ہیں۔ رومانیت کو زندگی سے فرار کا نام بھی دیا جاتا رہا ہے۔ شروع میں کولرج،

ورڈز ورتھ اوران کے ہم عصروں کے لیے جن کے دل میں انسانی جذبات کا درد اور قدریں تھیں ان کے لیے یہ تحریک ایک عظیم مشعل راہ تھی لیکن ان کے عزائم منزل مقصود تک پہنچنے سے پہلے ہی متزلزل ہو کر زمین بوس ہو گئے۔ لیکن جس راستے پر یہ تحریک چل نکلی تھی اگر صحیح سلامت منزل تک پہنچ جاتی تو آج اس کی صورت حال یہ نہیں بلکہ دوسری ہوتی اور رومانیت کے پیروکاروں نے جو خواب دیکھے تھے وہ حقیقت میں تبدیل ہو جاتے تو یہ رومانی تحریک کی سب سے بڑی کامیابی ہوتی لیکن آگے چل کر اس میں جو بدگمانیاں اور خرابیاں آئیں ان کو دیکھ کر رومانیت کی شان میں قصیدے پڑھنے والے بھی ششدر رہ گئے اور یہی وجہ ہے کہ انگریزی ادب میں شیلے، کیٹس اور بائرن کو اپنے پیشرووں یعنی ورڈز ورتھ اور کولرج وغیرہ کے خلاف یہ کہنا پڑا کہ وہ ''جس عظیم مقصد کو لے کر چلے تھے آخر میں انہوں نے اسے چھوڑ دیا اور وہ بزدلوں کی طرح انسانی زندگی سے فرار اختیار کر کے فطرت کی گود میں سو گئے''۔

15.2.1 مغرب میں رومانی تحریک:

جرمنی اور انگلستان میں رومانی تحریک کو روسو کے نظریات اور انقلاب فرانس کی پیداوار قرار دیا جاتا ہے، لیکن اس سے متعلق بھی مختلف آرا ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ تحریک انگلستان کی تہذیبی، معاشرتی زندگی پر زیادہ گہرے نقوش نہیں چھوڑ سکی۔ اس کے برعکس ادبا و شعرا کو اس نے ضرور کسی حد تک متاثر کیا۔ یوروپ کی رومانی تحریک کی بنیادی وجہ انقاب فرانس تھا لیکن انقلاب نے جن ارمانوں کو پروان چڑھایا تھا انقلاب کی کامیابی نے انہیں ٹھنڈا کر دیا کیونکہ انقلاب نے حکام کے چند مہروں کو ہی پکڑا تھا کہ جس کی وجہ سے کوئی مثبت ردعمل سامنے نہیں آیا بلکہ اس نے پرانے جاگیرداری نظام کو ہی مستحکم کیا۔ مغربی دنیا میں اس تحریک کا عمل دخل سب سے پہلے ہرڈر (Herder) کی تحریروں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ انہوں نے شاعری کو انسانیت کی زبان قرار دیا اور اپنے ہم عصر ادیبوں کو قومی اور ملی مزاج کے مطابق ادب تخلیق کرنے کی تلقین کی۔ ان میں ایک اہم نام جیمز میکفرسن کا ہے جنہوں نے اس نئی تبدیلی کے ساتھ چلنے کی کوشش کی، لیکن وہ اس میں کوئی زیادہ اپنی پہچان نہیں بنا سکے۔ اس کے بعد جونوجوان اس میدان میں ابھر کر سامنے آتے ہیں ان میں لینز، کلینگر، ملر اور ویگنر کے نام قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے اس فکر کو بروئے کار لانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور اسی قطار میں جرمن کا مشہور شاعر گوئٹے بھی شامل تھے۔ ان کی تصنیف ''ورتھر کا غم'' رومانیت کے حیوانی زاویے کی اور فاوسٹ فکری زاویے کی نمائندگی کرتی ہیں۔

جرمنی میں رومانی ادب کے آخری مفکر شلر کا نام آتا ہے۔ ان کا ڈرامہ ''Robbers'' کو اس تحریک کا روح رواں بھی کہا جاتا ہے۔ جرمنی میں اس تحریک نے اپنا رابطہ اور رشتہ مابعد الطبعیات کے ساتھ جوڑا۔ جرمن میں ان ہی ادیبوں نے انسانی ذہن کو جھنجھوڑا اور عروج عطا کیا اور ادب پر بھی اپنی فکر کے اثرات چھوڑے بلکہ بیسویں صدی نے ان ہی کے متعین کردہ اصولوں کو مطمح نظر بنایا۔ اس طرح یہ تحریک ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے انگلستان پہنچتی ہے اور انگلستان کے رومانی شاعر کالرج نے مشیلنگ کے نظریات کو بہت پسند کیا۔ ان کے نظریات کے اثرات ان کی تصنیف لٹریریا بیا گرافیکا میں نظر آتی ہیں۔ اس طرح یہ رومانی تحریک معجزاتی انداز میں انگلستان میں داخل ہوتی ہے اور یہاں پر رومانی شعرا میں بلیک کو اولین شاعر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ لیکن اس کے معاصرین نے انہیں رومانیت کا شاعر تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا۔ رومانی ادب کے شعرا میں ورڈز ورتھ کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے نظریات نے انقلاب فرانس سے راہ پائی تھی اور نیچر میں حسن کے تلاش کی جستجو شروع کی اور شاعری کے لیے عام فہم اور دیہاتی زبان کا استعمال کیا۔ ورڈز ورتھ کے ہمعصر کالرج کا شمار بھی رومانی ادب کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ انہوں نے رومانیت کو

ایک نئی روح اور تازگی عطا کی۔ وہ بیک وقت شاعر، نقاد اور مفکر بھی تھے۔ انہوں نے ''The Rime of Ancient Mariner'' اور ''کیلائی خان، کرسٹابل'' میں رومانیت کو تخلیقی جادو سے بھرپور زندگی عطا کی اس تحریک کے آخری شاعر Keats نے بھی رومانیت کے پرخار دروں میں سفر کیا۔ وہ مافوق الفطرت عناصر کے بجائے حقیقی دنیا کی ارضی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں جس کی عمدہ مثال ان کی نظم ''Labelle Dame Sans Merci'' ہے اور نثری ادب میں والپول، ولیم بیکفرڈ، جیمز وائٹ وغیرہ جیسے متعدد ادبا سامنے آئے۔ ان میں چارلس مالیمب، ولیم ہزلٹ اور ڈی کوئینسی نے بھی نثری ادب میں رومانیت کی داغ بیل ڈالی۔ انگلستان اور جرمنی میں رومانی تحریک کو روسو کی فکری جہت اور انقلاب فرانس سے رونما ہونے والے حالات کی وجہ قرار دیا جاتا ہے لیکن محققین کی آرا سے جو حقائق سامنے آتے ہیں وہ قدرے مختلف ہیں۔ امین کے رحمٰن کے مطابق ''رومانی تحریک کا آغاز Chaterabriand سے ہوتا ہے۔''

اٹھارہویں صدی کے نصف میں رومانی تحریک کو شکسپئر نے بھی بے پناہ مقبولیت عطا کی۔ دراصل رومانی تحریک کے خدوخال کے اثرات چوتھی صدی قبل مسیح میں قدیم یونانی دیومالاؤں میں بھی ملتا ہے۔ بہر حال یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کسی بھی تحریک کو ان کے روحانی رشتوں کو زمان و مکان کی حدود میں قید نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ تحریکیں راتوں رات جنم نہیں لیتی اور نہ ہی پروان چڑھتی ہیں بلکہ ان کا تانا بانا تیار کرنے میں صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ انور سدید رومانی تحریک کے بارے میں لکھتے ہیں:

''رومانیت کی اساسی روح افلاطون کے نظریات میں موجود ہے۔ چناں چہ جب افلاطون نے انسانوں کو ایک ایسا پرندہ قرار دیا جو بے پر ہونے کے باوجود قوت پرواز رکھتا ہے۔ تو درحقیقت انسان کے مخیلہ پر بالواسطہ مہر تصدیق ثبت کر رہا تھا۔ چناں چہ رومانیت اس کیفیت کو پالینے کا نام ہے، جب انسان کا مادی وجود ہمہ تن جذبے میں تحلیل ہو کر جسم کو پر لگا دیتا ہے۔ ولیم بلیک (William Blake) نے تخیل کو رومانی عمل کا مخرج قرار دیا ہے اور اس امر پر زور دیا ہے کہ تخیل خدا کا وہ عمل ہے جس سے وہ اپنی مخلوق کے ساتھ وابستہ ہے۔ کالرج فطری شاعر تھا اس لیے اس نے اپنے داخل کی آواز کو بگوش ہوش سنا اور عینی دنیا کو اعلیٰ ترین قوت والے انسان کا آشیانہ قرار دیا۔ کالرج تخیل کو زندہ طاقت تصور کرتا ہے اور اسے انسانی دانش کا محرک قرار دیتا ہے۔''

دراصل نویں صدی عیسوی میں رومانی زبان تحریری شکل میں سامنے آئی۔ چناں چہ ایک لمبے عرصے تک اس زبان میں صرف عشق و محبت کی کہانیاں لکھی جاتی رہیں اور اصطلاحی معنوں میں خیالی قصے کہانیوں کو رومانس کہا جاتا تھا۔ انگریزی ادب میں ان خیالی قصوں، مبالغہ آرائی، تخیلی دنیا میں محل تعمیر کرنا عقل کے خلاف باتیں کرنے کو ہی رومان کہا جاتا تھا۔ بہر حال ورڈز ورتھ اور کولرج کے خیال میں شاعری صرف آلہ اظہار ہی نہیں بلکہ اظہار فکر بھی ہے۔ رومانوی ادب کا اصل مقصد حیات و کائنات اور ان کے روحانی رشتوں کو سمجھنے اور پرکھنے کی ایک کوشش ہے۔ انگریزی ادب میں رومانی تحریک کا رجحان اور رومانوی فکر کس طرح داخل ہوتی ہے اس کے متعلق ساقی جاوید لکھتے ہیں:

''چناں چہ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں یہی کچھ ہوا اور انگریزی ادب میں ورڈز ورتھ اور کولرج کی مشترکہ کاوش LYRICAL BALLADS بن کر سامنے آئی۔ یہاں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ رومانیت کی یہ نئی تحریک شعر و ادب میں کن قدروں کی حامل تھی اور وہ زندگی کی کیا اور کس طرح تعبیر کرنا چاہتی تھی۔ اس سلسلے میں کچھ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ رومانیت کی تحریک کے علمبرداروں نے اپنے انداز فکر میں تعقل سے زیادہ تخیل اور تصور کو مشعل راہ بنایا۔''

دراصل کیٹس بائرن اور شیلے بھی رومانی نظام فکر کے حامی تھے اور اسی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں ورڈز ورتھ اور کولرج وغیرہ میں جو بنیادی نظریاتی فرق پایا جاتا ہے وہ ورڈز ورتھ اور کولرج کی طرح انسانی معاشرے سے فرار کے حق میں نہیں۔ انسانی معاشرے کی تعمیر پر اپنا سارا زور صرف کر دینا چاہتے تھے اور ارض وسماء کی ساری کائنات کے حسن کو جمع کر کے ایک حسین و جمیل کائنات کی تخلیق کرنا چاہتے تھے اور ایک ایسے نظام فکر اور معاشرے کی تعمیر کا خواب دیکھتے ہیں، جس کی بنیاد انسانی جذبات اور تخیل پر مبنی ہو۔

انقلاب فرانس نے پرانے اصول و نظریات کو یکسر مسترد کر دیا اور نئے اصول وضوابط وضع کیے۔ ان نئے اصولوں نے ایسے معاشرے کو جنم دیا جس نے پرانے اور کلاسیکیت کے اصولوں کو انسانیت کے خلاف قرار دیا۔ اس انقلاب نے امرا اور رؤسا کی اجارہ داری کو ختم کر کے مساوات اور آزادی کا نیا تصور دیا۔ کیونکہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور اسے آزادی سے رہنے اور جینے کا حق حاصل ہے۔ انقلاب فرانس سے اس طبقے کو بھی کھلی ہوا میں سانس لینے کا موقع ملا جو صدیوں سے امرا اور رؤسا کے واضح کردہ تہذیب کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ روسو نے تہذیب کے مقابلے میں نیچر کو ترجیح دی تاکہ انسان نیچر کے قریب رہ کر مساوات اور آزادی کے تصورات کو اپنا سکے اور یہی تصورات دراصل عام انسان کی ترجمانی کرتے تھے۔ اسی لیے عام آدمی نے ان تصورات کو اپنی آواز سمجھا۔ معاشرے پر بھی تیزی سے اس کے اثرات پڑنے شروع ہوئے اور ان تصورات سے فکر کے انداز بدلنا شروع ہوئے۔ کیونکہ کلاسیکیت کے نافذ کردہ اصول و نظریات صرف امرا اور وسا کے لیے تھے اور خواص کی زندگی کی ترجمانی کرتے تھے۔ انقلاب فرانس دراصل پرانے اصول و نظریات اور اسی طبقے کے خلاف جدوجہد کی تحریک تھی۔

انقلاب کے بعد جب عوام کی اپنی حکومت تشکیل پاتی ہے تب عام انسانوں کا ادب اور ان کے تصورات نے شرف قبولیت حاصل کیا۔ خواص کی جگہ عوام اور قدما کی جگہ دیہاتیوں نے لی اور عقل کی جگہ جذبات کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ کیونکہ عوام کے نزدیک جذبات عقل سے زیادہ اہمیت کے حامل ہے۔ کیوں کہ عوام عقل کے بجائے زیادہ تر کاموں کو جذبات کی رو میں آ کر انجام دیتی ہے اور بعد میں اسے عقلی دریچوں کے سانچے میں ڈھال کر اس کے لیے خیر اور شر کے راستے متعین کرتی ہے۔

ارسطو کے مطابق ''انسان عقلی حیوان ہے'' لیکن روسو کی رائے اس سے مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان ''جذباتی حیوان ہے''۔ اس لیے اس دور میں عقل کے بجائے جذبات اور حقیقت پسندی کے بجائے تخیلات اور امرا اور رؤسا کے بجائے عام عوام اور شہری زندگی کے بجائے دیہاتی زندگی ادب کا موضوع بننا شروع ہوتی ہے۔ اس سے پہلے ادب قدما کے معیار پر پرکھا جاتا تھا اور انفرادیت کا اس میں کوئی عمل دخل نہ تھا۔ لیکن رومانیت میں انفرادیت ادب کے لیے شرط اول ہے۔ اس طرح عام انسانوں کی زبان ادب کا معیار بنی۔ ان کے گیتوں، کہانیوں سے ایک نئی دنیا ابھر کر سامنے آئی۔ اس طرح ان بدلتے ہوئے حالات کے اثرات نہ صرف انسانی زندگی اور ادب پر پڑے بلکہ زندگی کے ہر شعبے یعنی سیاست، فلسفہ، معاشرت اور اقتصادیات پر بھی اثر انداز ہوئے اور جرمنی میں ان ہی بدلتے ہوئے رجحانات نے انگلستان اور فرانس میں بھی رومانیت کو فروغ دیا۔

جمیل جالبی کے مطابق ''ادب کی رومانی تحریک انگریزی قوم کے مزاج کے مطابق تھی''۔ جب روسو نے اس روایت کو اپنایا تو یہ تحریک انگلستان میں بھی مشہور ہوئی اور بڑی کم مدت میں انگریزی ادب میں دو بڑے نام ورڈز ورتھ اور کولرج سامنے آئے۔ کیونکہ ورڈز ورتھ انقلاب فرانس کے موقع پر فرانس میں موجود تھے اور اس انقلاب نے ان کی سوچ کو بدل دیا اور یہ انقلابیوں کے قافلے میں شریک ہو گئے، لیکن بہت جلد ان کو انگلستان جانا پڑا۔ اسی دوران ان کی ملاقات کولرج سے ہوئی اور ان دونوں نے مل کر نئی شعری روایات کی بنیاد ڈالی۔ کیونکہ انگریزی ادب میں اس

سے پہلے اس طرح کی کوئی روایات موجود نہیں تھی۔ ساری ادبی روایات پرانے ادبی مذاق پر قائم تھیں اس کے بعد ورڈ زورتھ نے شاعری کے لیے نئے اصول مرتب کیے اس کے بعد شاعری امراء ونوابین کے دربار اور قلعوں سے باہر نکل کر عام انسانوں کی زندگی کے احساسات سے موضوع تلاش کرنے لگی۔ عام انسانوں اور دیہاتیوں کی زندگی سے موضوعات حاصل کر کے اس کو شعری زبان میں پیش کرتے ہیں اور ان کے مسائل پر اپنی ادبی دنیا کی بنیاد قائم کرتے ہیں اور روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے نشیب وفراز کو شاعری میں پیش کرنے کی پیشکش کرتے ہیں، شہری زندگی کے برعکس دیہاتی زندگی سے دلچسپی اور ہمدردی ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے یہاں یہ احساس اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ دیہات میں بسنے والے نیچر سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ ان کی زبان میں تصنع و بناوٹ نہیں بلکہ مناظر قدرت کا فطری نمونہ ہوتی ہے۔ اس لیے ورڈ زورتھ دیہاتیوں کی زبان کو شاعری کے لیے موزوں قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک شاعری عقل کی حدود سے باہر تخیل کی دنیا میں پرورش پاتی ہے اور تخیل کے اصولوں کے تحت تخلیقی شکل میں سامنے آتی ہے۔ یہی اصل میں جذبات کا اظہار ہے۔ جذبات ہی اصل شے ہے اور شاعر کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ ان جذبات کو قارئین تک اسی انداز سے پہنچائے کہ وہ بھی ان کو اسی طرح محسوس کر سکیں۔ لیکن ورڈ زورتھ کے ہم عصر شاعر کولرج نے اپنی تصنیف ''بایوگرافیا لٹریریا'' میں ورڈ زوتھ کے نظریے سے بعض جگہوں پر اختلاف کیا ہے۔ ان کے نزدیک دیہاتیوں کی زبان معیاری نہیں ہوتی جس میں شاعری کی جا سکے بلکہ وہ بہت میکانکی ہوتی ہے اور اس کو تراش خراش کر اس کی نوک پلک کو سنوار کر کے شاعری کے قابل بنائی جا سکتی ہے۔ کولرج مفکروں کی زبان کو شاعری اور ادب کے لیے موزوں قرار دیتے ہیں۔ محمد ہادی حسن رومانیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جو عشقیہ داستانیں ازمنہ وسطی میں 'رومان' کے نام سے لکھی گئیں اگر کوئی منظر ان کے ماحول یا فضا کی طرف ذہن کو منتقل کرتا تھا تو اسے اس لقب سے ملقب کیا جاتا تھا۔ ان داستانوں میں تخیل واقعیت پر غالب ہوتا تھا۔ یعنی فرضی باتیں اصلی واقعات سے زیادہ اہم ہوتی تھیں۔''

15.2.2 اردو میں رومانی تحریک کا آغاز وارتقا:

جہاں تک اردو ادب میں رومانی تحریک کی آمد اور آغاز وارتقا کا تعلق ہے اس کے لیے کلیتاً کوئی سال وسنہ مقرر تو نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ کسی بھی تحریک کے اثرات اور اس کے خدوخال اور آثار ونقوش غیر محسوس انداز میں سامنے آنا شروع ہوتے ہیں، لیکن کبھی کبھار کوئی ایسا واقعہ پیش آتا ہے جو کسی بھی تحریک کے وجود اور انفرادیت کو قائم کرنے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بیسویں صدی کی ابتدا سے ہی رومانوی تحریک کے اثرات اردو ادب میں دیکھنے کو ملتے ہیں جو ایک طرف تو سرسید کی مفاہمتی تحریک کے رد کی شکل میں اور دوسری طرف نئے رنگ و بو کے جہاں کی تلاش میں سامنے آ رہے تھے۔ لیکن یہ ان ادیبوں کی انفرادی افتاد طبع تھیں کیونکہ سرسید کے عہد میں واضح طور پر رومانوی تحریک اجتماعی شکل میں سامنے نہیں آئی۔ لیکن یہ تمام انفرادی کاوشیں اسے تحریک کی شکل فراہم کرنے میں مناسب وقت کے انتظار میں تھیں۔ برصغیر میں سیاسی، سماجی اور فکری انقلاب نے نئی کروٹ لی تو اس نے ادب کو نئے موضوعات اور نئے فنی زاویوں سے روشناس کرایا جس کے نتیجے میں ان نئے زاویوں نے رومانوی تحریک کو جنم دیا۔ اس نئے تصور نے اردو ادب میں جدید ذہنوں کے منتشر رجحانات کو یکجا کرنے اور تحریک کی شکل دینے میں سر عبدالقادر کے رسالہ ''مخزن'' نے صحیح سمت عطا کی اور اس تحریک کی رہنمائی بھی کی۔ اس ادبی مجلّے میں سب سے پہلے سجاد حیدر یلدرم کے مضامین شائع ہونے شروع ہوئے اور ان ہی کے مضامین نے اردو ادب میں رومانوی تحریک کے اسلوب کو باقاعدہ اپنی تحریروں میں جگہ دی۔

رومانوی تحریک کا باقاعدہ آغاز اجتماعی طور پر رسالہ مخزن میں یلدرم کے مضامین سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد جن ادبا اور شعرا نے رومانوی

رجحان اور فکر کے تحت اپنی تحریروں سے مخزن کے مشن کو آگے بڑھایا ان میں علامہ اقبال، مولانا آزاد، ظفر علی خان، مرزا محمد سعید، خوشی محمد ناظر، مہدی افادی، لطیف الدین احمد، خواجہ حسن نظامی، شیخ عبدالقادر اور سجاد حسین کے نام قابل ذکر ہیں جنھوں نے سرسید کے عہد کے علمبردار ہوتے ہوئے بھی اپنی تحریروں میں نئے اور بدلتے ہوئے ادبی رجحانات کو جگہ دی ہے۔ پروفیسر محمد حسن کے مطابق ''اس جدید ذہن کی 'مخزن' اور 'نقاد' نے ایک سمت کی طرف رہنمائی کی۔ 'مخزن' اور 'نقاد' نے اردو ادب میں وکٹورین انگلستان کی تہذیب کو آدرش تسلیم کیا اور صاف ستھرے مذاق کی روایت استوار کی''۔ جذباتی سطح پر پہل پہلے اس کے ابتدائی نقوش محمد حسین آزاد، میر ناصر علی دہلوی اور عبدالحلیم شرر کی تحریروں میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

مخزن کے لکھنے والوں کے علاوہ جن ادبا کی تخلیقات نے رومانوی تحریک کو جلا بخشی ان میں نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، خان احمد حسین خان، حسرت موہانی، فانی بدایونی، اختر شیرانی، جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، معین احسن جذبی، فراق گورکھپوری، عظیم بیگ چغتائی اور امتیاز علی تاج وغیرہ نے نثری اور شعری ادب کے ذریعے اردو ادب میں رومانوی تحریک کے رجحانات کو برتا اور اس تحریک کو فروغ بخشا۔

عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناولوں میں رومانی رجحان نمایاں ہے۔ اگرچہ ان کے تاریخی ناول مسلمانوں کے اصلاحی پس منظر میں لکھے گئے ہیں لیکن ان میں رومانی عنصر کی فراوانی بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے معاشرتی ناولوں میں بھی تخیل اور جذباتیت کے رجحان کو بخوبی برتا ہے۔ جس کی زندہ مثالیں ''بدرالنساء کی مصیبت'' میں تخیلی اور جذباتی فراوانیاں نمایاں ہیں۔ بدرالنسا کی شادی، اس کا خضر کے ساتھ سفر کرنا اور راستہ میں ایک شریف النفس نوجوان سے ملاقات وغیرہ ان سارے واقعات میں حقیقت نگاری کا کہیں بھی شائبہ نہیں ہوتا۔ شرر کے یہاں رومانوی انداز فکر کا غلبہ ''یوسف و نجمہ'' میں نمایاں ہے۔ اس ناول کا مواد ہندوستان کی سرزمین میں تیار کیا گیا ہے۔ اس لیے اس میں ہندوستانیت کی خوبیاں اور خامیاں ملی جلی نظر آتی ہیں۔ علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

''ناول کی سب سے بڑی خوبی اس کی رومانی فضا ہے جس کو شرر نے بڑی دلچسپ ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ چوں کہ ناول کی کہانی ہیرو کی زبانی کہلوائی گئی ہے۔ اس وجہ سے کہانی میں ایک کشش بھی ہے اور نیا پن بھی۔ الغرض یوسف نجمہ خالص رومانی داستان ہے۔''

سجاد حیدر یلدرم کے مضامین ایک مدت تک باقاعدہ مخزن کی زینت بنتے رہے۔ اردو ادب میں یلدرم کے مضامین نے رومانی فکر اور رومانی اسلوب کا آغاز کیا۔ ان کے مضامین ابوالکلام کی طرح خطیبانہ اور مقصدی نہ تھے۔ ان کے ہاں رومانی فکر کے اثرات ابتداء سے ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یلدرم کو ترکی سے بے حد محبت تھی جس کے بارے میں۔ انور سدید لکھتے ہیں ''یلدرم نے ترکی کو اپنا آئیڈیل بنایا''۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے اردو ادب کے نابغہ روزگار شخصیت رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں ''ترک نہ کبھی غلام رہے نہ کبھی کسی کو غلام رکھا''۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی دونوں تخلیقات ''خارستان وگلستان'' اور ''سودائے سنگین'' ترکی سے ماخوذ ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے دوسرے افسانوں میں بھی تخیل کی بلندی اور جذبے کی فراوانی کی وجہ سے رومانی ادب کی پرچھائیاں نمایاں ہیں۔ ان کے افسانوں کی رومانوی انانیت کے بارے میں محمد حسن لکھتے ہیں:

''دراصل یلدرم کے افسانوں میں رومانوی تحریک کے مخصوص محاسن اور معائب دونوں ملتے ہیں وہی جذباتیت اور ماورائی حسن کی تلاش رومان اور حسن کو سماجی پس منظر سے فرار کا ذریعہ بنانا اور اسے زندگی سے ہم آہنگ کرنے کے بجائے خیالستان کی تعمیر میں صرف کرنا ان کے ہاں واضح طور پر ملتے ہیں''۔

یلدرم کے ہاں فطری انفرادیت ہے۔ وہ ایک خوش وخرم البیلے نوجوان کی شکل میں اپنی تحریروں میں کرداروں کے ذریعے رنگ بھرتے ہیں،

لیکن ان کے ہاں گھن گرج اور انقلابی جوش نظر نہیں آتا بلکہ اس رنگ برنگی دنیا میں ایک تازگی اور شادابی بکھیرتے نظر آتے ہیں اور اپنی تحریروں میں ایک خوش مذاق نوجوان کی صورت میں تخیلاتی دنیا میں ایک الگ جہاں آراستہ کرتے ہیں اور ان میں مشرقی وضعداری اور مغربی آزادی کے امتزاج سے رنگ بھرتے ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم نے اپنی تخلیقات میں کرداروں کے ذریعے فطرت کے پراسرار منظر کو پیش کیا ہے جس نے اردو ادب بلکہ ہندوستانی معاشرے کو ایک نئی فکر سے روشناس کیا ہے۔ جس میں حسن ارضی میں رومانی سرور وانبساط سے مرغوب ہونے کا رجحان نمایاں ہے۔ یلدرم کے ہاں تخیل پرستی اور ماورائیت میں مغربی طرز فکر ہے، لیکن وہ مغربی انداز فکر سے زیادہ مشرقی تمدن کے پروردہ نظر آتے ہیں۔ یلدرم نے اپنے افسانوں میں عورت کے کردار کو نئے روپ میں پیش کیا ہے، جس میں وہ تعلیم یافتہ، خوددار، انانیت پسند اور پوری انفرادی ذمہ داری کے ساتھ معاشرے میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ ان کے افسانے اردو ادب میں رومانی فکر، تخیل کی بلندی اور شدت جذبات کی فراوانی کا اہم ترین نمونے ہیں۔

مجنوں گورکھپوری نے بھی بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ادبی شہ پارے کا رخ اسی طرف موڑ دیا۔ کیونکہ مجنوں نیاز فتح پوری سے بہت متاثر تھے۔ یہ وہ عہد تھا جب اردو ادب کے ادیب مغربی انشاء پردازوں چیخوف، موپاساں ہارڈی، جیمس جوائس وغیرہ سے متاثر ہو رہے تھے بلکہ ان کے اثرات قبول کر رہے تھے اور اسی دور میں ادب لطیف کے زیر اثر نثری ادب میں رومانیت سر اٹھا رہی تھی اور یہ فکری رجحان اردو نثری ادب میں ٹیگور کے توسط سے داخل ہو رہا تھا اور نیاز فتح پوری اس طرز فکر اور رجحان کے برتنے میں بخوبی ماہر تھے اور ان ہی کے زیر اثر مجنوں افسانہ نگاری کا آغاز کرتے ہیں۔ انہوں نے پہلا افسانہ ''زیدی کا حشر'' نیاز کے افسانہ شہاب کی سرگزشت سے متاثر ہو کر لکھا، جس کو ناولٹ بھی کہا جاتا ہے۔ ان کے بعض افسانوں میں مغرب کا رنگ جھلکتا ہے۔ مغربی ادب کا وسیع تر مطالعہ اس کی بنیادی وجہ تھی۔ ان کے بعض افسانے طبعزاد تھے۔ انہوں نے خالص طبعزاد افسانے بھی لکھے ہیں۔ ان میں ''محبت کا جوگ'' اور ''تم میرے ہو''، وغیرہ میں رومانی جذباتیت کی فراوانی ہے اور وہ ایک سلجھے ہوئے ذہن کے قلم کا کرشمہ معلوم ہوتی ہے۔ ان میں محبت کے المناکیوں سے نقاب کشائی کی ہے۔ ان میں مشرقی فضا اور معاشرے میں مغربی خیالات اور رجحان کا ایسا غیر متوقع سنگم تیار کیا ہے جن کا ایک دوسرے میں آسانی سے مدغم ہونا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن ان کے ہاں مشرق ومغرب کا بڑا دلکش امتزاج ملتا ہے۔ بقول فرمان فتح پوری ''ان کا ذہن اپنے سائنٹفک انداز فکر کے لحاظ سے مغربی اور ان کا دل اپنے طرز احساس کے اعتبار سے خالص مشرقی ہے''۔

مجنوں کی یہی وہ خصوصیت ہے جس کے سبب ان کی تحریروں میں توازن واعتدال کی ایک خوشگوار لہر نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں رومانی جذباتیت ہے اور رومانیت میں ایک ٹھہراؤ ہے اور سنبھلی ہوئی شکل میں سامنے آتی ہے۔ جذبات کی شدت کے ساتھ ساتھ تشکیک کی جھلکیوں کا احساس بھی ہوتا ہے۔ سب سے اہم بات جو ان کے افسانوں میں ملتی ہے وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے جو اثرات قبول کرتے ہیں اس کا احساس ان کے افسانوں میں ہوتا ہے۔ ان کے سارے افسانے خواب وخیال، شکست بے صدا، محبت کی قربانیاں، ''ایک نکمے کی سرگزشت''، سراب، محبت کی فریب کاریاں، سوگوار سباب، گردش اور مراد میں رومانوی اور تخیلی جذبات کا احساس نمایاں ہے اور عشق ومحبت کی تخیلی دنیا میں خوبصورت محل تعمیر کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں عشق ومحبت کا انداز انوکھا اور نرالہ ہے۔ وہ رومانی افکار واقدار کی اعلیٰ نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے ہاں وصل کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اگر وصال ہو بھی جائے تو یہ محبت کی ناکامی اور موت ہے۔ اس سے محبت کے ساز وسوز کم ہوتے ہیں اور اس سے بدمزگی بھی پیدا ہوتی ہے بلکہ محبت کی تکمیل یہ ہے کہ اس میں تڑپ کر جان دینا ہی اصل زندگی ہے۔ بقول پروفیسر محمد حسن:

''مجنوں کی کہانیوں میں محبت ناکامی کا دوسرا نام ہے جس کی سزا اور پاداش سوائے گھل گھل کر مرنے اور خود کو بیخ و بن سے اکھاڑ ڈالنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور اس کے مختلف طریقے ہیں۔ خواب و خیال میں حسن اور محبت بیماری کی نظر ہو جاتے ہیں اور ''محبت کی قربانیاں'' اور ''مدفن تمنا'' میں یہ خود شکستگی سیاسی زندگی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے''۔

اردو رومانی ادب میں مہدی افادی کا شمار ان چند اہم رومانی ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اس نئے ادبی مذاق کو جذباتیت کے طور پر اپنایا اور مہدی افادی کے جذبے میں ٹھہراؤ کم ہے بلکہ ترقی پسندوں کی طرح ان کے ہاں جذبہ آتش فشاں کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مہدی افادی عربی، فارسی اور یونانی علوم سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ فارسی اور عربی ادب میں رومانیت بدرجہ اولیٰ موجود ہے۔ اس لیے ان کے ہاں خوب سے خوب تر کی تلاش کا جذبہ نمایاں ہے۔ بقول محمد حسن:-

''تلاش حسن کا تکملہ مہدی افادی اور سجاد حسین کے ہاتھوں ہوا۔ مہدی افادی کے مضامین ادب اور زندگی میں اول درجہ کی چیزوں کی تلاش کرتے ہیں۔ انہوں نے مضامین مختلف اور متنوع موضوعات پر لکھے ہیں۔ لیکن ہر جگہ یونانی نقطۂ نظر کی پرچھائیاں بکھری ہوئی ہیں۔ مہدی نے جمالیات کو فلسفے کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کی بلکہ جمالیات کے جذبے اور احساس حسن سے پوری طرح لطف اندوز ہوئے۔

مہدی افادی کے مضامین میں جمالیاتی جذبہ اور احساس حسن کا پلڑا مادیت پرستی کی جانب جھکا ہوا دکھائی دیتا ہے اور کہیں کہیں تو فحاشی اور عریانیت کا شائبہ بھی ہونے لگتا ہے۔ اس کا احساس ان کے افسانوں کے پڑھنے کے بعد ہوتا ہے۔ مہدی افادی لکھتے ہیں:

''سینہ کا حصہ افقی بالکل کھلا ہوا ہے اور اودی اودی رگوں کے پیچ و خم اور اعصاب کی کھینچ تان بتا رہی ہے کہ سرکشی لباس کی ممنوع نہیں بلکہ لباس خود سانچے میں ڈھل گیا ہے۔ نہایت باریک ریشم کی ساڑی آج کل کے مروجہ چست زیر سایہ زیر کمر ہے۔ نرم اور لچکدار جسم کے ساتھ قلمکار ساق بلوریں سات پردوں میں بھی پاکباز شوہر کے تار نظر کا مرکز بنی ہوئی ہے''۔

بہرحال ان کے ہاں انفرادیت ہے، جذباتیت اور تخیل کی بلند آفرینی ہے۔ اس لیے جہاں کہیں مشرقی اور مغربی تہذیب کے امتزاج کو پیش کرتے ہیں وہاں سماجی سطح کی حقیقتوں سے بھی پردہ سرکاتے ہیں۔ ایسا وہ جنسی لذتیت کے لیے نہیں بلکہ ان کے اس انداز سے یوٹوپیا کی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔

قاضی عبدالغفار کی تخلیقات میں بھی رومانی طرز فکر کی رعنائیاں ہیں۔ خاص طور سے ان کے مختصر ناولوں میں اس فکری انفرادیت کی گہری چھاپ ہے۔ ان کے یہاں جذبات کا وفور ہے اور رومانیت اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ اس میں رنگینی کے ساتھ ساتھ زندگی سے بے راہ روی اور بغاوت بھی ہے۔ بلکہ انہوں نے رومانوی تحریک کو ایک نئے حسن سے آراستہ کیا ہے۔ ان کی تصنیف ''لیلیٰ کے خطوط'' رومانی فکر و فن کے اعتبار سے اہم ہے۔ محققین اس کو لے کر تضاد کا شکار ہیں کہ اس کو ناول تسلیم کیا جائے یا نہیں۔ یہ الگ موضوع ہے لیکن جہاں تک اس میں رومانوی رجحانات کا تعلق ہے۔ انہوں نے رومانوی انداز بیاں تخیلی اور جذباتی قدروں کو اس میں سمویا ہے۔ اس ناولٹ کے کردار فنی اعتبار سے کمزور ہیں کیونکہ ان کے خطابی انداز اور جذباتی گفتگو سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ عبارت قاضی عبدالغفار کی ہے اور آواز لیلیٰ کی ہے۔ اسی وجہ سے لیلیٰ کے مکالموں سے یہ نہیں لگتا کہ ان میں کوئی عاجزی و انکساری ہے بلکہ آواز میں کھنک اور جوش ہے۔ ان کے دونوں ناولوں ''لیلیٰ کے خطوط'' اور ''مجنوں کی ڈائری'' کی ادبی اہمیت اور عظمت مسلم ہے۔ لیلیٰ کے خطوط میں انہوں نے ایک طوائف کے ذہنی ارتعاش کو موضوع بنایا ہے جس میں وہ مردوں کے تعمیر کردہ سماج سے ناخوش

نظر آتی ہے۔ کیونکہ اس نام نہاد سماج نے عورتوں پر ہر دور میں ظلم ڈھائے ہیں۔ ہیئت کے لحاظ سے لیلیٰ کے خطوط مجنوں کی ڈائری سے زیادہ اہم ہے۔ لیکن رومانوی نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو دونوں رومانوی اصول وضوابط کی پاس داری کرتے نظر آتے ہیں جس کا اظہار محمد حسن نے اس طرح کیا ہے:

''لیلیٰ کے خطوط'' میں جذباتیت کی فراوانی اور خطابت کا جوش ہے اور اس لحاظ سے وہ مکمل رومانوی تخلیق ہے۔ لیکن عشق جنسی زندگی اور سماجی رفاقت کا جو رویہ قاضی عبدالغفار نے پیش کیا وہ بڑا تعمیری اور صحت مند ہے۔ اس میں محض جذباتی ابال ہی نہیں بلکہ سماجی ذمہ داری اور اجتماعی آہنگ کا پورا احساس ملتا ہے''۔

قاضی عبدالغفار نے رومانی تحریک میں نئی وسعتوں اور نئی جہتوں کو جنم دیا ہے اور رومانی فکر میں نئی قدروں کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے اور توازن کو بھی برقرار رکھا ہے۔ لیلیٰ کے خطوط میں لیلیٰ کا کردار جنسی تسکین کی تکمیل کے لیے نہیں بلکہ خیالی دنیا میں تصورات کا محل تعمیر کرتی نظر آتی ہے۔ وہ اپنے والد کے ساتھ سفر کرتی ہے اور منگیتر بھی ساتھ ہے اور دونوں دوران سفر ہی آناً فاناً کسی دوسرے کی ہو جاتی ہے۔ والد اور منگیتر دونوں ایک دوسرے کا منھ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اسی اثنا میں کوئی دوسرا نوجوان اس سے جنسی تسکین حاصل کرتا ہے۔ اس میں تکنیک کا رنگ نمایاں ہے کہ تینوں کی موجودگی میں اسے گلے کا ہار بنایا اور مسل کر پھینک دیا۔ یہ محض خیالی دنیا کی پروازیاں ہیں جو حقیقت سے دور اور بعید از قیاس معلوم ہوتی ہیں۔

نیاز فتح پوری بھی اسی عہد کے پروردہ ہیں۔ جب نئی اور پرانی قدروں کی کشمکش جاری تھی کچھ ادیب ان میں سے بعض قدروں کو باقی رکھنے اور بعض کو حذف کرنے کے حق میں تھے اور اسی عہد میں ان قدروں سے بغاوت وتصادم کا رجحان بھی پرورش پا رہا تھا۔ مغربی ممالک کے اثرات یہاں کے ادبی اور فکری رجحان پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ حقیقی دنیا کی تعمیر کو چھوڑ کر تخیلی اور جذباتی دنیا کا رجحان عام ہو رہا تھا۔ انہی فکری جذباتیت رومانی ماورائیت اور تخیلی رجحانات کا احساس نیاز فتح پوری کے ہاں ملتا ہے۔ ان کے ناول ''شاعر کا انجام'' اور ''شہاب کی سرگزشت'' اسی نظریۂ عمل کی پیداوار ہیں جن میں تخیلی بلندی اور جذباتیت کی بہتات ہے لیکن اول الذکر ناول کے مقابلے میں ''شہاب کی سرگزشت'' میں جذبات پر عقل کی گرفت بھی نظر آتی ہے۔ انہوں نے بھی دوسرے ادیبوں کی طرح یونانی اور ترکی ادب سے متاثر ہو کر انگریزی ادب کے اثرات قبول کیے ہیں جس کا ذکر انہوں نے خود بھی کیا ہے۔

''آسکر وائلڈ کا منطقی قول محال (Paradox) مجھے بہت پسند تھا۔ شہاب کی سرگزشت میں آسکر وائلڈ چھپا ہوا ہے''۔ اس میں شک نہیں کہ دونوں ناولوں کا انداز بیاں، احساس فکر ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ شاعر کا انجام میں صرف وفور جذبات ہے اور یہی جذباتی ارتعاشات اس کو حقیقت پسندی سے دور کرتے ہیں جو اس ناولٹ کے کرداروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے جس کی عمدہ مثال افضال کا کردار ہے۔ شہاب کی سرگزشت ان کے پہلے ناول سے کئی لحاظ سے بہتر ہے۔ اسلوب نگارش میں نکھرا ہوا انداز بیاں ہے، ایک ٹھہراؤ ہے، جذباتیت کے ساتھ ساتھ عقلیت پسندی اور انفرادیت پسندی کا امتزاج بھی ہے۔ اس ناول کے کردار حقیقی دنیا کے کردار ہوتے ہوئے بھی تخیلی اور جذباتی آمیزش سے لبریز ہیں، جس سے اس ناول میں جمالیاتی حسن کے ساتھ رومانوی فکر بھی کارفرما ہے۔ دراصل نیاز اس رجحان کی پیروی کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ وصل موت کی علامت ہے۔ ہجر میں وصل کا احساس، تڑپ اور بے چینی سے جو لطف حاصل ہوتا ہے وہ وصل میں کہاں ملتا ہے۔ یہی احساس ان کے اس ناول کو رومانیت کی بیزارگی میں شامل کرتا ہے۔ نیاز فتح پوری کے مطابق ''کیا تمہیں یقین ہے کسی سے مل جانا ملنے کی آواز سے زیادہ پر لطف ہے۔ کیا تم واقف نہیں کہ آرزو کا حصول آرزو کی موت ہے۔ یاد رکھو لطف کا حقیقی راز صرف خلش ہے۔''

رومانی ادیبوں کے علاوہ اور بھی بہت سے اہم نام ہیں، جن کے شعری اور نثری تخلیقات میں رومانوی فکر وفن کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ اس لیے انہیں رومانی ادبا کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ فراق گورکھپوری گرچہ ترقی پسندیت سے وابستہ تھے لیکن ان کی شاعری میں رومانوی عنصر نمایاں ہے۔ انہوں نے بت شکنی کو جنم دیا۔ ان کے خوابوں اور جذبوں کے پس منظر میں ایک دوسری دنیا آباد نظر آتی ہے۔ ان کے علاوہ خلیق دہلوی کے ہاں بھی رومانیت کا جذبہ اور فکر کی ماورائیت نمایاں ہے اور اسی طرح مرزا ادیب نے رومانی تخیل کو داستان گوئی کے فن میں سمویا ہے۔ ''صحرا نورد کے خطوط'' ان کی ایسی داستانیں ہیں جن میں رومانوی عنصر پائے جاتے ہیں کیونکہ پرانے زمانے میں خیالی داستانوں سے ہی امرا اور وسا لطف اندوز ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں عظیم بیگ چغتائی کی تحریروں میں بھی رومانی تخیل پذیری اور جذبات کی شدت کا احساس ہوتا ہے۔

کشن پرشاد کول کا شمار بھی رومانی ادبا میں ہوتا ہے۔ ان کے ہاں مذہب اور سماج سے بیزارگی پائی جاتی ہے۔ خاص کر ان کے ناول ''شاما'' کا انداز بیاں رومانی ادبی مذاق کے زمرے میں آتا ہے۔ ''شاما'' میں مذہب اور سماج سے بغاوت صرف ذہنی کیفیت تک محدود رہتی ہے عملی صورت اختیار نہیں کرتی بلکہ صرف ایک جذباتی احساس اور تمنا ہے۔ اس کے علاوہ ناول نگار علی عباس حسینی کے ناول ''سر سید احمد پاشا یا قاف کی پری'' بھی رومانی فکر وفن کی ترجمانی کرتے ہیں۔ علی عباس حسینی کی رومانی فکر کشن پرسادکول اور نیاز فتح پوری سے قدر مختلف راستے اختیار کیے ہوئے ہے۔ انہوں نے صرف حسن و عشق کے قصوں کو تخیلی اور جذباتی انداز میں پیش کیا ہے اور اپنے اردگرد میں رونما ہونے والے حقیقی مسائل سے فراریت کا راستہ اختیار کیا اور خیالی دنیا میں محل تعمیر کر کے اس میں پناہ لیتے ہیں۔

اسی طرح اردو شاعری کا جائزہ لیا جائے تو اردو شاعری میں رومانیت کا ذوق شروع سے ہی پایا جاتا ہے۔ حالی اور اقبال کے علاوہ جن شعرا کے ہاں رومانوی عنصر نمایاں ہیں ان میں حفیظ جالندھری کا نام سرفہرست ہے انھوں نے زندگی کی مادیت پرستی سے نقاب کشائی کی ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ عظمت اللہ خان اور جوش ملیح آبادی کے ہاں رومانی جذبہ فکر کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی طرح اختر شیرانی رومانیت کی ایک توانا آواز ہے۔ ان کے یہاں رومانیت وطن سے محبت کے جذبے کی صورت میں پائی جاتی ہے۔ رومانی مکتبہ فکر سے متاثر ساغر نظامی اور احسان دانش بھی نظر آتے ہیں۔ ساغر نظامی نے تینوں کے اثرات قبول کیے ہیں بلکہ اقبال کی حب الوطنی کی روایت حفیظ کی نغمگی اور اختر شیرانی کی لاابالی محبت کو مدغم کر کے رومانیت کو ایک ایسا زاویہ نگاہ سے پیش کیا ہے جس میں جذبہ فکر اور انفرادیت دونوں موجود ہیں۔ احسان دانش کی رومانیت اپنی مٹی کی دین ہے۔ ان کے ہاں مغربی اثرات نظر نہیں آتے۔ ان کی رومانوی تخیل پسندی اور جذبے کے وفور کے نقوش ان کی نظموں 'سولن کی ایک شام'، 'شام اودھ'، 'بیتے ہوئے دن'، 'صبح بنارس میں' رومانی انداز بدرجہ اولیٰ موجود ہے۔

اس طرح سے ساڑھے تین دہائیوں پر مشتمل رومانوی تحریک نے اردو ادب کو بدلتے ہوئے حالات کے سانچے میں ڈھال کر ایک ایسا تغیر پذیر اسلوب فراہم کیا اور ایسے اثرات مرتب کیے جنہیں اردو ادب کی تاریخ فراموش نہیں کر سکتی، لیکن اپنی زندگی کے مختصر عرصہ لگ بھگ پینتیس برسوں میں ہی رومانوی تحریک نے اردو ادب کو نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ اس کے بعد 1935ء میں برصغیر میں ایک دوسری ادبی تحریک ابھر کر سامنے آئی اور اس کے بعد رومانوی تحریک پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ اس طرح 1901ء میں اردو ادب میں داخل ہونے والی رومانوی تحریک 1935ء میں پس منظر کی جانب پیش قدمی کرتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ رومانوی تحریک اردو ادب کی ایک فعال اور متحرک تھی جس نے اس عہد کے لکھنے والوں پر گہرے اور وسیع اثرات

مرتب کیے۔ آخر میں اس تحریک کے ساتھ بھی وہی ہوا جو اکثر دوسری ادبی، سیاسی اور سماجی تحریک کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس تحریک میں بھی دھیرے دھیرے خامیاں آنا شروع ہوئیں اور متعین کردہ اصول وضوابط سے انحراف نے اس تحریک کو بھی زوال کی راہ دکھائی۔ رومانی ادب یا رومانی تحریک کی جڑوں کو دوسری زبانوں یعنی سنسکرت اور عربی، فارسی میں بھی تلاش کیا جاسکتا ہے۔

15.2.3 اردو ادب پر رومانی تحریک کے اثرات:

بیسویں صدی کے آغاز سے قبل کی تحریکوں کا رجحان اصلاحی اور حقیقت پسندی کا تھا۔ تحریک علی گڑھ کے علاوہ انجمن پنجاب بھی بڑی اہم ادبی تحریک ہے۔ اس تحریک نے بھی مشرقی علوم کے علاوہ مغربی علوم کو بھی اپنی ادبی اور علمی حلقوں میں جگہ دی۔ بیسویں صدی میں عالمی سطح پر جو سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کے اثرات سے ہندوستان کا ادب داخلی اور خارجی سطحوں پر کسی حد تک متاثر ضرور ہوا اس میں ہیئتی تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں۔ فکری اور موضوعاتی سطح پر بھی اس طرح کی تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ سب سے پہلے اس نئے انداز فکر کے اثرات مولانا حالی کے یہاں ملتے ہیں۔ انہوں نے جدید اردو شاعری کو نئی سمت عطا کی اور انجمن پنجاب کے سرگرم کارکن محمد حسین آزاد نے اردو نظم میں ردیف اور قافیہ کے تجربات کو ترک کرنے کا مشورہ دیا جس نے صنف مثنوی کے لیے راستے ہموار کیے اور ان نئے تجربات اور مغربی علوم کی پیروی میں آزاد اور حالی بعض جگہوں پر ایک ساتھ نظر آتے ہیں اور اس ضمن میں مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ انہوں نے انگریزی نظموں کے ترجمے کے علاوہ اسی طرز پر اردو میں نظمیں لکھنے کی کوشش کی اور مغربی فکر کی جھلکیاں عبدالحلیم شرر اور طباطبائی کی تحریروں میں بھی ملتی ہیں۔ انہوں نے آزاد نظم اور نظم معرا جیسی صنف کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ لیکن یہ مخصوص انداز فکر اردو ادب کے لیے کتنا بارآور ثابت ہوا، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ مقامی سطح کی ان تبدیلیوں کے علاوہ بین الاقوامی سطح کی تبدیلیوں کے اثرات کا عمل دخل بھی شروع ہو رہا تھا۔ مقامی سطح پر علی گڑھ تحریک اس کی بڑی وجہ رہی ہے۔ کیونکہ سرسید کے عہد میں ہی ایسے عناصر متحرک ہو چکے تھے جو سرسید تحریک کی حد سے تجاوز کردہ عقلیت پسندی سے انحراف بالواسطہ طور پر کر رہے تھے۔ ان کی تحریروں سے اس کا احساس بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ اختلافات کی سطحیں ہر ایک کی الگ الگ درجے کی ہوتی ہیں۔ اس کے ابتدائی نقوش ''اودھ پنچ'' میں لکھنے والوں کے یہاں ملتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ اودھ پنچ کے مدیر منشی سجاد حسین سرسید کے کٹر مخالف تھے۔ ان کے ساتھ ہی اودھ پنچ میں مخالف سمت میں ابھرنے والی بڑی اور مضبوط آواز اکبرالٰہ آبادی کی تھی۔ کیونکہ اکبر کی اپنی ایک فکر تھی جو حالات کی تند و تیز آندھیوں میں بھی ڈگمگائی نہیں۔

اکبرالٰہ آبادی کی مذہب سے وابستگی اور مذہبی نظام فکر کے حق میں احتجاج اس وقت کارگر ثابت ہوتا دکھائی دیتا ہے جب بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں علامہ اقبال، حسرت موہانی اور مولانا محمد علی جوہر جیسے بڑے بڑے مفکروں کی ذہنی اور فکری آواز ان کی حمایت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے مغرب سے چلی آ رہی تند و تیز تبدیلیوں سے مفاہمت کے بجائے مشرقی اور مغربی سوچ میں توازن قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس بدلتے ہوئے نظام فکر میں ادبا و شعرا اپنی اپنی سوچ اور نئی ادبی فکر کے ساتھ سامنے آ رہے تھے۔ اس سلسلے میں مولانا شبلی بھی سرسید کے نظریات کے رد میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ گرچہ علامہ شبلی بھی علی گڑھ تحریک کے پروردہ تھے لیکن ان کا تخلیقی انداز بیاں سرسید کے مزاج سے مختلف تھا اور ان کے یہاں روانی اور سادہ اسلوب بیان ہے۔ ان کے اسلوب میں رومانیت کی فکر بھی موجود ہے جس کا ذکر ڈاکٹر محمد خان اشرف نے بھی کیا ہے ''ایک اور رومانی مزاج ادیب اور مفکر جو سرسید کی مقصدی تحریک کا آلہ کار بنا وہ شبلی تھے۔ شبلی ایک جامع الصفات شخصیت تھے جن کی طبع زاد رومانیت زیادہ عرصہ سرسید تحریک کے مقصدی اور عقلی بوجھ تلے نہ دب سکی۔''

برصغیر کی پچھلی کئی سو سالہ تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان مدتوں غیر ملکی حملہ آوروں کا شکار رہا ہے۔ کبھی غزنوی اور غوری کے حملوں اور کبھی شیر شاہ سوری اور احمد شاہ ابدالی سے اپنے تحفظ کی جنگ لڑتا رہا ہے اور شمال وجنوب سے ہونے والے ان حملوں کی یلغار یہاں کے سیاسی، معاشرتی، سماجی اور ادبی ماحول پر بھی اثر انداز ہوتی رہی ہے۔ لیکن ان تمام ہلچل اور نشیب وفراز کے باوجود برصغیر کی یہ سرزمین اپنی تہذیبی شناخت کو کسی نہ کسی صورت میں بچائے رکھنے میں کامیاب رہی۔ لیکن جب انگریز ہندوستان میں داخل ہوئے تو ان کی آمد سے ملک ایک نئے تاریخی دور میں سانس لینے لگا۔ وہ اپنے ہمراہ صنعتی انقلاب کے علاوہ غیر شخصی راج کے نظام فکر کو لے کر داخل ہوئے اور ان کا یہی نظام فکر یہاں کے تجارتی، صنعتی، سماجی ومعاشرتی نظام پر اثر انداز ہوا۔

عبدالحلیم شرر اگرچہ علی گڑھ تحریک کے معاون ومحسن تھے لیکن انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے رسالہ ''تہذیب'' اور ''دل گداز'' میں علی گڑھ تحریک کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کیا ہے۔ لیکن ان کے ناولوں میں رومانوی اثرات کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ ان کے علاوہ میر ناظر علی، مہدی افادی اور سجاد انصاری کا شمار بھی ان ادیبوں میں ہوتا ہے جن کے ہاں انفرادی سطح پر ہی سہی اسلوبیاتی اعتبار سے سرسید تحریک سے اختلافات نمایاں ہیں۔ علاوہ ازیں محمد حسین آزاد کی نیرنگ خیال میں بھی رومانوی طرز فکر کے رعنائیاں ہیں۔ اس دور میں نئے فکری جہت کی بنیاد مغربی علوم اور انگریزی تعلیم کے نتیجے میں جو مسائل سامنے آئے انہوں نے ہندوستانی ادیبوں میں ایک نیا شعور اور جذبہ پیدا کیا۔ ان علمی ادبی اور سماجی تبدیلیوں نے ملک کو دور جدید میں داخل کیا۔ ان تبدیلیوں سے ادب کا متاثر ہونا بھی لازمی امر تھا۔ اس سیاسی اور ادبی زندگی کے نقل وعمل کے نتیجے میں ہندوستان میں رومانوی تحریک کے نقوش ابھرنا شروع ہوئے۔

رومانوی ادب کے آغاز کے عہد میں مخزن میں شائع ہونے والے مضامین میں مقصدی ادب اور حقیقت نگاری کی بازگشت باقی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ علی گڑھ تحریک کے اثرات تھے۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی رومانوی تحریک کے فروغ کے لیے زیادہ اہم رہی۔ کیونکہ اس وقت علی گڑھ تحریک کی اثرات بھی مدھم پڑھ رہے تھے اور دوسری جانب عالمی سطح پر رونما ہونے والی سیاسی افراتفری نے برصغیر کے سیاسی سماجی حالات کو اس موڑ پر لا کھڑا کر دیا تھا جہاں سے جذباتیت کی شدت قدرتی امر تھا اور ان حالات میں رومانوی تحریک کا پوری شدت اور معقولیت کے ساتھ ابھر کر سامنے آنا بھی لازمی تھا۔ کیونکہ پہلی جنگ کے خاتمے کے بعد برصغیر میں ایک اضطرابی کیفیت طاری تھی۔ حصول آزادی کے لیے مختلف ہتھکنڈے اپنائے جا رہے تھے اور نئے نئے رجحانات جنم لے رہے تھے جن میں فہم وادراک کے بجائے جذبات کی شدت تھی۔ ان ہی جذباتی لہروں میں رومانوی تحریک فروغ کے راستے تلاش کر رہی تھی۔ ان حالات میں ادیبوں نے قومی اور ملکی حالات کے بجائے داخلی زندگی کو توجہ کا مرکز بنایا۔ معاشرے کی جگہ فرد توجہ کا مرکز بنا۔ رومانوی تحریک کے فروغ کی دوسری اہم اور بنیادی وجہ یہ بھی رہی کہ اس وقت اعلیٰ تعلیمی اداروں میں انگریزی نصاب میں جن شعرا کو شامل کیا گیا ان میں سے زیادہ تر کا تعلق رومانوی مکتب فکر سے تھا۔ اس طرح ان کی اس فکر سے پڑھے لکھے افراد تو متاثر ہو ہی رہے تھے لیکن نیم تعلیم یافتہ طبقہ کو بھی ان شعرا کے کلام کی دلفریبی نے متاثر کیا۔ اس وقت پورے برصغیر میں افراتفری اور انتشار کا ماحول سرگرم تھا۔ تحریک ترک موالات اور تحریک خلافت حصول آزادی کے لیے زوروں پر تھی۔ اس طرح کے حالات میں ایک حسین تصوراتی دنیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ تمام حالات بالواسطہ طور سے ادب پر اثر انداز ہو رہے تھے اور ان حالات سے راہ پا کر رومانوی تحریک اردو ادب میں اپنی ساخت مضبوط کر رہی تھی۔

15.3 حلقۂ اربابِ ذوق

15.3.1 حلقۂ اربابِ ذوق: پس منظر، قیام، سرگرمیاں:

1935ء کے لگ بھگ بلکہ یوں کہیے کہ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی، ہندوستانی معاشرہ میں انتشار، اختلال، افراتفری، پریشانی، بکھراؤ اور خلجان کا زمانہ تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز بلکہ اس سے کچھ پہلے بھی دیکھیں تو حالات کچھ اور سمت، کچھ اور موڑ اور کچھ اور رنگ اختیار کرتے جا رہے تھے۔ 1830ء کے اس واقعہ کا ہلکا سا تذکرہ ہو جائے راجہ رام موہن رائے، یورپ کے سفر پر روانہ ہوئے تو انہوں نے فرانسیسی جہاز سے جانے پر اصرار کیا کہ وہ فرانسیسی انقلاب سے متاثر تھے۔ پھر 1905ء اور 1917ء میں روسی انقلاب ہوئے۔ بلقان کے ہنگامے بھی اسی زمانے کی بات ہیں جس میں ہندوستانیوں نے ترکوں سے عدم تعاون کیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے اثرات ساری دنیا پر ترتیب پائے۔ 1933ء کی بات ہے کہ ہٹلر نے جرمنی میں فاشزم کی تحریک کی سرگردگی کی۔ ہونے والی دوسری جنگ عظیم کے خطرات منڈلانے لگے تھے۔ سیاسی کشمکش کا دور تھا۔ اقتدار کے لیے آویزش افزوں ہوتی جا رہی تھی۔ بڑی طاقتیں دنیا کے زیادہ سے زیادہ حصہ کو اپنی گرفت میں رکھنے کے جنون میں تھیں، بین الاقوامی بحران شدت اختیار کرتا جا رہا تھا اور اسلحہ کی دوڑ نے ترقی یافتہ ممالک کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں نے آواز بلند کی۔ یورپ کے روشن خیال اور ترقی پسند حلقوں میں فاشزم کے خلاف ردعمل ہوا۔ ہٹلر نے کئی شاعروں، ادیبوں اور سائنس دانوں وغیرہ کو یا تو قتل کرا دیا تھا یا جلاوطن۔ ایسے میں 1935ء میں ادیبوں وغیرہ کی کانفرنس ہوئی ہے۔ بعدازاں لندن میں مقیم ہندوستانی طلبہ جنہوں نے اس کانفرنس میں شرکت کی تھی اپنی کانفرنس کرتے ہیں اور ترقی پسند تحریک کا مینی فیسٹو تیار کیا جاتا ہے۔ یہ طلبہ جب ہندوستان واپس ہوتے ہیں تو لکھنؤ میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقد ہوتی ہے اور یہ سلسلہ چل نکلتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں علم نفسیات کو مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ فرائیڈ اور یونگ کے نظریات عام ہونے لگتے ہیں۔ ترقی پسندوں نے فرد کے جذبات و احساسات کو کم اہمیت دی تھی بلکہ نظرانداز کر دیا تھا۔ ترقی پسند مصنفین کو کمیونسٹ پارٹی کی سرپرستی حاصل تھی اور ترقی پسند فنکار، پارٹی پروگرام اور اس کی حکمتِ عملی کو روبہ عمل لانے کے پابند۔ معاشرہ کو اہمیت دی جا رہی تھی اور فرد کو معاشرہ کا آلہ کار بنا دیا گیا تھا۔ اس کا ردعمل ہونا لازمی تھا۔ چناں چہ دروں کی سیاحت کا رجحان عام ہوا۔ فرد کے جذبات و احساسات کو پہچاننے اور ان کا احترام کرنے پر زور دیا گیا۔ حالات بھی کچھ ایسے ہی موڑ کے متقاضی ہوتے جا رہے تھے اور کچھ ترقی پسند تحریک کے ردعمل کے طور پر حلقۂ اربابِ ذوق کا قیام عمل میں آیا۔

''بزم افسانہ گویاں'' کے نام سے پہلے ایک انجمن قائم کی گئی اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ بزم صرف افسانے تک محدود تھی لیکن بعد میں یعنی 29 اپریل 1939ء کو ترقی پسند تحریک کے قیام کے لگ بھگ تین سال بعد، نام تبدیل کر کے حلقہ اربابِ ذوق کی تشکیل کی گئی اور قیوم نظر اور یوسف ظفر کے حلقہ میں شامل ہونے کے بعد شاعری اور شاعری کی تنقید کو بھی یہاں جگہ ملی اور اس کے دائرہ کار میں بتدریج توسیع ہوتی گئی۔ ڈرامے نے بھی جگہ پائی۔ معریٰ اور آزاد نظم کو مقام ملنا ہی تھا۔ غزل کو بھی نظرانداز نہیں کیا گیا۔ غرض جلد ہی ایک جامع پیرایہ میں حلقہ اربابِ ذوق نے اپنی سرگرمیوں کو آگے بڑھایا۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ حلقۂ اربابِ ذوق کا قیام چوں کہ لاہور میں عمل میں آیا تھا اس لیے اس کو عموماً پنجاب کا حلقہ متصور کیا گیا لیکن جلد ہی یہ غلط فہمی دور ہو گئی اور برصغیر کے دیگر علاقے کے قلم کاروں نے بھی اس میں یا تو شرکت کی یا اپنا تعاون دیا۔ ''بزم افسانہ گویاں'' کے بانی ارکان میں شیر محمد اختر، تابش صدیقی اور نصیر احمد وغیرہ تھے لیکن پھر میراجی، ممتاز مفتی، مختار صدیقی اور دیگر نے بھی اس میں شمولیت اختیار کر لی۔ ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ میراجی نے بعد میں حلقہ اربابِ ذوق کی رکنیت لی۔ حلقہ کے ریکارڈ کے مطابق میراجی نے سب سے پہلے 25 اگست 1940ء کو حلقہ کے جلسہ میں شرکت کی لیکن چوں کہ میراجی کی وجہ سے حلقہ کو ایک واضح ادبی رجحان ملا اور اس کی کشش

کا باعث وہی ہوئے اس لیے حلقہ ارباب ذوق کا نام لیتے ہی میرا جی کا نام آجاتا ہے۔ ہر چند کہ اس کے ارکان میں بیدی' ہنس راج رہبر' کنہیالال کپور' پرکاش پنڈت اور بیگم سکینہ محمود کے نام بھی ہیں اور دہلی میں اس کی جو شاخ قائم ہوئی اس کے معتمد ڈاکٹر عبادت بریلوی ہوئے۔ بعدازاں دھیرے دھیرے خاص طور پر شمالی ہند کے کئی علاقوں میں حلقہ کو وسعت حاصل ہوتی گئی۔ حلقہ کے ارکان کی ہمیشہ یہ مساعی رہی کہ حلقہ کے مقاصد میں توسیع کی جائے اور ارکان کی تعداد میں اضافہ ہو۔

حلقہ کا اہم مسئلہ جلسوں کے لیے مقام کا حصول تھا۔ ابتداءً یہ جلسے ارکانِ حلقہ کی رہائش گاہوں پر ہوا کرتے تھے۔ چناں چہ پہلا جلسہ نصیر احمد جامعی کی رہائش گاہ عقب لکشمی منشن پر منعقد ہوا۔ پھر یہ جلسے کبھی بدرالزماں کے دفتر پر ہوئے جو امپورٹ' اکسپورٹ کا کاروبار کرتے تھے اور کبھی مصری شاہ میں واقع تابش صدیقی کے مکان پر۔ 1944ء میں کہیں یہ طے کیا گیا کہ یہاں وہاں جلسے کرنے کی بجائے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے میں جلسے ہوا کریں۔ یہ سلسلہ تادیر چلتا رہا۔

حلقۂ اربابِ ذوق نے صرف ادبی اجتماعات ہی کا انعقاد نہیں کیا بلکہ عملی طور پر بھی شعر و ادب کے فروغ میں اپنا حصہ ادا کرنے کی کوشش کی۔ اس رجحان کو آگے بڑھانے کے لیے میرا جی کے غیر معمولی حصہ کو سب ہی تسلیم کرتے ہیں۔ چناں چہ 1941ء کی بہترین نظموں کا انتخاب کیا گیا اور اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ اس انتخاب میں (24) نظمیں ہیں جو احمد ندیم قاسمی' فیض احمد فیض' مختار صدیقی' ن۔م۔ راشد' جوش' عدم' اختر شیرانی' سلام مچھلی شہری' شاد عارفی' میرا جی' اختر الایمان اور راجہ مہدی علی خاں جیسے فن کاروں کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ احمد ندیم قاسمی اور فیض جیسے شاعروں کی شمولیت اس امر کی غماز ہے کہ حلقہ نے ابھی ایسی صورت نہیں لی تھی اور ترقی پسندوں اور حلقہ کے افراد کے درمیان کوئی خطِ فاصل ظاہر نہیں ہوا تھا۔ اس انتخاب کا ابتدائیہ (پیش لفظ) میرا جی نے لکھا تھا میرا جی کے باعث حلقہ کے رنگ روپ میں فرق ضرور آیا لیکن بنیادی طور پر جیسا کہ یونس جاوید نے لکھا ہے: ''1941ء تا 1947ء تک حلقۂ اربابِ ذوق کی مجالس میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ ہوئی نہ مباحث کے رنگ بدلے نہ ہی تنقید میں کوئی نقطۂ نظر واضح ہو کر سامنے آسکا۔ البتہ 1941ء تا 1949ء تک کی بہترین نظمیں'' کے عنوان سے منتخب نظموں کے جو مجموعے شائع کیے گئے ان میں ہم حلقہ سے منسلک ادیبوں کی فنی بصیرت اور شعری ادراک کا عکس ضرور دیکھتے ہیں۔ ابتدا میں حلقہ ان شعری انتخابات کو اپنے طور پر ہی شائع کرتا تھا اور ناشر اس طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے کہ نئی نظم ابھی تک ان کے ہاں اعتبار نہیں پائی تھی لیکن ''1943ء کی بہترین نظمیں'' کو مکتبہ اُردو نے شائع کیا۔ گویا اب وہ بھی نئی نظم کی توانائی' تازگی اور مقبولیت سے متاثر ہو چکے تھے۔ نئی نظم کی مقبولیت اور حلقہ کے بڑھتے ہوئے اثر کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ ناشروں نے حلقہ سے پانچ سال تک کے انتخابات شائع کرنے کا معاہدہ کر لیا اور مشمولات کے تعلق سے ناشروں کے اعتراضات اور تجاویز کو ملحوظ رکھتے ہوئے انتخابات کی اشاعت عمل میں آنے لگی۔ تقسیم ہند کا وقت قریب آرہا تھا' شمالی ہند میں فسادات شروع ہو چکے تھے اس کا اثر حلقہ کے جلسوں اور شرکا کی تعداد پر بھی پڑا۔ چناں چہ مارچ 1947ء میں منعقدہ جلسے میں وحید قریشی' یزدانی ملک اور حفیظ ہوشیار پوری نے جن کو اس جلسہ میں مضامین پڑھنے تھے اس لیے شرکت نہیں کی کہ لاہور میں فسادات کی وجہ سے حالات اچھے نہیں تھے۔ اس کے بعد بھی دو' تین جلسے فرقہ وارانہ فسادات اور ناگزیر حالات کی بنا پر منعقد نہیں ہو سکے۔ فسادات کے بعد پہلا جلسہ 14 ستمبر 1947ء کو منعقد ہوتا ہے اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ بعدازاں 3 نومبر 1949ء کو میرا جی کے انتقال نے حلقہ کے موقف' اس کے استحکام اور امیج کو نقصان پہنچایا۔ یوں بھی تقسیم ہند کے بعد بدلے ہوئے حالات میں حلقہ کو اپنا توازن برقرار رکھنا دشوار تھا۔ بہترین نظموں کا ہر سال جو انتخاب شائع ہوتا تھا' اس سلسلے میں 1949ء کی بہترین نظموں کا انتخاب شائع ہوا جو میرا جی کے انتقال

کے بعد پہلا اور اس سلسلے کا آخری انتخاب تھا۔ اس کے بعد نہ تو کوئی ناشر اس کے لیے آمادہ ہوا اور نہ ہی حلقہ اس کے مصارف برداشت کر سکا۔

منتخب نظموں کی اشاعت کا سلسلہ تو مسدود ہو گیا لیکن ادبی ذوق کی تسکین کے لیے حلقہ نے اپنا مرتب کردہ جریدہ ''نئی تحریریں'' شائع کیا جس کی پہلی جلد 1948ء میں کراچی سے اور دوسری جلد 1954ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ حلقہ کے ترجمان ''نئی تحریریں'' کے صرف چار شمارے لاہور سے شائع ہوئے۔ البتہ اس دوران 1956ء میں "1955ء کی بہترین نظمیں'' کی اشاعت عمل میں آئی جس پر حلقہ کا نام تو درج نہیں تھا البتہ اس کے مرتب قیوم نظر تھے۔ حلقہ کا نام نہ ہونے کی اور کوئی وجہ نہیں تھی سوائے اس کے کہ حلقہ میں گروہ بندی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اختلافات شدت اختیار کرنے لگے تھے۔ اس کا اظہار یوں ہوا کہ انتظار حسین، عبادت بریلوی، اور سید وقار عظیم کو ان کی ''انتہا پسندانہ سرگرمیوں'' کی بنا پر حلقہ کی رکنیت سے علاحدہ کر دیا گیا۔

حلقہ کے جلسوں میں نظموں کے ساتھ افسانے بھی پیش کیے جانے لگے۔ چناں چہ اعجاز حسین بٹالوی نے افسانہ ''گرل فرینڈ'' 27 نومبر 1955ء کے جلسہ میں پیش کیا۔ سعادت حسین منٹو نے بھی ستمبر 1950ء سے کئی جلسوں میں اپنے افسانے سنائے جن پر کھل کر تنقید ہوئی۔ شاہ دولے کا چوہا'' منٹو کا آخری افسانہ تھا جو انہوں نے حلقہ کے 30 مئی 1954ء کے اجلاس میں پڑھا۔ پھر منٹو کے انتقال کے بعد ہی 23 جنوری 1955ء کو حلقہ کا اجلاس ہوا۔ اس مدت میں نہ صرف بہترین نظموں کے انتخابات شائع ہوئے بلکہ ''بہترین شاعری، بہترین افسانے'' اور بہترین مقالے بھی شائع کیے گئے۔ ان سب کے ناشر تھے مکتبہ جدید لاہور۔ ابھی چند سال بھی گزرنے نہیں پائے تھے کہ حلقہ کے اختلافات مزید ابھرے اور 12 مارچ 1972ء کو حلقہ دو حصوں میں منقسم ہو گیا اور جس گروہ نے قطع تعلق کیا اس نے اپنا نام حلقہ اربابِ ذوق (ادبی) رکھا۔ یہ گروہ ادب کو خالص ادب کے حوالے سے جانچتا پرکھتا تھا۔ دوسرا خالص سیاسی نقطہ نظر سے۔ اس طرح ادب اور سیاست ان کی شناخت بن گئی۔ اس کے بعد کے اتوار سے حلقہ اربابِ ذوق (ادبی) کے جلسے پاک ٹی۔ ہاؤس میں منعقد ہونے لگے جن میں 1977ء تک باقاعدگی رہی۔ بعد میں 1979ء تک بے قاعدگی سے چلتے رہے۔ یہی شب و روز تھے کہ 1980ء میں حلقہ ارباب ذوق (پاکستان) شاخ لاہور کا قیام عمل میں آیا جس کے اجلاس 30 مئی 1980 سے 4 اگست 1980 تک منعقد ہوئے لیکن یہ حلقہ جلد ہی معطل ہو گیا اور مارچ 1982ء میں یہ صورت رہی کہ تین حلقے اپنے جلسے منعقد کرنے لگے۔ حلقۂ اربابِ ذوق لاہور (پاکستان) حلقۂ اربابِ ذوق (سیاسی) اور حلقۂ اربابِ ذوق (قیوم گروپ)۔ ان میں حلقۂ اربابِ ذوق (پاکستان) اور حلقۂ اربابِ ذوق (سیاسی) کو ایک دوسرے میں ضم کرنے کی کوشش اپریل 1983ء میں شروع ہوئی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ یہ دونوں حلقے اپنے اپنے اجلاس منعقد کرنے اور ایک دوسرے کو غیر آئینی بھی قرار دیتے رہے آج بھی حلقۂ اربابِ ذوق کسی نہ کسی نام اور رنگ سے موجود ہے اور کئی ہیں۔ ان کی حیثیت آئینی ہے یا نہیں یہ اور بات ہے لیکن یہ بات طے ہے کہ ترقی پسند تحریک کی طرح اس کی سرگرمیاں بھی برائے نام رہ گئی ہیں اور ترقی پسند تحریک ہی کی طرح حلقہ اربابِ ذوق ہماری ادبی تاریخ کا حصہ بن کر رہ گیا ہے۔

15.3.2 حلقۂ اربابِ ذوق: رجحانات:

بیسویں صدی کے آغاز ہی سے ہمارا قومی ہی نہیں، سیاسی، معاشرتی اور ادبی منظر نامہ بدل رہا تھا۔ حتی کہ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے آتے آتے یہ پوری طرح واضح اور روشن تر ہو گیا۔ ترقی پسند تحریک کا آغاز ہونا ہی تھا سو ہوا اور اس کے ردِ عمل کے طور پر حلقۂ اربابِ ذوق کے قیام پر بھی کسی کو متعجب ہونے کی ضرورت نہیں۔ وقت بلاشبہ اس موڑ کا متقاضی تھا ترقی پسند تحریک کا آغاز خاصے زور و شور سے ہوا۔ ترقی پسندوں نے ادب

برائے زندگی کا نعرہ مخلصانہ طور پر بلند کیا ہوانہوں نے فرد کے جذبات واحساسات کونظر انداز نہ بھی کیا ہو بہرکیف ان کو کم اہمیت ضرور دی۔ ویسے نثر اور شاعری سے ایسی مثالیں مل جائیں گی جن میں فرد کے جذبات واحساسات کی دلنواز تصویر کشی اور موثر ترجمانی کی گئی ہے لیکن یہ ترقی پسند تحریک نہیں ہندوستان کے عوامی مزاج اور ہندوستانی زبانوں کے ادب کی صدیوں پرانی روایات کا اثر تھا جو ادیبوں اور شاعروں کے ضمیر اور خمیر میں شامل تھیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک ہندوستان کی نئی نسل کے ذہنوں کی نمائندگی کرتی ہو لیکن اس پر پیرس اور لندن کی فضاؤں کا بھی اثر تھا۔ اس پس منظر کے باوجود ترقی پسند تحریک کی یہ زبردست کامیابی تھی کہ اس نے کئی دلوں کو مسخر کرلیا۔ تاہم کئی ذہن ایسے بھی تھے جو اس کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ایسے نقاطِ نظر رکھنے والوں کے نزدیک اظہار ذات' انفرادی جذبات اور احساسات کی ترجمانی' انسانی نفسیات کی تحلیل' واردات قلبی کا انکشاف اور اس کی ترسیل کے بغیر ادب کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ لہذا ایسے فن کار جوان میلانات کے حامل تھے ترقی پسند تحریک میں ان کو نہ پاتے ہوئے حلقہ اربابِ ذوق کے قیام پر مائل ہوئے۔ ترقی پسندوں نے اور ان میں خاص طور پر سردار جعفری اور سجاد ظہیر نے حلقۂ اربابِ ذوق کو شدت سے نشانہ بنایا۔ سردار جعفری نے ''ترقی پسند ادب'' میں حلقۂ اربابِ ذوق کے ادیبوں کو ہیئت پرست' ابہام پرست اور جنس پرست ادیب قرار دیا جو یورپ کے انحطاطی ادب سے متاثر تھے سجاد ظہیر نے ''روشنائی'' میں ''میراجی'' کو انگلستان کے جدید رجعت پرستوں کا چربہ قرار دیتے ہوئے حلقہ اربابِ ذوق کی مجہولیت کا ذکر کیا۔ یہ زاویہ حلقۂ اربابِ ذوق کے قابل قبول نہیں رہا۔

حلقۂ اربابِ ذوق کو یورپ اور انگلستان سے وابستہ کردینا درست نہیں۔ خارجی اثرات کی اہمیت مسلم لیکن داخلی محرکات بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں جس طرح ترقی پسندوں نے روس اور فرانس کے اثرات قبول کیے حلقہ اربابِ ذوق والوں نے بھی فرانس اور انگلستان کے اثرات زیادہ قبول کیے۔ ہاں زندگی اور ادب کے بارے میں حلقۂ اربابِ ذوق کا رجحان قدرے بدلا ہوا تھا۔ انہوں نے زندگی کی کشاکش اور خارجی حالات کی کشمکش میں راست اور بھرپور حصہ نہ لیا ہو جس طرح نظریاتی طور پر ترقی پسند چاہتے تھے' حلقہ ارباب ذوق نے ادبی اقدار کو ملحوظ رکھا اور چاہا کہ ادب پہلے ادب ہو اور ادبی اقدار کا احترام کیا جائے۔ آیئے ہم ادب کے بارے میں حلقہ ہی کے ایک ترجمان کے خیالات سے واقفیت حاصل کریں۔

> ''ہمارے خیال میں ادب کی اولین خصوصیت یہی ہے کہ وہ اول اور آخر ادب ہو۔ ترقی پسندی اور رجعت پسندی بعد کی باتیں ہیں۔ جو چیز معیار پر پوری نہیں اترتی حلقہ کے نزدیک درخورِ اعتنا نہیں۔''
>
> (ادبی دنیا' لاہور جولائی 1945)

یہ اول وآخر والی بات حلقہ کے بعض ارکان میں انتہا پسندانہ حد تک ملتی ہے۔ ایسے افراد ادب کے ساتھ زندگی کو حشو وزواید میں شمار کرتے ہیں۔ اس انتہا پسندی نے جو ایک طرح کی شدید داخلیت پسندی یا اس کا ردعمل تھی حلقہ کو روشن خیال لوگوں میں معروف ہونے نہیں دیا۔ یہ رجحان انفرادی طور پر حلقہ کے سرگرم رکن میراجی کے یہاں بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ ایک موقع پر انہوں نے لکھا ہے:

> ''اگر دو ایک لمحوں کے لیے فن برائے حیات کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو ہم کہیں گے کہ فن برائے فن کے بغیر فن ہی نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ برائے حیات کا دم چھلا کیسا۔ حقیقت میں تہذیب وتمدن نے جن حشو وزواید کو ہم پر طاری کردیا ہے ان ہی میں سے برائے حیات کا تصور بھی ایک چیز ہے لیکن اسکا مطلب یہ نہیں کہ اس زمانے کے لوگوں کی باتیں زندگی کی ترجمان نہیں تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ لوگ حال کے بعض سیاسی نظریے اور سماجی واقتصادی نظام کے موجودہ رنگوں

سے واقف نہ تھے۔'' (میرا جی: ''دیباچہ'' 1941ء کی بہترین نظمیں۔ مرتبہ: حلقہ ارباب ذوق' لاہور۔ صفحہ 11)

بہر کیف بڑی حد تک یہ بات طے ہے کہ حلقہ اربابِ ذوق کی ادبی اقدار کو معاشرہ کے سرد و گرم سے اس نوع کا تعلق نہیں تھا جو ادب برائے زندگی کے کٹر حامیوں کا تصور ہے۔ ویسے ن۔م۔راشد نے جن کا حلقہ سے خاص تعلقِ خاطر تھا حلقہ کے رویہ کو نہایت معتدل اور متوازن انداز میں یوں بیان کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

''جدید شاعری کی جس تحریک سے میں وابستہ ہوں اس کے دو بنیادی مقاصد تھے۔ فارم کی جکڑ بندیوں سے اُردو شاعری کو آزاد کرانا اور دوسرے معاصر زندگی کی حقیقتوں سے قریب لانا۔'' اس سے حلقہ اربابِ ذوق کے نصب العین کا اظہار ہوتا ہے کہ اس نے شعر و ادب اور معاصر زندگی کے رشتہ کو کس حد تک سمجھا اور اس پر زور دیا ہے اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ حلقہ اربابِ ذوق نے فنکار کے انفرادی احساس پر زور دیا جس کی وجہ سے خارجیت اور بیرون کی داخلیت داخل اور درون کو اہمیت دی گئی۔ انہوں نے شعور کو نظر انداز کیا ہو لیکن تحت الشعور اور لاشعور کی باتیں ان کے یہاں زیادہ پائی جاتی ہیں اور ترقی پسند شاعروں کے مقابلے میں حلقہ کے شاعروں کے یہاں احساس ذات شدید ہے۔ حلقہ کے شاعروں کے کلام کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ فرد اور معاشرہ کی کشمکش میں حلقہ اربابِ ذوق نے معاشرہ کے مقابلہ میں فرد اور ذات کو اہمیت دی۔ تحلیل نفسی اور تحت الشعور اور لاشعور کے رجحانات نے ان فنکاروں کو اپنے درون میں جھانکنے اور داخل کا مطالعہ کرنے کی ترغیب دی۔ انہوں نے اسی کے ساتھ اپنی ذاتی کیفیات اور وارداتِ قلبی کو ظاہر کرنے کے لیے اسلوب میں نئے نئے تجربے کیے اور اوزان و بحور میں تبدیلیاں لائیں۔ چوں کہ وہ اپنے تجربات اور واردات اور کیفیات کو من و عن اور تجریدی پیرایہ میں بیان کرنا چاہتے تھے اس لیے ان کو روایت کا سہارا لیتے ہوئے بھی روایت سے بغاوت کرنی پڑی۔ انہوں نے مروجہ اصطلاحات' استعارات' تشبیہات اور اشارات وغیرہ کو یا تو قطعی طور پر رد کر دیا یا ان کو نئے مفاہیم سے آشنا کیا۔ یہ تبدیلیاں اُردو شاعری میں نئی ہی نہیں حیرت انگیز بھی تھیں چناں چہ اسی کے ساتھ یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ حلقہ اربابِ ذوق نے افادیت اور مقصدیت سے اپنے رشتہ کو قطعی طور پر نہیں توڑا بات صرف اتنی ہے کہ انہوں نے ترقی پسندوں کی طرح موضوع کو مقصدیت کی زنجیر نہیں پہنائی۔ بلکہ عملی طور پر خود کو زندگی کے چند موضوعات تک محدود رکھا۔ میرا جی نے ''1941ء کی بہترین نظمیں'' میں لکھا ہے کہ ''خیال یا موضوع کے اعتبار سے اس کی افادیت کو ملحوظ بھی رکھا گیا خواہ وہ افادیت انسانی زندگی کے کسی بھی پہلو یا شعبہ سے تعلق رکھتی ہو یعنی نظری ہو یا عملی۔'' اس صراحت کی روشنی میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حلقہ اربابِ ذوق کے ارکان نے زندگی سے اپنا تعلق منقطع کر لیا۔ حلقہ اربابِ ذوق کے ارکان نے اپنی ذات اور نج کو اہمیت ضرور دی لیکن خارج اور سماج کو نظر انداز بھی نہیں کیا۔ انہوں نے باغیانہ روش اختیار کی لیکن روایت کے احترام اور سماجی رشتہ کی پاسداری سے بھی گریز نہیں کیا اور تو اور میرا جی کے یہاں بھی ''ابوالہول'' جیسی منظومات ملتی ہیں جن میں سماجی ورثہ کی تکریم پائی جاتی ہے اور ان پر اظہار افتخار بھی......

الطاف گوہر نے جن کا حلقۂ اربابِ ذوق میں خاصا عمل دخل رہا' حلقہ کی تشکیل کے چھ سال بعد حلقہ کے شعری طریقۂ کار کی صراحت کرتے ہوئے جن باتوں کی نشان دہی کی ہے ان میں سے چند درج کی جاتی ہیں کہ ان سے حلقہ کے موقف کا اظہار ہوگا۔

1. اچھی شاعری وہ ہے جو اپنے ماحول سے آشنا ہوتے ہوئے ہمہ گیر تاثیر کی حامل ہو۔
2. شاعری اگر شاعری نہیں تو پھر جدید ہو یا قدیم سوختنی ہے۔
3. ہمارا احتجاج جمود کے خلاف ہے' روایات کے خلاف نہیں۔

4. شاعر کا واحد مقصد اپنے شدید طور پر محسوس کیے ہوئے تجربات کا مکمل اظہار ہے۔

واضح رہے کہ حلقہ کے نزدیک ماحول سے آگہی، نفسِ شاعری، روایات کی پاسداری اور شدید احساسات کی اہمیت ہے میراجی نے بھی ''اس نظم میں'' کے دیباچہ میں ادب کو زندگی کا ترجمان قرار دیا ہے وہ اپنے زاویہ سے ادب کو پیش کرنا چاہتے تھے اور ترقی پسند ادبی رجحانات سے فکری اختلاف کے باوجود ادب میں عصری زندگی کی عکاسی کے قائل تھے البتہ وہ اس کے خواہاں ضرور تھے کہ عصری مسائل اس طرح نہ پیش کیے جائیں کہ ادب صحافت بن جائے۔ اسی طرح ان کے ملحوظ نظریہ بات بھی تھی کہ ادب پہلے ادب ہو، فن پہلے فن ہو۔ شاعری میں شاعر کی ذاتی زندگی کے تجربات کی جھلک ہو۔ حلقہ نے تجربے پر زور دیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ تجربہ نیا اور منفرد ہو۔ اسی طرح حلقہ نے موضوع کے انتخاب اور شاعر کے اندازِ نظر کو بھی اہمیت دی اور اس امر کی وضاحت کردی کہ موضوع اچھوتا ہونا چاہیے اور اگر موضوع اچھوتا نہ بھی ہو تو کم از کم نظریہ جدید ہونا چاہیے۔ گویا حلقہ اربابِ ذوق کے قلم کار یہ رجحان رکھتے تھے کہ جدت یا انفرادیت ہو تو کوئی فن پارہ قابل قبول ہو سکتا ہے۔ چوں کہ ترقی پسندوں نے ایسی کسی جدت پر زور نہیں دیا اس لیے میراجی اس کمی کو ترقی پسند تحریک کا المیہ قرار دیتے ہیں۔ ان باتوں سے حلقہ اربابِ ذوق کے اس میلان پر روشنی پڑتی ہے کہ تجربہ اور انفرادیت فن کے لیے بنیادی چیزیں ہیں۔ وہ اس معروف خیال سے اتفاق نہیں کرتے کہ شاعری نقل کی نقل کا نام ہے بلکہ وہ شاعری کو تخلیق قرار دیتے ہیں اور پھر بات وہیں پر آجاتی ہے کہ فن پارے میں احساس، جذبہ، تجربہ ہو اور اس کے اظہار میں جدت تا کہ جو بات ہو شاعر اپنے انداز سے کہے۔ حلقہ نے صرف تجربہ، جدت اور انفرادیت ہی پر زور نہیں دیا بلکہ اظہار اور ہیئت اسلوب میں بھی ان چیزوں کو ضروری قرار دیا۔ اس طرح نئی ہیئت اور نئے اسالیب کی گنجائش خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔

ہر چند کہ نظم نگاری کا تصور پہلے بھی تھا اور ترقی پسندوں نے بھی اس طرف توجہ دی تھی لیکن حلقہ والوں نے نظم کو ''عضویاتی وحدت'' کی شکل دیتے ہوئے اس کو غزل سے آزاد رکھنے کی کوشش کی اور اس کو ایک جمالیاتی تجربے کی حیثیت بھی دی دی۔ جہاں تک نظم کی ہیئت کا تعلق ہے اس بحث سے قطع نظر کہ آزاد نظم کو وسیلہ اظہار بنایا اور اس میں ایسے کئی تجربے کیے جس کی آزاد نظم متحمل ہو سکتی تھی چناں چہ قافیہ در قافیہ اور اندرونی قافیوں کا استعمال بھی عام ہوا، طویل اور مختصر مصرعوں کی طرف بھی توجہ دی گئی، جملوں، سطروں اور اصوات کی تکرار ہوئی۔ نیز موضوعات کے تعلق سے بھی حلقۂ اربابِ ذوق کا رجحان الگ رہا۔ ترقی پسندوں کی طرف سے حلقہ کے شاعروں پر جنس پرستی کا الزام عائد کیا گیا اور یہ بھی کہ وہ سماجی موضوعات کو رد کرتے ہیں لیکن ایسا نہیں کیونکہ میراجی، مختار صدیقی، قیوم نظر، ضیا جالندھری اور خاص طور پر راشد کے ہاں سماجی اور سیاسی حالات کو نہایت اہتمام کے ساتھ موضوع بنایا گیا اور اس حد تک کہ سیاسی اور سماجی موضوعات سے بے توجہی کا الزام یکسر رد ہو جاتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ حلقۂ اربابِ ذوق کے شاعروں کے یہاں انفعالی کیفیات ملتی ہیں۔ ہیئت، موضوعات اور اظہار و اسالیب کے ضمن میں انہوں نے بعض منفی صورتوں سے کام لیا لیکن انتہا پسند ترقی پسندوں نے جیسا کہ حلقہ کے شاعروں کو بدنام کرنے کی سعی کی یہ کوئی مستحسن اقدام نہیں تھا۔ اُردو شاعری کو نئے افق سے روشناس کرانے، نئی جہات سے آشنا کرانے، نئی راہوں پر گامزن کرنے اور نئی بلندیوں کی سمت رواں کرنے میں حلقۂ اربابِ ذوق کا رویہ بھی ممتاز، نمایاں اور اہم ہے۔ اُردو شعر و ادب میں اور کئی تحریکات، نظریات اور میلانات کی طرح حلقہ اربابِ ذوق کی اہمیت بھی لائق ذکر ہے۔ ہماری ادبی تاریخ میں حلقہ کے نام اور کام کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہی نہیں بعد ازاں بیسویں صدی کے ساتویں دہے میں جدیدیت وغیرہ کے جو رجحانات منظر عام پر آئے ان کی ساخت و پرداخت میں بھی حلقہ اربابِ ذوق کے رجحانات اور شعری سرمایہ کا گراں قدر حصہ ہے۔

15.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ رومانی تحریک کے خدوخال کے اثرات چوتھی صدی قبل مسیح میں قدیم یونانی دیومالاؤں میں ملتے ہیں۔

☆ نویں صدی عیسویں میں رومانی زبان تحریری شکل میں سامنے آئی اور ایک لمبے عرصے تک اس زبان میں صرف عشق و محبت کی کہانیاں لکھی جاتی رہیں اور اصطلاحی معنوں میں خیالی قصے کہانیوں کو ہی رومانس کہا جاتا تھا۔

☆ اٹھارویں صدی کے نصف میں رومانی تحریک کو شیکسپیئر نے بھی بے پناہ مقبولیت عطا کی۔

☆ ورڈزورتھ کے ہم عصر کالرج کا شمار رومانی ادب کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔انہوں نے رومانیت کو نئی روح اور تازگی بخشی۔

☆ بیسویں صدی میں عالمی سطح پر جو سیاسی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اور ہندوستانی ادب بھی داخلی اور خارجی سطحوں پر کسی حد تک متاثر ہوا۔ ہیئتی، فکری اور موضوعاتی سطح پر بھی تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں۔اس نئے اندازِ فکر کے اثرات مولانا حالی کے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انہوں نے جدید اردو شاعری کو نئی سمت عطا کی۔

☆ رومانی تحریک کا باقاعدہ آغاز رسالہ ''مخزن'' میں سجاد حیدر یلدرم کے مضامین سے ہوتا ہے۔اس کے بعد جن ادبا و شعرا نے رومانی رجحان اور فکر کے ساتھ مخزن کے مشن کو آگے بڑھایا ان میں علامہ اقبال، مولانا آزاد، ظفر علی خان، مرزا محمد سعید، خوشی محمد ناظر، مہدی افادی، لطیف الدین احمد، خواجہ حسن نظامی، شیخ عبدالقادر اور سجاد حسین کے نام قابل ذکر ہیں۔

☆ رومانی تحریک کے فروغ کی دوسری اہم اور بنیادی وجہ یہ رہی کہ اس وقت اعلیٰ تعلیمی اداروں میں انگریزی نصاب میں جن شعرا کو شامل کیا گیا ان میں سے زیادہ تر کا تعلق رومانی مکتبۂ فکر سے تھا۔ان کی اس فکر سے پڑھا لکھا طبقہ تو متاثر ہو ہی رہا تھا، لیکن نیم تعلیم یافتہ طبقہ بھی ان شعرا کی دل فریبی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

☆ حلقۂ اربابِ ذوق کا قیام 29 اپریل 1939ء کو لاہور میں عمل میں آیا بعد ازاں دھیرے دھیرے دہلی میں بھی اس کی ایک شاخ قائم ہوئی اور شمالی ہند کے کئی علاقوں میں اس کو وسعت حاصل ہوئی۔

☆ حلقے نے صرف ادبی اجتماعات ہی منعقد نہیں کیے بلکہ عملی طور پر شعر و ادب کے فروغ کے لیے بھی کام کیا۔حلقہ نے ہیئت اور داخلیت پر زیادہ زور دیا لیکن سیاسی اور سماجی حالات سے بھی حلقہ کے شاعر بیگانہ نہیں رہے انہوں نے سیاسی، تہذیبی اور سماجی موضوعات پر اظہار خیال کیا اور اپنے زاویے کو کام میں لے آئے۔

☆ حلقۂ اربابِ ذوق کی مجموعی طور پر ہماری ادبی تاریخ میں بڑی اہمیت ہے۔

15.5 کلیدی الفاظ

لفظ		معنی
مستحکم	:	مضبوط، اٹل، پکا
امرا و روسا	:	دولت مند، رئیس، مالدار

نیچر	:	فطرت،خلقت،موجودات
مساوات	:	برابری،ہمسری،باہم برابر کرنا
تہذیب	:	آراستگی،شائستگی،خوش اخلاقی
کلاسیک	:	قدیم،اعلیٰ درجہ کا،مستند،ادبیات عالیہ
تشکیل	:	شکل بنانا،ساخت،ترکیب
اقتصادی	:	اقتصاد سے متعلق،مالی،معاشی
نوابین	:	نواب کی جمع
تصنع	:	بناوٹ،دکھاوا،فریب،مکر
جدید	:	نیا،تازہ
حقائق	:	حقیقت کی جمع،سچائی،راستی،صداقت
عریض	:	بڑا،وسیع،لمبا،چوڑا
خودمختار	:	آزاد،جس کے ہاتھ میں اختیار ہو
خلجان	:	اندیشہ،خلش
آویزش	:	لڑائی،فساد
ادراک	:	عقل،فہم
مصارف	:	اخراجات
غیرآئینی	:	بنیادی قوانین کے خلاف
انحطاط	:	زوال،کمی کھٹاؤ
انفعالی	:	شرمندہ کرنے والی
پاسداری	:	مروت،لحاظ،حمایت
ضم	:	ملانا،شامل کرنا

15.6 نمونہ امتحانی سوالات

15.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ یورپ میں رومانی تحریک کی بنیادی وجہ کیا ہے؟

2۔ مغرب میں رومانی ادب کا موجد کسے تسلیم کیا جاتا ہے؟

3۔ رسالہ ''مخزن'' کس نے جاری کیا؟

4۔ ''یلدرم نے ترکی کو اپنا آئیڈیل بنایا۔'' یہ قول کس کا ہے؟

5۔ ''خارستان وگلستان'' اور ''سوائے سنگین'' کس کی تصنیف ہے؟

6۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے ابتدائی ارکان کے نام لکھیے۔

7۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے لاہور شاخ کا قیام کب عمل میں آیا؟

8۔ ''گرل فرینڈ'' کس کا افسانہ ہے؟

9۔ روس کا انقلاب کب ہوا؟

10۔ میراں جی کا انتقال کب ہو؟

15.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ رومانی تحریک کے باقاعدہ آغاز سے متعلق اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

2۔ اردو شاعری کو رومانی تحریک نے کس طرح متاثر کیا؟ مثالوں سے سمجھائیے۔

3۔ اردو ادب میں رومانی تحریک کے فروغ کے اسباب بیان کیجیے۔

4۔ حلقۂ اربابِ ذوق کی سرگرمیوں کا جائزہ لیجیے۔

5۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے قیام کا پس منظر بیان کیجیے۔

15.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ رومانی تحریک کے آغاز وارتقا پر مفصل روشنی ڈالیے۔

2۔ اردو زبان وادب میں رومانی تحریک کی اہمیت وافادیت پر حوالوں کے ساتھ تفصیلی بحث کیجیے۔

3۔ ترقی پسند تحریک کن معنوں میں حلقۂ اربابِ ذوق کی ضد تھی؟ مثالوں سے واضح کیجیے۔

15.7 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	اردو ادب میں رومانی تحریک	ڈاکٹر محمد حسن
2۔	کلاسیکیت اور رومانویت	علی جاوید
3۔	اردو ادب کی تحریکیں	ڈاکٹر انور سدید
4۔	بیسویں صدی میں اردو ناول	یوسف سرمست
5۔	حلقۂ اربابِ ذوق	یونس جاوید
6۔	ترقی پسند ادب	علی سردار جعفری

اکائی 16: جدیدیت اور مابعد جدیدیت

اکائی کے اجزا

16.0 تمہید
16.1 مقاصد
16.2 جدیدیت
16.3 مابعد جدیدیت
16.4 اکتسابی نتائج
16.5 کلیدی الفاظ
16.6 نمونہ امتحانی سوالات
16.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
16.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
16.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
16.7 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

16.0 تمہید

شعر و ادب کے میدان میں جدیدیت کو ایک ذہنی احساس اور رویے کا نام دیا جاتا ہے۔ جدیدیت کوئی جامع شے نہیں ہے۔ یہ ایک متحرک قسم کا مستقل چلنے والا عمل ہے۔ جہاں تک مغرب میں جدیدیت کا سوال ہے تو بعض محرکات کی نشاندہی ضروری ہو جاتی ہے۔ جنھوں نے اس ذہنی فضا کو بنانے اور پروان چڑھانے میں اہم رول ادا کیا، جسے ہم جدید ادب یا جدیدیت سے عبارت کرتے ہیں۔ جدیدیت کا میلان اصل میں ایک ردعمل کی صورت میں نمایاں ہوا۔ تہذیب، زندگی، فن اور نفسیات اور فلسفے کے بعض مفروضات کے خلاف یہ ردعمل کسی سوچی سمجھی اسکیم یا منصوبہ بندی کا نتیجہ نہیں تھا۔ انسانی وجود کی تفہیم اب مروجہ پیمانوں کے مفروضے کے ذریعہ ممکن نہ تھی۔ اس لیے ادب و فن کے طریقۂ اظہار میں تبدیلی یا تفتیش کی کوشش کی گئی۔

مابعد جدیدیت، جدیدیت کے خلاف کسی ردعمل کی طرح وجود میں نہیں آئی ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ کچھ معاملات میں ایک فکری انحراف کا نام دیا جا سکتا ہے۔ جدیدیت کے بنیادی میلانات نے ہی مابعد جدیدیت کی شکل اختیار کی ہے۔

زیرِ نظر اکائی میں آپ جدیدیت کی تحریک، اس کی فکری بنیادوں اور اس کی امتیازی خصوصیات سے آگہی حاصل کریں گے۔ اس اکائی میں اکتسابی نتائج کے ساتھ مشکل الفاظ کے معنی بھی درج کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں نمونے کے طور پر امتحانی سوالات بھی دیے گئے ہیں۔ جن میں معروضی

جوابات کے حامل سوالات، مختصر جوابات کے حامل اور طویل جوابات کے حامل سوالات شامل ہیں۔ اکائی کے آخر میں کچھ کتابوں کے نام مع مصنف درج کیے گئے ہیں۔

16.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا تعارف کرا سکیں۔

☆ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی فکری بنیادوں کی وضاحت کر سکیں۔

☆ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی اہم اور نمایاں خصوصیات پر روشنی ڈال سکیں۔

☆ جدیدیت اور مابعد جدیدیت دونوں کا تجزیہ اور موازنہ کر سکیں۔

16.2 جدیدیت

ادب میں جدیدیت کا مفہوم کسی میکانکی اور مادی تقسیم کو قبول نہیں کرتا۔ اسی لیے جدیدیت کے مفہوم کا تعین کرتے وقت یہ پہلے ہی واضح ہو جانا چاہیے کہ اس سے کسی منظّم یا مستحکم قسم کے مفہوم کا نکلنا ممکن نہیں۔ ہم عصر اور جدید کو بھی آپس میں خلط ملط نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ جو شے یا رجحان اپنی ماہیت میں جدید ہے، تاریخی اعتبار سے وہ قدیم بھی ہو سکتی ہے۔ مغرب میں جدیدیت کی فکری بنیاد میں نطشے، سگمنڈ فرائڈ، کارل مارکس اور چارلس ڈارون کے تصورات شامل ہیں۔

نطشے نے خدا کی موت کا اعلان کر کے انسان کے مذہبی عقیدے کو ہلا کر رکھ دیا۔ چارلس ڈارون نے ارتقا کا نظریہ بیان کرتے ہوئے انسان کو بندر کی نسل کی ارتقائی شکل قرار دے دیا اور اس طرح انسان کے اشرف المخلوقات ہونے پر سوالیہ نشان لگا دیا۔ مارکس نے مادے کو اہمیت دے کر ہیگل کے خیال یا شعور کے نظریے کو پیروں کے بل کھڑا کر دیا اور تمام روحانی اقدار اور مطلقیت اور تصوریت کو انہدام کی حد تک پہنچا دیا۔ سگمنڈ فرائڈ نے انسانی لاشعور کے نہاں خانوں کی گندگی کا سڑتا ہوا ڈھیر باہر نکال کر دکھایا اور انسانی اخلاق اور عظمت کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ اس طرح اب انسان دنیا کا مرکز نہیں رہا اور خود دنیا بھی نظام شمسی کا مرکز نہیں رہی کیوں کہ گیلیلیو نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ سورج زمین کے گرد نہیں گھومتا بلکہ زمین ہی سورج کے چاروں طرف گردش کرتی ہے۔ اسی طرح آئنس ٹائن کے نظریہ اضافت نے مطلق (Absolute) کے تصور کو سرے سے ہی خارج کر دیا۔ یوں زندگی کے غیر منطقی اور متضاد پہلوؤں کو اس طرح ہمارے سامنے پیش کیا گیا کہ انسان کا کسی بھی مطلق نظریے پر سے اعتبار اٹھ گیا۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ سماج، زندگی، اخلاقی اقدار اور علم النفس وغیرہ کی ساری معیاری اقدار ٹوٹ کر بکھر گئیں اور اس طرح بیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں میں ایک نیا شعور اور نئی حسیت منظر عام پر آئی، جس کی علم برداری جیمس جوائس، ٹی ایس ایلیٹ، ایذرا پاؤنڈ، رلکے اور ڈبلیو۔ بی۔ ییٹس نے کی۔ ان ادیبوں کو یہ شدید احساس تھا کہ اب کائنات کی حقیقت بیان کرنے کے لیے ادب کو نیا پیرایۂ اظہار درکار ہے۔ اس لیے جدیدیت کے زیر اثر جتنے بھی تجربات، تکنیک اور اسلوب کی سطح پر ہوئے وہ اسی اظہار کی شعوری کوشش تھے۔ رہی سہی کسر پہلی جنگ عظیم نے پوری کر دی۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم نے انسانوں کو اجتماعی موت کے بھیانک احساس سے بھی دوچار کیا۔ ان جنگوں نے بہت سے فلسفے، بہت سی قدروں اور بہت سی خوش گمانیوں کو بے رحمی سے اٹھا کر کوڑے یا ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ انسان کا باطن اب نئے سوالات سے دوچار تھا۔ باطن نے باہری دنیا کو بھی اثر

انداز کیا۔شعر وادب اور فن اور جمالیات کے تصورات بدل کر رہ گئے۔ معاشرے کے تمام سانچے یا تو ٹوٹ گئے یا بالکل ہی بدل گئے۔اس سلسلے میں شمیم حنفی کا خیال ہے کہ:

''مغربی شعر وادب میں جدیدیت کی باقاعدہ روایت کا سر آغاز دوسری جنگ عظیم کے بعد تخلیق کیے جانے والے ادب سے جوڑا جاتا ہے۔ جب کہ مغرب میں جدید دور علمی اور سماجی اور سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے صدیوں پہلے شروع ہو چکا تھا۔ آواں گارد جو مغرب میں جدیدیت کی بنیاد ہے، جس کے اثر سے جو تحریکیں فروغ پذیر ہوئیں ان میں چار اہم تحریکیں یعنی (1) مکعبیت (کیوبزم) (2) ماورائے حقیقت نگاری (سر ریئلزم) (3) مستقبلیت (فیوچرازم) اور (4) دادا ازم، ان سب کا آغاز وارتقا دوسری جنگ عظیم سے پہلے ہوا۔ اور ان چاروں تحریکوں کی الگ الگ انفرادیت کے باوجود رومانیت اور اشاریت پسندی کو ان کا پیش رو سمجھا جاتا ہے، جس کی کہانی انیسویں صدی کے اواخر میں شروع ہوئی تھی۔''

(پروفیسر خالد جاوید-مارکسزم، جدیدیت اور ادبی تنقید، عرشیہ پبلی کیشنز دہلی، ص:85-84)

یہاں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ رومانی تحریک کے ساتھ بھی جدیدیت کا کوئی نہ کوئی دھندلا سا رشتہ بنتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایلیٹ کا خیال تھا کہ سترہویں صدی کے آغاز میں ادیب اپنے معاشرے کا زندہ اور جیتا جاگتا حصہ نہ رہ کر بدلتے ہوئے حالات اور نئے معاشی اور سیاسی ماحول کا شکار ہو کر اپنے عہدے سے الگ ہو گیا۔ ایلیٹ نے اسے ہوش مندی کے انقطاع Dissociation of Sensibility کا نام دیا ہے۔ شمس الرحمان فاروقی اس ہوش مندی کے انقطاع کو رومانی تحریک کے ساتھ منسلک کر کے دیکھتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ:

''جب ہم رومانی تحریک یا رومانی احیا تک پہنچتے ہیں تو ہوش مندی کے انقطاع کی پوری صورت سامنے آجاتی ہے۔۔۔اٹھارویں صدی کے وسط میں یورپ کا زراعتی سماج آخری بار ہچکی لے کر خاموش ہو گیا۔ اس کی جگہ تیزی سے ایک مشینی سماج نے لینی شروع کر دی۔ جس کے اقدار کی اساس حسن وخوبی اور علم وفن پر نہیں بلکہ کارآمدگی، مادی آسائشوں میں اضافہ اور توسیع پر تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعر اور ادیب جو اب تک حسن وخوبی اور علم وفن کی بنا پر معاشرے کے معزز اور اہم افراد تھے اچانک بے گھر ہو گئے۔ اب ان کو یہ احساس ہونے لگا کہ وہ دوسروں سے مختلف ہیں۔ میری نظر میں جدید ادب کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے اور ہوش مندی کا آخری انقطاع یہیں سے ہوتا ہے۔''

(پروفیسر خالد جاوید، مارکسزم، جدیدیت اور ادبی تنقید، عرشیہ پبلی کیشنز دہلی، ص:85)

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جدیدیت کا باقاعدہ آغاز تو دوسری جنگ عظیم کے بعد یا دونوں جنگوں کے درمیان کے وقفے میں ہی ہوا ہے۔ مگر اس ذہنی رویے کے سراغ ماضی میں بہت پہلے بھی مل جاتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر وحید اختر:

''جدیدیت کی مختصر ترین تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ یہ اپنے عہد کی زندگی کا سامنا کرنے اور اسے تمام خطرات اور امکانات کے ساتھ برتنے کا نام ہے۔ ہر عہد میں جدیدیت ہم عصر زندگی کو سمجھنے اور برتنے کے مسلسل عمل سے

عبارت ہوتی ہے۔اس لحاظ سے جدیدیت ایک ایسا مستقل عمل ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے۔‘‘

(ڈاکٹر وحید اختر: جدیدیت کے بنیادی تصورات، بشمول ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، مرتبہ: ڈاکٹر ندیم احمد، نئی کتاب گھر، دہلی، 2017، ص:209)

اب اگر ہم جدیدیت کی بنیادی خصوصیت بیان کرنا چاہیں تو وہ کچھ اس طرح ہوں گی۔

(1) پہلی بات تو یہ کہ جدیدیت نے زبان، اسلوب اور تکنیک کو معانی اور موضوع سے زیادہ اہمیت دی ہے۔

(2) جدیدیت میں کردار کے روایتی سانچوں اور تصورات سے انحراف کیا جاتا ہے۔

(3) جدیدیت میں بیانیہ غیر مربوط، کبھی کبھی غیر منطقی اور مختلف جہات کا حامل ہوتا ہے۔

(4) جس طرح دادا ازم یا سرریئلزم میں مشاہدے اور ادراک کی بگڑی ہوئی شکلیں پیش کی جاتی ہیں، اسی طرح ادب میں بھی اس کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔

(5) جدیدیت میں، ناول یا افسانے میں پلاٹ کے روایتی تصور سے مکمل انحراف کیا جاتا ہے۔

جدیدیت کی مندرجہ بالا خصوصیات محض فیشن پرستی یا ادبی تجربے کے باعث وجود میں نہیں آئی تھیں۔لیکن ایسا اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ جب کسی خیال، رجحان یا تحریک کو استحکام حاصل ہو جاتا ہے تو فیشن پرستی بھی وجود میں آجاتی ہے۔ان خصوصیات کی وجوہات بڑی واضح تھیں۔شمیم حنفی کا خیال ہے کہ:

> ’’جس پیچیدہ، پریشان کن، تہذیبی، تاریخی اور جذباتی ماحول کے واسطے سے جدیدیت کا میلان سامنے آیا اور جسے مرتب کرنے میں پہلی جنگ عظیم کے بعد کی دنیا پیش پیش رہی اس کی ایک نمائندہ جہت بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی کے سیاسی حالات سے نکلتی ہے۔۔۔پہلی جنگ عظیم کے بعد کی دنیا میں ایک طرف پرانے آدرشوں کی شکست کا شعور ہے، دوسری طرف نت نئے اندیشوں اور وسوسوں کی سرگوشی۔ یہ ایک عظیم افسردگی کا دور (Depression) تھا۔اور ایسی متضاد، عجیب وغریب کیفیتوں کی گرفت میں تھا کہ اس کی پہچان مشکل ہو گئی تھی۔اخلاقی ضابطوں کے لحاظ سے ایک انقلابی تبدیلی کا دور تھا، جس نے حساس لکھنے والوں کو اپنی صورت حال کی عکاسی کا ایک نیا راستہ دکھایا، نئے اسالیب اختیار کیے گئے اور اجتماعی، سماجی اور سیاسی تجربوں کی ایک نئی بصیرت کا دروازہ کھلا۔سماجی حقیقت نگاری کے روایتی تصور اور تاریخ کی جدلیات پر یقین رکھنے والوں کی رسمی وضع کے برخلاف سماج، سیاست اور تخلیقی تجربے کے گنجلک رشتوں کو سمجھنے کی نئی کوششیں سامنے آئیں۔‘‘

(پروفیسر خالد جاوید، مارکسزم، جدیدیت اور ادبی تنقید، عرشیہ پبلی کیشنز دہلی، ص:87-88)

اردو میں اس قسم کے رجحانات اور مسائل 1960ء کے بعد ہی گفتگو کا حصہ بن پائے یعنی مغرب کی جدیدیت کے کم وبیش 40-38 سال بعد ہی اردو میں جدیدیت کی تحریک وجود میں آئی۔اردو میں ترقی پسند تنقید اور ترقی پسند ادب کی ادعائیت اور اکہرے پن کے ردعمل کے طور پر بھی اور ترقی پسندی کی توسیع طور پر بھی جدیدیت کی آمد ہوئی۔ایک معنی میں جدیدیت سماجی حقیقت نگاری کے کٹر پن کے خلاف ردعمل اور برہمی کا اظہار بھی ہے۔

بہر نوع چاہے وہ مغرب کی جدیدیت ہو یا اردو کی، ایک بات بالکل واضح ہے کہ چند فلسفیانہ میلانات کے بغیر جدیدیت کو سمجھا نہیں جا سکتا۔ جدیدیت کا ذہنی پس منظر فکر اور فلسفے کے کئی شعبوں سے مل کر تیار ہوا ہے۔ ان فلسفوں اور فکر میں ایک بات یکسر طور پر مشترک ہے کہ ان کے تجربے کا مرکز انسان کا ظاہری وجود نہیں بلکہ داخلی وجود ہے۔ دراصل یہی وہ تنازعہ ہے جو ایک عرصے سے مارکسی یا ترقی پسند ادیبوں اور جدیدیت کے حامیوں کے درمیان چلتا آ رہا ہے۔ یوں دیکھیں تو مارکس کا فلسفہ بجائے خود ایک جدید فلسفہ ہے اور مغرب میں جدیدیت کے رجحان کو پروان چڑھانے میں اس کا بھی کافی رول رہا ہے۔ مثلاً خدا کے وجود سے انکار، مذہب یا عقیدے کو افیم کہنا، روح یا شعور کی جگہ صرف مادے کو ہی قبول کرنا، غصہ، احتجاج اور دنیا کو تبدیل کرنے کا خواب یہ سب وہ عناصر ہیں جن سے مغرب میں جدید ادب کی تشکیل ہوئی ہے۔ مگر یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ آج ہم جسے جدیدیت کہتے ہیں اس میں داخلیت، انسان کی تنہائی، بے مائیگی، بے چارگی اور سائنسی اور صنعتی معاشرے کے تناظر میں انفرادی مسائل اور ایک وجودی فکر کی بنا پر ان دونوں کے درمیان جو تنازع ہے وہ ختم ہی نہیں ہو پاتا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مارکس کا فلسفہ آگے چل کر ایک سیاسی اور سماجی لائحہ عمل میں بدل گیا جب کہ جدیدیت کا سروکار باقاعدہ طور پر فلسفیانہ افکار و خیالات سے قائم رہا۔ ان افکار میں سب سے اہم فلسفہ وجودیت کا ہے۔

وجودیت کا آغاز باقاعدہ طور پر کسی فلسفیانہ منظّم نظام کے تحت نہیں ہوا ہے۔ فلسفے کے میدان میں اس کی آمد زیادہ تر کہانیوں، ناولوں اور ڈراموں کے ذریعہ ہوئی۔ وجودیت روایتی فلسفے کے مفروضات کو قبول نہیں کرتی ہے۔ وجودی مفکرین روایتی فلسفے کو صداقت سے دور مانتے ہیں۔ جس میں صرف بال کی کھال نکالنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ روایتی فلسفے میں کبھی بھی انسان کی تشریح یا تفہیم پر توجہ صرف نہیں کی گئی اس کے برخلاف وجودی فلسفی ساری فکر، توجہ اور مطالعے کو انسان پر مرکوز کرنا چاہتے ہیں۔ وجودیت جوہر (Assence) کو نہ مان کر اس کے وجود (Existence) کو اہمیت دیتی ہے۔ فلسفے میں وجود کے معنی باہر نکلنے یا پھر ابھرنے کے ہوتے ہیں۔ یہ ایک حرکت پذیر عمل ہے۔ یعنی جو کچھ بھی وجود کے ساتھ ہے وہ اپنے میں سے ابھرتا رہتا ہے۔ ایک امکان کی طرح مگر اس ''ابھرتے رہنے کے عمل'' سے آگہی اور اس کا شعور بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ اس کا وجود۔

اس معنی میں ظاہر ہے کہ کوئی بھی شے وجودی نہیں ہو سکتی۔ اس معنی اور سیاق میں صرف انسان ہی وجودی ہو سکتا ہے کیوں کہ اسے اپنے تجربے کا شعور بھی ہے کہ وہ اندر سے ابھر رہا ہے۔ وہ ایک امکان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ''وہ'' دراصل ''وہ'' ہے جو ''وہ'' ابھی نہیں ہوا۔ جدیدیت اور وجودیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے کیوں کہ وجودیت کے فلسفے کا آغاز بھی پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان ہی ہوا۔ اگرچہ ایک فلسفیانہ میلان کے طور پر وجودیت کا چرچا بیسویں صدی میں عام ہوا لیکن اس کی جڑیں مذہبی اور فلسفیانہ فکر کی روایت میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ وجودیت سیاسی بھی ہو سکتی ہے اور مذہبی یا غیر مذہبی بھی، مثبت بھی اور منفی بھی۔ مغرب میں وجودیت کے فلسفے کے علم برداروں میں کیرکے گارڈ، مارٹن ہائی ڈیگر، کارل یاسپرس، مارٹن بیوبر، ژاں پال سارتر اور البیئر کامیو وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ وجودیت کے فلسفے کی چند اہم جہات اس طرح ہیں:

(i) بے چینی (Aniety)

(ii) موت کا تجربہ یا شعور

(iii) آزادی اور ذمہ داری

(iv) پھینکا ہوا ہونا(Thrownness)

(v) بے سہارا پن(Forlornness)

(vi) جھلاہٹ (Anguish)

(vii) مایوسی (Despair)

ان جہات کے عرفان کے ذریعے ایک غیر معتبر وجود، معتبر وجود بننے کی طرف گامزن ہو سکتا ہے۔ تمام وجودی مفکرین بہت سی باتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ اختلاف رکھنے کے باوجود اس نکتے پر پوری طرح ہم خیال ہیں کہ انسان کا وجود اس کے جوہر پر مقدم ہے اور یہی وجودیت کے فلسفے کی روح ہے۔

جدیدیت میں انسان کی داخلی تنہائی، کرب، بے چینی، جھلاہٹ، بے چارگی وغیرہ کو مرکز بنایا گیا اور تمام تر توجہ خارج سے زیادہ اندرون ذات پر صرف کی گئی۔ 1960 کے بعد جدیدیت کے تحت جو شاعری وجود میں آئی اس میں عمیق حنفی، عادل منصوری، بلراج کومل، ظفر اقبال، احمد مشتاق، کمار پاشی، ندا فاضلی اور محمد علوی وغیرہ کے نام بہت اہم ہیں۔ ذیل میں کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

شاعر ہوں، کتاب بیچتا ہوں
ہاں نان کباب بیچتا ہوں!
بکھرے ہوئے خواب بیچتا ہوں
اپنے ہیں، جناب، بیچتا ہوں
زخموں کے گلاب بیچتا ہوں
کرتا ہوں حساب، بیچتا ہوں

(ظفر اقبال)

میں اس مٹی کا ذرہ ہوں جو صحرا پر نہیں برسی
میں اس بادل کا ٹکڑا ہوں جو دریا پر نہیں آیا

یار سب جمع ہوئے رات کی خاموشی میں
کوئی رو کر تو کوئی بال بنا کر آیا

کوئی ڈھونڈو کوئی سراغ لگاؤ
انھی پتوں میں چھپ گئی ہے بہار

(احمد مشتاق)

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصرؔ
اداسی بال کھولے سو رہی ہے
(ناصرؔ کاظمی)

بَین کرتی ہے دریچوں پہ ہوا
رقص کرتی ہیں سیہ پرچھائیاں
(سلیمؔ احمد)

ایک مدت سے چراغوں کی طرح جلتی ہیں
ان ترستی ہوئی آنکھوں کو بجھا دو کوئی
(ساقی فاروقیؔ)

وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی
اسی پہ ضرب پڑی جو شجر پرانا تھا
(افتخارؔ عارف)

عجیب خواب تھا تعبیر کیا ہوئی اس کی
کہ ایک دریا ہواؤں کے رخ پہ بہتا تھا
(آشفتہؔ چنگیزی)

خبر نہیں ہے کسی کو بھی خستگی کی مِری
مجھے نہ ہاتھ لگاؤ کہ ٹوٹ جاؤں گا
(سلیمان اریبؔ)

جو بات دل میں ہے کہہ لے، اٹھا نہ کل پہ اسے
بکھرتی ریت کا سمٹا ہوا بدن ہوں میں
(لطف الرحمٰن)

ڈرتا ہوں مِرے سر پہ ستارے نہ آپڑیں
چلتا ہوں آسماں کی طرف دیکھتا ہوا
(شہزاد احمد)

کچھ دور پر بگولوں کی افواج ہیں کھڑی
کوئی بھی شہر میں نہیں کس کو خبر یہ دوں
(شہریارؔ)

کچھ نہ کچھ ساتھ اپنے یہ اندھا سفر لے جائے گا
پاؤں میں زنجیر ڈالوں گا تو سر لے جائے گا

عجیب رونا سسکنا نواحِ جاں میں ہے
یہ اور کون مِرے ساتھ امتحاں میں ہے
(بانیؔ)

عجب سپردگی برگ زرد تھی اس میں
وہ شخص کانپ اٹھا تھا ہوا کے چلتے ہی
(مصورؔ سبزواری)

کس گھنے جنگل میں جاکر اب چھپیں اہلِ وطن
آنکھ سی ابھری ہوئی سورج کی پیشانی میں ہے
(وزیر آغا)

اب تو اپنے آپ کو بھی اجنبی لگتا ہوں میں
کون مجھ سے چھین کر میری نشانی لے گیا
(سلطان اخترؔ)

زمیں نے مانگ لیا، آسماں نے چھین لیا
ہمارے پاس نہ اب جسم ہے نہ سایا ہے
(بشیر بدؔر)

نہ کوئی راستہ میرا نہ کوئی منزل ہے
توڑ کر بند کواڑوں کو میں باہر آؤں
(عالم خورشیؔد)

بھیڑ سے کٹ کے نہ بیٹھا کرو تنہائی میں
بے خیالی میں کئی شہر اجڑ جاتے ہیں
(ندا فاضلی)

کبھی کبھی تو مکمل بنا کوئی تصویر
کہ زیب کچھ تو رہے ذہنِ نارسا کے لیے
(زیب غوری)

مجھ کو گرنا ہے تو میں اپنے ہی قدموں پہ گروں
جس طرح سایۂ دیوار پہ دیوار گرے
(شکیبؔ جلالی)

آندھی کو اپنی شاخ میں روکے کھڑے رہے
یوں احتجاج کچھ نئے اشجار کر گئے
(باقر مہدی)

سرکشی اپنی ہوئی کم نہ امیدیں ٹوٹیں
مجھ سے کچھ خوش نہ گیا موسمِ آلام کبھی
(حسن نعیم)

شاید اس طرح مرے دل میں کھلیں تازہ گلاب
نئے نشتر مرے پہلو میں اتارے کوئی
(اطہر نفیس)

میں ایک ذرّہ مری حیثیت ہی کیا ہے مگر
ہوا کے ساتھ ہوں اڑتے ہوئے غبار میں ہوں
(عادل منصوری)

میں جو ٹھہرا، ٹھہرتا چلا جاؤں گا
یا زمیں میں اترتا چلا جاؤں گا
جس جگہ نور کی بارشیں تھم گئیں
وہ جگہ تجھ سے بھرتا چلا جاؤں گا
درمیاں میں اگر موت آ بھی گئی
اس کے سر سے گذرتا چلا جاؤں گا
(عتیق اللہ)

مندرجہ بالا اشعار میں ذات کی تنہائی، خوف، کرب، دہشت اور احساس بیگانگی کے ساتھ ساتھ نامانوس الفاظ کا استعمال وافر تعداد میں موجود ہے، جن کے ذریعے جدیدیت کے رجحان کی واضح نمائندگی ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ذات کی شکست وریخت، تنہائی، خوف اور کرب اس دور کی نظموں میں بھی موجود ہے۔ ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

راہ مہتاب میں خوابوں کے پریشاں سائے
آگہی بن کے یکا یک رگِ جاں تک آئے
میں نے چاہا تھا انھیں واقفِ اسرار کروں
ایک ہی پل کے لیے مائلِ گفتار کروں
سردیِ غم میں وہ شعلوں کی زباں بن جائیں
شمع خلوت کی فغاں بن جائیں
لے گئی بادِ سحر گاہ اڑا کر ان کو
آہ ڈھونڈوں کہاں جا کر ان کو

کون سی شاخ سے پوچھوں میں نشیمن ان کا
ہر کرن بن گئی مسکن ان کا
وہ مجھے چھوڑ گئے اور میں تکتا ہی رہا
میں اکیلا تھا اکیلا ہی رہا
(نظم ''خواب''، منیب الرحمن)

سالہا سال سے ہے مقدر ہمارا یہی تیرگی
سرد اور گرم گدلا دھواں
صورتیں۔عکس
جسم۔پرچھائیاں
اجنبی۔اجنبی
وقت یوں بہہ رہا ہے کہ جیسے یہاں کوئی زندہ نہیں
جیسے اس قطعۂ ارض کا حشر ہو بھی چکا
جانداروں کے پنجرے سبھی کھو گئے
(نظم ''بے نظیر میری آنکھیں''، قاضی سلیم)

پراسرار بلاؤں والا
سارا جنگل دشمن ہے
شام کی بارش کی ٹپ ٹپ
اور میرے گھر کا آنگن
ہاتھ میں اب ہتھیار نہیں ہے
باہر جاتے ڈرتا ہوں
رات کے بھوکے شیروں سے
بچنے کی کوشش کرتا ہوں
(نظم ''جنگ میں زندگی''، منیر نیازی)

جدائی محبت کے دریائے خوں کی معاون ندی ہے
نگاہوں میں خوابوں کے ٹوٹے ہوئے آئینے ہیں
دلوں کے جزیروں میں اشکوں کے نیلم چھپے ہیں
اور آنکھوں کے رادار پر صرف تاریک پرچھائیاں ہیں
ہمیں موت کی تیز خوشبو نے پاگل کیا ہے
امیدوں کے سرخ آب دوزوں میں سہمے
تباہی کے کالے سمندر میں بہتے چلے جارہے ہیں
(نظم ''موت کی خوشبو''، ساقی فاروقی)

اسی طرح فکشن میں انور سجاد، سریندر پرکاش، احمد ہمیش، بلراج مین را، غیاث احمد گدّی اور خالدہ حسین وغیرہ نے جدیدیت کے رجحان کے تحت بہت عمدہ افسانے لکھے۔ انور سجاد کا افسانہ ''کونپل''، سریندر پرکاش کا افسانہ ''دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم''، احمد ہمیش کا افسانہ ''کہانی مجھے لکھتی ہے''، بلراج مین را کا افسانہ ''آتمارام''، غیاث احمد گدّ کا افسانہ ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی'' اور خالدہ حسین کا افسانہ ''سواری''، جدیدیت کے رجحان کے تحت لکھے جانے والوں افسانوں کی بہترین مثالیں ہیں۔ یہ سلسلہ تقریباً دو دہائیوں تک محیط رہا جب تک کہ 1980 کے آتے آتے صورت حال میں کچھ ایسی تبدیلیاں آگئیں جن کے سبب ہم جدیدیت کے عہد سے مابعد جدیدیت کے عہد تک جا پہنچے۔ اگرچہ ادب کی تاریخ میں اس طرح کے تعین کرنا بھی آسان کام نہیں۔

16.3 مابعد جدیدیت

مابعد جدیدیت، جدیدیت کے خلاف کسی ردعمل کی طرح وجود میں نہیں آئی۔ اسے زیادہ سے زیادہ کچھ معاملات میں ایک فکری انحراف کا نام دیا جاسکتا ہے۔ جدیدیت کا رویہ فکری سطح پر ہونے والے انقلابات کا ردعمل تھا۔ اس لیے تکنیک اور اسلوب کی وہ تبدیلیاں جو جدیدیت کے زیر اثر لکھے جانے والے ادب میں رونما ہوئیں، ایک ثانوی حیثیت کی حامل تھیں۔ داخلی احساس کوئی تکنیک یا اسلوب نہیں تھا۔

مگر مابعد جدیدیت ایک تحریک کی صورت میں سامنے نہیں آئی۔ ایذرا پاؤنڈ، ٹی ایس ایلیٹ اور ورجینا وولف نے تو جدیدیت کے امتیازات نمایاں کرنے کے لیے باقاعدہ مضامین لکھے تھے۔ مگر مابعد جدیدیت کا اپنا کوئی واضح منشور نظر نہیں آتا۔

جدیدیت کے بنیادی میلانات نے ہی مابعد جدیدیت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اسے ایک ادبی رجحان بے شک کہا جاسکتا ہے۔ مگر اس کے پہلے کسی منظّم فلسفے کی چھان بے سود ہوگی۔ اس لیے مابعد جدیدیت کے تحت لکھے جانے والے ادب میں تکنیک اور اسلوب کی سطح پر تو روایتی قسم کی جدیدیت سے انحراف نظر آتا ہے مگر فکر اور احساس یا موضوع کی سطح پر کوئی بہت بڑی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ دونوں جگہ بنیادی مسئلہ انسان اور اس کے وجود کا ہی ہے۔ جہاں تک مابعد جدیدیت کے آغاز کا سوال ہے تو اس سلسلے میں شکوہ محسن مرزا لکھتے ہیں:

> ''ورجینا وولف نے 1929 میں شائع شدہ اپنے مضمون ''مسٹر بینٹ اور مسز براؤن'' میں لکھا تھا کہ جدید زمانے کا آغاز تقریباً دسمبر 1910 سے ہوتا ہے۔ جب انسانی کردار تبدیل ہوگیا۔ 1977 میں فن تعمیر کے ناقد چارلس

جینکس نے وولف کے قول میں اضافہ کیا، وہ لکھتا ہے کہ 15 جولائی 1977 کے دن تین بج کر بتیس منٹ پر جدیدیت اختتام پذیر ہوئی۔ چارلس جینکس کا اشارہ سینٹ لوئی میں منوریاماسا کی جدیدترین عمارتوں کے انہدام کی طرف تھا کیوں کہ یہ انہدام ایک دور کے اختتام کی علامت تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم ایسے زمانے میں سانس لے رہے ہیں جہاں جدیدیت سے مختلف نئے شعور اور حسیت کے خدوخال بھرے ہیں۔ اس شعور کے زیر اثر تخلیق ہونے والے ادب کے لیے مابعد جدید ادب کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ اس کے اثرات نہ صرف ادب بلکہ تمام فنون لطیفہ میں نظر آتے ہیں۔''

اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی مابعد جدیدیت کا تصور پوری طرح واضح نہیں ہوسکا ہے۔ مابعد جدیدیت کے ساتھ ساتھ پس ساختیات یا ردتشکیل کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ اکثر ان دونوں اصطلاحات کو ایک دوسرے کے بدل کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن پس ساختیات یا ردتشکیل (Deconstructur) کا تعلق تھیوری سے زیادہ ہے جب کہ مابعد جدیدیت کا تعلق تہذیب، ثقافت اور معاشرتی رویوں سے زیادہ ہے۔

مابعد جدیدیت، جدیدیت کی پیدا شدہ صورت حال کے بعد کی توسیع ہے یا اس کا ارتقا ہے۔ جدیدیت میں ایک طرح کا اکہرا پن موجود تھا لیکن مابعد جدیدیت میں کسی ایک نظام فکر یا کٹر پن کی اجارہ داری نہیں ہے۔ مابعد جدیدیت میں مختلف فکری دھارے، افکار اور نظریات برابر متحرک رہتے ہیں اور آپس میں مدغم بھی ہوتے رہتے ہیں۔ مابعد جدید مرکزیت سے نہیں بلکہ لامرکزیت سے متعلق ہے۔ ایک طرح سے مابعد جدیدیت ایک متوازن فکر کا نام ہے، یہ کسی ایک فکری نظام کو سب پر مسلط نہیں کرتا۔

جہاں تک مابعد جدیدیت کے لفظ کا سوال ہے، اسے سب سے پہلے ایک انگریز مصور جان وٹکنس چیمپین نے 1870 میں استعمال کیا تھا۔ مگر اس نے مابعد جدیدیت کو تاثیریت (Impressionism) کی تحریک اور سامنے آنے والے رجحان کے مفہوم میں برتا تھا۔ اس کے بعد 1954 میں Fredric Donession نے مابعد جدیدیت لفظ کا استعمال ایک ردعمل کے طور پر کیا۔ کیوں کہ اس زمانے میں جدید شاعری حد سے زیادہ مشکل پسند اور تجرباتی ہوتی جا رہی تھی۔ سوشلسٹ حقیقت نگاری کے مفہوم میں بھی آگے چل کر مابعد جدیدیت کو موجودہ اور معاصر صورت حال کے مفہوم میں برتا اور تفصیل کے ساتھ اس صورت حال کی وضاحت بھی کی گئی۔ اس کے بعد یہ اصطلاح ہر علوم کے شعبوں اور دانشوروں میں مقبول اور عام ہوگئی۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ مابعد جدیدیت کی اصطلاح تقریباً 136 سال پرانی ہے مگر آج جس مفہوم میں اس اصطلاح کا استعمال کیا جاتا ہے اس کی مدت پانچ دہائیوں سے زیادہ نہیں ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مابعد جدیدیت سے متعلق بحثیں شروع شروع میں ادب میں رائج نہ تھیں اور نہ ہی فلسفے یا لسانی افکار میں۔ بلکہ آرکی ٹیکچر میں ایک مخصوص رجحان کی نمائندگی کرنے کے لیے ان کا استعمال کیا جاتا تھا اور اس زمانہ میں یورپ کی دانشورانہ فضا میں ساختیات کا بڑا زور وشور تھا لیکن بعد میں جب مابعد جدیدیت آرکی ٹیکچر کے دائرے سے نکل کر یورپ کی یونیورسٹیوں اور کالجوں تک پہنچ رہی تھی، اس وقت پس ساختیات کے مباحث عام ہو رہے تھے۔ جن میں دریدہ، میشل فوکو، لاکاں اور جولیا کرسٹیوا وغیرہ کے خیالات اور افکار بے حد اہم ہیں۔ مابعد جدیدیت پس ساختیات کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتی رہی مگر اس نے اپنا تعلق کلچرل صورت حال سے زیادہ بنائے رکھا اور ان نظریات سے بھی جو جدیدیت کے ردعمل یا اس کی توسیع کے طور پر وجود میں آئے۔ اس طرح جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ پس ساختیات کا دائرۂ کار ایک فکر یا ایک نظریہ

تک محدود ہے جب کہ مابعد جدیدیت ایک پورے ثقافتی منظر نامے اور اس صورت حال سے وابستہ نظریات کے حوالے سے ایک عہد کے مترادف ہے۔ مابعد جدید کے اہم ترین نظریہ سازوں میں لیوتار اور بودریلا ہیں۔ ان دونوں مفکروں کے علاوہ مابعد جدیدیت میں فریڈرک جیمسن کا نام بھی بہت اہم ہے۔ جس نے لیوتار کی اس بات کو تسلیم نہیں کیا کہ اب مہابیانیہ (Grand Narrative) ختم ہو چکے ہیں اور اس کی جگہ چھوٹے چھوٹے مختلف ثقافتوں، اقوام، علاقوں اور چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی نمائندگی کرنے والے بیانیہ تشکیل کیے جا رہے ہیں۔ فریڈرک جیمسن کا خیال ہے کہ مہابیانیہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ وہ ہمارے اجتماعی لاشعور کا حصہ بن چکا ہے۔ اس کو وہ سیاسی لاشعور کا نام دیتا ہے۔ لیکن پس ساختیات یا مابعد جدیدیت دونوں ہی کلیت پسندی کی مخالف ہیں اور دونوں جدیدیت کے بنیادی مفروضات کو چیلنج کرتی ہیں۔ پس ساختیات اور مابعد جدیدیت، جدیدیت سے جن عناصر پر مختلف رویہ برتتی ہیں وہ ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں:

(i) آفاقیت کے بجائے مقامیت

(ii) مماثلت کے بجائے افتراق

(iii) یکسانیت کے بجائے تنوع

اسی طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان بنیادی اختلافات کے سبب مابعد جدیدیت کی کچھ ذیلی تھیوریاں بھی وجود میں آئیں۔ مثلاً نو آبادیت، نومارکسیت، نئی تاریخیت، تفہیمات، تانیثیت وغیرہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ دلت ادب، سیاہ فام ادب، لوک ادب، قبیلائی ادب یہاں تک کہ مقبول عام ادب یا پاپولر کلچر پر بھی نئے سرے سے غور و خوض اور تفتیش کا عمل مابعد جدیدیت کے دور میں ہی شدت کے ساتھ پروان چڑھا ہے۔ دراصل یکسانیت اور اشتراک جدیدیت کی صفات تھیں۔ مگر ان صفات کو مابعد جدیدیت تنقیدی نظر سے دیکھتی ہے۔ جدیدیت مماثلتوں کو اہمیت دیتی تھی۔ اور اس طرح اشیا اور مظاہر کی بنیادی اور آفاقی ساخت اور عالم گیر صداقت کو قبول کرتے ہوئے اس کی جستجو اور تفتیش کرتی تھی۔ مگر مابعد جدیدیت نہ تو کسی آفاقی ساخت کو مانتی ہے اور نہ ہی کسی آفاقی صداقت کو اور نہ ہی کسی قسم کی مرکزیت کو۔ اس ضمن میں ناصر عباس نیر لکھتے ہیں:

> ''مابعد جدیدیت کو چوں کہ ایک عہد قرار دیا گیا ہے، اس لیے اس عہد کی علمی، سماجی، ثقافتی اور جمالیاتی سرگرمیوں کو بھی مابعد جدید قرار دینا لابدی تھا۔ ادوار بندی یا Periodization میں ایک گونہ جبر ہوتا ہے۔ افتراقات کو نظر انداز کیا جاتا اور مماثلتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا اور انھیں ایک دور کی تمام سرگرمیوں پر مسلط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ جبر کسی حد تک مابعد جدیدیت میں بھی ہے، لیکن مابعد جدیدیت ''خود شعوریت'' کی حامل ہونے کی وجہ سے اس جبر سے آگاہ اور اس کی نقاد ہے۔ مثلاً بعض مورخین نے نشاۃ ثانیہ، روشن خیالی اور جدیدیت کے ادوار کو پورے یورپ اور پوری دنیا کی تاریخ کے ادوار کہا ہے۔ مابعد جدیدیت تاریخ کے ''جبری اور کلی تصور'' کو مسترد کرتی ہے۔ مابعد نو آبادیاتی تھیوری نے بالخصوص تاریخ کے اس تصور کو مغرب کے نو آبادیاتی مقاصد کا شاخسانہ قرار دیا ہے۔ مابعد جدیدیت ہر تاریخی عہد اور ہر مظہر کو Localized تسلیم کرتی ہے۔ لہٰذا ہر عہد اور ہر مظہر اپنے مقام تناظر میں وجود رکھتا اور قابلِ فہم ہوتا ہے۔ اس دلیل کی رو سے مابعد جدیدیت، خود بھی اپنے تناظر

کی پابند ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ ہر علاقے اور خطے کی اپنی مخصوص مابعد جدیدیت ہے۔ دوسرے لفظوں میں کسی تاریخی دور اور کسی علمی، ثقافتی یا جمالیاتی مظہر کی تفہیم کے لیے آفاقی اور اٹل اصولوں کی قائل نہیں۔ وہ ان کے لیے خود انھی سے یا انھی کے لیے موزوں پیراڈائم کی اہمیت پر زور دیتی ہے۔ مابعد جدیدیت کسی بھی طرح کی مرکزیت کی قائل نہیں۔''

(ناصر عباس نیرّ، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ص-583)

اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب ہم مابعد جدیدیت کی بات کرتے ہیں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس سے پہلے کے نظریات اور اصول قطعی ختم ہو گئے ہیں۔ دراصل مابعد جدیدیت کا تعلق بنیادی طور پر کلچر سے ہے۔ لیکن الگ الگ ادوار اور مقامات کی حقیقت کی آگہی بدلتی رہتی ہے۔ ہمیں ادب میں بھی یہ بات تسلیم کر لینی چاہیے کہ ہم مخلوط تہذیبوں کے دور میں زندہ ہیں۔ نظریاتی مرکزیت اب بکھر رہی ہے۔ نئے نئے مرکز وجود میں آرہے ہیں۔ مثلاً مذہبی نظریات کے مرکز، نسلی نظریات کے مرکز، جنسی تفریق اور امتیاز کے مرکز اور تہذیبی شناخت کے مرکز۔ مابعد جدیدیت اسی لگاتار متغیر اور تشکیل ہوتی ہوئی حقیقت کا ایک نام ہے۔

اردو میں مابعد جدیدیت کے مباحث 1986 کے بعد ہی عام ہو سکے ہیں اور مابعد جدید تنقید وجود میں آئی ہے جو کہ ڈی کنسٹرکشن یعنی ردتشکیل پر زور دیتی ہے اور ایک مخصوص کلچر اور ثقافتی پس منظر میں فن پارے کو دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ گوپی چند نارنگ، قمر جمیل، فہیم اعظمی، وزیر آغا، وہاب اشرفی، شافع قدوائی، ابوالکلام قاسمی اور ناصر عباس نیر نے مابعد جدید تنقید کے حوالے سے بہت سے مضامین لکھے ہیں جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

جہاں تک تخلیقی ادب کا سوال ہے، عرفان صدیقی، فرحت احساس، خالد عبادی، غلام مرتضٰی راہی، اسعد بدایونی، منظور ہاشمی، قاسم امام، مہتاب حیدر نقوی، آشفتہ چنگیزی، عزیز بہرائچی، عالم خورشید، شین کاف نظام، طارق متین اور راشد طراز وغیرہ کے نام مابعد جدید غزل کے حوالے سے نمایاں طور پر لیے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح عالم خورشید، جینت پرمار، ارشد عبدالحمید، سلیم انصاری، شاہد کلیم، فرحان حنیف وغیرہ مابعد جدید نظم کے اہم نام ہیں۔ مابعد جدید عہد کی شاعری کے حوالے سے ذیل میں کچھ مثالیں پیش کی جارہی ہیں:

ہوائے کوفۂ نامہرباں کو حیرت ہے
کہ لوگ خیمۂ صبر و رضا میں زندہ ہیں

گزرنے والے جہازوں کو کیا خبر ہے کہ ہم
اسی جزیرۂ بے آشنا میں زندہ ہیں

(عرفان صدیقی)

یہ سچ ہے ایک جست میں ہے فاصلہ تمام
لیکن اُدھر بھی شہر گماں دیکھتا ہوں میں
(آشفتہ چنگیزی)

اس شہرِ زیاں کے باہر کے منظر ہوں مبارک یاروں کو
ہم خوگر دھوپ کی شدت کے ہم عادی گردِ ملال کے ہیں
(اسعد بدایونی)

مِری زمین مرے ساتھ ساتھ چلتی ہے
وگرنہ میرے لیے تھا تو دربدر ہونا
(مہتاب حیدر نقوی)

صبح تلک جینا تھا سو ہم نے بات کو کیا کیا طول دیا
اگلی رات کو پھر سوچیں گے اگلا موڑ کہانی کا
(عرفان صدیقی)

حسین ابن علی کربلا کو جاتے ہیں
مگر یہ لوگ ابھی تک گھروں کے اندر ہیں
(شہریار)

ہم نے اپنا دستِ سوال قلم کر ڈالا ہے
ہم سے شاہ گداؤں جیسی باتیں کرتے ہیں
(اسعد بدایونی)

ہم کو پسند آگیا ساحل کا مشورہ
کشتی کی لکڑیاں تھے شجر ہو کے رہ گئے
(فرحت احساس)

وہ قصۂ خواب ہوں حاصل نہیں کوئی میرا
ایسا مقتول کہ قاتل نہیں کوئی میرا
(عین تابش)

اکثر تیری یادیں ہی اپنا سرمایہ ہوتی ہیں
اکثر تیری یادوں سے ہم کترانے سے لگتے ہیں
(شعیب نظام)

دو الگ لفظ نہیں ہجر و وصال
ایک میں ایک کی گویائی ہے
(فرحت احساس)

غروب مہر کی آبادیوں میں راستہ بن کر
وہ اک بلقیس کم آثار میرے ساتھ چلتی ہے
(ثروت حسین)

سلگتی ریت ہے اور ٹھنڈے پانیوں کا سفر
وہ کون ہے جو ہمیں راستہ دکھاتا ہے
(آشفتہ چنگیزی)

دمک رہا ہوں ابھی تک اس کے دھیان سے میں
بجھے ہوئے اک خیال کی روشنی تو دیکھو
(شارق کیفی)

ہجر و وصال چراغ ہیں دونوں تنہائی کے طاقوں میں
اکثر دونوں گُل رہتے ہیں اور جلا کرتا ہوں میں
(فرحت احساس)

آنکھوں نے دیکھتے ہی اسے غل مچا دیا
طے تو یہی ہوا تھا کہ رونا نہیں ہے آج
(فرحت احساس)

اے خدا میری رگوں میں دوڑ جا
شاخِ دل سے اک ہری پتی نکال
(فرحت احساس)

ستم یہ تھا کہ میں اس کا بدل بھی
اسی سے ملتا جلتا ڈھونڈتا تھا
(شارق کیفی)

گذر گئے ہیں جو موسم کبھی نہ آئیں گے
تمام دریا کسی روز ڈوب جائیں گے
(آشفتہ چنگیزی)

اسی طرح مابعد جدید نظم کے حوالے سے چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں:

تو ہم سب
عجب جنگلوں کے سفر پر رواں ہیں
ہر اک شخص انجانی دہشت سے سہما ہوا ہے
نظر کی حدوں تک
اندھیروں کا اک سلسلہ ہے
بھیانک درندوں کی آواز
ہر سمت پھیلی ہوئی خامشی توڑتی ہے
کہیں دور تک
جگنوؤں کے بدن سے
ابھرتی ہوئی روشنی کا نشاں بھی نہیں ہے

ہوائیں بہت تیزیوں چل رہی ہیں کہ
سارے دیے بجھ چکے ہیں
تو آؤ
ہر اک لمحہ بڑھتی سیاہی میں ہم
اپنے اندر کی مشعل جلائیں
خدا کو جگائیں
(نظم ''نجات کے لیے''، عالم خورشید)

صبح کا کونا بھرا پڑا ہے
ساری دنیا کی خبروں سے
بڑے بڑے کالے حرفوں کی یونی سے
ٹپک رہا ہے خون
گاؤں میں آدی باسی لڑکی پر زنا
پانچ پانچ بھیڑیوں کا
اک عورت کی رانوں پر
ناخن کے نیزوں کا نشان
جلتی چمڑی کی بدبو
چھپر کے ماتھے سے اٹھتا سرخ دھواں
کسی پھول کے سینے میں
گولیوں کی برسات
بجھی بجھی سی میری ذات
اسکول کے بچوں کی گردن پہ
لٹک رہا تلوار کا ہاتھ
بم پھٹنے سے کسی شہر کا سر غائب
(نظم ''ٹائمز''، جینت پرمار)

شاعر کہتا ہے
اور ہر شعر کے بعد اسے مرنا پڑتا ہے
ہر موت کے بعد اس کی ڈھیلی ڈھالی جیبوں سے
نظموں کی پڑیاں نکلتی ہیں
تڑے مڑے کاغذوں میں ٹیڑھے میڑھے مصرعے لکھے ہوتے ہیں
دھول سے اٹے ہوئے اس کے لمبے کوٹ میں
۔۔۔بھرا ہوتا ہے پورا ایک ماضی
جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا
کٹا پھٹا
جس کی پیوندکاری کرتے کرتے
اس کی انگلیاں چھل جاتی ہیں
آنکھوں میں تیلیاں چبھنے لگتی ہیں
وہ ہمیشہ خاموش رہتا ہے
صرف اس کے لفظ بولتے ہیں
لفظ ،کبھی کبھی چیخنے بھی لگتے ہیں
ان کی چیخ سے کسی کے کان نہیں پھٹتے
زمین کا پہیہ نہیں رکتا
آسمان نہیں گرتا
کچھ ادھر سے اُدھر نہیں ہوتا
پھر بھی لفظ بولتے ہیں
کبھی کبھی چیختے بھی ہیں
(نظم ''لفظ بولتے ہیں''، عتیق اللہ)

1980 کے بعد اردو میں جو افسانے لکھے گئے ہیں ان میں نیر مسعود، سید محمد اشرف، پیغام آفاقی ،مشرف عالم ذوقی، طارق چھتاری، غضنفر، خالد جاوید، صدیق عالم ایسے نام ہیں جنھیں بجا طور پر مابعد جدید افسانہ نگار کہا جا سکتا ہے۔ نیر مسعود کا افسانہ ''طاؤس چمن کی مینا''، سید محمد اشرف کا افسانہ ''بادِ صبا کے انتظار میں''، پیغام آفاقی کا افسانہ ''بالٹی''، مشرف عالم ذوقی کا افسانہ ''باپ بیٹا''، طارق چھتاری کا افسانہ ''نیم پلیٹ''، غضنفر کا افسانہ ''کڑوا تیل''، خالد جاوید کا افسانہ ''برے موسم میں'' اور صدیق عالم کا افسانہ ''ڈھاک بنڈ'' مابعد جدید افسانے کی نمایاں مثالیں ہیں۔

اسی طرح گذشتہ 30-25 سال میں اردو میں جو ناول لکھے گئے ہیں ان میں پیغام آفاقی کا ناول ''مکان''، غضنفر کا ناول ''پانی''، عبدالصمد کا ناول ''دھمک''، حسین الحق کا ناول ''بولو مت چپ رہو''، مشرف عالم ذوقی کا ناول ''مرگ انبوہ''، سید محمد اشرف کا ناول ''نمبردار کا نیلا''، خالد جاوید کا ناول ''نعمت خانہ''، صدیق عالم کا ناول ''چینی کوٹھی'' مابعد جدید رجحان کی عکاسی اور نمائندگی کرتے ہیں۔

اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر جدیدیت، ترقی پسندی کی توسیع تھی یا ہے تو اسی طرح مابعد جدیدیت، جدیدیت کی توسیع ہے۔ مابعد جدیدیت میں داخلیت اور تجریدیت کے عناصر جدیدیت کی مانند بے قابو نہیں ہوئے ہیں۔ مابعد جدیدیت میں فردیت اور اجتماعیت دونوں کا ایک متوازن امتزاج پایا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ مابعد جدیدیت نے ترقی پسند ادب کی صحت مند روایات کو جذب کرتے ہوئے جدیدیت کے بنیادی عناصر سے بھی چشم پوشی نہیں کی، جو کہ اس کی ہم عصریت کی ایک نشانی ہے۔

16.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- ☆ جدیدیت نے زبان، اسلوب اور تکنیک کو موضوع اور تفہیم سے زیادہ اہمیت دی۔
- ☆ جدیدیت میں کردار کے روایتی تصور سے انحراف کیا جاتا ہے۔
- ☆ جدیدیت میں بیانیہ غیر مربوط، علامتی اور کبھی کبھی تجریدی بھی ہوتا ہے۔
- ☆ جدیدیت میں مصوری کی بعض تکنیکوں مثلاً دادا ازم یا سرریئلزم کا بھی استعمال ہوتا ہے۔
- ☆ جدیدیت میں پلاٹ کے اکہرے اور روایتی تصور سے انحراف کیا جاتا ہے۔
- ☆ جدیدیت کی فکری بنیادوں میں وجودیت کا فلسفہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔
- ☆ وجودیت انسان کے جوہر پر اس کے وجود کو مقدم ٹھہراتی ہے۔
- ☆ مابعد جدیدیت، کلچرل صورت حال سے متعلق ہے۔
- ☆ مابعد جدیدیت، جدیدیت کی توسیع کہی جاسکتی ہے۔
- ☆ مابعد جدیدیت آفاقیت کے بجائے مقامیت پر زور دیتی ہے۔
- ☆ مابعد جدیدیت مماثلت کے بجائے افتراق کی قائل ہے۔
- ☆ مابعد جدیدیت یکسانیت کے بجائے تنوع سے سروکار رکھتا ہے۔
- ☆ اردو میں مابعد جدیدیت کی تحریک 1980 کے بعد سے وجود میں آئی۔

16.5 کلیدی الفاظ

الفاظ	معنی
آواں گارد	جدید، ماڈرن، ہراول دستہ، نئے خیالات اور آرٹ اور ادب میں نئی ہیئتوں کی ایجاد کرنے والا۔

دادا ازم	مصوری کی ایک تکنیک جو پہلی جنگ عظیم کے بعد وجود میں آئی اور جس میں حقیقی اشیا کا مسخ روپ پیش کیا جاتا ہے۔
سرریئلزم	تحت الشعور کیفیات یا خواب کی کیفیات کو مصوری میں ایک تکنیک کی طرح پیش کیے جانے کو کہتے ہیں۔اس میں بھی حقیقی اشیا اور شعور کے درمیان بظاہر کوئی منطقی ربط نہیں ہوتا۔
ہوش مندی کا انقطاع	ٹی ایس ایلیٹ کے ذریعہ دی گئی ایک اصطلاح جس کے بعد جدیدیت کا آغاز ہوا۔اس خیال کے مطابق سترہویں صدی کے آغاز میں کچھ ایسے سیاسی اور معاشی حالات پیدا ہوئے تھے جن کے سبب ادیب اپنے معاشرے کا ایک زندہ اور جیتا جاگتا حصہ نہ رہا اور اس سے کٹ کر تنہائی اور بیگانگی کا شکار ہو گیا۔
ردتشکیل	دریدا، لاکا اور جولیا کرسٹیوا کے مطابق کسی بھی فن میں معنی کا التوا میں ہونا۔یعنی تحریری متن کے جوہر یا مرکز تک رسائی کا نہ ہونا۔ردتشکیل کے افتراقی پہلو کی وجہ سے معنی لگاتار ملتوی ہوتے جاتے ہیں۔کیوں کہ زبان نظام نشانات کا ایک کھیل ہے جو کہ لامتناہی ہے۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ ردتشکیل کسی 'معنی' کو قبول نہیں کرتا بلکہ یہ کہ ایک معنی دوسرے معنی کا رد ہے۔یعنی برابر بکھرتے اور پھیلتے رہتے ہیں۔تحریری متن کے حوالے سے ردتشکیل کو ایک جدلیاتی عمل بھی کہا جا سکتا ہے۔
پس ساختیات	پس ساختیات میں ردتشکیل کے عمل کا استعمال کیا جاتا ہے۔یعنی کسی فن پارہ کا کوئی ایک مرکز نہیں ہوتا بلکہ ساخت ہوتی ہے اور پس ساختیات اس ساخت میں بھی کسی ایک مطلق یا حتمی معنی کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا۔
مہابیانیہ	مہابیانیہ سے مراد وہ بڑے اور عظیم بیانیہ ہیں جو کہ عالم گیری رجحان کے حامل ہیں اور جن میں انسان اور اس کی اخلاقی صورت حال کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔مہا بیانیہ آفاقی اقدار کی ترجمانی کرتا ہے۔ رامائن، مہابھارت، اوڈیسی، داستان امیر حمزہ وغیرہ مہابیانیہ کہے جا سکتے ہیں۔

16.6 نمونہ امتحانی سوالات

16.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ مغرب میں جدیدیت کی ابتدا کب ہوئی؟

2۔ اردو میں جدیدیت کی ابتدا کب ہوئی؟

3۔ جدیدیت کی نمائندگی کرنے والے کسی ایک شاعر کا نام لکھیے۔

4۔ جدیدیت کی نمائندگی کرنے والے کسی ایک افسانہ نگار کا نام لکھیے۔

5۔ مابعد جدید کا لفظ سب سے پہلے کس نے استعمال کیا؟

6۔ اردو میں مابعد جدیدیت کی شروعات کس دہائی میں ہوئی؟

7۔ اردو کے کسی ایک مابعد جدید ناول نگار کا نام لکھیے۔

16.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ جدیدیت کے رجحان پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

2۔ وجودیت کے مفہوم کو سمجھائیے۔

3۔ مابعد جدیدیت پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

4۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے فرق کو واضح کیجیے۔

5۔ جدیدیت کے نظموں کے موضوعات پر ایک نوٹ لکھیے۔

16.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ جدیدیت کی فکری بنیادوں کی نشاندہی کیجیے۔

2۔ فلسفہ وجودیت کی اہم جہات بیان کیجیے۔

3۔ مابعد جدیدیت کی بنیادی خصوصیات بیان کیجیے۔

16.7 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	جدیدیت کی فلسفیانہ اساس	شمیم حنفی
2۔	فلسفے کے جدید نظریات	قاضی قیصر الاسلام
3۔	مارکسزم، جدیدیت اور ادبی تنقید	خالد جاوید
4۔	اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ	گوپی چند نارنگ
5۔	ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت	ندیم احمد
6۔	فلسفہ وجودیت اور ادبی تنقید	خالد جاوید
7۔	دستک اس دروازے پر	وزیر آغا
8۔	ساختیات اور سائنس	وزیر آغا

نمونۂ امتحانی پرچہ

Time:3 hours وقت: 3 گھنٹے | Marks : 70 نشانات : ۷۰

ہدایات:

یہ پرچۂ سوالات تین حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم۔ تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینا لازمی ہے۔

1۔ حصہ اول میں 10 لازمی سوالات ہیں، جو کہ معروضی سوالات / خالی جگہ پُر کرنا / مختصر جواب والے سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے 1 نمبر مختص ہے۔ (10x1 = 10 Marks)

2۔ حصہ دوم میں آٹھ سوالات ہیں، ان میں سے طالب علم کو کوئی پانچ سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبرات مختص ہیں۔ (5x6=30 Marks)

3۔ حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں، ان میں سے طالب علم کو کوئی تین سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبرات مختص ہیں۔ (3x10=30 Marks)

حصہ اول

سوال:1

(i) غزل کس زبان کا لفظ ہے؟

(a) اردو (b) عربی (c) فارسی (d) ہندی

(ii) ''انجمن اصلاح زبان'' کس نے قائم کی؟

(a) یقینؔ (b) آرزوؔ (c) شاہ حاتمؔ (d) انجامؔ

(iii) ''خدائے سخن'' کس شاعر کو کہا جاتا ہے؟

(a) میر تقی میرؔ (b) مرزا غالبؔ (c) میر دردؔ (d) سوداؔ

(iv) ولیؔ کا دیوان دہلی کب پہنچا؟

(a) 1700ء (b) 1705ء (c) 1707ء (d) 1710ء

(v) دریائے لطافت کس کی کتاب ہے؟

(a) مولوی عبدالحق (b) انشااللہ خاں انشاؔ (c) امتیاز علی عرشی (d) محمود شیرانی

(vii) انیسؔ و دبیرؔ نے کس صنفِ شاعری کو فروغ دیا؟

(a) غزل (b) مثنوی (c) قصیدہ (d) مرثیہ

(vii) فورٹ سینٹ جارج کی تعمیر کس سنہ میں شروع ہوئی ؟

(a) 1630ء (b) 1640ء (c) 1650ء (d) 1660ء

(viii) رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کس نے جاری کیا؟

(a) شبلی (b) مولانا حالی (c) محمد حسین آزاد (d) سر سید احمد خان

(ix) ''خارستان وگلستان'' اور ''سودائے سنگین'' کس کی تصنیف ہے؟

(a) سجاد حیدر یلدرم (b) عبدالحلیم شرر (c) پریم چند (d) خواجہ احمد عباس

(x) جدیدیت کا علمبردار کسے مانا جاتا ہے؟

(a) گوپی چند نارنگ (b) احتشام حسین (c) شمس الرحمٰن فاروقی (d) محمد حسن

حصہ دوم

2۔ دکن میں ریختہ کی روایت پر روشنی ڈالیے۔

3۔ اصلاح زبان کی تحریک پر ایک نوٹ لکھیے۔

4۔ دبستان دہلی کی شاعری کی خصوصیات بیان کیجیے۔

5۔ فورٹ سینٹ جارج کالج کی اردو خدمات کا جائزہ لیجیے۔

6۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کی تحریک کا جائزہ لیجئے۔

7۔ انجمن پنجاب لاہور کے قیام اور اس کی مختلف کمیٹیوں کا جائزہ لیجئے۔

8۔ اردو ادب پر سر سید کے فکری اور عملی اثرات کا جائزہ لیجیے۔

9۔ جدیدیت کے رجحان پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

حصہ سوم

10۔ دبستانِ لکھنؤ کی شعری خصوصیات کیا ہیں؟ مثالوں سے سمجھائیے۔

11۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

12۔ رومانی تحریک کے آغاز وارتقا پر مفصل روشنی ڈالیے۔

13۔ ترقی پسند تحریک کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ تفصیلی نوٹ لکھیے۔

14۔ مابعد جدیدیت کی بنیادی خصوصیات بیان کیجیے۔

Notes/اہم نکات

یہ کتاب مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ڈی ٹی پی سیل کاؤنٹر پر دستیاب ہے۔

ملنے کا پتہ:

ڈی ٹی پی سیل کاؤنٹر، ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد-500032 (تلنگانہ)

DTP Sale Counter, Directorate of Translation & Publications

Room No. G-09, H. K. Sherwani Centre for Deccan Studies

Maulana Azad National Urdu University, Gachibowli,Hyderabad-500032

M: 9394370675, 9966818593, Email: directordtp@manuu.edu.in

Account Name: DTP Sale Counter **Account No.:** 187901000009349

Bank Name: Indian Overseas Bank **IFSC:** IOBA00001879

Branch: Gachibowli, Hyderabad

Counter Timings

Monday To Friday

09:30 a.m. To 05:30 p.m.

کتابوں کی قیمت پر رعایت کی شرح:

1۔عام قارئین کے لیے 25%

2۔طلبا، کالجز اور دیگر اداروں کے لیے 30%

کتابیں ڈاک سے بھی منگوائی جاسکتی ہیں۔

نوٹ: -/500روپے سے زائد کے بل پر ڈاک خرچ نہیں لیا جائے گا۔